UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222979
UNIVERSAL
LIBRARY

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیہ)

The Drinched Book

text fiy book

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۸۴) ۱

ہندستانی ادب

حیدراباد دکن

جلد (۱۵) نمبر (۴)

ایڈیٹر

جی۔ ام خان ام۔ اے (عثمانیا)

اسفندار ۱۳۶۴ ف جنوری ۱۹۵۵ء

چندا سالانا آٹھ روپے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
حقایق و معارف	اخفر موہانی	۴
یاد ہے	سید فضا (جالندھری)	۵
غزل	شبنم رومانی (بی کام)	۶
غزل	ناظم جکدیپوی	۷
بہار آئی	ابوالبیان محضر (سندیلوی)	۸
موجودا تعلیم روحانی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔	ڈاکٹر سمپورنانند	۹
افاناسی نکیتین کا سفر ہندستان	دنیا شیو سکایا	۱۱
ہندستانی کلچر	ہنس راج رہبر	۱۴
چمن چمن سے	ظفر عالمگیر بی۔ اے (عثمانیا)	۱۵
غزل	مشتاق پردیسی	۲۶
نوجوانوں کی بین قومی کانفرنس	شرلی کارٹن	۲۷
ہندستانی ڈرامے کی نشو و نما اور ارتقا	ا۔ ا	۲۸
یاد قمر	ظفر عالمگیر بی۔ اے (عثمانیا)	۳۰
تبصرے	"ا"	۳۲

ہمارے خیالات

اردو کے پریمیوں کے مونھ پر ایک اور طمانچہ

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے حال حال میں نیشنل ڈراما فسٹول منایا گیا تھا۔ اس سلسلے میں آج سے چند مہینے پہلے ہندستان کی مانی ہوئی ۱۴ بھاشاؤں میں ڈرامے مانگے گئے تھے۔ مقررمدت کے اندر اندر چند ایک بھاشاؤں کے ڈرامے وصول ہوئے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد میں "تلنگی" زبان میں تقریباً پانچ اوپر چھ سو ڈرامے وصول ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہندی کا نمبر تھا۔ اس بھاشا میں دو سو سے زیادہ۔ مرہٹی میں ایک سو سے اوپر۔ اس کے بعد غالباً گجراتی اور بنگالی وغیرہ کا نمبر تھا۔ اس وقت ہمیں ان کی تعداد یاد نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ صحیح تعداد کا نوٹ جو ہم نے رکھا تھا گم ہو گیا اور ہزار تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ اس لیے محض یاد سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بیان کرنے میں تھوڑی بہت بھول ہوئی ہو لیکن اس کا ہمیں پکا یقین ہے کہ فرق زیادہ نہیں ہو گا۔

— لیکن اردو کے بارے میں ہم سو میں سو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس بھاشا کے صرف اور صرف آٹھ عدد ڈرامے وصول ہوئے تھے ——!

اور یہ یقین ایسا ہے کہ نہ ۹ ڈرامے وصول ہوئے اور نہ ۷ —— بلکے —— صرف اور **صرف**

—— ۸ یعنی **آٹھ** ——!!

کہاں ہیں اردو کے وہ ٹھیکے دار جن کا یہ دعوا ہے کہ "اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے —— اردو کے بولنے اور سمجھنے والے کروڑوں ہی آدمی ہیں —— اور اردو کے پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد ڈیڑھ کروڑوں سے کم نہیں ——" !!

کیا ان سب کو سانپ سونگ گیا تھا —— آیا ان سب کے حواس مفلوج ہو گئے تھے —— یا ان کی عقلیں چرکھانے گئی تھیں؟ جو یہ ڈراما فسٹول کی اہمیت کو سمجھ نہ سکے اور ہزاروں کی تعداد میں —— "اردو ڈرامے" داخل نہ کروا سکے — خیر ہزاروں نہ سہی۔ سیکڑوں ڈرامے تو ضرور بہ ضرور داخل ہونے چاہئیں تھیں۔ اس لیے کہ بقول ان جھوٹے دعویداروں کے کہ اردو جب ہندو مسلمانوں کی ملی جلی میراث ہے تو دونوں کی متحدہ کوشش سے سیکڑوں ڈرامے تو لازمً داخل ہونے چاہئیں تھیں۔

"تلنگی پڑھنے لکھنے والوں کی نہیں بلکے "تلنگی بولنے والوں کی تعداد دو کروڑ سے بھی کم ہے۔ اور یہ تعداد اردو کے دعویداروں کی نام نہاد تعداد سے کئی گنا کم ہے لیکن اس کے باوجود اس بھاشا میں ۶ سو سے اوپر ڈرامے وصول ہوئے۔ اس سے ہرگز بحث نہیں کہ یہ سب داخل کیے گئے ڈرامے کیسے اور کس میعار کے تھے۔ اس لیے کہ ہر زبان سے صرف ایک ہی تو ڈراما چننا تھا۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ جب اردو کے بارے میں ایسے بھاری بھرکم دعوے کیے جا رہے ہیں تو ہندستان کی اتنی بڑی اردو جاننے والی آبادی کی طرف سے ہزار بارہ سو یا چار چھ سو، یا کم سے کم سو دو سو ڈرامے کیوں —— نہیں —— داخل کیے گئے

——؟؟؟ یہ ایک اہم ترین سوال ہے، اس پر ہر شخص کو کافی غور کرنا چاہیے!۔ اور اردو کے پرستاروں کو شرم سے نظریں نیچی کر لینی چاہئیں!

—— بلکل یہی صورت حال ہندی اور ہندی کے پجاریوں کی بھی ہے۔ ہندی کے بارے میں تو یہ دعوا کیا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف حکومت کی زبان ہے بلکہ قومی زبان بھی ہے —— یہ ایک بھونڈا سا دعوا ہے جس کا پول اس نوبت پر کھل جاتا ہے۔ ہندی کی سرکاری حیثیت تو مانی ہوئی ہے لیکن اس کے قومی زبان ہونے کا دعوا —— سفید جھوٹ سے کم نہیں۔ اس کا دہرانا اس لیے ضروری نہیں کہ انہیں صفحوں میں ہم نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس بات کو اعداد و شمار اور حقایق کی روشنی میں ثابت کر دیا ہے کہ ہندی قومی زبان نہیں ہے —— اگر ہندی جیسا کہ کہا جاتا ہے، واقعی قومی بھاشا ہوتی تو اس کے چاہنے والوں کی تعداد کروڑوں ہوتی اور اس بڑی تعداد والوں کی طرف سے ہزار دو ہزار یا کم سے کم ہزار آٹھ سو ڈرامے تو ضرور داخل کیے جاتے —— مگر اعداد و شمار گواہ ہیں کہ ایک غیر قومی اور کم تعداد والوں کی زبان سرکاری اور قومی زبان ہندی سے بھی بازی لے گئی —— !

اس لیے صاف اور کھلے طور پر نتیجا یہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندی اور اردو، دونوں کے دعوے جھوٹے ہیں۔ اگر یہ دونوں دعویدار اپنی اپنی ضد اور ہٹ سے اب بھی باز آ جائیں اور سر جوڑ کر بیٹھیں تو یقیناً کسی نہ کسی بہتر سمجھوتے کی صورت نکل آئے گی۔ اور گاندھی جی مرحوم کی "ہندستانی" کا بول بالا ہوگا ——

یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہندی کی سرکاری حیثیت ہونے پر ہندی اردو سے قریب تر کیسے ہو سکتی ہے ——؟ یہ اس لیے ممکن ہے کہ کسی زبان کی سرکاری حیثیت اور ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ اس کی عام حیثیت بلکل الگ ہو سکتی ہے۔

ہمارا یہی کہنا ہے کہ یہ قومی، قومی کا جھوٹا راگ الاپنا چھوڑ کر اگر دونوں بھاشاؤں کے دعویدار آپس میں سچے دل سے ہات ملانے کی کوشش کریں تو ایک بہتر صورت نکل سکتی ہے۔

اس سے بحث نہیں کہ ہمارے ان مفید مشوروں پر دھیان بھی دیا جائے گا یا نہیں۔ مگر نتیجے کے طور پر ہم پھر سے یہ ضرور کہیں گے کہ اردو کے دعویداروں کو ہمارے ان وچاروں پر خوب خوب ہی دھیان دینا چاہیے —— اور اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ نشنل ڈراما فسٹول کے سلسلے میں جو ڈرامے اسٹیج کیے گئے تھے ان میں ایک اردو کا ڈراما بھی تھا —— افسوس ہے کہ اس کو بھی کوئی انعام نہ مل سکا —— !

یہ ڈراما بھی کوئی اچھا ڈراما نہ تھا بلکہ ایک انگریزی ڈرامے کا چربا ہے۔ جو آج سے ۲۰،۲۲ سال پہلے حیدرآباد کے اسٹیج پر کھیلا گیا تھا۔ اس واقعے سے بھی اردو ڈرامے کی تنگ دامانی ظاہر ہوتی ہے کہ ادب اردو نے اپنی پیدائش سے لے کر آج تک ایک بھی ایسا ڈراما پیش نہیں کیا جو ڈراما فسٹول کے سلسلے میں کھیلا جا کر انعام پانے کا مستحق قرار دیا جا سکتا!

اسٹیج کیے جانے والے ڈراموں میں ہندی ڈرامے کو بھی انعام نہیں ملا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندی اور اردو کی ادبی کوششوں میں کوئی ٹھوس پن نہیں ہے۔ ان دونوں کا کام محض دکھاوے اور ظاہر داری کی خاطر ہے۔ ان دونوں کے پروپگنڈے غلط اور بے معنی سے ہیں۔ ان دونوں میں کچھ عرصے سے جو رسا کشی چل رہی ہے اس کی وجہ سے جیسا کہ چاہیے کام نہیں ہو رہا ہے۔ اگر یہ دونوں اپنے اختلافات کو مٹا دیں اور ایک دوسرے سے قریب تر ہو جائیں تو کیا عجب کہ دونوں کی ملی جلی کوششوں کا پھل مفید ثابت ہو، اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہندی اردو کے فروعی جھگڑوں کو مٹا کر ہندستانی کا روپ اختیار کیا جائے۔

حقائق و معارف

افقر موہانی وارثی

آئے یہاں تو زینتِ فرشِ زمیں رہے — پہنچے وہاں تو رونقِ عرشِ بریں رہے
جانِ حزیں بدن میں رہے یا کہیں رہے — اس سنگِ آستاں پہ مگر یہ جبیں رہے
زیرِ فلک رہے کبھی زیرِ زمیں رہے — ہم جستجوئے یار سے غافل نہیں رہے
دنیائے حسن رنگ بدلتی رہی مدام — اپنے خیال پر مگر اہلِ یقیں رہے
توہین ہے کلیم یہ ذوقِ نگاہ کی — خود جلوہ گر کہیں رہے جلوہ کہیں رہے
تیرا ہی گو خیال ہے تیرے سوا تو ہے — ہم تجھکو مونھ دکھانے کے قابل نہیں رہے
زاہد خراب ہے نہ کر سجدہ گاہ کو — سجدہ وہ کر کہ سجدے کے قابل نہیں رہے
دنیا کے رونے والے بس اتنا رہے خیال — تر آنسوؤں سے حشر میں بھی آستیں رہے
تیرا خیال، تیری تمنا، ترا ملال — یہ ساتھ عمر بھر رہے گو ہم کہیں رہے
اب کامیاب دید ہے اپنی نگاہِ شوق — بے پردہ کوئی آئے کہ پردہ نشیں رہے
ذوقِ سجود کی مرے اللہ ری کاوشیں — اب آستانِ یار رہے یا جبیں رہے
جتنے بھی سوگوار ترے اے شہیدِ ناز — تا عمر تیرے غم میں وہ اندوہگیں رہے
اے ناشناسِ جنسِ وفا ہم خدا گواہ — تیرے نہیں رہے تو کہیں کے نہیں رہے
زاہد بتائیں ہم تجھے آدابِ معرفت — کعبہ میں بھی خیالِ بتِ نازنیں رہے
افقر یہی ہے حاصلِ سرمایۂ حیات — آنکھوں میں جلوہ ان کا دمِ واپسیں رہے

یاد ہے

سید فضا جالندھری
فاضل ادب

وہ کسی کا جلوۂ زیبا دکھانا یاد ہے
مسکرانا بجلیاں دل پر گرانا یاد ہے

شوخ اداؤں کی وہ لذت وہ لگاوٹ کے مزے
وعدہ کرنا اور پیہم بھول جانا یاد ہے

عارضوں کے پھول مہکاتے ہوئے آتے تھے وہ
سانس کتنی تھی صبا کی وہ زمانا یاد ہے

تیرے پیمانِ وفا نے رنگ تھا جس میں بھرا
یاد ہے او بے مروت وہ زمانا یاد ہے

میں نے جب شکووں کے دفتر کھول کر رکھ دیے
وہ خفا ہو کر ترا مجھکو اٹھانا یاد ہے

ہائے وہ دلداریاں وہ رسم و راہ حسن و عشق
حالِ دل نظروں ہی نظروں میں سنانا یاد ہے

مہربانی سے کبھی نامہربانی سے کبھی
اضطرابِ شوق بے پایاں بڑھانا یاد ہے

وہ مری بیتابیوں پر ایک مستِ ناز کا
زیرِ لب کچھ کہہ کے دامن کا چھڑانا یاد ہے

پرسشِ حالِ دلِ مضطر ادائے خاص سے
بعد ازاں محرومیوں پر مسکرانا یاد ہے

اف وہ طرزِ دلکشی اف وہ نگاہِ سحرکار
میرے دل میں ہوک بن بن کر سمانا یاد ہے

جس کی ہر ساعت ہزاروں عشرتوں سے ہمکنار
وہ امنگوں آرزوؤں کا زمانا یاد ہے

آج تک اک کیف سے رنگیں ہے میرا خیال
وہ رخِ زیبا دکھا کر پھر چھپانا یاد ہے

وہ حضورِ حسن دلکش انتہائے جوش میں
دامنِ صد چاک پر آنسو بہانا یاد ہے

ہائے وہ دل جس میں حسرت تھی ترے دیدار کی
یاس کی پامالیوں میں اس کا آنا یاد ہے

فطرتِ حسنِ ستمگر میں کہاں لطف و کرم
اک حیا پرور کا اب تک دل دکھانا یاد ہے

انقلابِ دہر سے جو ہو گیا خواب و خیال
وہ فسانا یاد ہے اور وہ زمانا یاد ہے

کچھ نہیں دل میں فضاؔ اب داغِ حسرت کے سوا
ابتدائے عشق کا رنگیں زمانا یاد ہے

غزل

شبنم رومانی (بی کام)

آج! یہ بھیگی بھیگی سی پلکوں کی صف
حسن ہے غالبؔ اب خود اپنا ہدف

●

ہنس کے دیکھو مرے آنسوؤں کی طرف
خود بخود بج اٹھیں گے ستاروں کے دف

●

اللہ اللہ!! یہ فیض نگاہ کرم
پھول ہی پھول بکھرے ہیں چاروں طرف

●

دوستی دشمنی ـــــ روشنی تیرگی
کتنی مربوط ـــــ اور کس قدر مختلف!

●

میں ہوا آبدیدا تو وہ ہنس پڑے
یہ اشارا تھا "عہد وفا" کی طرف

●

ذہن میں یاد ایام کا قافلا
ساحل نیل پر مہ جبینوں کی صف

●

کس کی مخمور آنکھیں مجھے لے اڑیں
"جنت خواب" کی وادیوں کی طرف؟

●

کہکشاں منزل راہ شبنم نہیں
شبنمستاں ہے وہ دیکھیے! اسطرف!!

●

کس کو دعوا ہے اندازۂ "حسن" کا!
عشق تک کو تو حاصل نہیں یہ شرف!

غزل

کر اہتمام بہاراں، مگر چمن میں ندیم
لگی ہے آگ بھی پھولوں کے مسکرانے سے

یہ تیڑے میڑے ہی رستے گئے ہیں منزل کو
ندیم افائدا کیا سیدھی رہ پہ جانے سے

غمِ حبیب سے پہنچے غمِ حیات تلک
یہ راہ جاتی ہے تیرے ہی آستانے سے

ترا خیال ہے جو شام سے ہے پہلو میں
ترا وصال تو ہوگا سحر کے آنے سے

یہ آدمی کا جگر ہے یہ سنگ خشت نہیں
جو تلملائے نہ گھبرائے چوٹ کھانے سے

جئیں ہزار برس یہ فریب کار جئیں
کھلی ہے آنکھ ہماری فریب کھانے سے

وطن کی مانگ میں بھر دو لہو ستاروں کا
یہ رات مر نہ سکے گی دیے جلانے سے

نہیں ہے آدمی ہرگز وہ جس کو پیار نہ ہو
نئے جمال، نئی ضو، نئے فسانے سے

ہزار رنگ کی تصویر دل میں ہے ناظم
نہیں ہے کم یہ کسی بھی نگار خانے سے

ناظم (چکدہنوی)

بہار آئی

تجلی حسن کی دنیا میں جب پھر ایک بار آئی / پکارے حضرت موسیٰ نئے سر سے بہار آئی

ہنسی آتی نہ کیوں اس برق خرمن سوز پر مجھکو / جو دھوکے میں نشیمن کے قفس تک بار بار آئی

وہاں اٹھتے ہیں پردے بے محابا خود مٹے ہے پہ دیں / کہ میرے سامنے جب آئی شیشہ در کنار آئی

وہ ناکام تمنا ہوں میں دشت یاس و حرماں میں / کہ پابوسی کو میری گردش لیل و نہار آئی

رہ غربت میں لاشے کا ہمارے دفن ہونا تھا / سمٹ کر کل جہاں کی بیکسی سوئے مزار آئی

دل پر داغ کا ہر زخم مثل گل شگفتہ ہے / خزاں پیدا چمن زاروں میں پھر فصل بہار آئی

یہ کس وحشی کا صحرا میں پڑا ہے بے کفن لاشہ / کہ جس کو دفن کرنے اٹھ کے خاک کوئے یار آئی

مری کشتی تھی ڈانواڈول جب بحر محبت میں / کسی کی یاد اس دم بن کے دل میں غمگسار آئی

مریض شام غم اتنا سمجھنے سے بھی قاصر ہے / سحر ہونے کو آئی یا لبوں پر جان زار آئی

نہ جانے کیا نکل جاتا مرے منہ سے سر محشر / یہ ہے قسمت قضا میری بہ دامان یار آئی

پرانا بادہ کش محضر ہے تو بھی پاس کر ساقی
کہ دخت رز مچل کر اس کی خاطر بیقرار آئی

(ابو البیان) محضر (سندیلوی)

موجودہ تعلیم روحانی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی

(تعلیم کا حقیقی نصب العین عوام کی خدمت ہے) ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں مضمون نگار کے خیالات سے

ڈاکٹر سمپورنانند

علم اور قوت کو سب کی بھلائی کے لیے استعمال کرنا چاہیے ہمارا واحد حق لوگوں کی سیوا ہے اور یہی ہمارے فرض میں بھی داخل ہے۔ تعلیم کا مقصد ہی جسمانی و ذہنی نشو و نما۔ اخلاق اور جذبات کو اسی سانچے میں ڈھالنا ہے ہندستان میں تعلیمی سسٹم کے آیندہ ڈھانچے کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے تعلیم کے حقیقی مقصد کو سمجھنا لازمی ہے یہ روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ مستقبل میں بھارت میں تعلیم عام ہوگی اور ثانوی تعلیم کے نقایص کو دور کرنے کے لیے اس میں موزوں تبدیلیاں کی جائیں گی تاکہ ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبا کے لیے روزگار اور سماجی خدمت کے مواقع میسر ہو سکیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یونیورسٹی کی تعلیم کا معیار بھی بلند کیا جائے گا۔ ہندستان میں ٹکنیکل تربیت حاصل کرنے کی سہولتوں میں اضافہ ہوگا۔ اور ہندستانی سائنسداں عالمگیر سائنسی ترقی میں اپنا پارٹ ادا کریں گے اگر ہندستان میں اوپر کی تمام باتیں عملی شکل اختیار کر جائیں تو یقیناً یہ امر ہمارے لیے باعث فخر ہوگا۔

لیکن ہندستان کے آیندہ تعلیمی ڈھانچے پر اعتراض کرنے والے کسی فرد کے لیے محض اوپر کی باتوں کو پیش نظر رکھنا ہی کافی نہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تعلیم کا حقیقی مقصد کیا ہونا چاہیے۔

آج کل کی تعلیم کا اہم مقصد انسانوں کو زندگی کی جدو جہد کے لیے تیار کرنا اور اسے اپنے شعور اور شخصیت کی کی نشو و نما کے لیے مواقع بہم پہنچانا ہے تاکہ وہ اچھے شہری ثابت ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ جو تعلیمی سسٹم انسان کو کسی روزگار کے قابل نہیں بناتا۔ وہ اصلاح طلب ہے لیکن اس بارے میں کوئی انتہائی نظریہ قایم کرنا ایک ایسی غلطی کے مترادف ہوگا جس سے ہمیں بچنا چاہیے۔ لوگوں میں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ تعلیم بذات خود روزگار مہیا کر سکتی ہے۔ تجارت اور صنعت میں متوقع توسیع نہ ہونے کے باعث بیکاری کا مسئلہ دن بدن زیادہ خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ مگر بے کاری کے اس مرض کی تہ تک پہنچنے کی بجائے اس کی تمام تر ذمے داری موجودہ تعلیمی سسٹم پر ڈال دینے کا آسان طریقہ دریافت کر لیا گیا ہے۔

محض تعلیمی ڈھانچے میں تبدیلیوں سے ہی بیکاری کا یہ مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ایک دلیرانہ اور دور اندیشانہ اقتصادی پالیسی پر عمل کرنے کی ضرورت ہے اس موقع پر پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے۔ تعلیم اور زندگی کے حقیقی مقاصد میں چنداں تفاوت نہیں۔ ہندستان کے مفکروں کی رائے کے مطابق اپنی ہستی کو قایم رکھنا بھی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم دوسرے لوگوں کے اس قسم کے جذبات کو نظر انداز کر دیں۔ جب ذاتی مفاد کے احساس کے ساتھ ساتھ ہم علم اور تہذیب کی روشنی سے بہرہ ور ہوتے ہیں تو ہمیں زندگی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور ایک دوسرے کی خدمت کرنے کی اہمیت کا احساس بھی ہو جاتا ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ہمارے اندر بے غرضانہ خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ آخر کار ہم "کوشش" کی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور ہمارے تمام اعمال خود بخود مجسم دھرم کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ زندگی

کا یہی مقصد انسان کو "اشرف المخلوقات" ہونے کا درجا عطا کرتا ہے۔ چنانچہ تعلیم کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ تعلیمی اداروں کو آشرموں میں تبدیل کر دیا جائے اور انہیں لوکش کی منزل پر پہنچنے کے لیے یوگ وغیرا کی تربیت گاہیں بنا دیا جائے۔ بہرحال اس بات کو شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے کہ دھرم کے بغیر طلبا کو اخلاقی تربیت نہیں دی جا سکتی۔ یہاں مذہب سے مراد کوئی خصوصی اصول نہیں۔ بلکہ وہ اسپرٹ ہے جو تمام مذہبی عقیدوں کی تہ میں پائی جاتی ہے۔ اگر ہم سب فرائض کی انجام دہی کی طرف زیادہ توجہ دینے لگ جائیں تو ہر شخص کے حقوق بلا چیخ و پکار محفوظ ہو جائیں گے۔ تعلیمی عرصے کے دوران طلبا کو محض ذہنی نشو و نما یا جسمانی مشقت کی اہمیت پر ہی زور نہیں دیا جانا چاہیے بلکہ ان کی روحانی ترقی کی طرف بھی توجہ دی جانی چاہیے۔

ہمارے موجودہ تعلیمی سسٹم میں "عقیدے" کے اسی عنصر کی کمی ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی ایسا نصب العین نہیں جو محض زندہ رہنے کی خواہش سے بلند تر ہو۔ مہاتما گاندھی نے ہمارے سامنے ایک فلسفہ پیش کیا تھا لیکن اسے بھی ہم نے مکمل طور پر نہیں اپنایا۔ اس طرح ہماری زندگی میں ایک خلا سا پایا جاتا ہے۔ انسان کا نظریہ ایسا ہونا چاہیے جو محض مادی ترقی کے نظریے سے بلند تر ہو۔ اس غرض کے لیے انسان کو پھر دھرم کی طرف واپس لانے کی ضرورت ہے۔

اگر سیکولرزم اور جھوٹی عقلیت کے نظریوں پر غلط انداز سے زور نہ دیا جائے اگر ہمارے ملک کی تعلیمی پالیسی تیار کرنے والے افراد تعلیمی ڈھانچے میں ہمارے ملک کی عظیم روایات کو موزوں مقام دیں۔ اور اگر ہماری یونیورسٹیاں وقت کے تقاضے پر پوری اتر سکیں۔ تو ہندستان کا مستقبل یقینی طور پر شاندار ہوگا۔ اور اس قسم کی تعلیم سے ایسے شہری تیار ہوں گے جن کی موجودگی سے ہندستان میں پُر مسرت زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔ اس کے برعکس اگر ہمارے ماہرین تعلیم کے مسئلے پر بھی مغربیت سے ہی بندھے رہے اور انہوں نے تعلیمی سسٹم میں دھارمک سپرٹ کو داخل کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا تو ہماری ترقی رک جائے گی۔

انسان کو اس قسم کی تعلیم دی جانی چاہیے جس سے انسانوں میں پھوٹ ڈالنے والی رکاوٹیں بالکل مٹ جائیں یا بہت حد تک ان کا وجود باقی نہ رہے۔ اس راستے پر چلنے سے ہندستان تمام دنیا کی طرف سے مبارک باد کا مستحق ہوگا ورنہ وہ مغرب کے پیچھے ہی لڑکھڑاتا رہے اور عقلیت کے بے روح نظریے کی پیروی کرنے سے کوئی شاندار کامیابی حاصل نہیں کر سکے گا۔

● نئے تقاضوں کا ترجمان ——— نئے عزائم کا پیامبر
● اردو کا مقبول ترین شاعر
اختر انصاری (اکبرآبادی)
دل رسوا
اپنی جدید غزلوں اور نظموں کا مجموعہ پیش کرتا ہے
قیمت ——— دو روپیہ
برگ سبز
اردو شاعری کی جدید و قدیم اقدار کا مبلغ
ابو مسلم صحافی
اپنا پہلا مجموعہ کلام پیش کر رہا ہے
قیمت ——— دو روپیہ
سول ایجنٹ ——— مرکز ادب مشن روڈ۔ کراچی

افاناسی نکیتین کا سفر ہندستان

م۔ وتیناشیوسکایا

(پندرویں صدی کی تاریخ کا ایک ورق)

چارسو پچاسی برس ہوئے ۱۴۶۹ء کے موسم گرما میں تویر کا ایک سوداگر افاناسی نکیتین اپنے سفر ہندستان پر روانا ہوا یہ سفر چار برس تک جاری رہا۔ ہندستان آنے والے سب سے پہلے یورپی باشندے افاناسی نکیتین نے اپنی سیاحت کا مفصل روزنامچہ رکھا۔ روس واپس آنے پر ان کے حالات سفر روسی روزنامچے "دمانے کی داستان" میں شامل کردیے گئے۔ افاناسی نکیتین ایک متجسس ذہن کے مالک تھے اور صرف تجارتی مفادات ہی انہیں دور دراز ملکوں میں نہیں لے جاتے تھے۔ بلکے دوسری قوموں کی زندگی ان کی روایات، رسم و رواج اور مذہب سے ان کی گہری دلچسپی بھی شامل حال تھی۔

قدیم روسی شہر تویر سے (جو اب کالی نین ہے) ۱۴۶۹ء میں روانا ہوکر نکیتین سوداگروں کے ایک کاروان کے ساتھ کشتی کے ذریعے دریا والگا کے رستے روانا ہوئے استراخان کے آگے بحیرہ کیسپین میں سفر کرکے وہ دربینت پہنچے، باکو گئے۔ اور وہاں سے جہاز کے ذریعے ملک فارس (ایران) کو روانا ہوگئے۔ فارس میں ان کی سیاحت اپریل ۱۴۶۹ء تک جاری رہی۔

۹ اپریل کو نکیتین اپنے گھوڑے سمیت ایک چھوٹے سے جہاز میں سوار ہوئے۔ بعد میں یہ گھوڑا ہندستان میں فروخت ہوا۔ بحر ہند میں ساحل مالابار کی پہلی بندرگاہ چاول تک کا سفر چھ ہفتوں میں ختم ہوا۔ رستے میں نکیتین مسقط قلات اور دیو میں ٹھہرے۔ نکیتین کے تاثرات روزنامچے میں درج ہیں جن سے ہندستان کے سادا لوگوں سے محبت اور احترام کے جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے کھمبایت کا ذکر کیا ہے۔ جو گجرات کے بڑے شہروں میں سے ہے۔ اور اندنوں وہاں ہندستان میں مسلمانوں کی ایک خودمختار سلطنت تھی وہاں تیار ہونے والے مختلف کپڑوں اور رنگوں کے متعلق نکیتین نے مفصل معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے چاول کا ذکر کیا ہے۔ وہاں کے باشندوں کی زندگی کھانے اور کپڑوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

چاول سے نکیتین نے گھاٹ پار کیے اور سطح مرتفع دکن کے اندرونی علاقے میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے شہر جنار اور اس کے قلعے کا مفصل حال بیان کیا ہے۔ یہ بہمنی سلطنت کے سب سے بڑے شہروں میں سے تھا۔ انہوں نے ملک کے اس خطے کی زراعت اور کسانوں کی زندگی کے متعلق حالات بھی قلم بند کیے۔ جنار کے حاکم اسد خان نے نکیتین کو مذہب اسلام قبول کرانے کی کوشش کی۔ لیکن نکیتین راضی نہ ہوے کیونکے ان کی نظر میں ان کا مذہب اپنے وطن کا مذہب تھا۔ موسم برسات ختم ہوتے ہی نکیتین پھر سفر پہ چل کھڑے ہوے۔ ایک مہینے بعد ۱۵ ستمبر ۱۴۶۹ء کو وہ قرون وسطیٰ کی بہمنی سلطنت کے صدر مقام بیدر پہنچ گئے۔ وہاں سے وہ الاند کے میلے میں گئے۔ اور رستے میں لوک کہانیاں اور عام روایتیں قلم بند کرتے رہے۔ اس علاقے کے قدرتی حالات کا مشاہدہ کیا اور عام لوگوں کے حالات زندگی درج کیے۔

نکیتین نے بیدر کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

دارالخلافہ کی شان و شوکت نے سیاح کو بڑے اچنبے میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے سلطان کے محل کے طرز تعمیر، ہندستان کے باکمال فن کاروں کی سنگتراشی، شہری زندگی، دربار کے حالات اور مختلف رسموں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ سلطان کے دربار اور مقامی رئیسوں کے عیش و عشرت کے مقابلے میں جو کہ ترکوں اور افغانوں میں سے بھرتی کی ہوئی فوجوں اور دوسرے زرخریدوں کی مدد سے حکمرانی کرتے تھے، افاناسی نکیتین نے محکوم اور مظلوم ہندستانی آبادی کی افسوسناک حالت واضح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سر زمین اچھی خاصی آباد ہے۔ گاؤں والے بہت ہی مفلس ہیں۔ اور بوبیر (یعنی حکمران مسلم رئیس) فراغت اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نکیتین بہت سے ہندستانی دستکاروں اور کسانوں سے بھی ملے جب شہروں کے عوام اور کسانوں کو معلوم ہوا کہ وہ روسی ہیں۔ اور ان کے ارادے نیک ہیں تو وہ بڑی ہی مہمان نوازی سے پیش آئے اور انہیں خوشی سے اپنے رسم و رواج، مذہب دستکاریوں اور تجارت سے آگاہ کیا۔ بہ قول نکیتین "انہوں نے اپنے کھانے، تجارت، عبادت یا اور کوئی چیز مجھ سے چھپا نہیں رکھی" ہندستانیوں نے اپنے دوست کو شیو کے تہوار کے موقع پر پاروتا بلایا۔ پاروتا میں بہت سارے مندر تھے ان کے کھنڈرات گذشتہ صدی کے آخری نصف حصے میں دوبارہ ملے۔ اپنے روزنامچے میں نکیتین نے ایک سب سے بڑے مندر کا ذکر مفصل طور پر کیا ہے۔ مذہبی رسوم اور دیوتاؤں کے متعلق تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ نکیتین کو ہندستان کی ایک مورتی بہت ہی پسند آئی اور انہوں نے اس کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ انہوں نے مختلف ذاتوں ان کے کھانوں اور ان کی روایات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ پاروتا سے بیدر واپس آکر نکیتین نے اس ملک کے متعلق اپنا مشاہدہ اور مطالعہ جاری رکھا۔ ان کے روزنامچے میں ساحل مالابار پر واقع ہندستانی رجواڑوں کے خلاف بہمنی سلطان کی لشکر کشیوں کا مفصل حال موجود ہے۔

اس زمانے کی لڑائیوں کا حال انہوں نے بڑی ایمانداری اور تاریخ سے دیانتداری برتتے ہوئے لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ بہمنی حکمران اس بات پر بہت ہی برہم ہوئے کہ ان کی مہموں میں ہندستانی آبادی نے حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ افاناسی نکیتین نے وجے نگر کے محاصرے میں سلطان کی فوجوں کی ناکامی کا ذکر بھی کیا ہے چودھویں صدی میں وجے نگر ایک طاقتور ہندستانی سلطنت کی راجدھانی تھا اور بعد کی دو صدیوں میں سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے اس نے بڑا اہم حصہ ادا کیا۔ تاریخ نویسوں نے اس مہم کے متعلق بہت غلط بیانی کی ہے نکیتین نے ایک عینی شاہد کی حیثیت سے اس کا حال بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ان کی فراہم کی ہوئی معلومات اس لیے اور بھی زیادہ قابل قدر ہیں کہ سلطان کی اسی ناکام مہم سے بہمنی سلطنت کا زوال شروع ہوا جس کا شیرازہ پندرویں صدی کے اختتام اور سولویں صدی کے شروع میں منتشر ہو گیا۔ اور کئی جاگیرداروں نے اپنی اپنی خود مختار ریاستیں قایم کر لیں۔ دکن کا دورہ کرتے ہوئے نکیتین رایچور گئے جو حیدرآباد سے ایک سو ستر کلومیٹر (اکلو میٹر ۵/۸ میل) کے فاصلے پر واقع ہے۔ انہوں نے ساحل مالابار پر واقع ایک متمول شہر کالی کٹ کا حال لکھا ہے اور ان کا اور دوسرے کئی مقامات کا بھی ذکر کیا ہے وطن کی یاد نے نکیتین کو واپسی کے سفر پر مجبور کیا۔ اور وہ ۱۴۷۲ء میں وطن لوٹے وہ دابول سے جو ان دنوں ساحل مالابار کی ایک بڑی بندرگاہ تھا جہاز کے ذریعے ملک فارس (ایران) کے لیے روانہ ہو گئے وہاں سے وہ بحیرہ اسود پار کر کے کافا پہنچے۔ اور کافا سے (جو آج کل تھیوڈوسیا کہلاتا ہے) اپنے وطن تویر پہنچ گئے۔ لیکن اسمولینسک پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ دوسرے سوداگروں نے ان کی یادداشت ماسکو کے شہزادہ اعظم کے

دربار میں پہنچا دی۔

نکیتین کی سیاحت ہندستان اور ان کی نہایت ہی دلچسپ یادداشت نے روسیوں کو ہندستان سے واقفیت حاصل کرنے میں مدد دی۔ اور دونوں قوموں کے درمیان دوستانا تعلق اور رابطے کی ابتدا کی۔ نکیتین کا سفرنامہ دستیاب ہونے پر گذشتہ صدی کے مشہور روسی ادیب اور تاریخ نویس کارآمیزین نے لکھا تھا" پرتگال، ہالینڈ اور برطانیا کا نام سننے سے پہلے ہی ہندستان کے لوگوں کے کان روس کے نام سے آشنا ہو چکے تھے۔ جن دنوں واسکوڈی گاما افریقا سے ہندستان پہنچنے کا رستہ تلاش کرنے کے امکانات پر محض غور ہی کر رہا تھا ان دنوں ہمارا تویری افاناسی نکیتین مالابار کی سیاحت میں مصروف تھا۔" افاناسی نکیتین ایک چھوٹی سی کمزور کشتی پر ہندستان کے لیے روانا ہوا تھا۔ واسکوڈی گاما کی طرح نہایت اچھی طرح آراستہ جہاز پر نہیں۔ اس کی کل کائنات ایک گھوڑا تھا۔ لیکن جب افاناسی نکیتین نے نیا ملک نئی سرزمین دیکھی اور جب وہ نئے لوگوں سے ملا تو دنیا دیکھنے کی اس کی آرزو اس کو ایک نامعلوم ملک کے اندرونی علاقوں میں لے گئی۔ وہ ایک دوست بن کر آیا جسے کوئی لالچ اور منافع کی کوئی ہوس نہ تھی۔ اسی وجہ سے وہ ہندستان کے عام لوگوں سے بڑا بے تکلف ہو گیا تھا اور وہ ایسی یادداشت لکھنے کے قابل ہوا کہ جو پانچ سو برس کی مدت گذر جانے کے بعد آج بھی اپنے وطن دوستانا جذبات زندگی کی واضح عکاسی، مصنف کے بیانات کے خلوص اور راستی کے باعث ہمارے دلوں کو گرماتی ہے اور ہمارے دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔

نکیتین کی یادداشت میں پندرویں صدی کے ہندستان کے متعلق نہایت ہی بیش قیمت اور مختلف قسم کا مواد موجود ہے اس میں جغرافیائی معلومات بھی بہت ملتی ہیں ہندستان کی قوموں کی زندگی رسم و رواج اور مذہب کے متعلق ان کا تذکرہ اکثر اعتبار سے ان کے ہمعصروں کے لیے ایک انکشاف کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہندستان کے متعلق پندرویں صدی اور سولویں صدی کے جن مسلمان تاریخ نویسوں نے جو کچھ لکھا ہے انہوں نے اکثر ایسے واقعات کو نظرانداز کر دیا ہے جن سے مسلمان فاتحین کے عیوب ظاہر ہوتے ہیں۔ نہ ہی وجے نگر میں بہمنی سلطان کی شکست کا ان کی تحریروں میں کہیں ذکر آتا ہے۔ نکیتین واحد شخص تھے جنہوں نے قرون وسطا کے ہندستان کی تاریخ کا یہ دلچسپ ترین واقعا قلم بند کیا۔ ان کی یادداشت میں بہت سے بیش قیمت واقعات اور حقایق درج ہیں جن کا علم قدیم ہندستان کی زندگی کو سمجھنے کے لیے نہایت ضروری ہے اور جنہیں ان کے ہمعصر سیاحوں نے نظرانداز کر دیا تھا۔ یہاں یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اگرچہ نکیتین کی یادداشت کے بہت سے واقعات کا آج کل عموماً سب کو علم ہے لیکن پندرویں صدی میں ان کی اسی یادداشت نے روسیوں اور یورپ کی دوسری قوموں کو ہندستان کے متعلق سب سے پہلے معلومات فراہم کیں، جو اس زمانے میں دنیائے یورپ کے لیے قریب قریب ایک نامعلوم ملک تھا نکیتین کی یادداشت کی تاریخی اہمیت اور قدر اس لیے اور بھی کہیں زیادہ ہے کہ یہ پندرویں صدی کی ایک تاریخی اور ادبی یادگار ہے جو اپنی گمبھیرتا اور حقیقت بیانی کے لحاظ سے نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

اگر آپ مصنف ہیں

اور اپنی تصنیف کی بھلائیوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو "ہندستانی ادب" میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجیے۔ اس لیے کہ یہی وہ بیباک رسالہ ہے جو اپنوں اور غیروں کا لحاظ کیے بغیر کھری کھری سنا دیتا ہے۔

ہندستانی کلچر

ہنس راج رہبر

(پچھلے سال ہندستانی کلچر سوسایٹی نے ہندستانی کلچر پر انعامی لیکھ لکھائے تھے۔ تیس ودوانوں نے اس پرتی یوگتا میں بھاگ لیا تھا۔ دیش کے تین ذمے دار اور بڑے ودوان جج بنائے گئے تھے۔ انہوں نے محنت سے سارے لیکھوں کو پڑھ کر اپنا نرنے دیا ہے۔ ان لیکھکوں میں سے کسی کو انعام ملا ہے۔ چاہیے یہ تھا کہ ان لیکھوں کو پہلے چھاپا جاتا جن کو انعام ملا ہے۔ لیکن وہ سب لیکھ انگریزی ہیں اور انوواد کرنے میں سمے لگے گا اس لیے ہم پہلے ان لیکھوں کو چھاپ رہے ہیں جو ہندستانی بھاشا میں ہیں۔ ان لیکھوں میں جو وچار ظاہر کیے گئے ہیں ان کا 'نیا ہند' سے کوئی سمبندھ نہیں ہے اس پرتی یوگتا میں ہر وچار دھارا کے لوگوں نے بھاگ لیا ہے اور اسی لیے ان لیکھوں میں ہر وچار دھارا پڑھنے کو ملے گی۔ ہم نیا ہند کے پاٹھکوں کے سامنے یہ سامگری اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ وہ سب وچاروں کو سامنے رکھ کر اپنا وچار بنا سکیں اور صحیح کلچر کی روپ ریکھا سامنے آسکے۔ ایڈیٹر)

میرا خیال ہے کہ پرکرتی کے بارے میں ادھک سے ادھک جانکاری حاصل کرنا اور اسے عمل میں لانے کا نام کلچر ہے۔

جس دیش یا جاتی نے پرکرتی کے بارے میں جتنی ادھک جانکاری حاصل کی اور اپنے جیون میں اس جانکاری پر جتنا عمل کیا اتنا ہی اس کا کلچر آگے بڑھا۔ اور اس دیش یا جاتی کی ترقی ہوئی۔

ہندستان نے پرکرتی کے بارے میں ڈھیرے ڈھیرے جتنا گیان حاصل کیا اور اس گیان کو اپنے عملی جیون میں ڈھالا اسی کا نام ہندستانی کلچر ہے۔

وید — ہندستان کے شروع کے باشندوں — آریوں کے گیان کے بھنڈار ہیں اور وہ دنیا کی سب سے پرانی پستکیں مانی جاتی ہیں۔ وید شبد 'ود' دھاتو سے بنا ہے جس کا مطلب ہے — جاننا۔ ویدوں میں بھی سب سے پہلی پستک رگ وید ہے رگ کا مطلب ہے — نیچر یا پرکرتی۔ اور وید کا مطلب ہم پہلے بتا چکے ہیں — جانکاری۔ اس لیے رگ وید کا مطلب ہوا — قدرت کے بارے میں جانکاری۔

دوسری پستک یجر وید ہے۔ یجر کا مطلب ہے — کام میں لانا۔ عمل کرنا۔ اس لیے یجر وید کا مطلب ہے — جانکاری یا گیان کو عمل میں لانا۔

رگ وید اور یجر وید کے ان ارتھوں سے ہم ان نتیجوں پر پہنچتے ہیں کہ ہندستان کے شروع کے باشندوں — ہمارے پوروجوں نے — قدرت کے بارے میں ادھک سے ادھک جانکاری حاصل کرنے اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کی اس طرح انہوں نے اپنے کلچر کو آگے بڑھایا۔ گیان کے بارے میں ان کے من میں کوئی تعصب نہیں تھا۔ جس چیز کو وہ مفید دیکھتے تھے اسی کو اپنا لیتے تھے، اور جسے اپناتے تھے اس پر عمل کرتے تھے۔ ودوانوں کا کہنا ہے کہ ویدوں کے منتر رشیوں نے بنائے یا رچے نہیں۔ بلکے دیکھے ہیں۔ اس کا بھی یہی مطلب ہوا کہ ویدوں کے منتر کوی کے وچار کی اڑان یا کلپنا کی چیز نہیں بلکے منشیہ کے تجربے کا نچوڑ ہے۔ اس نے اپنے جیون میں جو کچھ دیکھا اور کیا اسے منتروں میں لکھ دیا۔ ظاہر ہے کہ آدمی جو کچھ دیکھتا اور کرتا ہے اسے لکھ دینا آسان نہیں ہے آدمی جو کچھ دیکھتا ہے اور کرتا ہے اس کے ساتھ اس کا انجانے ہی ایک دماغی سمبندھ جڑ جاتا ہے اور اس سمبندھ کے ذریعے وہ اپنے اندر ایک اثر قبول کرتا رہتا ہے یہ اثر جمع ہوتے ہوتے آتما میں ایک بیج سا بن جاتا ہے

اس بیج میں بہت سے باہری تتو ملے ہوتے ہیں۔ جیسے بیج آن کر پھوٹنے سے پہلے زمین کے اندر ایک عرصے تک پلتا رہتا ہے یہ بیج بھی آدمی کی آتما میں پرورش پاتا رہتا ہے اور ایک دن اچانک اس کا خول ٹوٹ کر الگ ہو جاتا ہے۔ اور اس میں سے ایک سندر اور کومل انکر پھوٹتا ہے۔ یہ آدمی کا گیان یا کلچر کا پھل ہوتا ہے۔ جیسے وہ منتر چھند یا شعر نثر مورتی یا چیز میں ظاہر کرتا ہے۔ کلچر اطالوی شبد CULTUS سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے جوتنا۔ اپنے اندر بیج بونا۔ ویدوں کے بنانے والے بہت سے رشی تھے۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی یعنی وید منتر سب کے ساجھے کے گیان کا بھنڈار ہے کوئی بھی منتر یا شعر کسی بھی ایک آدمی کے تجربے کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ ایک آدمی دوسروں کے تجربوں سے بھی سیکھتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتے اور رکھتے ہیں اس سے اثر لیتا ہے یہ تجربا اور اثر ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی کو وراثت میں ملتا ہے۔ اس لیے رشیوں نے جو وید منتر دیکھے تھے وہ ان سب منشیوں کے تجربے کا نچوڑ تھے۔ جو اس سمے تک قدرت کی جانکاری حاصل کرنے اور اسے عمل میں لانے کے لیے جٹے رہتے تھے۔

اتہاسکاروں کا کہنا ہے کہ آریا لوگ آیبریا سے آئے تھے کیونکہ ویدوں میں جن اندر اور ورن آدی دیوتاؤں کا ذکر ہے وہ ایرین کے بھی دیوتا تھے۔ پہلے پہل آدمی نے اپنے جیون کے انوبھو اور گیان کو دیومالا (MYTHOLOGY) میں ہی ظاہر کیا۔ کیونکہ وہ اسے اپنے گیان کے بنیادی اصولوں کو نہیں سمجھا تھا۔ دنیا کے بارے میں وہ اپنے گیان کو دیوتاؤں کے نام سے ظاہر کرتا تھا۔ آریا جب ہندستان میں آئے تو وہ اندر ورن اور سوریا آدی دیوتاؤں کے روپ میں کچھ گیان اور کلچر اپنے ساتھ لائے۔ ان کے آنے سے پہلے بھی یہاں دراوڑ اور کول بستے تھے وہ بھی ہزاروں سال سے قدرت کے بارے میں جانکاری حاصل کرتے اور اسے عمل میں لانے رہتے تھے ان کا ایک کلچر تھا جو سندھ میں پھل پھول رہا تھا۔ موہن جو درو اور ہڑپا کے کھنڈروں کی کھدائی سے پتا چلا ہے کہ ان کا کلچر بہت ترقی کر چکا تھا وہ روئی اگاتے تھے کپڑے پہنتے تھے اور اپنے برتنوں اور دوسری چیزوں پر نقاشی کرتے تھے اس کے علاوہ موہن جو دڑو سے ایک نٹی کی مورتی ملی ہے۔ جو بہت سندر ہے اور پتا چلتا ہے کہ اس سمے بھی ناچنے کی کلا بہت آگے بڑھی ہوئی تھی۔ آریوں نے ان کے تجربے سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے ایبریا کے اپنے تجربے کو ان لوگوں کے تجربے سے ملا کر ایک نئے کلچر کو جنم دیا۔ انہوں نے یہاں آکر نئے ڈھنگ سے رہنا سہنا اور نئے ڈھنگ سے سوچنا سیکھا۔ ہندستان ایک وشال دیش ہے اس کے میدانوں ندیوں اور پہاڑوں کے نئے آنے والوں پر اثر پڑنا ضروری تھا۔ نئے دیش اور نئے حالات میں رہتے ہوئے ان کی نظر بہت گہری اور اونچی ہو گئی۔ نظر بدلنے سے ان کی دیومالا کے پرانے معنی بدل گئے۔ اور اس میں نئے دیوتا بھی شامل ہوئے۔ اس بارے میں جن لوگوں نے کھوج کی ہے ان کا کہنا ہے کہ وشنو اور شو بالکل ہندستانی دیوتا ہیں۔ وشنو ایک ہرے بھرے سندر پہاڑ کے پرتیک ہیں اور شو برف سے ڈھکے کالے ننگے پہاڑ کے پرتیک ہیں آگے چل کر جب آریا پہاڑوں سے اتر کر میدانوں میں پہنچے تو ان دیوتاؤں کے معنی اور بدلے۔ وشنو کامیاب اور خوشحال زندگی کے اور شو ناکام اور نراش زندگی کے پرتیک بن گئے۔ مادی اور آتمک درشن الگ الگ ہونے لگا۔

مادی آتمک درشنوں کو شروع ہی سے سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ کلچر کو آگے بڑھانے میں ان دونوں درشنوں کا بڑا ہاتھ ہے اور آج مادی درشن اور آتمک درشن میں زبردست ٹکر ہو رہی ہے اسی ٹکر کا فیصلہ ہونا ہے۔

میکس بکل آف مارکسٹ فلاسفی میں لکھا ہے کہ شروع کا آدمی تباہی کی دنیا میں رہتا تھا۔ وہ اپنا سر کھپا کر ڈھنگ سوچتا تھا ایک ڈھنگ جسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں قدرت پر قابو پانے کا ہے

ہم گھر بناتے ہیں۔ کپڑا بنتے ہیں۔ آگ اور بجلی سے دشمنی ٹھاننے کے بجائے انہیں اپنا دوست بناتے ہیں۔ اور سماجی زندگی کے نیم بناتے ہیں۔ یہ دنیا کو عمل کے ذریعے تبدیل کرنے کا ڈھنگ ہے۔

لیکن ایک دوسرا ڈھنگ ہے۔ وہ دنیا کو تبدیل کرنے کی بجائے اپنے آپ کو بھاونا‌ؤں اور وچاروں کو تبدیل کرنے کا ڈھنگ ہے۔ پہلے اسی طریقے کا نام مذہب اور پھر درشن پڑا۔

یورپین وِدوانوں نے ویدوں کو دیومالا کی پستکیں کہا ہے۔ اس پر آریا سماجی ودوانوں کو اعتراض ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وید دیومالا کی نہیں درشن کی پستکیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ویدوں کے بارے میں یہ دونوں باتیں سچ ہیں۔ اس سمے منشیہ جو کچھ دیکھتا تھا اسے اپنی کلپنا سے دیوتا کا نام دے دیتا تھا۔ اس میں اس کا تجربا اور درشن دونوں شامل رہتے تھے اس سے مادی اور ادھیاتمک کی بحث میں وہ نہیں پڑا تھا جس طرح بچے روٹی یا پھل کھاتے ہیں اور زندا سمجھ کر اس سے باتیں بھی کرتے ہیں وید کے زمانے کا منشیہ بچے کی طرح معصوم تھا۔ وہ قدرت کو بھوگتا بھی تھا اور اسے زندا سمجھ کر اس سے باتیں بھی کرتا تھا۔

ویدوں کا زمانا ہزاروں سال تک پھیلا ہوا ہے۔ اس زمانے میں آدمی نے دونوں طرف ترقی کی۔ اس نے اپنی شکتی اور سمجھ کے مطابق پرکرتی کو بھی تبدیل کیا۔ اور اس نے اپنے آپ کو بھی وچاروں اور بھاونا‌ؤں میں بدلا۔ وہ سورج سے گرمی حاصل کرتا تھا۔ اسے اپنے کھیتوں کو اگانے والا سمجھتا تھا اور اسے دیوتا سمجھ کر بل اور شکتی مانگتا تھا۔ صبح ہوتی تھی تو وہ اوشا کو دیکھ کر ناچ اٹھتا تھا اور پھر قدرت کو اپنے مطلب کے لیے تبدیل کرنے کو کمر کس لیتا تھا۔

اس زمانے میں آدمی، آدمی میں بھید نہیں تھا۔ گیان اور دھن سب کا ساجھا ہوتا تھا لوگ جتھوں میں مل کر رہتے تھے کسی کام کو کرنے سے پہلے آپس میں صلاح مشورا کرتے تھے ایک ویدمنتر کا ارتھ ہے۔ "ہم سب آپس میں مل کر رہا کریں مل کر رہا کریں۔ مل کر آپس میں صلاح مشورا کریں۔ ہم سب کے وچار یا من ایک سمان ہوں۔"

صلاح مشورے کے لیے سبھائیں ہوتی تھیں۔ لکھا ہے۔

"ہے سبھا! ہم تیرا نام بھلی بھانت جانتے ہیں۔ تجھ میں منشیہ اکٹھے ہوتے ہیں۔ تیرے جو بھی سبھاسد ہیں وہ سب سچ بولنے والے ہیں۔"

اس سبھا میں سب لوگوں کو برابر کا درجا حاصل تھا۔ اور امید کی جاتی تھی کہ سب ہی لوگ اونچی اور سچی بات کہیں گے۔ لکھا ہے۔

"جس سبھا میں سب آدمی نہ چمکیں اور جس میں صرف ایک آدمی چمکے وہ سبھا، سبھا نہیں ہوتی۔ سبھا وہ ہوتی ہے جس میں سب مل کر چمکیں اور ہر ایک آدمی دوسرے کو چمکانے میں مدد دے۔"

"سبھیتا" جس کا مطلب تہذیب ہے۔ سبھا شبد سے بنا ہے۔ تہذیب کا کلچر سے گہرا سمبندھ ہے۔ تجربے اور عمل سے آدمی جتنا اونچا اٹھتا ہے اتنا ہی وہ کلچرڈ یا سنسکرت کہلاتا ہے۔ اور جتنا وہ اس کلچر کو دیوہار میں لاتا ہے اتنا ہی تہذیب آگے بڑھتی ہے۔ کلچر آدمی کے اندر سے سمبندھ رکھتا ہے جس سے اس کا من اور شریر سوستھ اور مضبوط بنتا ہے۔ تہذیب یا سبھیتا اس کلچر کے باہری روپ کا نام ہے جس دیش یا قوم کے لوگوں کا جتنا اونچا کلچر ہوگا اتنا ہی وہ میل جول سے رہیں گے اپنے کام صلاح مشورے سے کریں گے۔ اور سبھا میں اونچی اور سچی بات کہیں گے۔ ان سب باتوں کے کارن وہ مہذب یا سنسکرت کہلائیں گے۔ ان کا کلچر ان کے کھانے پہننے اوڑھنے سہنے کو بنا اور کلا میں ظاہر ہوگی۔

جب کسی دیش یا قوم کے لوگ کلچر میں بچھڑ جائیں یعنی وہ سچائی اور انصاف کا ساتھ چھوڑ دیں ان کی کرنی اور کہنی میں فرق آ جائے لیکن کھانے پہننے اور رہنے سہنے میں ترقی کر لیں تو وہ تہذیب کھوکلی کہلاتی ہے اس میں بناوٹ

اور پاکھنڈ آجاتا ہے وہ تہذیب زیادہ دنوں ٹکنے والی نہیں ہوتی
اس کا کارن کیا ہے؟ کلچر اور تہذیب میں تبدیلی کیوں
آتی ہے؟ دنیا کے شروع سے اب تک ایک ہی کلچر اور تہذیب
کیوں نہ ہوئی؟ تبدیلی کی کیا ضرورت تھی؟ اگر ضرورت تھی
تو کیا اس تبدیلی میں کوئی کام یا سلسلہ ہے یا وہ تبدیلی اچانک
آجاتی ہے؟

کسی زمانے میں پیداوار کے جو سادھن ہوتے ہیں انہیں
کے مطابق اس زمانے کے ساماجک سمبند قایم ہوتے ہیں اور ایک
راج کاجی ڈھانچا بنتا ہے۔ پھر ان سبھی کے میل سے اس زمانے
کی کلچر جنم لیتی ہے۔ ہم کلچر کے پیداوار کے سادھنوں اور راج
کاجی ڈھانچے سے الگ نہیں کر سکتے۔ ان تینوں کا آپس میں
گہرا سمبند ہے۔ ماؤزے تنگ نے اپنی پستک چین کی نئی جمہوریت
میں کلچر کی ویاکھیا اس طرح کی ہے۔

"A GIVEN CULTURE IS THE IDEALOGICAL REFLECTION OF THE POLITICAL ECONOMY OF A GIVEN SOCIETY."

(یعنی کسی زمانے کا کلچر اس زمانے کے سماج کی ارتھک اور
راج نیتک ویوستھا کی وچار دھارا کا عکس یا روپ ہوتا ہے۔)

ویدوں کے زمانے کا کلچر اس زمانے کے پیداوار کے
سادھنوں اور راج کاجی ڈھانچے کی وچار دھارا کا ہی ایک
روپ تھا۔ بے شک دیوتاؤں میں اس سمے کے آدمی کا وشواس
تھا لیکن اس نے قدرت جیسی زبردست ورودھی کی تباہی سے
بچنے کے لیے گھر بنائے تھے زمین جوتنا اور بونا سیکھا تھا۔ اس کے
علاوہ وہ پشو پالتا تھا گائے کا دودھ پیتا تھا اور اس سے
مکھن نکالتا اور گھوڑے پر چڑھتا تھا۔ اس نے آگ کو اپنا
ساتھی اور مددگار بنایا تھا۔ اور دھات کو ڈھالنا سیکھ لیا
تھا۔ یہ آدمی کی بہت بڑی کامیابی تھی اور اس سے اپنے آپ
میں اس کا وشواس بڑھا تھا۔ اپنے اس وشواس کو ظاہر کرنے
کے لیے اس نے ہوا سے بھی تیز تقریر اور خیال کو ایجاد کیا تھا۔

آدمی ساجھی محنت سے قدرت کو جیت رہا تھا۔ سب
لوگ آپس میں میل جول سے رہتے تھے۔ سب ہی سماج کے
فائدے کے لیے کام کرتے تھے۔ سب سرکھیا کے لیے قاعدے
قانون بناتے تھے۔ ان میں کوئی اونچ نیچ اور جات پات کا
بھید نہیں تھا۔ لوگ بھن بھن کام کرتے ہوئے بھی ایک سمان
ایک گھر میں رہتے تھے۔ ایک وید منتر میں کہا ہے۔

"میں شلپی ہوں۔ میرا پتا وید ہے اور میری ماں اپلے پاتھنے
کا کام کرتی ہے الگ الگ پیشوں اور مارگوں پر چلتے ہوئے
ہم ایک گھر میں نواس کرتے ہیں۔"

دھیرے دھیرے پیداوار کے سادھنوں کی ترقی ہوئی
اور محنت تقسیم ہو گئی۔ اس سے چار ورن وجود میں آئے۔
براہمنوں کا کام کیول پڑھنا پڑھانا رہ گیا۔ محنت سے ان کا ناتا ٹوٹ
گیا لیکن آدمی ہمیشا عمل اور تجربے سے سیکھتا ہے۔ وچار کے ساتھ
جب محنت کا پسینا ملتا ہے تب ہی اس کا گیان تازہ رہتا ہے۔
اس تقسیم کے کارن ویدوں کے زمانے کا سماج ٹوٹنے لگا۔ پھر
آریوں نے ہندستان کی دوسری جاتیوں دراوڑ اور کول
آدی کو ہرا کر اپنا غلام یا داس بنانا شروع کیا جو کوئی جتنا بڑا
پنڈت ہوتا تھا۔ اسے اتنے ہی ادھک داس دان میں ملتے
تھے۔ وچار اور عمل میں جو درار پڑی وہ دھیرے دھیرے بڑی
ہی گئی۔ سوچنے اور کام کرنے والوں کی دو جماعتیں بن جانے
ہی سے یونان کی پرانی سبھیتا نشٹ ہوئی تھی۔ اس تقسیم کے
ویدوں کے زمانے کا پرانا سماج ٹوٹ گیا اور قبیلوں کے
الگ الگ راج نے ان راج یا ریاستوں میں براہمن اور چھتری
پڑھتے پڑھاتے اور قاعدے قانون بنانے اور راج کا کام کرتے
تھے۔ دوسرے لوگ محنت کر کے ان کے لیے جینے کے سادھن
جٹاتے تھے۔ اور ان کی سیوا کے لیے داسوں کی بہت بڑی تعداد
ہوتی تھی۔

اب براہمن اور چھتری دوسروں کی محنت پر پلنے والا

ورگ تھا۔ اس نے آدمی کی کامیابی کو دیوتاؤں کی کرپا کا پھل بتانا شروع کیا اور دیوتاؤں کو پرسن کرنے کے لیے یگ ہونے لگے، اور اس میں پشوؤں اور منشیوں تک کی بلی دی جانے لگی براہمنوں نے گیان کی تجارت شروع کر دی۔ زندگی کے تجربے سے وید کی بات کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ آدمی نے جو نیم اصول اور قاعدے اپنی بہتری کے لیے بنائے تھے انہیں آدمی سے بہتر سمجھا جانے لگا۔ آدمی کی حفاظت کی جگہ نیموں اور اصولوں کی حفاظت کے لیے خود آدمی قربان ہونے لگا۔

پنڈتوں کے بے عمل ہو جانے کے کارن وہ دھرتی پر رہنے کے بجائے ہوا میں اڑنے لگے اور ان کا درشن کم سے کم مادی اور ادھک سے ادھک آتمک ہوتا گیا۔ آخر پھر وید میں آتما ہی کو سب چیزوں کا ناپ اور کسوٹی مان لیا گیا۔ پھر وید کے ہی ایک منتر کا مطلب ہے۔

"آتما کا ناش کرنے والا آدمی موت کے بعد اندھیرے میں لپٹے ہوئے لوگوں میں بھٹکتا رہتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ آدمی ان ادی درشنوں سے منھ موڑ کر آتما کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے گیان سے اس دنیا کو ہی نہیں موت کے بعد کی دنیا کو بھی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور وہ اس دنیا اور موت کے بعد کی دنیا میں سمبندھ جوڑنے کی فکر میں تھا۔ درشنوں اور اپنشدوں میں آدمی اس کھوج میں لگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ اس کا تجربہ اور اس تجربے سے حاصل کیا ہوا گیان ان سب سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے آپ کو وچاروں میں تبدیل کیا۔ اور آتما پرماتما سورگ اور نرک کی سرشٹی کر کے اپنے اس سوال کا جواب دیا۔

بچہ جیسے بڑا ہو کر اپنی معصومیت کھوتا ہے۔ لیکن گیان اور ودیا میں وہ آگے بڑھتا ہے۔ اسی طرح وید کے زمانے کے آدمی نے کام کرنے والوں اور کام کرانے والوں میں تقسیم ہو کر اپنی سماننتا اور برابری کھو دی لیکن وہ گیان اور علم میں آگے بڑھا گیا۔ اور دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہوئے بھی وہ بنیادی طور پر ایماندار تھا اور ایمانداری سے زندگی کے نئے سوالوں کا حل ڈھونڈتا تھا۔ سانکھیہ شاستر میں لکھا ہے کہ اسیتہ سے ستیہ کا جنم نہیں ہو سکتا۔ اس وقت کا آدمی بھی پوری ایمانداری سے گیان کی کھوج میں لگا ہوا تھا۔ وہ آقا اور غلام کی تقسیم کو بھی زندگی کی ایک سچائی مانتا تھا۔ اس کا بنا پھر اس کی نئی وچار دھارا کا بنا روپ تھا۔

نیموں اور اصولوں کی زیادہ پابندی اور دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے آدمیوں اور پشوؤں کی قربانی سے یہ کلچر بہت بدنام ہو گیا۔ اس سمے ایک راجا کے گھر میں بدھ کا جنم ہوا۔ اور انہوں نے اس کلچر میں بہت کچھ سدھار کیا۔

سدھار اور تبدیلی میں بڑا فرق ہے۔ کلچر میں تبدیلی تو اس سمے آتی ہے جب پیداوار کے سادھن بدلتے ہیں اور ان پر قایم سماج بدلتا ہے۔ لیکن سدھار میں پیداوار کے سادھن اور سماج ویسا ہی رہتا ہے اس میں جو خرابیاں آ جاتی ہیں انہیں اسی سماج کی سیما میں رہتے ہوئے دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جیسے پانی ابلنے سے پانی ہی رہتا ہے لیکن اس میں جو ملاوٹ آ جاتی ہے ابلنے سے وہ نیچے بیٹھ جاتی ہے۔ سدھار بھی سماج کے لیے ایسا ہی عمل ہے براہمنوں نے ویدوں کے نام پر گیان اور ودیا کی تجارت شروع کر دی تھی اور آتما کی رکھشا اور مکتی کے لیے دیوتاؤں کو قربانی دینی شروع کر دی۔ بدھ نے براہمنوں کی اجارہ داری توڑنے کے لیے ویدوں کو ماننے سے انکار کیا۔ یگیوں میں قربانی کا ورود کر کے نیک کاموں اور خواہشوں کے تیاگ کو مکتی یا نروان کا سادھن بتایا بدھ آتما کو نہیں مانتے تھے۔ لیکن کہتے تھے کہ ایک جنم سے دوسرے جنم میں آدمی کے کاموں کے سنسکار اس کے ساتھ جاتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے کہ آتما کو نہ مانتے ہوئے بھی بدھ کا کا درشن مادی نہیں آتمک تھا۔ اور انہوں نے جس سماننتا کا پرچار کیا وہ بھی مادی نہیں آتمک تھی۔ موٹے طور پر ان کا کہنا تھا کہ آقا

اور غلام دونوں کو موت آتی ہے دونوں موت کے سامنے ایک سمان ہیں اس لیے آؤ ہم دنیا کی خواہشوں کو چھوڑ کر موت کا حل ڈھونڈیں۔

ہاویل نے اپنے اتہاس میں لکھا ہے کہ بدھ نے جو سنگھ کھولے تھے ان میں غلاموں کو داخل نہیں کیا جاتا تھا، اور غلاموں کے علاوہ ایسے لوگ بھی داخل نہیں ہو سکتے تھے جنہیں دوسروں کا قرض دینا ہوتا تھا جو اپرادھی اور ڈاکو تھے یا راجا کے کرمچاری تھے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ویدوں کے زمانے کے بعد کام کی تقسیم کے کارن غلامی کا زمانہ شروع ہوا جس میں نئے درشنوں اور نئے کلچر نے جنم لیا۔ اس درشن کا نچوڑ یہ تھا کہ ایک ندی کی طرح زندگی کا سلسلا جاری رہتا ہے آدمی ایک جنم کے بعد دوسرا جنم لیتا ہے۔ کسی جنم میں آقا غلام اور غلام آقا بن سکتا ہے غلام کو سیوا کا کام ایمانداری سے کرنا چاہیے۔ اس سیوا کا پھل اسے اگلے جنم میں ملے گا۔ یہ وچار محنت سے پسینے والے آدمی کو بڑی تسلی دیتا تھا۔ گو اس طرح ایک طبقا محنت سے پسنا رہا لیکن ایک طبقے کو سوچنے سمجھنے کا ادھک موقع ملا۔ درشن اور کلائیں انتی ہوئیں اور کلچر آگے بڑھتا رہا۔ اور اس زمانے کا آدمی مادی کم اور آتمک ادھک ہو گیا۔

بدھ کے سدھار کے بعد بھی آقا اور غلام کا سمبندھ رہی رہا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اشوک نے کلنگ کی تباہی کے بعد لڑائی سے توبا کر لی لیکن اس لڑائی سے وہ جو دو لاکھ آدمی غلام بنا کر لائے تھے۔ انہیں چھوڑ دینے کا کسی اتہاس کار نے ذکر نہیں کیا کیونکے وہ چھوڑے نہیں گئے۔ بدھ نے یگیوں میں پشوؤں کی بلی بند کرنے کے لیے اہنسا کا جو پرچار کیا تھا اسے باغی غلاموں کو شانت کرنے کے لیے بھی کام میں لایا گیا۔

غلامی کی ویوستھا سے بھی کلچر بہت آگے بڑھا۔ لیکن اب یہ ویوستھا ٹکنے والی نہیں تھی۔ کھیتی باڑی اور ویاپار بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ پیداوار کے سادھنوں کے ساتھ نیا ساج کا ڈھانچا اور نئی وچار دھارا جنم لے رہی تھی۔ اور سدھار سے نہیں بدلی سے بھی کلچر آگے بڑھ سکتا تھا۔ کھولنے کے بعد پانی جب دوبارا ٹھنڈا ہوتا ہے تو ملاوٹ اور گندگی پھر اس میں مل جاتی ہے۔ سنگھوں میں خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ بھکشو آرام طلب اور فضول میں بال کی کھال اتارنے والے بن گئے۔ خواہشوں کے تیاگ کے نام پر اس دنیا کی اور زندگی کی ذمے داریوں کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ اتہاس میں اشوک کو مہان اور دیوانام پریہ کہہ کر بہت غلط اچھالا گیا ہے۔ اشوک کے زمانے میں ہمارا کلچر اتنا ہی آگے بڑھا ہے کہ اشوک کے پتھر کے مکان بنائے۔ اور غلط درشنوں کا پرچار کر کے آدمی کے وچاروں کے گرد بھی دیوار کھڑی کر دی۔ کہاں ہماری پرمپرا یہ بھی کہ جس سبھا میں کوئی آدمی نہ جھکے یا صرف ایک آدمی جھکے وہ سبھا، سبھا نہیں ہے۔ کہاں اشوک کا یہ کہنا کہ جیسے باپ اپنے بیٹے کا پالن کرتا ہے۔ میں اپنی پرجا کا پالن کروں گا۔ کسی راجا یا ایک وکتی کو ساری قوم کا نیتا بننے اور اس کے لیے سوچنے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ جس کا نتیجا یہ ہوا کہ لوگ بے حس اور بے عمل ہو گئے۔ اشوک کے بیٹے باہر کے حملوں کو نہیں روک سکے۔ اور موریا راج نشٹ ہو گیا۔

دراصل یہ بچھڑی ہوئی غلامی کی ویوستھا کا ناش تھا اس کے بعد گپت راج نئی آرتھک ویوستھا اور نئی وچار دھارا پر قایم ہوا۔ مہابھارت اور گیتا کے بھاگوت مت میں اس دنیا اور موت کے بعد کی دنیا کو ملا دیا گیا ہے۔ کرشن ارجن سے کہتے ہیں کہ چھتری کا دھرم لڑنا ہے۔ اپنے اس دھرم کا پالن کرو۔ مرنے مارنے کی چنتا میں نہ پڑو نہ کوئی کسی کو مارتا ہے اور نہ کوئی مرتا ہے۔ آتما امر ہے وہ مر نہیں سکتی۔ جیت جاؤ گے تو اس دنیا پر راج کرو گے۔ اور مر جاؤ گے تو سورگ میں راج کرو گے۔

خواہشوں کے تیاگ کی جگہ عمل کا پیغام پھر گونج اٹھا۔ پنچ تنتر میں لکھا ہے "لکشمی تو سنگھ کے سمان باعمل لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ بھاگیا دیتا ہے۔ یہ کمزور لوگ کہا کرتے ہیں اس لیے بھاگیا کو چھوڑ کر اپنی شکتی سے پرشارتھ کرو اگر تم

کرنے سے بھی کامیابی نہ ہو تو دیکھنا چاہیے کہ یتن میں کیا خرابی ہے۔" پھر لکھا ہے "پچھلے جنم میں کیے ہوے کام کو ہی تقدیر کہتے ہیں۔ اس لیے آدمی کو آلسیہ چھوڑ کر محنت کرنی چاہیے"۔ اس لپینک میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس جاتی کے عمل اور وچن میں انتر آجاتا ہے وہ ناش کو پراپت ہوتی ہے۔

عمل کے کارن ہی پھر ایک مضبوط اور بڑا راج قایم کرنے کی ضرورت تھی۔ تب ہی کھیتی باڑی ویاپار اور کلا آگے بڑھ سکتی تھی۔ تب ہی آپس کے جھگڑے ختم ہو سکتے تھے۔ تب ہی باہر کے حملوں سے دیش کی رکشا ہو سکتی تھی۔ اس سے افضل یتقل کا زمانا تھا۔ روم کا مہان راج ٹوٹ رہا تھا۔ سارے دیش کی ایک مضبوط راج کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوے ہی مہابھارت میں لکھا ہے کہ تمہارا سورگ تمہاری راجنیت ہے اور ونسینٹ اسمتھ آدمی یورپین ودوانوں نے بھی لکھا ہے کہ مہابھارت کا بنیادی نکتا ایک مرکزی حکومت قایم کرنا ہے۔ اسی لیے کروچھیتر کا مہابھارت کا یدھ ہوا تھا۔

اس وچار دھارا کو گپت راج میں عملی روپ ملا اور اسی بات کو لے کر مہاکوی کالیداس نے رگھوونش مہاکاویہ رچا۔ اس میں رام چندر کے پوروج رگھو کو لے کر ایک مہان پراکرمی اور انصاف پسند راجا کے گن بیان کیے گئے ہیں۔ دراصل یہ سامنتواد کی ترقی کا زمانا تھا۔ سامنتواد کی ترقی سے زندگی آگے بڑھ رہی تھی۔ راجا کو جنتا کا سہیوگ پراپت تھا وہ ان کا نیتا تھا اور اپنے عمل سے ساری جنتا کو حرکت میں لیتا تھا عمل سے ان کا لوک پرلوک دونوں سنورتے تھے۔ یہاں مادی اور آتمک درشنوں میں ایک پرکار کا میل اور سمجھوتا ہو گیا تھا اسی لیے اس زمانے میں مہابھارت اور گیتا کا پرچار خاص طور پر ہوا۔ اسی لیے کلچر کی ترقی ہو سکی۔ کالیداس جیسا مہاکوی پیدا ہوا۔ کمار بھٹ نے زمین کے گھومنے چندر گرہن اور سوریہ گرہن کے نیم معلوم کیے۔

کلا ساہتیہ درشن اور ہر طرح کے گیان کا سروت (چشمہ) جنتا اور اس کا عمل ہے پیداوار کے سادھنوں کی ترقی رک جانے سے جنتا اور سرکار کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے تب یہ سروت بند ہو جاتا ہے۔ اور کلچر پچھڑ جاتا ہے۔ کلچر کو پھر آگے بڑھانے کے لیے پیداوار کے سادھنوں کو آگے بڑھانا اور جنتا اور حکومت میں سمبندھ جوڑنا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ کام نہیں چل سکتا۔

اس سے ہندستانی کلچر اور سبھیتا اتنی بڑی ہوئی تھی کہ باہر سے سنگ کش، ہن کوئی بھی جاتی آئی اس نے اس کی مہانتا کو سویکار کیا اور ہمارے سماج نے انہیں اپنے اندر سمو لیا۔

لیکن باہر کے حملے بڑھتے گئے اور آواجائی کے کافی سادھن نہ ہونے کے کارن بڑے راج بن بن کر ٹوٹتے رہے اور دیش پھر چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا۔ پھر آدمی دنیا میں اپنی ذمے داری کو بھول کر دوسری دنیا کی باتیں کرنے لگا۔ پھر کتابوں اور نیموں کو آدمی سے زیادہ اہمیت ملنے لگی۔ جات پات کے جھگڑے بڑھ گئے۔ شنکراچاریہ نے بدھ مت کے مقابلے میں جو نیا مت چلایا اس میں بھی مادی دنیا کو نظر انداز کیا گیا۔ بدھ مت سنگھوں کا مت تھا۔ لوگ گرہستھ چھوڑ کر سنگھوں میں جا رہے تھے جس سے خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ لیکن ہندو مت میں گرہستھ دھرم کو بھی مہانتا پراپت تھی۔ جو آدمی گرہستھ کا پالن اچھی طرح نہیں کرتا تھا ہندو دھرم اسے اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن آچاریہ بودھ بھکشوؤں کی طرح گرہستھ چھوڑ کر سادھو اور مہنت بننے کی ریتی چلائی۔ اور ان سادھوؤں اور مہنتوں کے لیے بدھ مت کے سنگھوں کی طرح مٹھ کھولے۔ ان میں مکتی چاہنے والے بے عمل آدمی بھر گئے۔ ہمارے سماج کی خرابیاں دور ہونے کی جگہ بڑھتی ہی گئیں۔ شنکراچاریہ کو دوسرا بدھ ٹھیک ہی کہا جاتا ہے دونوں سدھاروادی تھے اور دونوں نے خواہشوں کو چھوڑ کر مکتی کا مارگ بتایا۔ بااعمل دنیا کو سنگھوں اور مٹھوں میں تبدیل کیا۔

جب درشن کا عمل سے سمبندھ نہیں رہتا تو اس کا کام بال کی کھال اتارنا ہو جاتا ہے۔ وچار دھارا آگے بڑھنے کے بجائے گول چکر میں یا بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتی ہے۔ اس سے کلچر کا وکاس بھی رک جاتا ہے۔ اب ہندو درشن ودیا تمک واد یا روحانیت کی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ اور اس میں مت متانتر کی کتنی ہی بے کار کی شاخیں پھوٹ آئی تھیں عام آدمی بھرم اور اچرج میں پڑ گیا تھا۔

اس سمے ہندستان پر مسلمانوں کا حملا ہوا اور بے حرکت زندگی میں اتھل پتھل پیدا ہوئی۔ بہت سے پنڈت حملے کی زد سے بچنے کے لیے دکھن میں چلے گئے۔ اور اپنے ساتھ گیتا زمانے کا وشنو مت لے گئے، جو بہا بھارت کی مدد سے دکھن میں پھیلنے لگا۔ مسلمان بہت سے مت متانتروں اور دیوتاؤں کی جگہ ایک ایشور یا اللہ کو مانتے تھے۔ اور ان کا مذہب اس سمے کے ہندو دھرم یا شنکر اچاریہ کے ادویتواد کے مقابلے میں بہت سادا اور باعمل تھا۔ ہندستان کے لوگوں پر اس کا اثر پڑنے لگا۔ اور براہمنوں نے اپنے درشنوں کو بھی نئے حالات کے انوسار ڈھالنا شروع کیا۔ رامانج نے شنکر اچاریہ کی شکھشا کے مقابلے میں ایسا مت چلایا جس کی پرمپرا ہندستانی لیکن وہ اسلام کی طرح سادا تھا اور لوگوں کی سمجھ میں آسکتا تھا۔ ناویل لکھتا ہے: "اسلام کی تلوار بھگوان کے ہات میں جراح کا چاقو تھا جس کے ذریعے اس کیان کے پودے سے جو اس نے بھارت ورش میں لگایا تھا سڑی ہوئی اور بے کار شاخوں کو کاٹ ڈالا"

مسلمانوں سے پہلے بھی شک سنگ کشان اور ہن آدمی حملہ آور باہر سے آئے لیکن انہوں نے ہندستانی کلچر اور درشن اپنا لیا اور ہندستانی بن کر رہنے لگے۔ لیکن مسلمانوں میں غیر معمولی جوش تھا، جیون شکتی تھی۔ ہندو دھرم کی پیچیدگیوں کو خود ہندستانی جنتا نہیں سمجھتی تھی۔ حملہ آور اسے کیا سویکار کرتے۔ رائج نیتک جیتوں کے ساتھ انہوں نے کلچر کے ساد ھنوں پر بھی قبضا کر لیا۔ اور خود ہندو بننے کے بجائے ہندستانیوں کو مسلمان بناتے رہے۔ جب پنے ہی گورکھ دھندے میں الجھ جانے سے ہندو دھرم اور ہندستانی کلچر کا وکاس رک گیا تھا اسلام پھل پھول رہا تھا۔

اسلام کی نئی شکتی کے اثر سے ہندو دھرم اور ہندو کلچر میں بھی حرکت پیدا ہوئی۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ مسلمانوں کی آمد کے کارن بچھڑے ہوئے دکھن کا وکاس ہوا۔ بلکہ محمود غزنوی اور محمد غوری کے حملوں کے بعد جب یہاں ہندستانی مسلمان راجاؤں کی راجدھانیاں بنیں تو کلاکاروں کو جو اب مسلمان بن چکے تھے اپنی کلا کو نئے روپ میں پیش کرنے کا موقع ملا۔ ان مسلمان راجاؤں کے درباروں میں ہندو کلچر خوب پھلا پھولا۔ ان کی مسجدوں محلوں، باغوں اور حماموں میں ہندستانی شلپی کلا کا رنگ صاف ابھر رہا ہے۔ محمود بھی قنوج اور متھرا سے ہندو کاریگروں کو پکڑ کر لے گیا تھا۔ اس نے غزنی میں جو مسجد بنوائی اس میں بھی دسویں صدی کے مندروں کا رنگ جھلکتا ہے۔ لیکن ان سب عمارتوں میں اسلام کی سادگی اور حملہ آوروں کی جرات کا نرالا پن ایک خاص بات ہے۔ ان میں حسن کے ساتھ سادگی اور وقار پیدا ہو گیا ہے۔

جہاں ہندو دھرم پر اسلام کا اثر پڑا وہاں اسلام بھی ہندو دھرم سے پربھاوت ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ کوئی بھی دھرم یا درشن جب دوسرے دیش میں جاتا ہے تو اس کے ماحول اور پرمپرا کو ضرور اپناتا ہے۔ پھر مسلمان حملہ آوروں نے ہندو عورتوں سے شادیاں کیں۔ اور بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ ان عورتوں اور مردوں کے ذہن میں ہندستانی درشن اور پرمپرا خوب بس چکی تھی۔ اس لیے انہوں نے اسلام کو بھی نیا رنگ دیا۔ جو عرب اور ایران کے اسلام سے مختلف تھا۔ اسے ہندستانی اسلام کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا ہندستان میں شیعہ اور سنی دونوں آئے اور ہندستان میں

جو نئے مسلمان بنے ان میں سے برہمن اور اونچی جاتیوں کے لوگ تو سید اور شیخ کہلائے اور دوسرے ڈوم میراثی چھوٹی جاتیوں میں گنے جانے لگے۔ جب مذہبی جوش ختم ہوا تو سنی اور شیعوں میں خوب لڑائیاں ہونے لگیں۔ سنی اور شیعہ ایک دوسرے کو ہرانے لگے۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ لڑائیاں مذہب کے نام پر گدیوں کے لیے ہو رہی ہیں۔ اور ہوس کو مذہب کا نام دے کر ناحق خون بہایا جا رہا ہے۔

مسلمانوں کے حملوں سے جہاں بہت سے مت متانتر ٹوٹے تھے وہاں جات پات دھرم کرم اور پوجا پاٹ کے بندھن سخت بھی ہو گئے تھے۔ کیونکہ جن پنڈتوں اور ہندوؤں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تھا انہوں نے اسلامی وچار دھارا سے اپنے آپ کو اور اپنے ہم مذہبوں کو بچائے رکھنے کے لیے وچار اور اندوشواس کی دیواروں کو اور مضبوط بنا دیا تھا۔

چار پانچ صدی کے خون خرابے، بدامنی، تعصب اور اندوشواس سے ہندو مسلمان دونوں ہی تنگ آ چکے تھے۔ اور انہوں نے ہندو راجاؤں کو ہندوؤں کے اور مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف لڑتے اور دیکھ کر لڑائی کو اکارن سمجھ لیا۔ اور ہند مسلم جنتا میں آپس کا میل جول بڑھنے لگا جس سے بھگتی اندولن نے جنم لیا۔ اور اس اندولن کو سنت، اولیوں اور صوفی شاعروں اور درویشوں کا سہیوگ پراپت تھا۔ کبیر، نانک، تلسی داس، معین الدین چشتی، بابا فرید، نظام الدین اولیا، رحمان، رس کھان، سور داس، تکا رام، وارث شاہ اور بلے شاہ نے بھگتی اور تصوف کے دریا بہائے۔ آدمی اور آدمی میں پریم بڑھایا۔ اس اندولن نے لوگوں کے پرانے عقیدوں کو بدل دیا اور ان سادھو سنتوں نے اگلی تین چار صدی تک کلچر سبھیتا اور سماج پر گہرا اثر ڈالا۔ انہوں نے وید، قرآن، ملا اور برہمن کو چیلنج کیا اور آدمی کو جات پات اور مذہبی تعصب کے دلدل سے نکال کر سیدھی اور سچی راہ دکھائی۔

اکبر نے اسی بھگتی اندولن کے اثر سے دین الٰہی نام سے اپنا درباری مذہب چلایا۔ جس کا عام جنتا پر بھی بہت اچھا پربھاو پڑا۔ اور ہندو مسلمانوں کو مذہبی برابری ملی۔ اکبر نے خون ریزیوں اور مصیبتوں میں دن کاٹے تھے۔ اور اپنی آنکھوں سے سلطنتوں کے الٹ پھیر دیکھے تھے۔ زندگی کے اس تجربے سے اس نے سمجھ لیا تھا کہ جب تک ہندو مسلمان ایک دوسرے کو غیر سمجھ کر لڑتے رہیں گے۔ ہندستان میں کوئی بھی راج ادھک دنوں تک قایم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس نے راجپوتوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اور ہندو مسلمانوں میں میل قایم کیا اتنا ہی نہیں۔ ہندستانی راج نیتی کی پرمپرا کو لے کر نیا راج کاجی ڈھانچہ بنایا۔ جس کے بارے میں جادو ناتھ سرکار نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ وہ ایرانی راج کاجی ڈھانچے کا ہندستانی روپ تھا۔ دیش کی پرمپرا کے مطابق گاؤں کی خودمختاری اور سوا ولمبن بحال کی گئی۔

امن قایم ہونے سے کام دھندے اور ویاپار بڑھا۔ لوگوں میں خوش حالی آئی۔ ساہتیہ اور کلا کی انتی ہوئی کیونکہ جب آپس کا میل جول اور پریم بڑھتا ہے۔ اور جب آدمی اندوشواس اور تعصب کو چھوڑ کر سوتنتر روپ سے سوچنے لگتا ہے۔ اور جب اس کا اپنی نرمان شکتی میں وشواس بڑھتا ہے تو کلچر اور سبھیتا کا وکاس ہوتا ہے۔ مغلیہ زمانے میں ہندستانی ساہتیہ ادب اور کلا نے بے حد ترقی کی۔ تاج محل مغلیہ زمانے نے ہماری کلچر کا شاہکار ہے۔

سامنتی ڈھانچے کے اندر جتنی ترقی ہو سکتی تھی اتنی ہندستان شاہجہاں کے زمانے تک کر چکا تھا۔ اب اس ڈھانچے کے اندر رہ کر آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے یہ شامنتی ویوستھا اورنگ زیب کے زمانے میں ٹوٹنی شروع ہو گئی۔ پنجاب، مہاراشٹر اور بھرت پور آدی میں نئی شکتیاں ابھرنے لگیں۔ دراصل سامنت واد نے جن جاتیوں کو دبا کر رکھا تھا وہ اب ابھر رہی تھیں۔ شامنتی ویوستھا کی ترقی میں جو ویاپاری پونجی لگی

تھی۔ وہ وکاس چاہتی تھی۔ اس لیے نئی شکتیوں کے پیچھے ویاپاریوں کا ہاتھ تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ ہندستان شامنتی ویوستھا سے پونجی وادی ویوستھا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جب کوئی دیش ایک سماجک ویوستھا سے دوسری سماجک ویوستھا کی طرف جانے لگتا ہے تو اس کو وہی کشٹ سہنا پڑتا ہے جو ایک ماں کو بچا جننے سمے سہنا پڑتا ہے۔ ہمارے دیش کی اٹھارویں صدی کی خانہ جنگی کا کارن یہ تھا کہ پرانا سماج نئے سماج کو جنم دے رہا تھا۔ اس سمے ودیشی ویاپاریوں نے دخل اندازی کر کے ہمارے دیش کے اتہاسک وکاس کو روک دیا اور اس خانہ جنگی سے فایدا اٹھا کر انگریزوں نے ایک لیا غیر ملکی راج قایم کر لیا جس کا مقصد ہندستان کو ترقی دینا نہیں بلکے اس کا شوسن کرنا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ جس دیش کا ارتھک شوسن ہوا اس دیش میں کلچر کی سروت بھی سوکھ جاتے ہیں۔ اس لیے یہ سچ ہے کہ برٹش راج میں ہمارا دیش کلچر کے معاملے میں بہت پیچھے پڑ گیا۔ اور سامراج نے اپنے غلام کلچر کو ہمارے اوپر لادا۔

لیکن اس بارے میں اتنا ہی کہنا کافی نہیں ہوگا انگریز اپنے دیش میں پچھلے زمانے کی شامنتی سبھیتا سے آگے جا چکے تھے وہ اپنے ساتھ ایک نئے وچار دھارا اور نئی سبھیتا لائے تھے جو کافی سائنٹیفک تھی۔ ہندستان کی سامنت شاہی اور پرانی اور پرانی سبھیتا سے ان کی سیدھی ٹکر تھی۔ اس لیے انہوں نے سامنت شاہی کے ساتھ ہندستانی سبھیتا کے پچھڑے پن کو بھی دور کرنا شروع کیا۔ ہندستانی راشٹر پتا کے پتا راجا رام موہن رائے نے بھی اندوشواس اور روڑھی واد کے خلاف آواز بلند کی۔ برہم سماج کی نیو ڈالی اور پچھم سے سائنٹفک وچار سیکھنے کی پریرنا دی۔

لیکن انگریزی حکمرانوں کا یہ جوش غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ختم ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے ہندستان میں اپنی لوٹ کھسوٹ کی حکومت کو پکا کرنے کے لیے ہماری جنتا کی لوٹ کھسوٹ پر پلنے والے ورگوں سے ناتا جوڑا۔ ریاستوں میں سامنتوں کو اپنا غلام بنا کر قایم رہنے دیا۔ زمینداری کو پکا کیا۔ اور وکٹوریا کے اینٹھ اور سہانبھوتی بھرے فرمان کے ذریعے مذہبی آزادی کے نام پر اندوشواس روڑھی واد اور تعصب کو مضبوط کرنے کی چھوٹ دی۔

اب برٹش سرکار کا پرانی سامنت شاہی سے نہیں جنتا سے ورودھ شروع ہوا۔ اس نے ودروہی جنتا کو ہر طرح دبانا اور کچلنا شروع کیا۔ لیکن جنتا کو پراست کرنے اور ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے ہمارے دیش کے جن وادی کلچر کو کچلنا اور دبانا بھی ضروری تھا۔ اس لیے ہندستان کے اتہاس کو جو تمام کلچر کا سروت ہوتا ہے غلط رنگ سے پیش کیا گیا ہے حالانکے ہندستانی جنتا جتنی محنت کرتی ہے اتنی شاید کسی اور دیش کی جنتا کو کرنی پڑتی ہو۔ لیکن ہمیں بتایا گیا کہ ہندستان گرم دیش ہے اس لیے اس کے واسی سست ہوتے ہیں سدا ہارنے اور غلام رہنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں پورب کے پاس کچھ بھی گرو کرنے لایق نہیں ہے اگر اسے ترقی کرنی ہے تو بھول جائے کہ وہ پورب ہے اسے سب کچھ پچھم سے سیکھنا ہوگا۔

انیسویں صدی کے انت اور بیسویں صدی کے شروع میں جب قومی آزادی کا اندولن آگے بڑھا تو قومی کلچر کی طرف بھی لوگوں کا دھیان گیا۔ کیونکے قومی آزادی کی لڑائی میں قومی کلچر بھی ایک بہت بڑا ہتھیار ہوتا ہے لیکن جس طرح قومی آزادی اندولن کی باگ ڈور بورژوا اور بیچلے ورگ کے ہاتھ میں تھی۔ ہمارے کلچر کا نیترتو بھی اسی طبقے کے ہاتھ میں تھا جس طرح انگریزوں نے کہا تھا کہ پورب کے پاس کچھ بھی اپنا گرو کے لایق نہیں ہے اسی طرح ہمارے راشٹریا اندولن کے نیتاؤں نے ان کے جواب میں کہنا شروع کیا کہ ہمیں پچھم سے کچھ بھی نہیں سیکھنا ہے۔ ہمارا اتیت (ماضی) بہت ہی شاندار ہے اس سے ہمیں ہر طرح کا گیان اور شکشا مل سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارا اتیت (ماضی) شاندار ہے

لیکن راجا رام موہن رائے اور گوپال کرشن گوکھلے آدی نیتاؤں کی اس روایت اور پرمپرا کو بھلا دیا کہ ہمیں اپنا اندھوشواس اور روڑھی واد چھوڑ کر پچھم سے نئے وچار سیکھنے چاہئیں کیونکہ جس طرح پہلے ہندستانی کلچر یونان ایران سے نئے وچار لے کر سوستھ اور سندر بنا تھا اسی طرح اب پچھم سے سائنٹفک وچار لے کر ہی آگے بڑھ سکتا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ ہندستان میں بیسویں صدی کے شروع تک جیسا کہ لینن نے سنہ ۱۹۰۸ء میں لکھا تھا ہندستان میں کارخانہ داری بڑھنے سے مزدوروں کی تعداد اور چیتنا اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ ہندستان کے راشٹریہ اندولن کو ورگ سنگھرش کے روپ میں آگے بڑھا سکتے تھے۔ اور ان کے نیترتو میں مزدور اور محنت کش جنتا کا جن وادی کلچر آگے بڑھ سکتا تھا لیکن ہمارے راشٹریہ اندولن کے منجھلے اور برزوا ورگ کے نیتاؤں نے مزدور ورگ اور جن وادی کلچر کو نظر انداز کیا۔ اور ایک ایسے درشن اور کلچر کو پروتساہن دیا جس کا مقصد یہ سکھانا تھا تمام لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کچھ نہیں کر سکتے کچھ ایک نیتا یا خاص آدمی ہماری قوم کی قسمت کو پلٹ سکتے ہیں۔ ایسے درشن سے ظاہر ہے کہ جن وادی نہیں جن ورودھی کلچر جنم لیتا ہے کسی اور کی بات جانے دیجئے۔ کانگریس میں پنڈت جواہر لال کلچر کے سب سے بڑے نیتا رہے ہیں۔ وہ مارکس وادی اور ترقی پسند کہلاتے رہے ہیں۔ وہ اپنی پستک، وشو اتہاس کی جھانکیاں۔ میں لکھتے ہیں۔

سادھارن مرد اور عورتیں عام طور پر ساہسی بھاونا کے نہیں ہوتے۔ بڑے نیتاؤں میں کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن سے وہ ساری جاتی میں جان پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اس سے بڑے کام کروا لیتے ہیں۔"

یہ اوتار واد کا درشن ہے جس کا مطلب جنتا کو ایک نیتا کی پوجا کرنا اور اس میں اندھی شردھا رکھنا سکھاتا ہے اس کے کاموں اور آدرشوں کو دیکھنے اور پرکھنے کی ضرورت نہیں اس کی جات میں وشواس کافی ہے ایسے درشن سے سبھا میں ایک آدمی چمک سکتا ہے بہت سے نہیں ارتھات یہ درشن سامنت وادی ہے اور ویدوں کے جن وادی درشن کے الٹ ہے۔

جونی جن وادی بھوتنا اور کلچر آئے گا۔ وہ ویدوں کے زمانے کی سبھیتا کی طرح جن وادی ہوگا۔ لیکن وہ زیادہ خوشحال اور سمپن ہوگا کیونکہ اب آدمی کے پاس پیداوار کے سادھن بہت بڑھ گئے ہیں۔ سائنس نے قدرت کے بارے میں بہت سا گیان حاصل کر لیا ہے۔ سائنس کی ایجادوں کو جتنا ادھک جنتا کے ہت کے لیے عمل میں لایا جائے گا اتنا ہی کل وہ آگے بڑھے گی۔ اتنا ہی لوگوں کو پڑھنے لکھنے سوچنے شریر کو سوستھ اور سندر بنانے کا موقع ملے گا۔ اور اتنا ہی سبھا میں زیادہ لوگ چمکیں گے۔

برزوا سبھیتا اس دشا میں ایک حد تک آگے بڑھتی ہے وہ ڈارون کے وکاس واد ڈگروٹ کے بھوتک واد اور ہیگل کے دوند آتمک واد کو تو مان لیتی ہے لیکن اس کے لیے اس سے آگے بڑھتا مارکس کے دوند آتمک بھوتک واد اور اتہاسک وکاس کو ماننا کٹھن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایسا ماننے سے برزوا کلچر کے اپنے استتو پر چوٹ پڑتی ہے کیونکہ اسے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اب ہمارا پونجی واد سے نکل کر اپنے قدرتی وکاس کے رستے پر ضرور آگے بڑھے گا۔ اور پونجی وادی زمانے کی برزوا کلچر کو نئے جن وادی اور سامیہ وادی کلچر کو استھان دینا ہوگا (نیا ہند سے شکریے کے ساتھ)

اسٹینفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے وظیفے

اسٹینفورڈ یونیورسٹی نے اخبار نویسی کی تربیت کے سلسلے میں ایشیائی باشندوں کے لیے دو وظیفوں کا اعلان کیا ہے۔

۲ ہزار ڈالر کے ان وظیفوں کا اہتمام سانفرانسسکو کی ایشیائی فاؤنڈیشن نے کیا ہے اور ۱۹۵۵-۵۶ کے لیے مقصود ہیں۔ تربیت کے بعد امیدواروں کو ایشیا میں ہی کام کرنا ہوگا۔

چمن چمن سے

ظفر عالمگیر بی۔اے (عثمانیہ)

(میں نے غیر ہندستانی نظموں کو اکثر ہندستانی میں پیش کیا ہے۔ بنگالی۔ گجراتی، انگریزی۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ منظومات کا ترجما پابند نظم میں یہ خوبی نہیں کیا جاسکتا، آزاد نظم اور اس سے بھی زیادہ نثر ہی اس غرض کے لیے موزوں اور مفید ہے ممکن ہے میرا یہ عقیدہ میری کم مائیگی کی بنا پر ہو۔ چند انگریزی نظموں کا ترجما پیش ہے۔ (ظفر عالمگیر)

عشق:——

چشمے دریا سے مل جاتے ہیں اور دریا سمندر سے!
ایک میٹھے احساس کے ساتھ آسمان کی ہوائیں گھل مل جاتی ہیں
دنیا میں کوئی شے اکیلی نہیں
ایک سماوی قانون کے تحت تمام اشیا ایک دوسرے سے گھل مل جاتی ہیں
پھر میں تم سے کیوں نہ گھل مل جاؤں؟
دیکھو! پہاڑ اونچے آسمانوں کو چومتے ہیں
اور لہریں ایک دوسرے کو بھینچ لیتی ہیں۔
کسی پھول یا پتے کو اگر وہ اپنے ہم جنس سے انجان رہے تو معاف نہیں کیا جائے گا۔
سورج کی کرنیں زمین سے چمٹ جاتی ہیں
اور چاند کی شعاعیں سمندر کی لہروں کو چوم لیتی ہیں
اگر تم مجھے پیار کرنے سے انکار کرتی ہو
تو یہ سارا پیار کیا ہے۔
جو قدرت کے مظاہر میں نظر آتا ہے —— پرسی بی شیلی

اسکالر:——

میرے دن قدیم مصنفین کے ساتھ گذرے ہیں
اتفاق سے جب بھی میری نگاہیں پڑتی ہیں
تو میرے اطراف قدیم زمانوں کے زبردست دماغ نظر آتے ہیں۔
یہ میرے کبھی نہ ٹوٹنے والے دوست ہیں
جن سے میں دن بہ دن قریب ہوتا جاتا ہوں
ان کی محفل میری مسرتوں کو چار چاند لگاتی ہے
اور ان ہی کی محفل میں میں اپنے غم بھول جاتا ہوں
اور جب میں سمجھتا اور محسوس کرتا ہوں کہ
میں ان کا کس قدر رہون منت ہوں
تو میری آنکھیں اکثر ممنونیت کے اشکوں سے بھیگ جاتی ہیں۔
وہ میرے خیالات کا محور ہیں
میں ان کے ہمراہ گذرے ہوئے زمانوں کی سیر کرتا ہوں
ان کی نیکیوں کو سراہتا ہوں ان کی غلطیوں پر تنقید کرتا ہوں
اور ان کی امیدوں کا شریک ہوتا ہوں
اور اپنی حقیر فکر سے ان سے درس و ہدایت حاصل کرتا ہوں۔
میری امیدیں ان سے وابستہ ہیں
میرا نام ان ہی لوگوں میں رہے گا
اور مستقبل میں ان کے ساتھ میں سفر کرتا رہوں گا
مجھے یقین ہے کہ میں دنیا میں ایک نام چھوڑ جاؤں گا
جو غبار زمین فنا نہ ہوسکے گا —— رابرٹ ساؤتھی

زندگی :

اے زندگی میں نہیں جانتی کہ تو کیا ہے؟
لیکن اتنا معلوم ہے کہ ہم دونوں کو جدا ہونا ہے
کب، کہاں اور کس طرح ہم ملے تھے
یہ میرے لیے اب تک ایک راز ہے!
اے زندگی! ہم دونوں بہت دنوں ساتھ رہے
خشگوار دنوں میں ـــــ صبر آزما لمحات میں!!
ـــــ جدائی بہت محال ہوتی ہے جبکہ دوست عزیز ہوں
غالبؔ اس کی قیمت ایک آنسو ـــــ ایک آہ ہوگی
اس لیے جب چاپ چلدے (جدا دے)
اور اس وقت (جدائی) کی اطلاع نہ دینا
اپنا وہ وقت آپ ہی انتخاب کرلے
ہاں مجھے شب بہ خیر نہ کہنا بلکہ
کسی عالم نوریں میں مجھے صبح مبارک کہنا ـــــ مسز انا لٹی تا بار بالڈ

آزادی :

دولت کی میرے پاس قدر نہیں
اور محبت کا میں مذاق اڑاتی ہوں
اور شہرت کی خواہش تو صرف ایک خواب ہے
جو صبح صبح لوٹ جائے ـــ
اگر میں دعا کرتی ہوں تو صرف اس دعا کے لیے میرے
لب ہلتے ہیں کہ
ـــــ "مجھے اس دل سے نجات ملے جو میں رکھتی ہوں
اور مجھے آزادی عطا ہو ـــــ"
ہاں جیسے جیسے میرے دن تیزی سے اختتام کی طرف
سفر کر رہے ہیں
یہی میری ایک تمنا ہے کہ
" زندگی اور موت میں آہ کیے بغیر سب کچھ
برداشت کرسکنے والی آزاد روح رہوں ـــــ"
مس ایمیلی برانٹ

غزل

مشتاق پردیسی

رکے گا عزمِ مستحکم کہاں تک
بھلا رستوں کے پیچ و خم کہاں تک
جبیں غیروں کے در پہ خم کہاں تک
یہ توہینِ سرِ آدم کہاں تک
یہ ضبطِ گریۂ پیہم کہاں تک
سنبھالوں میں تمہارا غم کہاں تک
کبھی تو عشق بھی خوددار ہو جائے
کسی کی بے رخی کا غم کہاں تک
لہو در کار ہے جوشِ نمو کو
چمن میں گریہ و ماتم کہاں تک
نشیمن پھونک دیں اے برق خود ہی
ترا احساں اٹھائیں ہم کہاں تک
کہو تفصیلِ دار و گیر ابھی اب
فسانہ زیست کا مبہم کہاں تک
ہمیں ٹھہرا لیا منزل نے ورنہ
نکل جاتے نہ جانے ہم کہاں تک
ہنسو غنچے کی صورت چاکِ دل پر
یہ نقلِ گریۂ شبنم کہاں تک
مذاقِ شعلہ خو یہ کہہ رہا ہے
چراغِ زیست کی لو کم کہاں تک
اٹھو مشتاق سرِ دامن چھڑا دو
نظامِ زندگی پر ہم کہاں تک

نوجوانوں کی بین قومی کانفرنس

شرلی کارٹن

اس موسم گرما میں تقریبًا ایک ہزار نوجوان سنگاپور میں جمع ہو رہے ہیں۔ یہ وہ نوجوان ہیں جو قومی اختلافات کو مٹا کر ایک بین قومی برادری قایم کرنا چاہتے ہیں موجودہ دنیا میں یہ کوئی آسان کام نہیں لیکن پھر بھی وہ ایک نئی دنیا کی تعمیر کے اصولوں اور آدرشوں میں یقین رکھ کر اس کام کو انجام دینے کے لیے بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔

یہ سب نوجوان آزاد دنیا کے چالیس سے زاید ممالک کی سنگاپور کانفرنس میں نمایندگی کریں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کانفرنس سنگاپور میں کیوں منعقد کی جا رہی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ سنگاپور ایشیا کی جانب جانے والے رستوں میں سے ایک اہم رستا ہے۔ براعظم ایشیا ایک نئے دور میں سے گذر رہا ہے اور اسے اپنے مستقبل کے متعلق فیصلا کرنا ہے۔ اس کی معاشی اور سیاسی ترقی کا انحصار اس کے نوجوانوں پر ہے چنانچہ یہ بھی بات ہے کہ بین قومی اصولوں میں یقین رکھنے والے نوجوانوں کی کانفرنس وہاں منعقد کی جاے۔

نوجوانوں کی عالمی اسمبلی

یہ تمام نوجوان ایک بین قومی تنظیم ”ورلڈ اسمبلی آف یوتھ“ کے رکن ہیں۔ یہ تنظیم ۱۹۴۸ء میں نوجوان تحریک کے لندن کے ایک جلسے کے بعد جو لندن میں بلایا گیا تھا قایم کی گئی تھی۔ اور اس کا نصب العین اقوام متحدہ کے اعلان انسانی حقوق کے مقاصد کو حاصل کرنا ہے ”ورلڈ اسمبلی“ میں (۴۳) اقوام شامل ہیں اور آشا ہے کہ سنگاپور کانفرنس کے بعد تین یا چار اور قومیں اس میں شامل ہو جائیں گی۔

ہر قوم کی اپنی قومی رابطا کمیٹیاں قایم ہیں جن میں مذہبی وسیاسی نوعیت کی تمام نوجوان تحریکوں کے نمایندے شامل ہیں شرط یہ ہے کہ وہ ”ورلڈ اسمبلی“ کے اصولوں کو تسلیم کریں۔ ان میں سے ایک اصول جمہوری طرز کی حکومت کی حمایت ہے ”ورلڈ اسمبلی“ میں بواے اسکاوٹس گرل گائڈز لبرل خیالات رکھنے والے نوجوان قدامت پسند نوجوان۔ نوجوان سوشلسٹ کیتھولک نوجوان، پروٹسٹنٹ نوجوان۔ ہندو۔ مسلم سب شامل ہیں۔ مختصر یہ کہ اس تنظیم کو عالمگیر حیثیت حاصل ہے اور یہی اس کی طاقت کا راز ہے یہ اس وقت آزاد دنیا کے دس کروڑ نوجوانوں کی نمایندگی کر رہی ہے۔

”ورلڈ اسمبلی“ صرف بحث مباحثے ہی نہیں کرتی۔ اگر اس کے پچھلے ریکارڈ کا مطالعا کیا جاے تو پتا لگے گا کہ اس کی قومی کمیٹیوں نے کافی تعمیری کام بھی کیا ہے۔ یہ کمیٹیاں ان پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھاتی ہیں۔ صحت عامہ کے مسایل سے نپٹتی ہیں اور زراعت کو بہتر بنانے میں کسانوں کی امداد کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بین قومی کام بھی سرانجام دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر سویڈن کی قومی کمیٹی نے پاکستان کے کئی دیہات کی اراضی کو بہتر بنانے اور پانی کی سہولتوں کے متعلق فنی مشورا دیا ہے۔

سنگاپور کانفرنس میں ”ورلڈ اسمبلی“ کے ڈیلیگیٹ موجودہ صدی کے دو اہم مسایل پر تبادلہ خیال کریں گے ایک تو یہ کہ ”خوراک اور عوام“ اور دوسرا ہے۔ ”انسان اور مشین“ اس کے علاوہ یہ کانفرنس نوجوان تحریکوں کے کئی اور مسایل پر بھی بحث کرے گی۔ خصوصًا تعلیمی مسایل پر زیادہ زور دیا جاے گا۔

ہندستانی ڈرامے کی نشو ونما اور ارتقا

(۱ - ۱)

انیسویں صدی کے پہلے نصف تک ہندستانی میں ڈرامے کی طرف چنداں توجہ نہیں دی گئی لیکن کہیں کہیں ایسی روایات ضرور پائی جاتی ہیں جن سے آخر کار ناٹک نے جنم لیا۔ پورے دور مغلیا میں منڈلیوں کا رواج تھا۔ جو متھرا اور بندرابن جیسے مقامات سے روانا ہو کر جگہ جگہ ناٹک کھیلتے۔ ان میں سنگیت اور ناچ کو خاص دخل ہوتا تھا۔ متھرا اور بندرابن سے کرشن جی کا تعلق رہا ہے۔ اس امر کی شہادت بھی ملتی ہے کہ واجد علی شاہ اودھ نے ان روایتی ناٹکوں کو دیکھا اور شاید ان میں سے بعضوں میں خود بھی حصا لیا۔ لکھنو کے امیروں کے طبقے میں نقالی کا رواج پایا جاتا تھا۔ یہ کام پیشا ور مسخرے کیا کرتے جن کے پاس کوئی نوشتا یا مسودا نہیں ہوتا تھا۔ یہ نقالی اسی وقت ہوا کرتی شاید کسی غیر ملکی شخص کی تجویز پر (گو کہ اس مسئلے پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے) واجد علی شاہ نے امانت لکھنوی سے ایک طربیا ناٹک لکھنے کو کہا جس میں موسیقی بھی اس طرح ۱۸۵۳ء میں ناٹک "اندر سبھا" عالم وجود میں آیا اس ڈرامے کے مناظر اندر دیوتا کے دربار کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ اور اپسراؤں نے جنہیں پریوں کا نام دیا گیا اس کے مناظر میں چار چاند لگا دیے۔ ناٹک کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا سا ہے۔ ایک پری کسی انسان پر عاشق اور فریفتا ہو جاتی ہے۔ اس ناٹک کی ایسی مانگ ہوئی کہ اسے مختلف رسم خط میں چھاپا گیا۔ جن میں دیوناگری، گجراتی اور گورمکھی بھی شامل ہیں۔ انڈیا آفس لائبریری میں اس کے کم سے کم چالیس ایڈیشن موجود ہیں سنہ ۱۸۹۲ء میں اس کا ترجما جرمن زبان میں بھی ہوا۔

پر ان سکوہ مناظر کی روایات کو بہت ہی پارسی تھیٹریکل کمپنیوں نے اپنایا اور تجارتی نہج پر فروغ دیا۔ پارسیوں کے تھیٹریکل گروہوں میں سے چند نام یہ ہیں۔ پیسٹن جی فرام جی کی اوریجنل تھیٹریکل کمپنی بالی والا کی وکٹوریا ناٹک کمپنی اور کاؤس جی کی الفریڈ تھیٹریکل پارسی کمپنیوں میں رونق بنارسی میاں حسنی ظریف ونایک پرشاد طالب بنارسی احسن لکھنوی پنڈت نارائن پرشاد بیتاب دہلوی وغیرہ تمثیل نگار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ احسن لکھنوی پہلے ڈراما نویس ہیں جنہوں نے ہندستانی ناٹک میں نثر کو رواج دیا۔ انہوں نے مغربی ڈراموں کو ہندستانی کا جاما بھی پہنایا۔

ہندستانی ڈراما مستقل تصانیف اور ترجموں پر مشتمل ہے۔ تصانیف کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ اور جو ہیں وہ کسی سیاسی یا سماجی بحث پر مبنی ہیں ترجموں کے ماخذ یہ ہیں۔ (۱) سنسکرت (۲) انگریزی یا اور کوئی یورپین زبان انگریزی ترجمے کے ذریعے (۳) فارسی قصے (۴) دیسی زبانیں خصوصاً بنگلا مرہٹی وغیرہ۔

عبداللہ یوسف علی آئی۔ سی۔ ایس نے ایک مضمون میں ہندستانی ڈرامے کے عناصر ترکیبی قرار دیے ہیں۔

(۱) قدیم سنسکرت ڈراما (۲) ہندوؤں کے خالص مذہبی ناٹک اور دیوتاؤں اور دیویوں کے حالات (۳) وہ چیزیں جو عوام میں رائج ہیں مثلاً سوانگ نوٹنکی نقلیں وغیرہ (۴) اسلامی نظمیں اور قدیم روایات (۵) ہمارا موجودا انگریزی ڈراما اور یورپین اسٹیج کی ترقیاں۔

انگریزی اسٹیج کا اثر نئے دور کے ہندستانی ڈرامے پر سب سے زیادہ ہے۔ ہندستانی اسٹیج انگریزی ناٹکوں کے ترجموں سے بھرا ہوا ہے۔ اسٹیج کی وضع تھیٹر کی ساخت پردے لباس

نشستوں کا طریقہ تماشے کی تقسیم پارٹیوں کا انتظام یہ سب بالکل انگریزی اصول کے مطابق اور انہی کے زیر اثر ہیں۔

سیٹھ پستن جی فرام جی جن کو ہندستانی اسٹیج کا باوا آدم سمجھنا چاہیے ہندستانی خوب جانتے تھے بلکہ اس میں شعر بھی کہتے تھے یہ خود بھی بہت عمدہ ایکٹ کرتے تھے خورشید جی بالی والا کاوس جی کھٹاؤ سہراب جی اور جہانگیر جی مشہور ایکٹر تھے۔ ان کے علاوہ رستم جی خرشید بائی، مہتاب بائی اور ایک یورپین مس میری فنٹن پنجر شاہ، گلزار خاں، مادھو رام، موہن، نیحر جی، زہرا بائی اور گوہر بائی بھی ایکٹنگ میں شہرت رکھتے تھے۔

بیتاب دہلوی بمبئی ہی میں رہتے تھے۔ اور ایک رسالہ موسوم بہ شیکسپیر نکالتے تھے جس میں مشہور ڈراموں کا ترجمہ چھپتا تھا۔

چند دوسری مشہور ناٹک کمپنیوں کے نام یہ ہیں (۱) اولڈ پارسی تھیٹریکل کمپنی جس کے مالک اردیشر جی تھے (۲) جوبلی کمپنی دہلی۔ اس کو دہلی کے ایک امیر آدمی نے عباس علی ایکٹر کے زیر اہتمام قایم کیا تھا (۳) بھارت ویاکل کمپنی میرٹھ اس کے ڈائرکٹر ایکٹر پڑے لکھے تھے۔ (۴) امپیریل کمپنی (۵) لائٹ آف انڈیا

ہندستانی ڈرامے کی دنیا میں آغا حشر کاشمیری کا نام بڑی شہرت رکھتا ہے۔ انہیں ہندستانی ڈرامے کا مارلو کہتے ہیں۔ انہوں نے پارسی تھیٹروں کی ڈگر پر چلنے کی بجائے اپنی راہ الگ بنائی آغا حشر نے مغربی شاہکاروں سے خوشہ چینی کی اور ان میں سے بہتوں کو اپنے رنگ میں ڈھال لیا حشر میں جہاں خوبیاں تھیں وہاں چند نقایص بھی تھے۔ وہ جذبات کی نزاکت کی بجائے شدت اور نفس رنگ کی بجائے گہرے اور متعدد رنگ کے قایل تھے۔ پھر بھی ان کے یہاں زور بیان کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ان کا اسٹیج زیادہ تر کلکتہ ہی میں رہتا لیکن انہوں نے ملک کا دورہ بھی کیا اور چھوٹے موٹے بیٹیاور ایکٹروں اور نوسکھیا کلیوں کو نیا ڈھنگ بھی سکھایا۔

یوں تو سماجی ناٹک کی بنیاد بعد میں پڑی۔ لیکن اب اسی قسم کے ڈراموں کا دور دورہ ہے بیسویں صدی کے قاید

عبدالماجد دریابادی اور عبدالحلیم شرر ہیں۔ عبدالماجد دریابادی نے زود پشیماں لکھا۔ جو شادی کے مسایل سے بحث کرتا ہے۔ عبدالحلیم شرر نے "میوہ تلخ" لکھا۔ یہ ڈراما سخت پردے کے رواج کی برائیاں بیان کرتا ہے۔ برج موہن دتاتریہ کیفی نے راج دلاری اور "مراری دادا" جیسے ڈرامے لکھے جو نثر میں ہیں اور جدید سماجی اور خانگی زندگی کا خاکا پیش کرتے ہیں یہ تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے فطرت کا آئینا رکھ دیتے ہیں اور ان کا مقصد اصلاح حال ہے ان میں اونچے متوسط طبقے کے مردوں اور عورتوں کے خیالات اور کمزوریوں کا کامیاب مرقع پیش کیا گیا ہے۔ زبان ٹکسالی اور بامحاورہ ہے ڈاکٹر عابد حسین راجندر سنگھ بیدی اور اپندر ناتھ اشک کرشن چندر سعادت حسن منٹو عصمت چغتائی اور دوسرے ہمعصر تمثیل نگاروں میں بھی یہی رجحان پایا جاتا ہے ان میں سے بہتوں نے ایک ایکٹ کے ڈرامے کو کامیابی سے برتا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے بعض ڈراما نویسوں میں یہ نام بھی شامل ہیں۔ منشی غلام علی دیوانہ منشی محمد ابراہیم محشر انبالوی، منشی رحمت علی، دوارکا پرشاد، مرزا عباس آغا شاعر دہلوی لالا کشن چند زیبا لالا نانک چند ناز، لالا کنور سین مضطر، سہاے میاکل، منشی جانیشر پرشاد مایل دہلوی رادھے شام سدرشن منشی جوالا پرشاد برق۔

سیاسی نوعیت کے بھی بعض ڈرامے لکھے گئے ہیں جن میں امراو علی کا ڈراما "البرٹ بل" بھی شامل ہے ایک ڈراما انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد کو اجاگر کرنے کے لیے لکھا گیا تھا ترک موالات کے عروج کے زمانے میں بھی بہت سے ڈرامے سیاسی مسایل پر لکھے گئے۔ اور ممنوع قرار پائے منشی کشن چندر زیبا نے "زخمی پنجاب" کے نام سے ایک ڈراما لکھا تھا۔

آغا حشر نے سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھا تھا کسی تجارتی کمپنی کے مالکوں کے احکام پسند اور تجارتی نقطہ نظر پر منحصر رہنا ادبی تصانیف کی تخلیق میں انہیں باتوں کو مطمح نظر بنائے رکھنا اور

مغز راحمد وو وقت میں ان کی تخلیق بھی کرنا ان ساری چیزوں کے دایرے میں جو تصنیف معرض وجود میں آئے گی وہ ادبی تصنیف۔

یادِ قمر

ظفر عالمگیر۔ بی۔ اے (عثمانیا)

پچھلے نمبر میں ہم نے قمرالدین قمر کے بارے میں ایک نوٹ تو دیدیا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس سالے سے مرحوم کے تعلق کا لحاظ کرتے پورا پورا حق ادا نہ ہوا تھا۔ وجہ یہ ہوئی تھی کہ ان کی موت کی اطلاع اس وقت ملی جبکے ایڈیٹوریل لکھا جاچکا تھا۔ اور بعد کے صفحے نظموں وغیرا سے بھر چکے تھے۔ اس لیے مجبوراً ایک گنجایش میں اپنے ادارتی فرض کو بلکل ہی رواروی میں ادا کرنا پڑا۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ اس نمبر میں اس کی پابجائی کس طرح پر کی جاے کہ ایسے میں ظفر عالمگیر کا نیچے کا خط وصول ہوا۔ اس کے پڑنے سے ہمیں ایک طرح کا سکون ہوا اور ہم نے یہ طے کیا کہ وہ خط جوں کا توں دیدیا جاے۔

اس خط سے ظاہر ہے کہ ظفر عالمگیر کو اپنے ایک ہم مشرب کے بچھڑ جانے پر بڑا ہی دکھ ہوا، اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ اس لیے کہ کسی ادیب یا شاعر کی موت پر سواے ایک ادیب اور شاعر کے دوسرا کون آنسو بہاے گا۔! چنانچہ نیچے دیے ہوے خیالات اور تاثرات ایک ادیب و رشاعر کے رنجیدا اور ملول دل کے آئینا دار ہیں۔ قمر کی جواں مرگی پر ظفر عالمگیر کی نوحا خوانی اور رنج و غم میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں ———

گوشِ محشر[?]

حیدرآباد دکن

۲۹ر دسمبر ۵۴ء

میرے مکرم خان صاحب!

گلدستۂ تسلیمات۔ رسالا آج ملا۔ اوراق الٹے تو بڑا افسوس ہوا۔ قمرالدین قمر کی موت کی اطلاع پاکر ۔۔۔! کسی کے اشعار ذہن میں گونج اٹھے ؎

راہ رو ملتے ہیں پل بھر میں بچھڑ جانے کو
پھر بھی جاتے ہوے کچھ اشک ڈھلک جاتے ہیں
وقت کر دیتا ہے یادوں کو فضا میں تحلیل
جس طرح پھول تہِ خاک سرک جاتے ہیں

کبھی ان اشعار کو یاد کرتا تھا تو شاعر کے خیالات کی داد دیتا تھا۔ اور سوچتا تھا کہ کتنی سچی بات کس نکھرے ستھرے انداز میں اس نے کہدی ہے لیکن آج ان مصرعوں کو دہرا رہا ہوں لہٰذا ان مصرعوں سے حسرت ٹپکتی محسوس ہورہی ہے۔ وہی حسرت جو کسی پرانی تاریخی عمارت سے ٹپکتی ہے گولکنڈا میں قطب شاہوں کے مقبروں سے ٹپکتی ہے۔ جو اکبر اعظم کی چہیتی ملکا جودھا بائی کے محل کی ہر دیوار سے چمٹی ہوئی ہے وہی حسرت جو حیدرآباد کے زبردست نوابوں اور جاگیرداروں کی عظیم الشان کوٹھیوں کے دریچوں سے آج جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے وہ حسرت جو شہر خموشاں پر راج کرتی ہے جہاں قمر ہمیشا کے لیے جا سویا۔ ان مصرعوں کو دہرا رہا ہوں تو وہی حسرت ہو رہی ہے جیسے کسی زبردست اور شاندار عمارت کے کھنڈروں میں کھڑا ہوں جہاں کبھی زندگی کے چہچہے اور نہگامے تھے۔ شان اور آن بان تھی ــ "ایک ساتھی چھوٹ گیا ـــــ"!!

نہ جانے کوئی جوانی میں زندگی کی آغوش سے نکل کر موت کی باہوں میں سما جاتا ہے تو مجھے بے حد افسوس ہوتا ہے خصوصاً اگر وہ فن کار ہو خواہ وہ میرا ہم خیال ہو نہ ہو رجعت پرست ہو یا تعمیر پسند ہو یا ترقی پسند خواہ کچھ ہو اس کی موت کا مجھے صدما ہوتا ہے۔

میں "جادہ" (بھوپال) کا وہ شمارا نہیں بھول سکتا جس میں اشعر ملیح آبادی کی جوان موت پر خلیل الرحمن کے آنسو اشعار کے روپ میں شایع ہوے تھے۔ اشعر کے کلام کو شاید میں نے ایک دو بار دیکھا ہوگا۔ مقصد کا اعتبار کرتے میں اشعر سے

بہت دور ہوں لیکن اس کے باوجود اشعر مجھے یاد آجاتا ہے۔ "جادہ" یاد آجاتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے آنسو یاد آجاتے ہیں۔ صاحبزادہ میکش بھی مجھے اتنا یاد آتا ہے جو اکثر میکش جو اس بزم ہستی سے تشنہ کام گیا۔ جس سے زندگی میں صرف ایک بار ملا تھا۔ اور وہ بھی ان دنوں جب کہ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ادب کیا ہے اور فن کس چڑیا کا نام ہے۔ اور "لالۂ خودرو" کی خالق اور ڈاکٹر ریاض الحسن ہاشمی کی اکلوتی لڑکی سیدہ برجیس نازش کا نام بھی میرے حافظے سے نہ مٹ سکے گا۔ اٹھارہ سال کی مختصر سی عمر میں اس کی شعری صلاحیتوں کا یہ عالم تھا کہ اس کے کلام کے مجموعے "لالۂ خودرو" پر نیاز فتح پوری نے لکھا تھا "کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کچھ دن اور مہلت دیتی تو ہمارے لیے وجہ نازش ثابت ہوتیں"۔ لیکن برجیس آتے آتے صرف اٹھارہ سال کی زندگی مانگ لائی تھی اور جاتے جاتے "لالۂ خودرو" چھوڑ گئی۔

اشعر، میکش اور برجیس — اور آج ایک اور نام کا اضافہ ہوا۔ قمر — ان تینوں کا ذکر آتا یا کبھی خیال آجاتا تو اکثر عجیب سی کیفیت محسوس کرتا ہوں جیسے کسی نے میرے سینے سے دل نکال لیا ہو۔ اور آج قمر کی موت کی اطلاع پاکر محسوس ہو رہا ہے کہ سینے میں دل نہ رہا۔ اگرچہ کہ قمر ابھی اتنا نہ ابھر سکا تھا جتنے میکش یا اشعر!

قمر ابھی ابھی اس محفل میں آئے تھے ادبی ذوق رکھنے والے ان گنت ہوں گے جنہوں نے قمر کا نام تک نہ سنا ہوگا۔ اس لیے کہ وہ عظیم فن کار نہ تھا بلکہ اس مقام کی جانب رواں تھا جہاں عظمت و شہرت قدم چومتی ہے شاید بڑے بڑے فن کاروں نے بھی قمر کا نام نہ سنا ہو۔ کسی رسالے میں اس کا افسانہ دیکھ کر یوں ہی الٹ دیا ہو۔ اور دیکھا تک نہ ہو کہ اس نے کیا لکھا ہے ہاں بڑے فن کاروں کو اپنے سوا دنیا میں کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر بھی قمر کو بہت سے لوگوں نے پڑھا ضرور ہے لیکن بہت کم ہندستانی افسانے وغیرہ بہت کم پڑھتا ہوں۔ وقت ہی کم ملتا ہے۔ کالج کی جماعتوں کے اور خصوصاً بی۔اے کے طلبا کو انگریزی پڑھانے دماغ کا جنازہ نکل جاتا ہے اور اس پر اخباروں اور رسالوں کے مدیروں کے احکام۔ آدمی کسی کام کا نہیں رہتا۔ قمر کے افسانے "ہندستانی ادب" میں دیکھتا تو سوچا کرتا کہ جلدی کیا ہے پڑھ ڈالیں گے کبھی یہی سوچ کر ہمیشہ ٹالتا رہا۔ کسے خبر تھی کہ قمر اتنی جلد دنیا سے سفر کرے گا میں نے زندگی میں قمر کو کبھی نہ دیکھا کبھی بات نہ کی۔ کبھی نہ تعارف ہوا۔ اور شاید قمر بھی مجھے نہ جانتا ہو لیکن اس اجنبیت کے باوجود قمر کی موت کی خبر بے حد گراں گذری قمر سے میں بہت کم ملا ہوں۔ انسان کی حیثیت سے نہیں بلکہ افسانہ نگار کی حیثیت کسے گوشت پوست کے انسان کے روپ میں نہیں بلکہ کاغذ پر بکھرے ہوئے الفاظ کے روپ میں اور اسی اعتبار سے میں قمر کو جانتا ہوں۔ نہ جانے وہ کون تھا۔ کس کی آنکھوں کا نور کس کی ممتا کی آغوش کا پھول۔ کس خاندان کا چراغ کس سرزمین کا فرزند کس کی امیدوں کا محل۔ کس کی زندگی کا سہارا۔ پتا نہیں لیکن پھر بھی قمر ہم سب میں سے تھا نوعمر فن کاروں کی محفل کا ایک چراغ تھا۔ اور یہ چراغ بجھ گیا۔ موت کے جھونکوں نے اقبال غالب اور اختر شیرانی جیسے ستاروں کو پھونک دیا۔ ان جھونکوں کا مقابلہ بھلا یہ چراغ کیا کرسکتا۔ آج افسوس ہو رہا ہے کہ میں اس چراغ سے کس قدر انجان رہا۔ کتنا بے خبر — کہ ایک چراغ دھیرے دھیرے اپنی روشنی میں اضافہ کر رہا ہے۔ اپنا نور پھیلا رہا۔ اور ان ابتدائی منزلوں ہی میں موت کے جھونکے کی نظر انتخاب اس پر پڑے گی اور دھوئیں کا مرغولا بن کر اس کی زندگی فضا میں تحلیل ہو جائے گی۔

قمر کے ایک افسانے "آگ میں پھول" کے آخری جملے مجھے یاد آرہے ہیں۔

وہ بیدار حسرت بھری نظروں سے بار بار گاڑی

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی-ام-خان-ام-اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانیوالا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

جلد (۱۵) نمبر (۵)

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیا)

فروردی سنہ ۱۳۶۴ ف فروری سنہ ۱۹۵۵ ع

چندا سالانا آٹھ روپے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
حقایق و معارف	اَفقر موہانی	۳
غزل	اعتبار الملک دل شاہجہانپوری	۴
غزل	سراج (لکھنوی)	۵
غزل	جوش آنند نراین ملا (لکھنوی)	۶
غزل	اختر انصاری (اکبرآبادی) ایڈیٹر "مشرب" کراچی	۷
غزل	سلام سندیلوی ام۔ اے ال ال۔ بی وایس پرنسپل (لکھنو)	۸
ہندستان میں سماجی تعلیم کی تحریک	ا۔ ا	۹
یاس و امید	حبیب پرویز (لکھنوی)	۱۱
ہندستان اور ایران کے تعلقات	ڈاکٹر تاراچند	۱۲
غزل	صابر (لکھنوی)	۱۳
اقبال کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی	ظفر عالمگیر بی۔ اے عثمانیا میرٹ اسکالر	۱۴
پریزیڈنٹ ٹیٹو	ا۔ ا	۱۸
لینن ریاستی لائبریری میں ہندستانی ادب کا ذخیرا	ب۔ یوگاچیف (ڈائرکٹر لینن ریاستی لائبریری)	۲۰
فارسی زبان کا مطالعا	عبدالرحمن خان	۲۲
کرالا میں ڈرامے کی روایات	ا۔ ا	۲۳
برطانوی یونیورسٹیوں میں انجینرنگ کی تعلیم	جی۔ ایچ۔ راکلیف (پروفیسر الکٹریکل انجینرنگ برمنگھم یونیورسٹی)	۲۵
سوراشٹرا کی قدیم تہذیب	جے۔ ایل۔ جیر	۲۶
کولمبیا یونیورسٹی	یوسیس	۲۸
چین میں شوفینلڈ دیوال ورفن کاروں کی حوصلا افزائی	ج۔ ا	۳۱
تبصرے	"ا"	۳۲

ہمارے خیالات

"NATIONALISATION کو ہندی میں کیا کہنا چاہیے —؟"

۱۹ر جنوری ۱۹۵۵ء کو آل انڈیا کانگریس سشن مدراس میں ہندستان کے بڑے وزیر جواہر لال نہرو سبجکٹس کمیٹی میں دیش کی معاشی حالت پر ایک تحریک پیش کر رہے تھے۔ تحریک یہ قول بڑے وزیر ہندی میں پیش ہو رہی تھی۔ انگریزی شبد NATIONALISATION چونکہ انہیں کھٹک رہا تھا، اس لیے انہوں نے کمیٹی کے ممبروں سے مخاطب ہو کر کہا "کہیے آپ کی ہندی بھاشا میں NATIONALISATION کے لیے کون شبد ہے —" یہ کہا اور ممبروں کی طرف گھورتے رہے تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد ایک شخص نے کہا "راشٹریا کرن" اور پھر سبھوں نے ایک آواز ہو کر بیان کیا "جی ہاں یہی شبد ٹھیک ہے" مگر بڑے وزیر نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "نہیں جی! یہ تو ٹھیک نہیں۔ اس لیے کہ اس کے حقیقی مطلب اور مفہوم کو ادا نہیں کرتا ہے"۔ بہر حال یہ مسئلہ جوں کا توں لاینحل رہ گیا۔

"آپ کی قومی بھاشا" کے شبد استعمال کرتے ہوئے بڑے وزیر نے اصل میں ان مجنونوں پر چوٹ چلی تھی جو ہندی کو قومی بھاشا اور ایک کامیاب زبان مانتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ آج کل کے ہندی لٹریچر میں سنسکرت کے موٹے موٹے شبد ٹھونس رہے ہیں۔ اس سے زبان کٹھن سے کٹھن بنی جا رہی ہے یہی وجہ تھی کہ کمیٹی کے ممبر کوئی آسان اور عام فہم شبد نہ بتا سکے۔ اور یہ ایسے اچنبھے کی بات بن گئی کہ اس سلسلے میں اخباروں نے عجیب عجیب سرخیاں قایم کر دیں۔ ان میں سے ایک سرخی یہ بھی تھی کہ —

"اسکالروں (محققوں یا چھان بین کرنے والوں) کے لیے لمحہ فکر" ہو سکتا ہے کہ یہ سرخی ہندی کے اسکالروں کے لیے "لمحہ فکر" بنے مگر "ہندستانی" بھاشا کے اسکالروں کے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے پہلے ہی سے ایسے شبد بنا رکھے ہیں جو انگریزی شبدوں کا بدل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ایک ہندستانی بھاشا کا اسکالر نہایت آسانی کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ انگریزی شبد NATION کا بدل ایک عام فہم اور روز روز کی بول چال کا شبد "قوم" اس طرح قوم سے انگریزی NATIONALISATION کا بدل "قومیانا" ہو سکتا ہے۔ لیجیے! کس آسانی سے گتھی سلجھ گئی۔

صرف اسی ایک شبد پر کیا منحصر ہے "ہندستانی" بھاشا میں ایسے سیکڑوں اور ہزاروں ہی شبد موجود ہیں جو بلا تامل انگریزی زبان کے شبدوں کے ہم معنی اور ان کا ٹھیک ٹھیک بدل ہو سکتے ہیں۔ یہ سب آسانیاں اور سہولتیں اسی وقت ظاہر ہو سکتی ہیں جبکہ ہندستان کے بڑے وزیر جواہر لال نہرو اپنے پرانے خیال پر لوٹ آئیں۔ جس طرح سے انہوں نے بہت سارے ناممکن سے مسایل کو ممکن کر دکھایا اور منوایا ہے۔ اسی طرح دیش بھاشا یا قومی زبان کے بارے میں ہندستانی کو منعقد اور ان گنت مثالوں سے یہ منوانے اور قایل کروانے کی کوشش کریں کہ گاندھی جی مرحوم کے وچاروں کے برابر ہندستان کی قومی زبان صرف "ہندستانی" ہی ہو سکتی ہے ہمیں آشا ہے کہ ہمارے بڑے وزیر زبان جیسے اہم مسئلے پر پھر سے ضرور دھیان دیں گے تاکہ یہ آئے دن کی کٹھنائیاں دور ہو جائیں۔

حقائق و معارف

افقر موہانی وارثی

وہ کچھ اس انداز سے جلووں کو دکھلانے لگے　　　کائنات دو جہاں کو وجد میں لانے لگے

جب حریم ناز کے جلوے نظر آنے لگے　　　آستان یار سے ہم سر کو ٹکرانے لگے

فصل گل آتے ہی گلچیں باغباں صیاد و برق　　　دیکھنے میرا نشیمن سب ہی تو آنے لگے

کیا کہے بیمار غم اس وقت کی مجبوریاں　　　چارہ گر بالیں سے جب منہ پھیر کر جانے لگے

انقلاب انگیزیاں خون وفا کی دیکھ کر　　　حاملان عرش و کرسی تک بھی تھرانے لگے

اے جبین شوق سجدہ کر یہ ہے وقت سجود　　　مجھکو نقش پائے جاناں اب نظر آنے لگے

مل گئی داد محبت ہو چکی قدر وفا　　　جن سے درماں کی توقع تھی وہ سمجھانے لگے

سارے میکش میکدے میں ہو گئے سرشار جب　　　خود بخود پیمانے سے پیمانے ٹکرانے لگے

بات تو جب ہے کہ تاب دید بھی ہو اے کلیم　　　وہ بھی ہے ذوق نظر کوئی کہ غش آنے لگے

کہہ دیا کس نے یہ تربت ہے شہید ناز کی　　　سن کے آنا وہ نشان قبر ٹھکرانے لگے

غرق ہوتے مجھکو افقر دیکھ کر ساحل کے پاس
اہل ساحل بند آنکھیں کر کے تھرانے لگے

غزل

اعتبار الملک دلؔ شاہجہانپوری جانشین امیرؔ مینائی

سوز ہم دل سوز ہم جانبازیٔ پروانہ ہم — بن گئے جاتی ہوئی دنیا ترا افسانہ ہم
کہہ گئے ہیں سرگذشت عشق بے تابانہ ہم — ختم ہم روداد ہم آغاز ہر افسانہ ہم
کھینچتی موج مخالف جب سفینہ لے چلی — دور تک دیکھا کیے ساحل کو مایوسانہ ہم
اشک رنگیں ہو چلے خون تمنا ہو چکا — آج چھیڑیں گے یہیں سے اک نیا افسانہ ہم
جام کوثر روح بادہ جنت میکش کا پھول — اور کیا سمجھیں تجھے اے نرگس مستانہ ہم
سرحد ادراک تک ہے پائے لرزاں میں خلش — اس کے آگے اے جنوں پھر گردش صحرا نہ ہم
ہر قدم پر روندتی چلتی ہے اک دنیا ہمیں — درس عبرت ہیں مثال سبزۂ بیگانہ ہم
سرگذشت نامکمل واقعات ناتمام — ایک افسانہ ہے دنیا دوسرا افسانہ ہم
آج یہ کہہ کر ہوئے قربان ان پر جاں نثار — بزم سوز و ساز میں تم شمع ہو پروانہ ہم
اے نگاہ منفعل خوددار رہنا چاہیے — ہم سمجھتے ہیں ترا یہ عذر معصومانہ ہم!
آفریں صد آفریں اے جذبۂ توفیق عشق — ایک آہ سرد میں کل کہہ گئے افسانہ ہم
وہم کا اک شعبدہ ہے یہ طلسم زندگی — جس نظر سے دیکھیے آباد ہم ویرانہ ہم
ہر نظر شرح تمنا ہر نفس روداد عشق — سن چکا اک سننے والا کہہ چکے افسانہ ہم
شامل روداد ہو کر بجھ گئی شمع سحر — سوز دل کا جب مکمل کر چکے افسانہ ہم

حضرت دلؔ قصۂ دار و رسن دہرا دیا
بے تکلف کہہ گئے اک لفظ گستاخانہ ہم

غزل

سراج (لکھنوی)

دکھا گئی وہ کرشمہ نگاہ یار مجھے
ہر آئینا نظر آنے لگا غبار مجھے

ذرا سنبھلنے تو دے اپنے نگاہ یار مجھے
کہ اب تو آ ہی گیا تیرا اعتبار مجھے

نظر میں پھر وہی ہنگامۂ قیامت ہے
پھر آ چلا ترے وعدے کا اعتبار مجھے

ترے فراق کی ساری حدیں تمام ہوئیں
اب اپنی یاد ہے اپنا ہے انتظار مجھے

فریب خواب محبت ارے معاذ اللہ
پکارتا ہے کوئی جیسے بار بار مجھے

اب آگے دیکھیے تقدیر کیا دکھاتی ہے
قفس تک آ کے تو پہنچا گئی بہار مجھے

کہاں کا وعدہ کہ جھوٹی تسلیاں بھی نہ دیں
مگر وہ سونپ گئے اپنا انتظار مجھے

خوشی سے اپنی کوئی سانس لے نہیں سکتا
دیا گیا ہے زمانے کا اختیار مجھے

پروں سے منہ کو چھپائے قفس میں بیٹھا ہوں
یہ شرم ہے کہ نہ پہچان لے بہار مجھے

ترے نثار اک ایسی نگاہ بھی ساقی
جو بے پلائے بنا دے گناہگار مجھے

ہوں مشت خاک بیادگار آتش گل
جھٹک نہ دینا کہیں دامن بہار مجھے

بشکل رنگ پریدہ چمن میں کیا جاؤں
سراج بھول گئی ہو گی اب بہار مجھے

غزل

جسٹس آنند نرائن ملا (لکھنوی)

سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے

اشک آنکھوں میں ہیں ہونٹوں پہ بکا سے پہلے
قافلہ غم کا چلا بانگِ درا سے پہلے

یہ تو سچ ہے کہ تجھے ترکِ وفا کا حق ہے
ہاں مگر پوچھ تو لے اہلِ وفا سے پہلے

اڑ گیا جیسے یکایک مرے شانوں پر سے
وہ جو اک بوجھ تھا تسلیمِ خطا سے پہلے

ہاں یہی دل جو کسی کا ہے اب آئینۂ حسن
ایک پتھر تھا محبت کی جلا سے پہلے

آنکھ جھپکا بھی تو دے دل کو چرانے والے
اک تبسم نگہِ ہوش ربا سے پہلے

لذتِ زیست کوئی اس کے مقابل کی نہیں
وہ جو اک کیف سا طاری ہے خطا سے پہلے

ابتدا ہی سے نہ دے زیست مجھے درس اس کا
اور بھی باب تو ہیں بابِ رضا سے پہلے

درِ میخانہ سے آتی ہے صلائے تازہ
آج سیراب کیے جائیں گے پیاسے پہلے

راز مے نوشئ ملاؔ ہوا افشا ورنہ
کیا وہ بدمست نہ تھا لغزشِ پا سے پہلے

غزل

اختر انصاری اکبرآبادی
ایڈیٹر "نشرب" کراچی

کون سنتا ہے صرف ذات کی بات
لب پہ ہے میرے کائنات کی بات

لفظ مہمل ہے بزم عشق میں موت
ہر خموشی ہے اب حیات کی بات

کیوں شکن پڑ گئی ہے ابرو پر
میں تو کہتا ہوں ایک بات کی بات

شمع روتی ہے تارے ڈوبتے ہیں
اب فسانہ بنے گی رات کی بات

صبح نو مسکرانے والی ہے
کیا کہیں شب کے حادثات کی بات

مضطرب ہو رہے ہیں دیوانے
ہے تمہاری نوازشات کی بات

بزم اختر میں کیوں خموش ہو تم
ہے یہ بے جا تکلفات کی بات

غزل

سلام سندیلوی ایم۔ اے، ال ال۔ بی
وائس پرنسپل (لکھنؤ)

موج مئے گل جام میں لہرائی ہوئی ہے
یا سحر پری شیشے میں بل کھائی ہوئی ہے

زلفوں کو تری چھو کے ہوا آئی ہوئی ہے
خود ہی نہیں بہکی ہے یہ بہکائی ہوئی ہے

وہ گل کدہ صبح ہو یا میکدہ شام
ہر چیز تری سانس کی مہکائی ہوئی ہے

بہکی ہوئی آنکھوں پہ وہ بہکی ہوئی زلفیں
پیمانوں پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے

اللہ رے چمن میں تری گلگشت کا عالم
پھولوں کے بھی ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی ہے

کچھ مستیاں یوں ہی نہیں سرخی شفق میں
یہ مئے بھی ترے ہاتھوں کی چھلکائی ہوئی ہے

رخساروں پہ تیرے مری نظروں کا مچلنا
یا باد صبا پھولوں سے اٹھلائی ہوئی ہے

غنچوں کی طرف ناز سے اے دیکھنے والے!
اک دل کی کلی بھی ہے جو مرجھائی ہوئی ہے

پہلے ہی سے کیا کم تھی حیا رخ پہ کلی کے
آنے سے ترے اور بھی شرمائی ہوئی ہے

دیبلے تصور میں سلام ان کی حسیں یاد
کچھ نیند سرِ شام ہی سے آئی ہوئی ہے

ہندستان میں سماجی تعلیم کی تحریک

ا - ا

بالغان کو تعلیم دینے کے موجودہ طریقے کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں ہوا۔ یہ وہ زمانا تھا جبکہ صنعتی انقلاب کے باعث دنیا کا نظام ایک نئے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ شروع شروع میں تعلیم بالغان کی مہم کا مقصد بالغوں اور خصوصاً شہری بالغوں کو اس قابل بنانا تھا کہ کارخانوں میں زیادہ اطمینان سے کام کر سکیں۔ لیکن رفتار زمانا کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغان کی مہم کے اغراض و مقاصد کا دائرا بھی وسیع تر ہوتا گیا اور اب اس مہم کے ذریعے محض پیشاورانا نقطہ نگاہ سے ہی بالغوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی بلکے بہ حیثیت مجموعی انہیں اچھے شہری بنانے کی طرف بھی دھیان دیا جاتا ہے تاکے وہ سماجی زندگی میں اپنا پارٹ ادا کر سکیں۔ اس وسیع تر نقطہ نگاہ سے ہی آج کل تعلیم بالغان کی مہم کو بنیادی یا سماجی تعلیم کی مہم سے موسوم کرنا زیادہ موزوں خیال کیا جاتا ہے۔

ہندستان میں سماجی تعلیم اور قومی تحریکوں کا گہرا تعلق رہا ہے۔ غیر ملکی تسلط متوسط طبقے کی بڑھتی ہوئی تعداد دیہاتی علاقوں میں امداد باہمی کی مہم اور سیاسی بیداری کی وجہ سے سماجی تعلیم کی تحریک بتدریج زور پکڑتی گئی۔ تعلیم بالغان سماجی تعلیم کا ہی ایک جز ہے اس تحریک کا آغاز نائٹ اسکولوں اور لائبریریوں وغیرا کی تشکل میں ہوا۔ یہ ادارے کوآپریٹو ایجنسیوں کے زیر اہتمام چلائے گئے۔ بنگال اور بمبئی میں پہلی عالمگیر جنگ کے آغاز سے پیشتر ہی اس قسم کے اسکول کھل چکے تھے۔ میسور میں سنہ ۱۹۱۲ء میں ہی ان پڑھ دیہاتیوں کے فائدے کے لیے رات کے اسکول کھولے گئے تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں حکومت یو۔ پی نے ان پڑھ بالغوں کے لیے رات کے اسکول جاری کرنے کی غرض سے تمام میونسپل کمیٹیوں کو مالی امداد دینے کا فیصلا کیا۔ جہاں تک عام لوگوں کے مطالعے کے لیے لائبریریاں قایم کرنے کا تعلق ہے بڑودا میں سنہ ۱۹۱۱ء میں ہی پبلک لائبریریاں قایم کی جا چکی تھیں۔ اس سے چند سال بعد اس ریاست مذکور میں چلتی پھرتی لائبریریاں بھی قایم کی گئیں۔ اسی طرح سنہ ۱۹۳۵ء کے بعد ٹریونڈرم کی پبلک لائبریری کو ریاست کے مختلف دیہات میں قایم شدا لائبریریوں کے مرکز کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ ٹریونڈرم کی اس مرکزی لائبریری سے مختلف دیہاتی لائبریریوں کو ہر ماہ کتابیں مہیا کی جاتی ہیں۔ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر فوجی جوانوں کی واپسی کی وجہ سے لوگوں میں زیادا سیاسی بیداری آئی۔ کوآپریٹو تحریک کو تقویت ملی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں ہندستان میں صرف ۱۹۲۴ کوآپریٹو سوسائٹیاں کام کر رہی تھیں سنہ ۱۹۲۶ء میں ان کی تعداد ۸۰۱۸۲ تھی پنجاب میں جہاں یہ تحریک مقابلتاً زیادا ترقی کر چکی تھی سنہ ۱۹۲۲ء میں کوآپریٹو سوسائٹیوں کے زیر اہتمام ایک سو سے زیادا نائٹ اسکول چل رہے تھے۔

حصول آزادی کے بعد اس تحریک نے نیا انداز ور پکڑا سنہ ۱۹۴۸ء میں مرکزی مشاورتی تعلیمی بورڈ نے علاقائی ضروریات کی بنیادوں پر تعلیم بالغان کی مہم کی اسکیم مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی اس کی رو سے تعلیم بالغان سے متعلق حکومت کی پالیسی واضح

اور قطعی طور پر بدل دی گئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم بالغان کی مہم کو ان پڑھ بالغوں کو محض لکھنا پڑھنا سکھانے تک ہی محدود نہ رکھا جائے بلکہ انہیں شہریت حفظان صحت کے اصولوں، زراعت اور گھریلو دستکاریوں کے بارے میں بھی ضروری تعلیم دی جائے۔ کمیٹی نے اس امر کی سفارش بھی کی کہ لوگوں کو مذکورہ امور کی تعلیم دینے کے لیے بصری وسماعی طریقوں مثلاً فلموں، اور پوسٹروں وغیرہ کی نمائش اور نشری تقریروں سے کام لیا جائے۔ مرکزی وزارت تعلیم نے اس اسکیم کی بنیادوں پر سماجی تعلیم کو فروغ دینے کی ایک تجویز مرتب کی۔ یہ تجویز ۱۹۴۹ء میں ریاستی وزرائے تعلیم کی ایک کانفرنس میں منظور کی گئی۔ اور اسی سال کے آخر تک ہندوستان سرکار نے اس سلسلے میں ریاستی پلانوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مختلف ریاستی سرکاروں کو مجموعی طور پر ۶۰ لاکھ روپے کی امداد دی۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اس پلان کی تکمیل کے لیے نئے نئے طریقے اختیار کیے گئے مثال کے طور پر مغربی بنگال میں سفری تھیٹروں عوامی ناچوں اور بھجن منڈلیوں وغیرہ کے ذریعے یہ مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اتر پردیش میں سماجی تعلیم کو فروغ دینے کی غرض سے اٹاوا پروجیکٹ کی صورت میں ایک نیا تجربہ کیا گیا۔ سماجی تعلیم سے متعلق ضروری کتابیں وغیرہ شائع کرنے میں ریاست میسور سب سے پیش پیش رہی ہے۔ وہاں تعلیم بالغان کی ریاستی کونسل کناڈی زبان میں سب سے زیادہ کتابیں شائع کر رہی ہے دلی میں تعلیمی میلوں کا اہتمام کیا گیا ہے ان میلوں میں ایک سینما لاری دو چلتی پھرتی نمائشی لاریاں اور ڈرامے کی ایک نقل پذیر اسٹیج کے ذریعے لوگوں تک ضروری معلومات پہنچائی جاتی ہیں۔ یہ لاریاں ہمیشہ ریاست دلی کے مختلف دیہات کے دورے پر رہتی ہیں۔

۱۹۵۳ء کو ختم ہونے والے پانچ سال کے عرصے میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں تقریباً ۵۰ لاکھ بالغوں نے بنیادی سماجی تعلیم کی جماعتوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ مسلح افواج میں ۹ لاکھ ۵۳ ہزار افراد کو جو تعلیمی سرٹیفکیٹ جاری کیے گئے ہیں وہ اس تعداد کے علاوہ ہیں۔ سماجی تعلیم کے پروگرام میں لائبریریوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ۱۹۵۲ء میں بھارت کے مختلف حصوں میں لائبریریوں کی تعداد ۲۲ ہزار کے قریب تھی۔

تعلیم بالغان کے پروگرام کے سلسلے میں ہندوستان سرکار مختلف ذرائع استعمال کر رہی ہے جامعہ ملیہ کی وساطت سے بالغوں کے پڑھنے کے لیے سادہ اور آسان زبان میں کافی تعداد میں پمفلٹ شائع کیے گئے ہیں اور مرکزی سرکار ان پمفلٹوں کا علاقائی زبان میں ترجمہ شائع کرانے کے لیے ریاستی سرکاروں کو امداد بہم پہنچا رہی ہے۔ اگر پمفلٹوں وغیرہ کو مفت تقسیم کیا گیا تو بھارت سرکار ان کے اخراجات کے پچاس فی صد حصہ اور اگر انہیں قیمتاً فروخت کیا گیا تو ان کے اخراجات کا ۲۵ فی صدی حصہ برداشت کرے گی۔ ہندوستان سرکار اور فورڈ فاؤنڈیشن کے مشترکہ اہتمام میں ۱۹۵۳ء میں دلی میں ایک لٹریری ورکشاپ قائم کیا گیا۔ تھا جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے کارکنوں کو سماجی تعلیم سے متعلق پمفلٹ وغیرہ لکھنے کی تربیت دی گئی۔ اسی قسم کے آئندہ اور لٹریری ورکشاپ کھولنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ وزارت تعلیم نے ایک مرکزی فلم لائبریری قائم کی ہے جہاں سے فلمیں اور پوسٹر وغیرہ مختلف اداروں کو عاریتاً مہیا کیے جاتے ہیں۔ بمبئی میں تعلیمی فلمیں تیار کرنے کے لیے دو فلم یونٹ قائم کیے گئے ہیں۔ ۱۹۵۲ء میں یونیسکو کی امداد سے دلی اور میسور میں دو تحقیقی مجلسیں منعقد کی گئیں جن کا مدعا کارکنوں کو اس امر کی تربیت دینا تھا کہ سماجی وبصری طریقوں سے سماجی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے

جن چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے انہیں کم لاگت پر ملکی پیداوار سے تیار کرنے کے لیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔

اگست ۱۹۵۳ء میں مرکزی سرکار نے ریاستی سرکاروں کو اس امر سے مطلع کیا کہ وہ ۵۴-۱۹۵۳ء میں سماج تعلیم کے ۳ ہزار اور ۵۵-۱۹۵۴ء میں ۵ ہزار مراکز کے قیام میں مدد دینے کو تیار ہے۔

ان مراکز کے استادوں کی تنخواہوں کی پچاس فی صدی رقم مرکزی سرکار ادا کرے گی۔ اور یہ امداد مارچ ۱۹۵۶ء کے آخر تک دی جائے گی۔ ریاستوں نے اس تجویز کا گرمجوشی سے سواگت کیا ہے۔

ہندستان کی سماجی ترقی کی تاریخ میں اجتماعی ترقی کے منصوبوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ان کا مقصد ملک کے کسانوں کی معاشی و اخلاقی کو سدھارنا ہے۔ اسطرح ان کے پس پشت سماجی تعلیم کو فروغ دینے کا جذبا ہی کارفرما ہے۔ ہر منصوبے کے لیے عرصے تین سال کے لیے تقریبًا ۷ لاکھ روپے کی رقم منظور کی گئی ہے۔ اور اس رقم کا تقریبًا ۱/۴ حصا سماجی تعلیم کے پروگرام پر صرف کیا جائے گا۔ اجتماعی ترقی کے منصوبوں کے پروگرام کے تحت سماجی تعلیم کے آرگنائیزروں کی تربیت کے لیے ۵ مراکز قایم کیے گئے ہیں۔ ہر منصوبے کے دائرہ عمل میں سماجی تعلیم کے سات آرگنائیزر مقرر کیے جائیں گے۔ یہ پروگرام وسیع بنیادوں پر مرتب کیا گیا ہے اور اس کے مطابق ان پڑھ اشخاص کو نہ صرف پڑھنا لکھنا ہی سکھایا جائے گا بلکے گشتی لائبریریاں ڈراما کلبیں خواتین کی فلاح و بہبود کی کلبیں اور نوجوانوں کی کلبیں بھی قایم کی جائیں گی۔ اس کے علاوہ مختلف علاقوں میں کسانوں کے میلے منعقد کیے جائیں گے اور انہیں ضروری واقفیت مہیا کرنے کے لیے دوسرے ذرایع سے بھی کام لیا جائے گا۔

یاس و امید

حبیب عزیز (لکھنوی)

چمن میں چاروں طرف آج جو اداسی ہے
قبائے گل کی خزاں سے ہوئی ہے مجادری
نگاہ شوق میں باقی چمک ذرا سی ہے
پکارتا ہے فضاوں میں نالۂ سحری
—— کہاں ہے روشنی کہکشاں کی تابانی

سکوت آشنا سوسن چمن چمن خاموش
چمک ستاروں کی تاریکیوں میں کھوئی ہے
کلی کلی میں خموشی کی ہے جھلک دلکش
مرے خیال کی دنیا بھی آج سوئی ہے
—— کہاں ہے روشنی کہکشاں کی تابانی

بڑی امید محبت سے ہم لگائے تھے
نہ ایک صبح تمنا ہے اور نہ شام وطن
حبیب سوچ کے کیا کیا یہاں ہم آئے تھے
کدھر ہے زلف سیاہ اور کہاں رخ روشن
—— کہاں ہے روشنی کہکشاں کی تابانی

ہندستان اور ایران کے تعلقات

ڈاکٹر تاراچند

شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ تاریخ عالم میں ہندستان اور ایران کے مانند دو ملکوں کے لوگوں کے اس قدر قریبی تعلقات کی مثالیں خال خال ہی ملیں گی۔ ابتدائے تاریخ سے آج تک دونوں ملک تجارتی اور ثقافتی داد و ستد کے گہرے رشتے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ چلے آئے ہیں۔

پوربی ایران (بلوچستان، سیستان اور مکران) اتری ایران (دامغان) پچھمی ایران (سوسمانا۔فارس) اور ہندستان میں سندھ ستلج اور سرسوتی کی وادیوں میں آثار قدیمہ کی تلاش میں جو کھدائی کا کام ہوا ہے اس سے انتہائی قدیم زمانے کی ایسی یادگاریں برآمد ہوئی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ ان ملکوں کے مابین کافی وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ نقش و نگار والے برتن آویزے ابھرن، سیپ کے کام والی اشیا ہاتھی دانت کی چیزیں اور ہندستانی مناظر پیش کرنے والی پرستش و عبادت کی اشیا ایران میں اوپر تباہ ہوے مقامات پر بکھری ہوئی پائی گئی ہیں۔ چاول، سوتی کپڑا اور روزمرہ کی ضروریات کا مال بھی ایران میں درآمد ہوتا تھا۔ اور اس کے بدلے میں یہاں سے نیلم فیروزے اور عقیق جیسے جواہرات تانبا اور کانسی جیسی دھاتیں اور دھاتوں کے بارے میں علمی واقفیت ایران سے باہر جاتی تھی۔ اجناس میں سے جو اور گندم اور پھلوں میں سے آڑو، خوبانی اور شاید انگور کی کاشت کا علم بھی ایران سے ہی ہندستان آیا تھا۔

ثقافتی تعلقات

کئی صدیوں تک باہمی تبادلے کا یہ سلسلہ جاری رہا اس عرصے میں ہندستان اور ایران نے زمانے کے کئی انقلابات دیکھے۔ ایران اور ہندستان میں عالمگیر مذاہب نے جنم لیا اور عالمگیر سلطنتیں قایم ہوئیں۔ مختلف ملکوں اور لوگوں کے وسیع سیاسی نظاموں کے تحت پرامن طور پر اکٹھے رہنے سہنے سے تجارت اور سیر و سیاحت کو توسیع دینے کے لیے موافق اقتصادی اور مجلسی حالات پیدا ہوے۔ بہت سی قوموں کے بحری سیاحوں نے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی جانب سفر کیے۔ جہازوں کے ذریعے ہندستان سے سونا، سوتی اور ریشمی کپڑے، گرم مسالے، صندل وغیرہ کی خوشبودار لکڑی، ساگوان، روزمرہ کے استعمال اور آرایش و آسایش کی چیزیں بحری جہازوں کے ذریعے ایران جاتی تھیں جو وہاں سے دھاتیں خلیج فارس کے موتی اور ہیرے جواہرات ہندستان لے آتے تھے ان سب سے زیادہ بیش قیمت ایک اور تبادلہ بھی ان دونوں ملکوں کے مابین ہوتا رہا۔ یعنی علوم و فنون لطیفہ سائنس، فلسفہ اور مذہبی خیالات کا تبادلہ۔ اسلام کے پھیلاو سے ایران اور ہندستان کے تعلقات اور بھی زیادہ قریبی ہو گئے۔ اور سمندری رستوں کے علاوہ قافلوں کے ذریعے ہرات، کابل اور مشہد کے رستے، نیشاپور ہمدان اور تبریز وغیرہ ایرانی شہروں بلکہ ان سے بھی پرے کے علاقوں کے ساتھ ہندستان کا تجارتی تعلق قایم ہو گیا۔ ان قافلوں کے ساتھ علما۔ حکما۔ منجم۔ سنگیت کار، شاعر مصنف۔ مصور۔ معمار اور روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کو حسن و خوبی عطا کرنے والے دستکار لوگ بھی ایک سے دوسرے ملک کو آنے جانے لگے۔ ان لوگوں کی بدولت

علوم وفنون، دستکاریاں اور اخلاقی خیالات، قصے کہانیاں اور شعر و ادب ملکی حدود سے بے نیاز ہو گئے۔

زمانے نے کروٹ بدلی۔ اور ایشیا کا ستارا پچھمی سورج کے طلوع ہونے پر ماند پڑ گیا۔ انیسویں صدی میں ایران اور ہندستان کے لوگوں کے ثقافتی تعلقات کی رو مدھم پڑ گئی، لیکن بیسویں صدی کے شروع سے ایشیا کے لوگوں میں پھر بیداری کا ایک نیا جذبا پیدا ہوا اور آج وہ ترقی وخوشحالی کے ایک نئے دور کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

یکساں قسم کے مسایل

ہندستان اور ایران کو یکساں قسم کے مسایل درپیش ہیں۔ غربت بیماری اور جہالت ہم دونوں کے ملے جلے دشمن ہیں۔ ہمیں ان کا مقابلا کرنا ہے۔ ہماری مجلسی خمابیان بھی ایک جیسی ہیں۔ ہماری ضروریات اور مقاصد بھی ملے جلے ہیں۔ خوش قسمتی سے قدرت نے ایران کو زرعی اور معدنی دولت سے مالا مال کر رکھا ہے اس نے آگے بڑھنے، اپنی صنعتوں کو فروغ دینے اپنی زراعت کو جدید ترین معیار پر لانے اور اپنے شہریوں کا معیار زندگی بلند کرنے کا پکا ارادا کر رکھا ہے۔ ہندستان کو بھی ایسے ہی مواقع میسر ہیں۔ اور وہ بھی ایسی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس لیے ہمیں دونوں ملکوں کی بہبودی خوشحالی اور دولت کو فروغ دینے کے لیے نہ صرف اپنے قدیمی تعلقات کو از سر نو بحال کرنا چاہیے بلکہ ان سے بھی زیادا گہرے اور مضبوط تعلقات کو استوار کرنا چاہیے۔

ہندستانی زبان

اور ادب کی سیوا ہر ہندستانی پر فرض ہے

غزل

صابر (لکھنوی)

پہلے نمود خلق کا عنواں بنا دیا
پھر آب وگل سے پیکر انساں بنادیا

لطف وکرم سے بندۂ احساں بنادیا
جلوے نے اس کے صاحب عرفاں بنادیا

ساقی کی چشم مست نے کل کائنات کو
بس اک نظر میں بیخود و حیراں بنادیا

دنیائے رنگ وبو نے دکھائی وہ دلکشی
دلدادۂ بہار گلستاں بنادیا

جلوا دکھا کے یار نے اپنے جمال کا
مانند آئینا مجھے حیراں بنا دیا

تعمیر کائنات سے جو بچ رہی تھی خاک
جب کچھ نہ بن سکا دل انساں بنادیا

عذر جفائے یار نے مشق جفا کے بعد
اپنی نظر میں مجھکو پشیماں بنا دیا

دنیا بنانے والے کے قربان جائیے
سب کچھ بنادیا اگر انساں بنادیا

آزادیوں کے دور نے صابر یہ کیا کیا
اہل وطن کو قیدی زنداں بنادیا

انتقاد

"اقبال کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی"

ظفر عالمگیر بی۔ اے (عثمانیہ) ریسرچ اسکالر

(ایڈیٹر کا تنقید نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں)

میرا عقیدہ ہے کہ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین نہ ہوتے اور ہندستان میں بیسویں صدی میں کوئی پیغمبر جنم لیتا تو وہ دانائے راز حضرت اقبال ہوتے۔ لیکن آج اقبال کو اس کے حامی اور ہمدرد بدنام ہی نہیں کر رہے بلکہ اس کی شاعری کا ناس مارا جا رہا ہے۔ ہر فنکار ابھرنے کا جذبہ رکھتا ہے مشہور ہونا بھی چاہتا ہے لیکن بعض نوعمر فن کاروں نے عجیب راہ اختیار کی کہ کسی بڑے شاعر اور خصوصاً اقبال پر کوئی تنقید دے ماری جائے اور آسانی سے شہرت حاصل کی جائے۔ اقبال پر آج کل بہت زیادہ لکھا جا رہا ہے اور اکثر لکھنے والے اس عظیم فلسفی شاعر کے کلام کی روح تک پہنچنے کی زحمت گوارا کیے بغیر سطحی انداز میں چند خوش فہمیوں میں مبتلا ہو کر لکھ رہے ہیں۔ ان کی یہ ادائیاں نہ جانے اقبال پر ابھی کیا کیا ستم ڈھائیں گی۔ اقبال تنقید سے بالاتر ہیں، کبھی نہیں لیکن سطحی مطالعے کے سہارے تنقیدیں لکھ مارنا کہاں کا انصاف ہے!

اقبال کے شارحین میں جو مرتبہ رضی الدین، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر میر ولی الدین، نور الحسن ہاشمی اور دوسرے بعض اصحاب علم کو حاصل ہے وہ ہر کسی کے نصیب میں آنے سے رہا۔ بعض اصحاب نے اقبال پر ٹھوس پر مغز اور معنی آفریں مضامین بھی لکھے ہیں یا تنقیدیں کی ہیں۔ اور یہ تنقیدیں ہمارے انتقادی ادب کا سرمایہ ہیں۔ ان کو لکھنے کا سلیقہ اور اقبال کو سمجھنے کی صلاحیت حاصل ہے۔ آیندہ زمانوں میں بھی اقبال پر بہت کچھ لکھا جائے گا۔ تائید میں بھی مخالفت میں بھی۔ ہمارے دور میں بھی اقبال کے مخالفین خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ جن میں مرزا یگانہ چنگیزی اور حضرت جوش ملیح آبادی قابل ذکر بن چکے ہیں۔ ان کی مخالفت سنجیدگی کی حدود سے نکل کر گالی گلوج بن گئی ہے آئے دن وہ اپنے چھچھورے پن کے مظاہرے کر جاتے ہیں۔ یگانہ چنگیزی نے اقبال کو "مسلمانوں کا ایک نادان دوست اور بوگس شاعر" قرار دیا۔ کہا کہ "اس کے سر پر چوبیس گھنٹے اسلام کا بھوت سوار رہتا ہے۔" اقبال کو "پنجابی شیخ چلی" کے خطاب سے نوازا۔ اس کی اوندھی کھوپڑی کو لاعلاج گردانا۔ اقبال کے خدا کو "الّو کا پٹھا" ثابت کیا اور حد ہو گئی کہ مرزا یگانہ۔ بڑے ہی عظیم شاعر اور یکتائے روزگار فن کار نے فتویٰ صادر فرمایا کہ

جبریل و کلیم کا تماشا دیکھا
ذاتی کوئی جوہر نہ ذرا سا دیکھا
سنتے تھے اقبال بڑا شاعر ہے
دم اس کی اٹھا کے کیا کہیں کیا دیکھا

کاش یگانہ صاحب کبھی اپنی دم اٹھا کر دیکھ لیتے اور دوسرے جوش ملیح آبادی ہیں۔ جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ ان کے جنسی اختلال نے ان کی شاعری تباہ کر دی مستقبل کی بے پناہ وسعتوں کا سفر کرنے کے لیے چند نظموں کے سوا جوش کے پاس کیا دھرا ہے؟ ان کی شاعری سرمستی نہیں بلکہ بد مستی ہے خرمستی سے بغلگیر ہو رہی ہے وہ اقبال کی مخالفت کر رہی ہیں۔

اقبال کے مخالفین کے مقابلے ان کے شارحین اور ان

کے حامیوں کا گروہ ہے اور اس کو میں دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جس نے اقبال کے فلسفے کو سمجھنے کی واقعی زحمت اٹھائی ہے۔ اور اس گروہ کے اصحاب میں وہ صلاحیت علمیت اور سلیقہ ہے کہ وہ اقبال کو سمجھ سکتے ہیں۔ اور سمجھا سکتے ہیں۔ تنقید کرتے ہیں تو ان کی تنقید وزن رکھتی ہے بے بنیاد بے سرو پا اور اوٹ پٹانگ نہیں ہوتی۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے اقبال کو شروع ہی سے غلط سمجھا اگرچہ کہ وہ اقبال کا حامی ہے لیکن یہ حمایت اقبال پر ستم ہے اس گروہ میں پرانے اور پختہ مشق فن کار بھی ہیں اور نئے بھی ہیں نئے فن کاروں نے لکھا تو شہرت کی خاطر اور پرانے فن کاروں نے لکھا تو اپنی علمیت کی ڈھاک بٹھلانے کے لیے!

حال ہی میں عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ مذہب و تمدن پروفیسر ڈاکٹر ظہیر الدین الہامی کی تصنیف "اقبال کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی"۔ منظر عام پر آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ۲۳۰ صفحات پر مشتمل اپنی اس کتاب کو جس مقصد کے پیش نظر لکھا ہے اور اقبال کے فلسفہ اور تعلیمات کی شرح کی ہے وہ ان ہی کی زبانی یہ ہے کہ—

"ایک تنقیدی اور تحلیلی بحث جس میں عارف اقبال کے آدم گرانہ شعر کی حیثیت اور پیامبرانہ کلام کی اہمیت کو نمایاں کیا گیا۔ اور کوشش کی گئی ہے کہ اس بزرگ تر دانائے راز کے ہمہ گیر فلسفہ کی دراست کے لیے مقدمہ کا کام دے سکے"۔

اگر بلا کسی رعایت کے تنقید کی جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تصنیف اس مقصد کی آئینہ دار نہیں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ کہانی زیادہ تر "ان کی زبانی" ہے لیکن دراصل یہ کہانی محض "میری زبانی" بن کر رہ گئی ہے۔ —— ڈاکٹر صاحب کو اس گروہ میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ جس نے اقبال کو واقعی سمجھا ہے۔ اقبال کو ڈاکٹر صاحب کس حد تک سمجھتے ہیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ "آدم گرانہ شعر اور پیامبرانہ کلام اور ہمہ گیر فلسفہ" کے خالق "عارف اقبال" اور "بزرگ تر دانائے راز" کا رومی سے یہ تعلق بتلاتے ہیں کہ رومی کی غلامی نے اقبال کو شاعری کے اس مقام تک پہنچایا۔ اور دوسری جانب ڈاکٹر صاحب اتاترک کو رومی کی تعلیمات کا مجسم اور پیکر قرار دیتے ہیں کہاں اتاترک! کہاں رومی! کہاں اقبال؟

ایک جانب ڈاکٹر صاحب اقبال کو "عارف" "بزرگ تر دانائے راز" "آدم گرانہ شعر اور پیامبرانہ کلام" اور "ہمہ گیر فلسفہ" کا خالق کہتے ہیں۔ اور پھر اسی اقبال کو رومی کا غلام بتلاتے ہیں۔ اسی طرح اقبال کی غلامی رومی کی غیر معمولی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔ جس کا غلام اس قدر عظیم فلسفی شاعر ہو۔ وہ خود کتنا عظیم شاعر نہ ہوگا۔

دوسری جانب رومی کی غیر معمولی عظیم تعلیمات کا مجسم ڈاکٹر صاحب نے اتاترک کو قرار دے ڈالا۔ اگر اتاترک کو پیش نظر رکھیں تو رومی کی تعلیمات لوچ اور ان کی عظمت مشکوک اور اقبال کو بزرگ تر دانائے راز کہنا بے معنی۔ —— اگر اقبال اور رومی کو پیش نظر رکھیں تو اتاترک کا وہاں کیا رشتہ؟

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے "رومی کی غلامی" کو اقبال کی بلندی کا سبب ٹھہرایا ہے۔ لیکن "غلامی" کا مفہوم کیا لیا گیا۔ اس پر کوئی حاشیہ یا فٹ نوٹ ہوتا تو بہتر تھا جو موجود نہیں۔ بہتر ہوتا کہ غلامی کا مفہوم سمجھا دیا جاتا ورنہ یوں تو اقبال کے تعلق سے غلامی کا لفظ گراں گذرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کتاب حال میں لکھی ہے اور انداز بیاں خطیبانہ اور پچھلے دور کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی اس دور کی یادگار کہا جا سکتا ہے۔ خطیبانہ انداز کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے عجیب عجیب سی ترکیبیں استعمال کی ہیں۔ اور ان میں سے بعض تو سامعہ پر بار گذرتی ہیں۔

اقبال پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے غیر مانوس الفاظ اور عربی اور فارسی ترکیبیں استعمال کی ہیں ایسا ہی اعتراض ہمارے دور کے مشہور ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد نے اردو قصیدہ گو شعرا پر کیا تھا۔ لیکن یہ اعتراض بے بنیاد ہیں۔ اقبال جس دور کے شاعر ہیں اردو ہندستان کی عام زبان ہونے کے باوجود عربی اور فارسی سے بہت قریب تھی۔ جو الفاظ آج ہم کو غیر مانوس دقیق اور مشکل نظر آتے ہیں وہ اقبال کے دور میں عام طور پر بولے اور سمجھے جاتے تھے۔ تعلیم کی ابتدا عربی اور فارسی سے ہوتی تھی سعدی کی گلستاں اور بوستاں عام طور پر پڑھائی جاتی ہمارے بزرگ جو اس دور کی یادگار ہیں عربی اور فارسی خوب جانتے ہیں لیکن ہم جدید نظام تعلیم کی بنا پر نہیں جانتے۔ اقبال نے اپنے دور کی زبان استعمال کی ہے اقبال شاعری کی دنیا کا پیغمبر تھا۔ نجومی نہ تھا کہ زائچہ کھینچتا اور معلوم کرتا کہ آیندہ زمانے میں کون سے الفاظ استعمال ہونے لگیں گے اور ان الفاظ کو خود بھی استعمال کرتا۔ جو لوگ اقبال پر اس قسم کا اعتراض کرتے ہیں وہ میر تقی میرا اور ولی۔ امیر خسرو وغیرہ کے متعلق کیا فرمائیں گے انہوں نے بھی اپنے دور کی اردو زبان میں شاعری کی اور اس دھوم دھام سے کہ زندہ جاوید بنے۔

اپنے دور کی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار ہوتا آیا ہے لیکن گذرے ہوے زمانے کے انداز اور رجحان کے مطابق ہمارے زمانے میں وہی زبان استعمال کرنا جس کے الفاظ کو غیر مانوس سمجھا جاتا ہو۔ اور دقیق کہا جاتا ہو درست نہیں ہمارے زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے زمانے کی زبان استعمال کی ہے جو قابل گرفت ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کتاب اردو میں لکھی ہے لیکن کوئی ۱۱۳ اشعار میں سے جو کتاب میں درج ہیں ۹۶ اشعار فارسی ہیں جن کو سمجھنے کی صلاحیت آج ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب میں بھی اس لیے نہیں پائی جاتی کہ انہوں نے فارسی نہیں پڑھی اور بچپن میں پڑھی بھی ہو تو اقبال کے فارسی کلام کو سمجھنے میں مدد نہیں دے سکتی۔ ان اشعار کا ترجمہ درج کیا جاتا تو پڑھنے والوں کو آسانی ہوتی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب کو اپنے پڑھنے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے ورنہ دقیق زبان اور عجیب و غریب ترکیبیں وہ اس قدر کشادہ دلی سے استعمال نہ کرتے۔ فارسی اشعار کو ترجمہ کے بغیر ٹھونس مارنے۔ یوں بھی اشعار کی تشریح کرتے ہوے ڈاکٹر صاحب کا قلم لڑکھڑایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اگر چاہتے تو سلیس زبان میں بہتر طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے لیکن اپنی پسند اور مرضی یہی تو وہ جذبہ تھا جس نے غالب سے کہلوایا تھا۔

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

ڈاکٹر صاحب مدعی ہیں کہ اقبال کے شارحین نے اقبال کو سمجھا تک نہیں۔ اس دعوے کی ایک کڑی ابتدائی باتوں میں بھی ملتی ہے کہ "اقبال کے شارحین اس کے پیام کی روح تک نہ پہنچ سکے اور اس کے عالمگیر پیام کو زمان و مکان سے مقید اور ایک خاص طبقہ تک محدود کر کے رکھ دیا۔" اگر ڈاکٹر صاحب بات پوری وضاحت سے کہتے تو بات بھی تھی۔ اپنے دعوے کا ثبوت پیش کرنا چاہیے تھا یا کم سے کم ایسے شارحین کی فہرست شائع کی ہوتی تو ہمیں یہ جاننے میں مدد ملتی کہ ان شارحین نے اقبال کے پیام کو مقید اور محدود کر دیا۔ یا ڈاکٹر صاحب ان کو سمجھ نہ سکے۔ اور الزام دے چلے۔ اقبال کے سارے شارحین نے ایسا نہیں کیا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان شارحین پر برس پڑنے کی کوشش کی ہے اور بڑے سخت لہجے میں۔

ڈاکٹر صاحب کے اس دعوے کو میں احساس برتری سے تعبیر کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب خود اپنی تصنیف میں اقبال کے فلسفے کو آسان فہم بنانے کی بجاے اتنا الجھا گئے کہ وہ کہاں

خو: اس قدر دقیق نہیں جتنی ڈاکٹر صاحب کی شرح یا ان کے الفاظ میں "ہمہ گیر فلسفہ کی دراست کے لیے مقدمہ۔"

قابل اعتراض یہ نہیں کہ دوسرے شارحین کے متعلق ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر جداگانہ ہے یہ اپنی اپنی فکر اور "فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست" ہی ہوا کرتی ہے۔ لیکن بجائے خود ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر دھندلا سا ہے اور اس غبار میں چھپا ہوا ہے جو انہوں نے دوسرے شارحین پر اڑایا ہے اس علمی اور فلسفیانہ تخلیق کی وسعتوں میں یہ گرد و غبار ناقد کو ڈاکٹر صاحب کے قلم سے بدظن کرتا ہے۔

اگر آپ دوسرے کے عیب نکالیں اور اپنے کام کو سراہیں تو دوسروں کو واقعی عیب نہیں لگ جاتا۔ اور آپ کا کام قابل تعریف نہیں ہو پاتا۔ ناقد تو خیر اس دھوکے میں آ ہی نہیں سکتا۔ عوام بھی اب تو اتنا شعور رکھتے ہیں کہ اچھے اور برے کی بہ آسانی تمیز کر لیتے ہیں۔ عوام کا احتساب ایک ناقد کے احتساب سے کہیں کڑا ہوتا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب نے دوسرے شارحین کو ٹوکا ہے تو ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کی تصنیف سے یہ خوش فہمی کسی نے وابستہ کی ہو تو ہو کہ واقعی یہ عظیم تر تصنیف ہے ورنہ گہری لگا ہ شور و غل کو تاڑ لیتی ہے۔ خواہ کتنی ہی سنجیدگی کے لباس میں ہو۔

اس تصنیف کو میں عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ کی تصنیف قرار دینے کے لیے جھجکتا ہوں۔ جیسے وہاں کے لکچراروں اور پروفیسروں کی تصانیف نے ساری دنیا میں ہنگامے برپا کیے۔ اور اس یونیورسٹی کا لوہا منوایا۔ خصوصاً رضی الدین، یوسف الدین اور ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہ

اگر آپ کی
مدت خریداری ختم ہوگئی ہے تو کرپا کر کے چندہ منی آرڈر کر دیجیے وی۔ پی کی شکل میں خرچ زیادہ بیٹھے گا۔

انجنیروں کیلیے وظیفے

ان دنوں برطانیا کی انجنیرنگ فرموں اور برطانیا کی قومی صنعتوں میں دولت مشترکہ اور دوسرے ممالک کے ڈگری یافتہ نوجوان انجنیروں کو اعلا فنی تربیت دی جا رہی ہے اس تربیت کی مدد سے وہ اپنے اپنے ملک کی ترقیاتی اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے میں بہت معاون ثابت ہوں گے۔

یہ نوجوان برطانوی صنعتوں کی فیڈریشن (الیف۔ بی۔ آئی) کی اسکالرشپ اسکیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جو اس نے سمندر پار کے طلبا کے لیے مرتب کی ہے اس اسکیم کا مقصد سمندر پار کے ایسے نوجوان انجنیروں کو تربیت دینا ہے جن کا تعلق الکٹرک پاور۔ پانی کی سپلائی۔ ٹرانسپورٹ آبپاشی کان کنی اور دوسری بنیادی صنعتوں سے ہے۔

یہ اسکیم سنہ ۵۰ء میں شروع کی گئی تھی۔ اور اس وقت ایسے چند بڑے کامن ویلتھ ممالک تک محدود رکھا گیا تھا سنہ ۵۲ء میں الف۔ بی۔ آئی کی وظیفہ کمیٹی کے چیرمین سر آرتھر فلیمنگ کی قیادت میں ایک مشن لاطینی امریکا گیا تھا اور اس کے دورے کا یہ نتیجہ نکلا تھا کہ وہاں کی بڑی بڑی ریپبلکوں مثلاً ارجنٹاین۔ کیوبا۔ میکسیکو وغیرہ کے نوجوان انجنیروں کو اس اسکیم کے تحت وظیفوں کی پیش کش کی گئی تھی۔ لاطینی امریکا کے انجنیر اب برطانیا میں اس اسکیم سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ دولت مشترکہ کے ممالک میں سے آسٹریلیا ہندستان اور پاکستان کے تربیت یاب ان وظیفوں پر برطانیا میں تربیت حاصل کر رہے ہیں اب یہ اسکیم دولت مشترکہ کے دوسرے ممالک عراق اور مشرق وسطی کے دوسرے ممالک تک بڑھائی جا رہی ہے۔

پریزیڈنٹ ٹیٹو

مارشل ٹیٹو ایک غریب کسان کے گھر ۱۸۹۲ء میں کروشیا کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئے۔ کروشیا یورپ کی آسٹریا ہنگری سلطنت کا ایک حصہ تھا یہ سلطنت بذات خود غلط زمانی کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ اس کا نظام اور اقتصادیات جاگیردارانہ تھیں لیکن یہ سارے یورپ میں نہایت بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی تھی۔ سلاوزیک۔ رومانوی۔ اور پولی لوگوں پر اس کی حکمرانی کا سکا چلتا تھا۔

سماج وادی تحریک سے دلچسپی

بچپن میں اسے جوزف بروز کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اپنے گاؤں میں ہی ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد جوزف ہوٹل میں ملازمت کا کام سیکھنے کے لیے سیاک نامی ایک نزدیکی قصبے میں چلا گیا۔ لیکن ہوٹل میں بہرے کے کام اور برتن صاف کرنے سے اکتا کر اس نے ایک تالا ساز کی ورکشاپ میں شاگردی اختیار کر لی۔ اس جگہ شاگردی کرنے کے دنوں میں اس نے پہلی بار یوم مئی۔ ٹریڈ یونین تحریک اور ان اصولوں کی اہمیت سے آگاہی حاصل کی جن کے لیے سوشل ڈیموکریٹ جد و جہد کر رہے تھے۔ شاگردی کا کورس مکمل کرنے کے بعد نوجوان جوزف ملازمت کی تلاش میں نکلا وہ اس جستجو میں بوہیمیا۔ جرمنی۔ ٹریسٹ اور آسٹریا گیا۔ ان مسافتوں کے دوران اس نے جرمن زبان سیکھ لی۔ اور ان ملکوں کی سماج وادی اور ٹریڈ یونین تحریکوں کا مطالعہ کیا جو وہ آسٹریا میں تھا تو اسے فوجی خدمات کے لیے طلب کر لیا گیا پہلی عالمگیر جنگ میں جوزف بروز آسٹروی فوج کا ایک سپاہی تھا۔ وہ لڑائی میں زخمی ہو گیا۔ اور روسیوں نے اسے قیدی بنا لیا۔ روس میں اس نے کئی طرح کے جان جوکھوں کے کام سر انجام دیے۔ وہ روس کے انقلاب کا شاہد بنا۔ اور وہ ان لوگوں میں شامل تھا جو سب سے پہلے انٹرنیشنل ریڈ گارڈ (بین قومی سرخ فوج) میں بھرتی ہوئے تھے۔

کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت

جنگ کے بعد یورپ کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ اکثر ملکوں کی کلیتاً نئی حد بندیاں ہوئیں۔ جنوبی سلاویا ایک واحد ریاست کی شکل اختیار کر گیا اور یوگوسلاویا مملکت عالم وجود میں آئی۔ لیکن یوگوسلاویا کے نام سے جو ملک اس طرح قائم ہوا وہ کسی طرح بھی اس یوگوسلاویا سے مطابقت نہ رکھتا تھا جس کا نقشہ عوام کے ذہن میں تھا۔ ضروریات زندگی کی اشیا کے نرخ آسمان پر پہنچے ہوئے تھے۔ ایسی کھلبلی کے دور میں یوگوسلاویا کی کمیونسٹ پارٹی نے جنم لیا جوزف بروز نے انقلاب کے نظارے سے جو تاثر حاصل کیا تھا اس کی اکساہٹ پر وہ سیاسیات میں شامل ہو گیا۔ غیر معین زندگی بسر کرتے ہوئے وہ ٹریڈ یونین اور پارٹی کی تنظیم میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔ ۱۹۲۸ء میں اس پر مقدمہ چلا اور اسے پانچ برس قید کی سزا ہوئی۔

سپین کی خانہ جنگی اور ٹیٹو

جیل سے رہائی حاصل ہونے پر وہ ماسکو چلا گیا۔ انہی دنوں اس نے ٹیٹو نام اختیار کر لیا۔ ماسکو میں قیام کے دوران اسے وہ کتابیں دستیاب ہوئیں جو اسے یوگوسلاویا میں حاصل نہ ہو سکیں تھیں اس نے وسیع مطالعہ کیا اور یوگوسلاویا ریاست ہائے بلقان اور سماج وادی تحریک سے متعلقہ مسائل پر دماغ سوزی کی اس کے بعد وہ فرانس چلا آیا۔ جہاں اسے ہسپانیہ کی خانہ

جنگ میں شمولیت کے لیے یوگوسلاوی والنٹروں کی تنظیم کا انچارج مقرر کیا گیا۔ اسپین کی جنگ میں جن والنٹروں نے حصہ لیا اس کے بعد ان میں سے بہت سے والنٹروں نے یوگوسلاویا کی جنگ آزادی میں اپنے جوہر دکھائے۔

ٹیٹو کی دور اندیشی

۱۹۳۷ء میں ٹیٹو کو یوگوسلاوی کمیونسٹ پارٹی کا عارضی سکریٹری مقرر کیا گیا اور اس نے پارٹی کی از سر نو تنظیم کا کام شروع کیا۔ ٹیٹو نے یہ اصول بنا دیا کہ پارٹی کی لیڈرشپ ملک کے اندر ہی رہے اور اس کے جماعت کے تمام لوگوں کے ساتھ مسلسل گہرے تعلقات قایم رہیں اس لئے اس امر پر بھی زور دیا کہ ان کی پارٹی اپنے پاؤں پر خود کھڑی ہو۔ اور وہ بیرونی امداد پر تکیہ نہ ہو۔ افسروں کا انتخاب کرتے وقت وہ عہدوں کے متلاشی لوگوں سے محتاط رہتا تھا۔ اور پارٹی کے ممبروں کو ذمے دارانا کام سپرد کرنے میں اس کا فیصلا کبھی غلط ثابت نہیں ہوا تھا وہ جانتا تھا کہ دنیا میں دوسری عالمگیر جنگ ضرور ہوگی۔ یوگوسلاویا کی پرانی حکومت چکنا چور ہو جائے گی اور کمیونسٹ اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کی رہنمائی کریں گے۔

مسند اقتدار پر

جب دوسری عالمگیر جنگ ختم ہوئی تو یوگوسلاویا میں نئی حکومت عالم وجود میں آئی کہ جس کی عنان اختیار ٹیٹو کے ہاتھ میں تھی۔ جنگ کے دوران بہت دوررس سیاسی اور اقتصادی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ یوگوسلاویا کے لیڈروں نے ملک کے اقتصادی اور سیاسی نظام کو یکسر بدل دینے کا تہیا کر لیا۔ صنعتوں اور بنک وغیرا کو قومی ملکیت قرار دیدیا گیا بنیادی زرعی اصلاحات نافذ کی گئیں پہلی بار ملک کو اور وسیع پیمانے پر صنعتی بنانے کا منصوبا زیر عمل لایا گیا۔

۱۹۴۵ء میں نیا آئین نافذ ہونے پر مارشل ٹیٹو یوگوسلاویا کی فیڈرل ری پبلک کا پردھان منتری بنا اور ۱۹۵۲ء تک وہ اس عہدے پر فایز رہا۔ یکم جنوری ۱۹۵۳ء کی وہ ری پبلک کا صدر منتخب کیا گیا اور اس کے بعد ۲۹ جنوری ۱۹۵۴ء کو فیڈرل اسمبلی کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں اسے پھر سے ری پبلک کا صدر چنا گیا۔

برطانوی یونیورسٹیوں میں دولت مشترکا کے طلبا

پچھلی چوتھائی صدی کے دوران برطانوی یونیورسٹیوں میں دولت مشترکا اور سمندر پار کے برطانوی علاقوں کے طلبا کی تعداد دھیرے دھیرے بڑھتی رہی ہے ۱۹۳۷ء میں دولت مشترکا اور برطانوی نوآبادیات کے طلبا کی تعداد ۲۵۱۸ تھی اور ۵۲-۵۳ میں یہ تعداد ۲۶۹۰ تک پہنچ گئی تھی۔ اسی عرصے کے دوران دوسرے ملکوں کے طلبا کی تعداد ۱۲۹۱ سے ۲۷۶۵ ہو گئی تھی۔ یہ اعداد و شمار فل ٹائم طلبا سے متعلق ہیں پارٹ ٹائم طلبا کی تعداد ۳۷-۳۸ میں ۱۶۰۰ تھی اور ۵۲-۵۳ میں ۳۰۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔

دولت مشترکا اور خاص کر ہندستان اور پاکستان میں یونیورسٹیوں اور یونیورسٹی کالجوں کی ترقی کے نتیجے کے طور پر مستقبل میں ان ملکوں کے طلبا کی تعداد برطانوی یونیورسٹیوں میں کم ہو سکتی ہے۔ ملایا۔ گولڈ کوسٹ، مشرقی افریقا نائیجیریا وغیرا میں بھی یونیورسٹی اداروں کی تعداد بڑھ رہی ہے نوآبادیاتی طلبا کی تعداد برطانوی یونیورسٹیوں میں بہت تھوڑی ہے یعنی دو فیصد کے قریب لیکن ان کی تعداد میں بھی اضافا ہوتا رہا ہے ۱۹۳۹ء میں نوآبادیاتی طلبا کی تعداد ۴۰۰ کے قریب تھی۔ اور ۱۹۵۲-۵۳ء تک یہ تعداد ۲۲۵۰ تک پہنچ گئی تھی ان کی تعداد ۲۵ فی سال کی رفتار سے بڑھتی رہی ہے

- - - - - - - - -

لینن ریاستی لائبریری میں ہندستانی ادب کا ذخیرہ

پ۔ یوگا چیف (ڈائرکٹر لینن ریاستی لائبریری)

روزانا پانچ ہزار آدمی لینن ریاستی لائبریری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان میں سائنس داں انجینر اسکول ماسٹر کارخانے کے مزدور ماہرین زراعت، پنچایتی کسان دفتروں کے کارکن کالج کے طلبا اور اسکول کے بچے شامل ہیں۔ ان کی بہت سی فرمائشوں میں بیرونی ادب کی فرمائش بھی شامل ہے پچھلے سال۔ لائبریری کے خاص ذخیرے میں سے ۴ ہزار بیرونی کتابیں اور رسالے اور تین ہزار بیرونی اخباروں کی جلدیں جاری کی گئیں۔ لائبریری کی طرف سے بیرونی ادب کا ایک خبرنامہ جاری کیا جاتا ہے اگر مطلوبا کتاب ہماری لائبریری میں بر وقت موجود نہ ہو تو اس صورت میں وہ کتاب ملک کی کسی بھی لائبریری سے پڑھنے والے کے لیے بآسانی حاصل کی جا سکتی ہے

اس وقت لینن لائبریری میں بیرونی کتابوں کی بیس لاکھ سے زاید جلدیں موجود ہیں ان میں ہندستان کے عظیم ترین سیاست دانوں، سائنس دانوں اور ادیبوں کی تصانیف شامل ہیں۔ ہندستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی تحریریں جو ۱۹۴۲ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان شایع ہوئی ہیں۔ ایک ممتاز درجا رکھتی ہیں۔ ان میں ان کے مضامین اور تقریروں کا انتخاب۔ گاندھی سے متعلق نہرو کے خیالات تاریخ عالم کی جھلکیاں "آزادی کی طرف" "ہندستان کا اتحاد" مہاتما گاندھی امریکا کی سیر اور بہت سی دوسری کتابیں شامل ہیں۔

قدرتی سائنس، معاشیات، لسانیات وغیرہ سے متعلق ممتاز ہندستانی سائنس دانوں کی تصانیف لائبریری میں موجود ہیں۔ ان میں د۔ ن۔ واڈیا کی کتاب "ہندستان کی ارضیاتی ساخت" م۔ س۔ کرشنن کی تصنیف "ہندستان اور برما کی ارضیاتی ساخت" "ستاروں کی حرکت کے اصول اور نقل لاشعاعی"۔ قومی آمدنی پر پ۔ چ۔ مہالنوبس کی بہت سی تصانیف گ۔ ب جاتھر اور س گ۔ بیری کی۔ "ہندستانی اقتصادیات" اور ج۔ ک وکیل اور ا۔ مکرجی کی اقتصادیات سے متعلق دوسری تصانیف شامل ہیں۔

سنسکرت کی ساری قدیم تصانیف لینن لائبریری کی زینت ہیں ان میں ہندستانی ادب کی قدیم یادگاریں محفوظ ہیں مثلاً "مہابھارت" اور "رامائن" جیسی منظوم تصانیف جن کی کئی کئی جلدیں اس لائبریری میں دستیاب ہیں۔

ہندستانی زبان میں پریم چند کی تمام تصانیف اور بنگالی زبان میں رابندرناتھ ٹیگور کی تمام تصانیف اور اس شاعر کی ادبی خدمات سے متعلق تمام ادب اس لائبریری میں موجود ہے۔ یہاں یشپال او رانک کی تمام تصانیف لائبریری کے ادبی ذخیرے میں شامل ہے ان کے علاوہ امرت رائے شیام سندر رام بلاس شرما اور بہت سے دوسرے ادیبوں کی تصانیف بھی یہاں موجود ہیں۔

سوویت عوام کو ہندستان کے افسانوی اور شعری ادب سے بڑی گہری دلچسپی ہے۔ سوویت یونین میں ہندستانی مصنفوں کی کتابوں کے ترجمے اڈیشنوں کی بڑی بڑی تعداد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کتابیں یہاں کتنی مقبول عام

ہیں۔ مثال کے طور پر ملک راج آنند کی کتاب "قلی" کا ایک ایڈیشن پچاس ہزار جلدوں کی تعداد میں شایع ہوئی۔ کرشن چندر کی کہانیوں کا ایک ایڈیشن ۳ لاکھ چالیس ہزار کی تعداد میں شایع ہوا۔

لینن لائبریری میں آنے والوں کو ہندستان میں شایع ہونے والے رسایل و جراید کے مطالعے کا موقع ملتا ہے۔

اس سال لائبریری نے ہندستان کے ۱۹۶ اخباروں اور رسالوں کی خریداری قبول کی۔ اس کے علاوہ لائبریری کو کتابوں کے تبادلے کی بین قومی تنظیم کی معرفت ہندستان کے سائنسی اور ادبی اداروں اور انجمنوں سے کتابیں اور رسالے موصول ہوئے ہیں۔

لینن لائبریری پرائیویٹ پانچ سو بیرونی تنظیموں سے جن میں ہندستانی تنظیمیں بھی شامل ہیں مطبوعات کا تبادلہ کرتی ہے۔ مطبوعات کا تبادلہ اکادیمیوں، بڑی بڑی یونیورسٹیوں تحقیقاتی اداروں، سائنسی تنظیموں، انجمنوں لائبریریوں بڑے بڑے رسالوں، عجائب گھروں اور دوسرے سائنسی اداروں سے کیا جاتا ہے۔

رائل انڈیا سوسائٹی

یہ سوسائٹی سنہ ۱۹۱۰ء میں بعض آرٹسٹوں اور ادیبوں نے قایم کی تھی۔ ڈبلو۔ بی ییٹس، رابندر ناتھ ٹیگور اور آنند کمار سوامی کے اس سوسائٹی کے ساتھ تعلقات قایم تھے۔ ٹیگور کی مشہور کتاب گیتانجلی کا پہلا ایڈیشن اسی سوسائٹی نے شایع کیا تھا۔ سنہ ۳۴ء میں اس انجمن نے لندن میں جدید ہندستانی آرٹ کی پہلی نمایش منعقد کی تھی۔ اس سوسائٹی کی جانب سے لندن میں گورنمنٹ کالج آف آرٹ کلکتہ کے مسٹر ایس این گھوسل کی بنائی ہوئی آرٹ کی ایک نمایش منعقد کی گئی تھی۔

نوجوان فن کاروں کے لیے ثقافتی وظیفے

ہمت افزائی کے خیال سے ہندستان سرکار نے ۱۹۵۴ء میں ایک اسکیم منظور کی تھی جس کی رو سے سو سے زیادہ وظیفے ایسے نوجوان فن کاروں کو دیے جائیں گے جنھوں نے ادبیات کو چھوڑ کر فنون لطیفہ موسیقی۔ رقص، ڈراما اور فلموں وغیرہ جیسے مختلف تمدنی اور ثقافتی شعبوں میں بنیادی تربیت حاصل کر لی ہے اور نمایاں صلاحیت اور ہونہاری کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔

حال ہی میں ۹۴ امیدواروں کے ناموں کا اعلان کیا گیا تھا جن کا انتخاب عمل میں آ چکا ہے۔

ان وظیفوں کے مستحق ایسے ہندستانی باشندے ہوں گے جن کی عمر ۱۸ سال سے کم اور ۳۵ سال سے زیادہ نہیں ہے اور جو کافی عام معلومات کے ساتھ ساتھ اپنے فن میں نمایاں صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ وظیفے کے لیے امیدواروں کا انتخاب مرکزی وزارت تعلیم ایک انتخابی کمیٹی کی مدد سے کرے گی انتخاب کے بعد وظیفہ فن کار کو ہندستان میں کسی مانے ہوئے ادارے میں یا کسی مانے ہوئے ماہر فن کے تحت کام کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ادارے وغیرہ منتخب کرنے کا اختیار وظیفہ پانے والے فن کار کو ہوگا۔ مگر اس کے لیے ہندستانی سرکار کی منظوری لازمی ہوگی ہر وظیفہ ڈھائی سو روپے ماہانہ کا ہوگا۔ مدت عموماً دو سال ہوگی۔

فارسی زبان کا مطالعا

عبدالرحمٰن خان

جدید فارسی کا آغاز سامانی اور غزنوی بادشاہوں کی عدالتی زبان کی حیثیت سے ہوا۔ اس کے بعد ایران کے ایل خان اور ہندستان میں مغل شہنشاہوں کی عدالتی زبان رہی فارسی کئی دوسرے ملکوں مثلاً ترکی مشرقی ترکستان اور افغانستان کی ثقافتی زبان رہ چکی ہے۔ اگر قوم پرستی کا غلط اور تعصب آمیز رجحان سدراہ نہ ہو تو اس زبان کی مقبولیت بدستور نسلاً بعد نسلٍ قایم رہے گی۔ چین سے لے کر پولینڈ اور ہنگری تک متعدد قوموں، ملکوں اور فرقوں کے لاکھوں ہی لوگ اسے سمجھتے بولتے اور پڑھتے لکھتے رہے ہیں۔ بڑے بڑے علما اور فضلا کی پرانی فارسی کتابوں اور قلمی نسخوں کی تلاش میں ایشیا اور یورپ کے متعدد اسکالر اور پرتنا کے ملکوں میں سرگرداں رہے۔ پرانی کتابوں اور مسودوں کا خزانا بھولی بسری لائبریریوں میں لوگوں کی نظروں سے اوجھل دبا پڑا تھا۔ فارسی کی تحقیق اور تدقیق کے سلسلے میں جن مشہور یورپین علما اور فضلا نے بیش قیمت خدمات سر انجام دیں ان میں لوڈبک جیولس موہل روگرٹ ایتھے، وارنر ای۔ جی براؤن، نکلسن اور سرای ڈینیسن راس وغیرا شامل ہیں۔

فارسی کی غزل گوئی سحر میں غنائیت سحر آفریں۔ اسلوب بیان انوکھی تشبیہات و استعارات کا خاص اہتمام ہوتا ہے۔ دل و دماغ دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نظم کی یہ شاخ پوری دنیا میں مقبول تھی۔ فارسی کے قصاید ترک ترکمان اور مغل حکمرانوں سے خراج تحسین حاصل کرتے اور قصیدا گو شاعروں پر انعام و اکرام کی بارش ہوتی۔

فارسی نظم و نثر کی مستند اور معیاری کتابیں دنیا بھر کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ اس میں کسی ملک، طبقے اور فرقے کی تخصیص نہیں ہے۔ ہندستان کے مسلمان تو اسے تقریباً مذہبی جذبے کے ساتھ پڑھتے۔ ہندوؤں کے وسیع القلب اور علم دوست فرقوں کے افراد کے لیے فارسی خاص پسند کی چیز تھی۔ ان میں پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے کئی مضمون نگار اور شاعر بھی ہوئے ہیں۔

حیدرآباد کے مرحوم مہاراجا سر کشن پرشاد فارسی شاعری کے بڑے دلدادا تھے۔ میں ذاتی معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ سورگباشی مسز سروجنی نائیڈو فارسی شعر و سخن کے بارے میں بخوبی واقفیت رکھتی تھیں۔ اگر ان کی ادبی سرگرمیوں کا گہرا مطالعا کیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ اپنی سحر انگیز انگریزی شاعری سے دنیا کو محظوظ کرنے سے پہلے وہ حافظ و سعدی کی غزلیات سے مستفید ہوئی تھیں۔

جہاں فارسی کی شاعری حسن و جمال کا مرقع ہے وہیں فارسی زبان آسان بھی ہے فارسی نہ صرف آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے بلکہ اسے زیادا دنوں تک ذہن میں محفوظ بھی رکھا جا سکتا ہے فارسی صرف و نحو قطعی مشکل نہیں ہے اس کے الفاظ بھی پیچیدا نہیں۔ فارسی اپنے الفاظ اور محاورات کا استعمال بڑی کفایت سے کرتی ہے۔ اس کی مقفیٰ نثر میں وہ جاذبیت ہے کہ بچپن میں ہم جو ضرب الامثال، کلمات حکمت اور مقولے سیکھتے ہیں وہ بڑھاپے میں بھی ہمارے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں مقبول عام شاعر و نثار سعدی کی گلستاں و بوستاں کی مثال دیکھا سکتی ہے۔

ہندستانی ادب
کی توسیع اشاعت میں ہاتھ بٹانا ہندستانی پر فرض ہے

کرالا میں ڈرامے کی روایات

ا - ا

ڈرامے کا جو مطلب آج کل سمجھا جاتا ہے ویسا ڈراما کرالا میں موجودہ صدی ہی میں ظہور میں آیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کرالا ناٹیا ناٹک ڈرامائی روایات کے متعلق عوام کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ اس روایت کی ابتدا کلیر کے ڈراموں کے ساتھ ہوئی جن میں میلوں کے موقع پر مندروں میں قومی داستانیں رزمیہ نظموں کی صورت میں پیش کی جاتی تھیں۔ ان نظموں میں مقامی واقعات اور اہم عصری حالات نہایت خوبی سے بیان کیے جاتے ہیں۔ اور شروع ہی سے ان میں حقیقت پسندی کی جھلک پائی جاتی تھی۔ کنچن نمبیار نے اس روایت کو برقرار رکھا۔ انہوں نے ساٹھ سے بھی زیادہ ٹھلال لکھے ہیں۔ ٹھلال ایک طویل نظم ہوتی ہے جو ماہرین رقص ناچ کے ساتھ گاتے اور اس کے مطابق سوانگ بھرتے تھے۔ ٹھلال روایت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے ساتھ صرف ایک اداکار کے ذریعے تمثیل کا فن کمال کو پہنچ گیا۔ ٹھلالوں میں ہمعصروں کی زندگی بیان کی جاتی اور نمبیار مختلف طبقوں کے لوگوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے جن میں پجاریوں کا ذکر ہوتا جو ویدوں کے علمی خزانے پر اپنا پیدائشی حق جتلاتے اور اس میں بلیک مارکیٹ کے مرتکب ہوتے تھے امرا کے زوال کو جو نفس پرستی اور خودنمائی کا شکار ہو رہے تھے ان ٹھلالوں میں دلکش پیرائے میں بیان کیا جاتا اور زیادہ قیمتیں وصول کرنے والے تاجروں کی داستانیں اور ایسے سرکاری افسروں کی کہانیاں بیان کی جاتی تھیں جو اپنے آقاؤں اور عوام دونوں کو دھوکا دیتے تھے۔

کتھا کلی کرالا کے ناٹیا ناٹک کی نہایت ترقی یافتہ تصویر ہے۔ حقیقت میں یورپین اوپیرا کی مانند کتھا کلی بھی نظم ڈراما، سنگیت اور تھیٹر کے دوسرے ضمنی آرٹ مثلاً میک اپ اور لباس وغیرہ کا مجموعہ ہے۔ البتہ ٹھلال کی طرح اس میں صرف ایک فرد ہی سوانگ نہیں بھرتا اس میں اتنے ہی ایکٹر کام کرتے ہیں جتنے کہ ڈرامے میں کیرکٹر ہوتے ہیں چونکہ پلاٹوں کا ایک نمایاں اور عام پہلو یہ بھی تھا کہ مخالف کیرکٹروں میں تصادم ہو۔ اس لیے اوپیرا میں عمل کا عنصر بہت زیادہ ہوتا تھا۔

ڈرامے کی موجودہ روایت کلاسیکل روایت کے تماشاؤں اور ڈراموں کے ترجموں کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی۔ کالیداس کی تصانیف کے متعلق شکنتلا کے چار اور "مالاویکا گنتم" "وکرم اوروسیا" کے تین تین ترجمے موجود ہیں۔ ہرش کی تصانیف "رتناولی" "ناگانندم" اور "پریادرشیکا" کے دو دو آزادانہ ترجمے کیے گئے۔ شودرک کا ڈراما "مرچھ کٹیکا" مراری کے ڈرامے "انارگھ راگھو" اور جے دیو کے ڈرامے "پرسن راگھو" کا بھی ترجمہ کیا گیا لیکن ترجمے سنسکرت سے کیے گئے۔ ان ترجموں میں پرانی روایت کے سنگیت اور ناچ موجود نہ تھے اس لیے سنگیت ڈرامے کی ایک الگ روایت کو فروغ حاصل ہوا۔ "شکنتلا" کا بھی اسی طریقے پر ترجمہ کیا گیا اور ایسی مقبول عام دوسری تخلیقی روایتوں میں سے چکرپانی وزیر کی تصانیف "ہرش چندر چرتیا" اور اچھوت مینن کی تصانیف "سنگیت نائشادھا" شامل ہیں۔

جب سی۔ وی۔ رمن پلے نے مزاحیہ ڈراموں اور

پر انسانوں کا سلسلا شروع کیا تو لوگوں کے مذاق میں ایک نیا انقلاب پیدا ہوا۔ ان سے بتر و ترش سماجی حقیقت پسندی کمبیار کے مُخلاتوں کا طنز و ہجو اور چباک دمک کا سماں بلدگیا۔ اور اسی وجہ سے اسے بہت جلد مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں سنگیت کو چھوڑ کر نثر کو بیان کا ذریعا بنایا جو پائیدار ثابت ہوا۔

اسی زمانے کے ڈراموں نے اس روایت کو طویل زندگی دی۔ لیکن ایک گہرا اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ سماج کے متعلق گہری واقفیت ہونے کے سبب امن پلے کے ڈراموں کی آب و تاب اور بھی بڑھ گئی۔ یہ لا بنجی بھی اسی طرح پر لطف ہے لیکن اب اس کا واسطہ راست غیر سماجی عناصر اور ان کے کردار ہیں۔ اس نئی روایت میں زور بھی ہے۔ کیونکہ اس میں گہری ذمے داری کا احساس پایا جاتا ہے۔ اس نئی تخلیق میں آرٹ سماجی دنیا کو دلی خواہشات کے برابر ڈھالنے کی راہ نکالتا ہے۔

○ نئے تقاضوں کا ترجمان — نئے عزائم کا پیامبر
○ اردو کا مقبول ترین شاعر
اختر انصاری اکبرآبادی
دلِ رسوا
اپنی جدید غزلوں اور نظموں کا مجموعہ پیش کرتا ہے
قیمت دو روپے
برگِ سبز
اردو شاعری کی جدید و قدیم اقدار کا مبلغ
ابو مسلم صحافی
اپنا پہلا مجموعۂ کلام پیش کر رہا ہے
قیمت دو روپے
سول ایجنٹ — مرکزِ ادب مشن روڈ — کراچی

مرکزی ادارہ تعلیمات کا یوم قیام

سنٹرل ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ (مرکزی ادارہ تعلیمات) کی بنیاد ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی سے صرف چار مہینے بعد رکھی گئی تھی۔ مرکزی وزیر تعلیم مولانا آزاد نے اس موقع پر فرمایا تھا کہ یہ ادارہ مختلف پالیسیوں کے لیے مثالی تجربوں کی تربیت دینے اور ملک کے تعلیمی مسایل کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں تحقیق مرکز کے فرایض انجام دے گا۔ ۱۹ دسمبر کو اس ادارے کا یوم قیام منایا گیا ہے۔

شروع میں اس ادارے میں صرف بی۔ ٹی کے نصاب کی تعلیم دینے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ لیکن اب اس میں دلی یونیورسٹی کی ڈگریوں بیچلر آف ایجوکیشن اور ماسٹر آف ایجوکیشن وغیرہ نصابوں کی تعلیم کے انتظامات بھی کیے گئے ہیں۔ پانچ غیر ملکی طلبا بھی اس ادارے میں تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ اس ادارے میں بچوں کی ذہنی قابلیت کا جایزہ لینے کے طریقوں کے بارے میں بھی تحقیق کی جا رہی ہے۔ اس کے سوا ادارے میں ایک نرسری اسکول بھی چل رہا ہے۔ جس میں ۵۲ بچے تربیت پا رہے ہیں۔ بچوں کی نفسیات اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص کو مطالعے کے لیے یہ مرکز ایک مناسب موقع فراہم کرتا ہے ادارے کے تحت ایک جونیر بنیادی اسکول بھی چل رہا ہے۔

برطانوی یونیورسٹیوں میں انجینئرنگ کی تعلیم

جی۔ ایچ۔ راکلف (پروفیسر الکٹریکل انجینئرنگ برسٹل یونیورسٹی)

یہ واقعی ایک عجیب بات ہے کہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے جب برطانیہ دنیا کا ایک بہت بڑا "ورک شاپ" بن رہا تھا تو ملک میں زیادہ تر ایسے اسکول اور کالج قائم کیے جا رہے تھے جہاں طلبا کو غیر سائینسی مضامین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ گرامر اور پبلک اسکولوں میں کلاسیکل اور ادبی مضامین کو سب سے بلند جگہ حاصل تھی۔ سائنس کی تعلیم تو دی جاتی تھی لیکن سائنس کو عملی زندگی میں استعمال میں لانا ایک گھٹیا قسم کا خیال کیا جاتا تھا۔ اور بہت کم ہونہار اور قابل نوجوان نئی صنعتوں میں داخل ہونے کے لیے حوصلا افزائی کی جاتی تھی۔

یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ صورت حال اب بلکل بدل گئی ہے لیکن اب اس بات کی بہت سی علامتیں نظر آرہی ہیں کہ لوگوں کے نظریے بدل چکے ہیں اور بدل رہے ہیں۔ قومی نظام تعلیم میں اب فنی اور سائینسی تعلیم اور تربیت پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔ جنگ کے بعد سے فنی تعلیم کے اداروں کو وسعت دی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر لندن، مانچسٹر، شیفیلڈ، کیمبرج، ڈنڈی، نیوکاسل، برسٹل وغیرہ میں کالجوں اور اسکولوں کے انجینئرنگ شعبوں کو وسعت دینے کے لیے بڑی بڑی رقمیں مہیا کی گئی ہیں۔

برسٹل یونیورسٹی انجینئرنگ کالج کی عمارت تقریباً تمام نئی بنائی جا رہی ہے اور اس میں موجودہ تعداد سے دگنے طلبا کے لیے جگہ ہوگی۔ اس ادارے میں انجینئرنگ کے چار شعبے ہیں۔ سول انجینئرنگ میکینکل انجینئرنگ ہوا بازی سے متعلق انجینئرنگ اور الکٹریکل انجینئرنگ کا شعبا۔ سمندر پار کے کئی طلبا اس ادارے میں تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ نئی عمارت کو نہایت جدید قسم کے سامان سے لیس کیا جا رہا ہے۔ اور آشا ہے کہ طلبا کو اس ادارے میں ریسرچ کی بہت زیادہ سہولتیں مل سکیں گی۔ عمارت کو مکمل ہونے میں دو سال لگیں گے۔ اور یقین ہے کہ برسٹل کا یہ انجینئرنگ ادارا برطانیا کے تمام یونیورسٹی انجینئرنگ اداروں میں تقریباً سب سے اعلا ہوگا۔

سرونسٹن چرچل کو برسٹل یونیورسٹی سے بہت دلچسپی ہے۔ انہیں ۱۹۲۹ء میں اس یونیورسٹی کا چانسلر بنایا گیا تھا۔ اس وقت کسی کو بھی یہ خیال نہ تھا کہ ایک دن وہ اپنے وقت کی نہایت ممتاز شخصیت بن جائیں گے۔ سرونسٹن چرچل اپنے پرانے دوستوں کے ہمیشا وفادار رہے ہیں۔ اور برسٹل یونیورسٹی کے تئیں ان کی وفاداری میں کبھی بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ پچھلے ۲۵ سال سے وہ باقاعدہ وقفوں کے بعد اس یونیورسٹی میں آتے رہتے ہیں۔ اس یونیورسٹی اور اس کے انجینئرنگ ادارے کے حالات اور فضا کا برطانیا کی کسی بھی یونیورسٹی کے ساتھ مقابلا کیا جا سکتا ہے۔

ہندستانی ادب
کے خریدار بن کر ہمیں علم و ادب کی سیوا کا موقع دیجیے

سوراشٹر کی قدیم تہذیب

جے۔ایل پرمار

سوراشٹر ادہ پردیش ہے جہاں بھگوان کرشن نے سکونت اختیار کی تھی۔ گاندھی جی کا جنم بھی اسی علاقے میں ہوا تھا اس پردیش میں لمباڑی کے قریب رنگ پور میں تاریخی اشیا دستیاب ہوتی ہیں۔ ان سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ سوراشٹر کی تاریخ سے پہلے کی تہذیب وادی سندھ کی ثقافت سے منسلک ہے اور چھ برس قبل وادی سندھ کا کلچر اور تہذیب یہاں اپنے عروج پر تھی۔

آریوں کی آمد سے پہلے اس دیش میں کول۔ کابا اور بھیل آباد تھے جنہیں داسو کہا جاتا ہے پھر گرنسل کے لوگ پنجاب میں آئے اور انہوں نے پھر گو پور آباد کیا۔ سارسوت نسل کے لوگ کشاستھلی اور گرنار میں آباد ہوئے۔ شریات کے لڑکے آنارتا کے نام پر اس دیش کو "آنارتا" کہا جاتا تھا۔ اس کو کشادرت بھی کہتے تھے۔ کشاستھلی وہی جگہ ہے جہاں بھگوان کرشن کی دوارکا آباد تھی۔ گرنار کو بھگوان نیمی ناتھ نے پوتر کیا تھا اور شترنجے کو بھگوان آدی ناتھ کی تپسیا نے مقدس بنا دیا یادونسوں سے لے کر موریا خاندان کے عہد تک کے زمانے کی تاریخ ابھی تک تاریکی کے پردے میں ہے۔ موریا لوگوں نے زراعت کو ترقی دی۔ مہاراجا اشوک نے عالا معیار کی کی حکومت قایم کی۔ اور لوگوں میں خدا ترسی کے جذبات پیدا کیے۔ سونگ خاندان نے اپنے عہد میں برہمنی دھرم کا بول بالا کیا۔ شبا کا نسل نے سورج کی پوجا کو مقبول بنایا۔ اور کشترپا لوگوں نے یہاں دولت کے انبار لگا دیے۔ گپتا عہد کے دوران سوراشٹر میں پھر ایک بار سنہری زمانا آگیا۔ اس کے بعد گوجر لوگوں نے اس دیش میں اپنا کلچر پھیلایا۔ جو سولیھی کلچر کے نام سے مشہور رہے۔ سومنات ان دنوں دھارمک سرگرمیوں میں اعتقاد، قربانی اور پوجا پاٹ کا گڑھ تھا۔

"ولبھی عہد کے زوال کے بعد سوراشٹر ایک بار پھر تاریکی میں چلا گیا۔ یہاں چوڑا، چوداسما اور جیٹھا نسلوں کی حکومتیں بن گئیں۔ پیشروؤں اور اہیروں نولوں اور گوہیلوں کی سلطنتیں قایم ہوئیں۔ چوڑا راجوں کے بعد سولنکی خاندان نے سوراشٹر کو فتح کر لیا۔ اسی اثنا میں زال آئے اور گوہیلوں نے اپنی حکومت قایم کر لی۔

حدیکوں نے ہالار۔ گوہیلوں نے گوہلواڑ جھالوں نے جھال واڑ نام کی سلطنتیں قایم کیں مسلمانوں کی فتوحات کے بعد سورٹھ پر نوابوں کا قبضہ ہو گیا۔ انگریزی عہد میں بھی سوراشٹر میں دو سو دو دیسی ریاستیں قایم رہیں بھارت کے آزاد ہونے کے بعد ان تمام چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے لاثانی اتحاد سے ایک ریاست قایم ہوئی۔

سوراشٹر میں جہاز رانی کا ہنر تاریخی دور سے پہلے سے چلا آتا ہے۔ گپتا عہد کے دوران بھارت کے اتری علاقوں کی سمندر پار ملکوں سے تجارت سوراشٹر کی بندرگاہوں شنکھ ودھومنی ویلاوالی۔ پربھاس۔ پشیاستھلی اور ولبھی وغیرہ کے رستے ہوتی تھی۔ مصر کا طولیمی قلادلفوس (۲۶۰ ۔ق۔م) لکھتا ہے کہ مصر۔ روم اور افریقا کے ساتھ سمندری تجارت سوراشٹر کی بندرگاہوں سے ہوتی تھی۔

اس پردیش میں بدھ مت، جین مت اور شومت کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل رہی۔ ایک زمانے میں لوی پوجا یعنی شکتی دھرم سارے سوراشٹر میں پھیل گیا تھا لیکن

برہمن اور راجپوت سیویہ اور وشنو ہی رہے۔ راما نندی سادھوؤں نے سوراشٹر کے ہر ایک گاؤں میں پوجا پاٹ کے لیے رام مندر تعمیر کیے۔ یہ دیار لوگوں کی اس دھرتی پر وشنو فرقے کی ایک شاخ سوامی نارائن سمپر دائے کو بہت ترقی ملی۔ اس سمپر دائے نے دلت پسماندہ اور غریب لوگوں اور داسوں (یعنی اچھوت جاتیوں اور فرقوں) میں پاکیزہ برتاؤ کا پرچار کیا اور ان کو نیک انسان بنایا۔

سوراشٹر کی ادبی روایات کا کھوج ساتویں صدی عیسوی میں ولبھی حکومت کے عہد تک ملتا ہے۔ عظیم شاعر بھٹی اسی زمانے میں مشہور ہوا تھا۔ یہ سلسلہ وسطی زمانے تک چلا آتا ہے۔ پندرہویں صدی میں نرسنگ اور میراں بائی نے بھجن تیار کیے تھے۔ جس کے بعد ایک ایک کر کے تقریباً ایک سو شاعر اور عالم اس پردیس میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ جدید زمانے کے شاعروں مثلاً دل پت رام، ننا لال، کنت، کالپی اور میگھنانی سے مل جاتا ہے۔

سوترا پد سے ایک قدیم منقوش تحریر ملی ہے جس میں ہسکو اور جس کو نامی دو لڑکیوں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ دونوں بہت بڑی موسیقار تھیں۔ انیسویں صدی میں ہندستان بھر کے مشہور سنگیت اچاریہ آدتیا رام جی جام نگر میں ہوئے تھے۔ سوراشٹر کی دیسی ریاستوں نے راگ ودیا اور سنگیت کی جو سرپرستی کی اس کے باعث بھارت کو رحیم خاں جیسے مشہور بین کار، چندر بھاگا جیسی نامی گھائیکا، خاں صاحب عبدالکریم خاں اور رکند لیکار جیسے عظیم فن کار حاصل ہوئے۔

سوراشٹر نے بھارت کی روایتی راگ مالا میں تین راگوں کا اضافہ کیا ہے۔ گاندھار بھگوان کرشن کے زمانے میں گایا جاتا تھا۔ اس کے بعد سارنگ ان دونوں کو ملا کر نیا راگ بنایا گیا۔ جسے سوراشٹر لیکا یا سورٹھی کا نام دیا گیا بلاول راگ سوراشٹر کے شہر ویراوال یا ویلاولی سے حاصل ہوا۔

اگرچہ سوراشٹر میں منی پوری یا کتھا کلی طرز کا ناچ کبھی رائج نہیں ہوا۔ پھر بھی اس علاقے کو اپنے مخصوص قسم کے ناچ ورثے میں ملے۔ جو بھارت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہاں کا لاس نرتیا جو بھارت نرتیا سے بھی قدیم ہے بھگوان کرشن کے پوتے انی رودھ کی استری اور بانا سر کی پتری اوشا نے سوراشٹر کی عورتوں کو سکھایا تھا۔ بھگوان کرشن سے انہیں راس نرتیا ملا۔ پھر ان دونوں سے بڑھا تیانی۔ ڈنڈیا۔ گوفا گنتھن۔ ماتکی۔ تلوار۔ گیر۔ گربا اور دیگر قسم کے ناچ پیدا ہوئے۔

وشنو مت کے پیروؤں نے سوراشٹر کو سنگیت اور تصویر کشی کے فن سکھائے۔ اسی طرح جین مت والوں نے اس دیش کو قدیم زمانے کی عمارتیں خاص کر گرنار اور شترنجے کے جین مندر ورثے میں دیے ہیں۔ سوما پوروں کا مشہور معماروں کا فرقہ سومناتھ میں رہتا تھا۔ وہ بے نظیر قسم کے مندر اور مسجدیں تعمیر کرنے کے لیے خاص شہرت رکھتے تھے۔ کشمیر اور کھٹمنڈو جیسے دور دراز علاقوں تک ان کی شہرت تھی۔ اور ان کی خدمات مستعار لی جاتی تھیں۔

سوراشٹر میں تصویریں بنانے اور ان میں رنگ بھرنے کے ہنر کو بھی ترقی ملی۔ سوراشٹر کے قدیم اور جدید راج محلوں میں لاثانی تصویر کشی کے نادر نمونے بہتات سے ملتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ سوراشٹر کا ہر مکان اور جھونپڑا اس کی تمدنی زندگی کا مظہر ہے۔ ان کے زیور۔ پوشاک۔ کشیدہ کاری۔ قالین۔ دروازوں اور دیواروں کی سجاوٹ بلکہ ان کے بیلوں اور گھوڑوں کی سج دھج غرضیکہ سوراشٹر کی دیہاتی اور شہری زندگی کی ہر ایک چیز کو سوراشٹر کے مخصوص فنکارانہ انداز میں سجایا جاتا ہے۔ سوراشٹر بہادروں کا ہے اس دیش کے بہادروں نے ماضی اور حال میں ہمیشہ ہی میدان جنگ میں اپنی نمایاں قابلیت کے جوہر

کولمبیا یونیورسٹی

یوسیس

کولمبیا یونیورسٹی نہ صرف امریکا بھر میں بلکہ ساری دنیا میں عالمانہ ترین شہرت کی مالک ہے۔ اس یونیورسٹی نے علم و ادب اور سائینس کی خدمات بجا لانے میں پچھلے دو سو برس میں جو شاندار ریکارڈ قایم کیا ہے اس کی تاریخی تفصیل ۱۹ جلدوں پر مشتمل سلسلۂ کتب میں درج کی گئی ہے جو عنقریب شایع ہوں گی۔ امریکا میں یہ یونیورسٹی ہر لحاظ اور حیثیت سے کلیدی ہی نہیں بلکہ قیادتی درجہ رکھتی ہے۔

کتنے ہی ہندستانی اصحاب نے اس میں تعلیم پائی۔ ڈاکٹر امبیڈکر جنھوں نے ہندستان کا آئین بنانے میں مدد دی اور جو پنڈت نہرو کی کابینا کے بھی ایک رکن رہ چکے ہیں اسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں۔ امریکا کے کئی پریذیڈنٹ ڈاکٹر سائینداں اور نوبل انعام پانے والے بھی کولمبیا یونیورسٹی میں ہی رہ چکے ہیں۔ مزید حالات کا خاکا ذیل میں درج ہے جو یقیناً دلچسپی کا باعث بنے گا۔

نیویارک کے نچلے حصے میں ٹرینی ٹی کلیسا کے پاس ہی ایک اسکول کی کھڑکی میں سے اگر ۱۷ر جولائی سنہ ۱۷۵۴ء کو کسی شخص نے اندر جھانکا ہوگا تو اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں آٹھ نوعمر لڑکے نظر آئے ہوں گے۔ ان کے سامنے ڈاکٹر سیموئیل جانسن کھڑے ہیں جو اسٹریٹفورڈ کنیکٹی کٹ سے حال ہی میں آئے ہوئے ہیں۔

وہ آٹھ لڑکے اس اسکول کی اولین جماعت تھے جو آج کولمبیا یونیورسٹی کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہے، جو امریکا کی عظیم ترین یونیورسٹیوں میں سے ہے۔ اور گریجویٹ نصاب کی تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد میں بھی اول نمبر پر ہے۔

ان آٹھ لڑکوں کے استاد ڈاکٹر سیموئیل جانسن ہی اس تعلیمی ادارے کے معلم اور صدر تھے۔ اسے ان دنوں کنگس کالج کہتے تھے۔

سنہ ۱۷۵۴ء میں اس کی منظوری دی گئی۔ اور نیویارک کی پردیسی بندرگاہ کی طرح اس میں بھی وسیع مشربی پائی جاتی ہے اور اس کے منشور کے تحت ہر مذہب ہر عقیدے اور ہر خیال کے طلبا کو اس کالج میں داخلے کی اجازت ہے۔

اس کی ۷۰ عمارتوں میں دو انڈر گریجویٹ اسکول ۱۴ گریجویٹ اور پیشہ اور حرفت سکھانے والے ادارے بہت سی تجربہ گاہیں اور ۲۰ لاکھ کتابوں پر مشتمل کتب خانے پھیلے ہوئے ہیں اب اس میں ۲۵ ہزار سے زیادہ طلبا اور ۳۰۰۰-۳ اشخاص پر مشتمل پڑھانے کا عملا ہے۔

کولمبیا یونیورسٹی میں ۱۴ سو سے زیادہ طلبا کو پیشہ ورانا اور تہذیبی نصابوں کی تعلیم دی جاتی ہے یہ یونیورسٹی کے غیر سکونتی طلبا ہوتے ہیں اور شام کی کلاسوں اور سنیچر کے دن پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ۵۱ ہزار طلبا توسیعی نصاب کا مطالعا کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹ء میں گرمائی تعلیمی ادارہ قایم کیا گیا تھا اس میں ۱۴ سو معلم اور طلبا ملک کے ہر حصے سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے آسکتے ہیں۔

یونیورسٹی میں لیکچر دن تا ملکوں، موسیقی بحث مباحثوں

مناظروں وغیرہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے اور کم و بیش ایک لاکھ اشخاص سالانا ان میں حصہ لیتے ہیں۔ حال ہی میں اسی نے امریکی تہذیب اور تمدن کے متعلق ایک ٹیلی ویژن مذاکرہ منعقد کیا تھا۔

مطبوعات کولمبیا یونیورسٹی امریکا کے مشہور رسالوں سے ۴۰ رسالے شائع کرتی ہے اس کے پریس میں کولمبیا انسائیکلوپیڈیا بھی شائع ہے یونیورسٹی کی تاریخ ۱۹ جلدوں میں عنقریب ہی چھپے گی۔

۱۹۵۰ء سے اس یونیورسٹی میں ایک سالانا امریکی اسمبلی ہوتی ہے۔ جس میں تجارت پیشہ لوگ، معلم اور سرکاری افسر جمع ہوتے اور وقت کے مسایل پر غور و خوض اور بحث مباحثے کرتے ہیں۔

پاور کونسل کولمبیا یونیورسٹی نیشنل مین پاور کونسل کی محرک بھی ہے اور انسانی وسایل کا مطالعا کرتی ہے۔ اور لوگوں مختلف ملکی کاموں کے لیے منتخب کرنے اور ان کی بہترین قابلیت سے استفادہ کرنے کے امکانات پر غور کرتی ہے۔

امریکا میں نیچرل ہسٹری کے عجایب خانے اور میٹرو پالیٹن میوزیم آف آرٹ، راک فیلر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور نیویارک کے قرب و جوار میں دوسرے اداروں کے ساتھ بھی اس یونیورسٹی کے تعلقات ہیں۔

ترقی اگرچہ اس یونیورسٹی کی ترقی نکولاس مرے بٹلر کے عہد میں ۱۹۰۱ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیانی ۴۶ برسوں میں عمل میں آئی لیکن پچھلے چند برسوں میں اس نے بڑی وسعت پائی ہے۔

ہر بات میں اولیت کولمبیا یونیورسٹی کو اکثر امور میں پہلا نمبر حاصل ہے۔ مثلاً اس یونیورسٹی میں کان کنی کی تعلیم دینے کے لیے امریکا کا سب سے پہلا اسکول قایم ہوا۔

اب یہ انجینرنگ کالج میں تبدیل ہو چکا ہے اسی یونیورسٹی میں سب سے پہلے ۱۸۱۸ء میں امریکا میں سیاسی اقتصادیات پر لیکچر دیے گئے تھے۔ اسی نے امریکا میں پہلی بار ڈاکٹری میں (طب میں) ایم۔ ڈی کی ڈگری دی تھی۔ اسی میں سب سے پہلے "قانون اور زراعت" کے مضمون پڑھانے کے لیے پروفیسر مقرر ہوے۔ لائبریری سائنس کی ٹریننگ بھی سب سے پہلے اسی یونیورسٹی میں شروع ہوئی تھی۔ معلموں کی تربیت کا کالج بھی اسی میں سب سے پہلے قایم کیا گیا تھا۔ معاشرتی اور سماجی کاموں کی تربیت کے لیے پہلا گریجویٹ اسکول بھی یہیں قایم ہوا۔ اور دانتوں کی ڈگری سکھانے کا بھی اسی یونیورسٹی میں سب سے پہلا کالج کھولا گیا۔

سائنسدانوں کی کارکردگی اس یونیورسٹی کے سائنسدانوں بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد سب سے پہلے کونین کا تجزیہ کیا اور اسی میں امریکا میں ایکسرے کا سب سے پہلا فوٹو لیا گیا۔ اولین عمل آکسیجن نقاب بھی اسی میں تیار ہوا۔ سب سے پہلا کامیاب بیٹاٹرائن اور ایٹمی توانائی حاصل کرنے کا سب سے پہلا تجربا بھی اسی یونیورسٹی میں کیا گیا۔

یہاں کے تعلیم یافتہ کولمبیا یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ نیویارک کے میئر اور نیویارک ریاست کے گورنر رہ چکے ہیں۔ موجودہ گورنر ڈیوے نے اسی میں تعلیم پائی تھی۔ امریکا کی عدالت عالیہ کے کئی جج اور (چیف جسٹس جان جے چارلس ایونز ہیوگس و کانسٹون) بھی یہیں پڑھتے رہے ہیں۔ امریکا کے صدروں میں سے تھیوڈور روزویلٹ اور فرینکلن ڈی روزویلٹ بھی اسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور امریکا کے موجودہ صدر آیزن ہوور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک اس کے پریذیڈنٹ رہے جس کے بعد وہ امریکا کے صدر منتخب ہوے۔

کولمبیا یونیورسٹی میں نوبل انعام حاصل کرنے

بہت سے امریکی بھی تعلیم پا چکے ہیں جن میں اورنگ لینگ مور اسٹیڈوڈ آئی۔ رابی۔ ہیرالڈ یورنکولاس مرے بٹیلر اور تھیوڈورروزویلٹ بھی شامل ہیں۔

بیرونی ملکوں کی نامور ہستیاں

اس یونیورسٹی میں امریکی باشندوں کے علاوہ باہر کے ملکوں کے ہزاروں طلبا نے تعلیم پائی ہے جن میں سے بعض دنیا کے مشہور ڈاکٹر۔ انجینیر۔ اخبار نویس معلم۔ سیاسی سائنس وغیرہ ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں۔

امریکا میں چین کے سفیر کے والنگٹن کو اور مسٹر ہوشی فلپائین کی طرف سے امریکا میں سفیر کا یوس اور مولو— ہند کے ڈاکٹر بی امبیڈکر جنہوں نے ہندستان کا آئین بنانے میں مدد دی ہے اور جو آزاد ہندستان کے اولین کابینا کے رکن بھی تھے۔

اس یونیورسٹی میں ۱۸۳۰ غیر ملکی طلبا زیر تعلیم ہیں امریکا کی تمام یونیورسیٹوں کے مقابلے میں اس میں غیر ملکی طلبا کی تعداد سب سے زیادہ ہے جو ۵۶ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے ہیں۔

ایسے طلبا کی سہولت کے لیے امریکی زبان اور رہن سہن کے متعلق چھ ہفتوں کا ایک تربیتی نصاب بھی رائج کیا گیا ہے۔

بین قومی معاملات کے متعلق بھی ۱۹۴۶ء سے ایک اسکول قایم ہے۔

موجودہ صدر

کولمبیا یونیورسٹی کے موجودہ صدر ڈاکٹر گریسن کرک ہیں جو پہلے ایک سکول کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے ہی یونیورسٹی کے دوسو سالہ جشن کا انتظام کیا اور اس کا پلان بھی بنایا تھا۔

اس تقریب میں بحث اور تقریروں کے لیے ایک خاص موضوع یہ رکھا گیا تھا "علم حاصل کرنے میں انسان کا حق اور اس کا آزادانہ استعمال"۔

چنانچہ ۳۵۰ یونیورسیٹوں اور امریکا سے باہر کے اداروں نے اس موضوع پر تقریریں کیں۔

اس کے علاوہ تین دن تک ایک کانفرنس بھی جاری رہی۔ جس میں زمانہ حال کی زندگی میں بڑے بڑے شہروں کا اثر "ثقافت" اتحاد علم جیسے موضوعات پر بحث مباحثے ہوتے رہے۔

"اس دوسو سالہ جشن کے موقع پر ایک سات روزہ کانفرنس میں روحانیات پر بھی تبصرے اور تقریریں ہوئیں۔ اور مذہبی اعتقادات اور آزادی کے موضوع کے علاوہ ذہنی آزادی کا مذہب سے تعلق کے مضمون پر بھی ایک کانفرنس بلائی گئی تھی۔

سمندر پار کے طلبا کے لیے خاص کورسوں کا انتظام

برٹش کونسل نے گرمیوں کی تعطیلات کے دوران جن خاص کورسوں کا انتظام کیا ہے ان میں ۵۰۰ سو سے زاید سمندر پار کے طلبا شرکت کر سکتے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان اور سیلون کے کافی طلبا ان کورسوں میں حصہ لیتے ہیں یہ مجلاوا کورس ہیں ان کورسوں کا مقصد غیر ملکی طلبا کو برطانیہ کے اہم مقامات اور برطانوی عوام کی طرز زندگی سے روشناس کرانا ہے۔ چنانچہ چند طلبا کو اسکاٹ لینڈ کے تاریخی صنعتی اور دوسرے اہم مقامات کی سیر کرائی گئی۔ اور اسی طرح میں طلبا کی ایک اور پارٹی شمالی آیرلینڈ کی سیر کی گئی تھی۔ اور طلبا کی ایک تیسری پارٹی پیدل ایک ڈسٹرکٹ کی سیر کو گئی تھی۔

چین میں شوقیہ ادیبوں اور فن کاروں کی حوصلہ افزائی

ا. ح. پ

چین کے ادیبوں اور فن کاروں کی کانفرنس حال ہی میں ختم ہوئی۔ اس کانفرنس نے ادبی اور فنی حلقوں کی پیکنگ فیڈریشن کی کونسل کے ۵۴ ممبر چنے۔ لاوشیہ مشہور ناول نگار ساویو، ڈراما نگار۔ لے لان، فانگ جینی اوپیرا کے مشہور اداکار اور جوشی تیئن نغمہ نگار شامل ہیں۔ جن ممبروں کو منتخب کیا گیا ہے ان میں بہت سے ذہین شوقیہ مزدور فن کار اور ادیب بھی ہیں۔

اس کانفرنس میں جن اہم کاموں کا فیصلہ کیا گیا وہ یہ ہیں کہ چین کے ادیبوں اور فن کاروں کو مدد دی جائے اور انہیں منظم کیا جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ فن پارے تخلیق کریں۔ اور انہیں عوام کی زندگی کے بارے میں بھرپور اور مکمل معلومات حاصل کرنے اور اپنی تخلیقی ذہانت بڑھانے میں مدد دی جائے۔ اور مقبول عوامی ادب اور آرٹ کی ترقی کو اور آگے لے جانے میں ان کی امداد کی جائے۔

چین کے ادبی اور فنی حلقوں کے ۲۰۰ نمایندوں کا ایک وافر تناسب جو اس کانفرنس میں شریک ہوا نوجوان ادیبوں اور فن کاروں پر مشتمل تھا۔ جو مزدوروں اور کسانوں میں سے حال ہی میں آگے آئے ہیں۔ چین کے ادیبوں اور فن کاروں کی گذشتہ کانفرنس کے بعد سے گذشتہ چار سال میں فیڈریشن نے جو کام کیا ہے کانفرنس میں اس پر تبصرہ کیا گیا۔ گذشتہ چند سالوں میں جو ہزاروں نئے ناٹک لکھے گئے ہیں ان میں سے جن کا بہت زیادہ خیر مقدم کیا گیا وہ ایسے ناٹک ہیں جو ہفتوں اور مہینوں تک کھچا کھچ بھرے ہوئے تھیٹر ہالوں میں کھیلے گئے ان میں سے لاوشیہ کا ڈراما "اژدہے کی داڑھی میں کھائی" اور وانگ یاپنگ مقبول عام ادب کے پسند کیے جانے والے ادیب کا ڈراما "چانگ یو سمندر کو ابالتا ہے" بے حد مقبول ہوئے۔ پہلا ۳ ایکٹ کا ڈراما ہے جو چین کے محنت کش عوام کی زندگی کی قومی آزادی سے پہلے اور بعد کی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہے۔ بعد کا ڈراما چین کا مقامی اوپیرا ہے جس کی بنیاد ایک جوان لڑکے اور اژدہے کی بیٹی کے درمیان محبت کی داستان کی روایت پر رکھی گئی ہے۔

کانفرنس میں رپورٹ پیش کی گئی کہ مزدوروں کی شوقیہ ناٹک ٹولیاں دوگانوں ناچ اور آرٹ کی ٹولیاں جو اس سے پہلے کے عہد حکومت میں نایاب تھیں شہر کے ہر حصے میں ابھر رہی ہیں سنہ ۱۹۵۰ء میں ان کی گنتی ۱۳۵ تھی۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں ان کی گنتی ۵۰۰ سے زاید تھی اور ان کی ممبر شپ سنہ ۸ سے ۱۷۰۰۰ ہو چکی تھی۔ بہت سے نئے ادیب نغمہ نگار اور مصور نامور ادیبوں اور فن کاروں کی تنظیم کی ہدایت اور امداد کی بدولت مزدوروں اور کسانوں کی صفوں سے ابھرے۔

کانفرنس میں ادبی اور فنی حلقوں کی پیکنگ فیڈریشن کے صدر لاوشیہ نے گذشتہ چار سالوں میں مقبول عام ادب کی تخلیق کے تجربے کا ذکر کرتے ہوئے تین اہم نتائج کی طرف اشارہ کیا۔ مثلاً حقیقت پسندی کے طریقوں کا فوری طور سے اطلاق کرنا۔ مقبول عام ادب کی نفسیات کو مقامی طور سے حاصل کرنا اور آرٹ کی تخلیقات کو مضبوط بنانا۔ نیز نئے فن پارے تخلیق کرنے کے لیے متحدہ کوشش کریں" تاکہ ملک کی زندگی مالا مال کیا جا سکے۔

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی - ام - خان ام - اے
(عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر	ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

حیدر اباد دکن

جلد (۱۵)	نمبر (۶)

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان ام۔اے (عثمانیا)

اردی بہشت ۱۳۶۴ف	اپریل ۱۹۵۵ء
چندا سالانا	آٹھ روپے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	پنجابی ڈرامے کا ارتقا	ا۔ ا	۱۶
حقایق و معارف	افقر موہانی	۳	پنسلین کا موجد	ال۔ لوڈو ولسی	۱۷
غزل	سراج الحسن سراج (لکھنوی)	۴	تائی وان	چین ہانگ سینگ	۱۹
غزل	جسٹس آنند نراین ملا (لکھنوی)	۵	تلاش	راہی (جگدیشپوری)	۲۲
آرزو کا ساز	سلام سندیلوی ام۔اے ال ال۔بی	۶	وادی کشمیر موسم خزاں میں	رام سروپ	۲۳
زہرا سے	فضا جالندھری فاضل ادب	۷	حسن تغزل	حبیب پرویز (لکھنوی)	۲۴
چمن چمن سے	ظفر عالمگیر بی۔اے (عثمانیا)	۸	ارتقاے ادبیات	حافظ محمد امام (اکبر آبادی)	۲۵
ہماری تعلیم کی خوبیاں اور خرابیاں	پروفیسر ہمایون کبیر	۹	ماسکو کے صحافیوں کا کلب گھر	گریب نیزنف	۲۸
رد الحسن قاتہ	تمکین کاظمی	۱۰	نیویارک میں طلبا کے لیے ایک بین قومی عمارت	یوسیس	۳۰
تبصرے	ا	۳۴			

ہمارے خیالات

ہمارے نظام تعلیم کا ایک کمزور پہلو

تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر اب تک ہم نے درجنوں ہی مضامین پیش کیے ہیں۔ یہ سب مضامین ہندستان کے ماہرین تعلیم کے قلم سے تھے۔ آشا ہے کہ آنے والے نمبروں میں اس قسم کے مضامین پیش کیے جاتے رہیں گے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان تمام مضامین میں ایک بات ملی جلی نظر آئی ہوگی —— وہ ہے ہماری تعلیمی کمزوریاں۔ ہر مضمون لکھنے والے نے اس کمزوری کو کسی نہ کسی رنگ میں پیش کیا ہے، دوسرے معنی میں ہمارے ہر ماہر تعلیم نے ہمارے تعلیمی ڈھانچے کے کسی نہ کسی کمزور پہلو کا اعتراف ضرور کیا ہے۔

مرکزی وزارت تعلیم کے رسالے "ایجوکیشن کوارٹرلی" کی تازہ اشاعت میں پروفیسر ہمایوں کبیر نے ایک مضمون لکھا ہے اس کا عنوان ہے "کیا ہماری تعلیم کا موجودہ نظام اپنا رہا ہے؟" اس مضمون میں پروفیسر کبیر نے غالباً اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ایسا نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے تعلیم کے موجودہ نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہماری تعلیم کے موجودہ نظام کی غلط وجوہ کی بنا پر خدمت کی جاتی ہے۔" اور آگے چل کر آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ "اس کی مذمت اس لیے نہیں کی جاتی کہ تعلیم کے لیے کافی سہولتیں موجود نہیں ہیں بلکہ اس لیے کہ گذشتہ زمانے کی طرح تعلیم پانے والوں کو روزگار ملنا یقینی نہیں ہوتا۔۔۔"

مضمون کافی لمبا چوڑا ہے۔ ہم نے مضمون کی شکل میں اس کا صرف خلاصہ پیش کیا ہے۔ اور اسی خلاصے کی روشنی میں یہ چند سطریں لکھ رہے ہیں۔

آگے چل کر مضمون میں پروفیسر کبیر نے لکھا ہے کہ "۔۔۔ اگر پھر بھی یہ (طالب علم) کامیاب ثابت نہیں ہوتا تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اساتذہ قابلیت کے معیار پر پورے نہیں اترتے، اور دوسرے اسکولوں میں طلبا کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ان کے لیے جسمانی سہولتیں جو نہایت ہی ضروری ہیں مثلاً رہائش کھیلوں کے میدان۔ ساز و سامان۔ کتابیں اور دوسری ضروری چیزیں فراہم نہیں کی جا سکتیں۔"

ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ ہر ماہر تعلیم نے "تعلیم کے کمزور پہلو" کا کسی نہ کسی طرح پر اعتراف ضرور کیا ہے۔ پروفیسر کبیر کی حیثیت نہ صرف ایک ماہر تعلیم کی ہے بلکہ حکومتی مشنری کے وہ ایک ذمے دار عہدے دار بھی ہیں، جن کا تعلق مرکزی وزارت تعلیم سے ہے۔ اس لیے آپ کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ "مستند ہے آپ کا فرمایا ہوا۔"

چنانچہ اس بارے میں ہمارا بھی یہی کہنا ہے کہ واقعی۔ "اساتذہ قابلیت کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔" جب اساتذہ خود ہی قابل نہ ہوں تو دوسروں کو کیا خاک قابل بنا سکتے ہیں؟ یہ ایک نہایت ہی غور طلب مسئلہ ہے مگر افسوس کہ ہمارے تعلیمی نظام کو چلانے والی مشنری اس طرف مطلق دھیان نہیں دے رہی ہے۔ ناقص قسم کے استادوں سے کام لے کر ناقص تربیت یافتہ لڑکے نکال رہی ہے۔ اس کا ثبوت خود یہی ناقص اساتذہ ہیں جو کل تک اپنے ہی جیسے ناقص اساتذہ سے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

دوسرے یہ کہ دفتروں میں ان کے عہدے دار ہر وقت ناقص کارکردگی کا ڈھنڈورا پیٹا کرتے ہیں۔ تیسرے ان کی نااہلیت اور نااہلیت کا ثبوت یوں بھی ملتا ہے کہ جب میٹرک اور انٹر کا پاس طالب علم مختلف دفتروں میں ملازمت کے لیے درخواستیں دیتے ہیں اور انٹرویو کے وقت عام معلومات سے متعلق ان سے جو سوالات کیے جاتے ہیں اور وہ جو جوابات دیتے ہیں اس سے ان کی ناقص تعلیم کا کافی ثبوت مل جاتا ہے پیا ایسے بے تکے اور جہل قسم سے جواب ہوا کرتے ہیں کہ انہیں ایک میٹرک یا انٹر کامیاب سے منسوب کرتے سخت افسوس ہوتا ہے۔ ان حالات کی روشنی میں وزارت تعلیم کو ہمارا یہ مشورہ ہے کہ وہ ہر سال زیادہ سے زیادہ تعداد میں ٹرینڈ اور قابل اساتذہ اختیار کرے تاکہ ان کی تعلیمی کوششوں کے نتیجے کے طور پر ہر سال صحیح معنی میں قابل تعلیم یافتہ پیداوار مل سکے۔

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

حق کی صفات و ذات سے واصل حق جدا نہیں
بحر میں جو کہ مل گیا قطرہ وہ پھر رہا نہیں

بہر جزا و بخشش خلد کے ماسوا نہیں
ایک بھی سجدہ حرم سجدۂ بے ریا نہیں

مر کے ملے جو زندگی اس کو کبھی فنا نہیں
ایسی حیات جاوداں عمر گریز پا نہیں

کس کو خبر قبول کی حد میں ہوا ہے یا نہیں
سجدۂ طاعت خدا سجدۂ ماسوا نہیں

نالۂ درد دل مرا نغمہ جانفزا نہیں
شاعر خوش خیال ہوں مطرب خوش نوا نہیں

وسعت دو جہاں ہے کیا وسعت دل کے سامنے
اس کی ہے پھر بھی انتہا اس کی کچھ انتہا نہیں

چھائی ہوئی ہے بیخودی خیرہ نگاہ شوق ہے
اور حریم ناز کا پردہ ابھی اٹھا نہیں

ایسا بھی اک مقام ہے منزل عشق میں جہاں
اور کسی کا ذکر کیا اپنا بھی کچھ پتا نہیں

میری لحد پہ ہیں نشاں ان کے خرام ناز کے
ہوگی لحد کسی کی وہ ان کا جو نقش پا نہیں

حسن کی بے نیازیاں وجہ ملال ہی سہی
مسلک عشق میں مگر حسن طلب روا نہیں

منظر صد فریب ہے گلشن رنگ و بو کی سیر
رنگ بہار و نکہت گل سے فریب کھا نہیں

اتنی بھی تو خبر نہیں مدعیان عشق کو
عشق ہے ترک مدعا عشق کا مدعا نہیں

کوند رہی ہیں بجلیاں ڈھونڈھ رہا ہے باغباں
اور چمن میں آشیاں اپنا ابھی بنا نہیں

کشتۂ تیغ ناز ہوں خاک رہ نیاز ہوں
موت ہے میری زندگی میری فنا فنا نہیں

سنگ در حبیب پھر سنگ در حبیب ہے
سجدہ یہاں قبول ہے سجدے سے سر اٹھا نہیں

اتنا کرم ہو اے نیاز اپنے نیاز مند پر
تاکہ نہ غیر کہہ سکیں اس کا کوئی خدا نہیں

چشم کلیم رہ گئی حسرت دید میں کھلی
جلوے میں گم نظر ہوئی جلوے کا کچھ پتا نہیں

وہ ہو صنم پرست یا بندہ حق پرست ہو
دونوں کا وہ ہے ناخدا جس کا کوئی خدا نہیں

لب پہ ہو گفتگوئے راز سجدے میں ہو سر نیاز
یہ ہے نماز عاشقاں مر کے بھی جو قضا نہیں

جلووں میں گم نظر ہوئی جلوے نظر میں گم ہوئے
اس سے زیادہ حاصل ذوق فنا بقا نہیں

افقر مے پرست پھر محفل دہر ہیچ ہے
محفل دہر میں اگر ساقی مہ لقا نہیں

غزل

سراج الحسن سراج (لکھنوی)

لیا جنت میں بھی دوزخ کا سہارا ہم نے
آشیاں برق کے تنکوں سے سنوارا ہم نے

حسنِ آئینہ غیرت کو سنوارا ہم نے
نہ لیا عشق میں اپنا بھی سہارا ہم نے

نقش فانی ہی رہا رنگ بقا چڑھ نہ سکا
عمر بھر عالم امکاں کو سنوارا ہم نے

ہر نفس مرثیہ تھا ساعت بیداری کا
لاکھ سوئی ہوئی قسمت کو پکارا ہم نے

ہائے اے مصلحت وقت دہائی تیری
کر لی نا اہل کی تنقید گوارا ہم نے

پھر بھی پیشانی طوفاں پہ شکن باقی ہے
ڈوبتے وقت بھی دیکھا نہ کنارا ہم نے

دھڑکنیں دل کی بھی شاہد ہیں خدا بھی ہے گواہ
ہم پہ جب وقت پڑا تم کو پکارا ہم نے

سایۂ گل میں کہاں فطرت آزاد کو چین
ہر تڑپتی ہوئی بجلی کو پکارا ہم نے

سارا گھر پھونک دیا آتش غیرت نے سراج
نہ لیا برق کے تنکوں کا سہارا ہم نے

غزل

جسٹس آنند نراین ملا (لکھنوی)

صف حیات سے جب کوئی تشنہ کام آیا
نظام ساقیِ محفل پہ اتہام آیا

ملا بھی غم تو وہ غم زندگی کے کام آیا
مرے لیے ہر اک آنسو میں ایک جام آیا

عدو کو بخش دیے ہم نے کوثر و تسنیم
یہ کس کے ہونٹوں کو چھو کر ہمارا جام آیا

کھڑا ہوں دیر سے گم زیست کے دوراہے پر
جو کارواں سے چھڑاتا ہے وہ مقام آیا

کوئی مصور ہستی کا شاہکار بھی ہے
ابھی تلک تو ہر اک نقش ناتمام آیا

حریف بن کے جہاں جب مٹا سکا نہ ہمیں
تو دوست بن کے محبت کا لے کے نام آیا

مجھے مٹا کے وہ تھوڑی ہی دیر خوش سے رہے
پھر اس کے بعد محبت کا انتقام آیا

خوشا وہ ساعت فردوس جب کہ پہلے پہل
کسی کے لب پہ ذرا رک کے اپنا نام آیا

رہ حیات ہے سونی مقام عشق کے بعد
یہاں تلک تو ہر اک دل سبک خرام آیا

ہنسوں کہ روؤں میں اپنی حیات پر ملاؔ
ہوا سے بچ کے سحر تک چراغ شام آیا

آرزو کا ساز

سلام سندیلوی ایم۔ اے۔ ایل ایل بی

اے دل رہا نہ پوچھ مری خامشی کا راز
ٹوٹا ہوا ہے آج مری آرزو کا ساز

مدت ہوئی طلوع ہوا تھا جب آفتاب
لیکن فضائے دہر میں ظلمت ہے آج بھی

علم و ہنر بھی ذہن کو صیقل نہ کر سکے
عقل و خرد پہ زنگ جہالت ہے آج بھی

ارباب عقل تنگ خیالی کے ہیں اسیر
اہل نظر کو ضعف بصارت ہے آج بھی

ہر سو اچھل رہی ہے تعصب کی گندگی
دامان زندگی پہ نجاست ہے آج بھی

نادار کو سکون میسر نہ آ سکا
زردار کو غرور امارت ہے آج بھی

ہیں پاسباں کے روپ میں رہزنان اقوام
ہر سو امانتوں میں خیانت ہے آج بھی

گو یاد ہے جہاں کو پیغام آشتی
اقوام کے ضمیر میں عداوت ہے آج بھی

اب تک بنا نہ ڈال سکے اتحاد کی
پیران میکدہ سے شکایت ہے آج بھی

کام و دہن میں عقرب واقعی کا زہر ہے
پر امن گفتگو میں ہلاکت ہے آج بھی

صیاد ہیں مخالف آزادی طیور
صحن چمن میں دام سیاست ہے آج بھی

میدان زیست میں ہے وہی جنگ زرگری
اہل ہوس میں زر کی رقابت ہے آج بھی

دنیا کو ایک محور گردش بنا دیا
بازی گران نو میں خباثت ہے آج بھی

قوموں کے دشمنانہ خصائل نہ جا سکے
انساں میں خون پینے کی عادت ہے آج بھی

تیمور کی نظر میں ہے نوک سناں ہنوز
چنگیز کے لہو میں حرارت ہے آج بھی

فرعون کے دماغ میں اب بھی غرور ہے
شداد کا جنون شقاوت ہے آج بھی

اب بھی ہے خیر و شر میں وہی جنگ دائمی
یزداں سے اہرمن کو بغاوت ہے آج بھی

القصہ دور نو میں بھی نکہت نہ جا سکی
خورشید انقلاب سے ظلمت نہ جا سکی

زہرا سے

فضا جالندھری فاضل ادیب

بساط خاک پہ اک موج نور ہے زہرا
بہشت حسن و جوانی کی حور ہے زہرا

وہ مست مست نگاہیں وہ ہر ادا سرشار
تمام نشۂ کیف و سرور ہے زہرا

زہے فریب تماشا خوشا رعایتِ ذوق
قریب دل سے نگاہوں سے دور ہے زہرا

ترے جمال سے میں کر سکا نہ کسب ضیا
تری خطا نہیں میرا قصور ہے زہرا

نسیم ہے تری موج نفس سے عطر آگیں
شمیم تیری لطافت سے چور ہے زہرا

گزر رہی ہے بہت سخت مرحلوں سے حیات
کہ غم سے شیشۂ دل چور چور ہے زہرا

بہار میں یہ اداسی مآل غم ہی سہی
ترا بھی اس میں اشارا ضرور ہے زہرا

فضا بساط شب ماہ کچھ سے کچھ ہو جائے
اگر وہ آئے کہ اک سیل نور ہے زہرا

چمن چمن سے

سوچتا ہوں نذر کیا دوں بارگاہ ناز میں
جان بھی سو وہ بھی لے لی گردش افلاک نے
حال دل تم پوچھتے ہو اور میں خاموش ہوں
ساتھ چھوڑا ہے کہاں پر جرات بے باک نے

زندگی ہے مری نہ موت مری
میرے حق میں دعا کرے کوئی
دل میں اب تاب انتظار نہیں
اپنا وعدہ وفا کرے کوئی

مجھ کو خو حال دل سنانے کی
ان کو عادت ہے روٹھ جانے کی
بیٹھے بیٹھے جہاں وہ روٹھ گئے
انتہا تھی مرے فسانے کی

بھاتی نہیں اب ان کو ستاروں کی روشنی
ذروں کو آج نور سحر کی تلاش ہے
لائی غرور عشق کی ہمت بھی کیا اثر
سنتا ہوں آج ان کو ظفر کی تلاش ہے

یہ تمنا ہے حیات گل افسردہ کی
ہیں چمن سوز بہاروں کی فضا بن جاؤں
منتظر جس کا ہے پژمردہ گلستان حیات
گل ہیں جس کے متلاشی وہ صبا بن جاؤں
میرے ہونٹوں پہ ہر اک آہ یہ کہتی آئی
انقلابوں کی زمانے میں صبا بن جاؤں

آج پھولوں کے لبوں پر ہیں شرارے رقصاں
گل فروشوں سے کہو موت کا ساماں کرلیں
رنج و فرحت سے عبارت زندگی ہر شخص کی
اک فسانہ ہے [illegible] کاتب تقدیر کے

ظفر عالمگیر بی۔ اے (عثمانیہ)

یا رب مرے نصیب میں گر زندگی نہیں
کیا یہ ستم نہیں کہ مجھے موت بھی نہیں
اک میں ہوں جس کو یاد ہے ماضی کی بات بات
اک آپ ہیں کہ آپ کو کچھ یاد ہی نہیں

پژمردہ ہے کیوں فصل بہاراں میں گلستاں
آئی تو نہیں فصل خزاں بھیس بدل کر

گر زیست میں ہمدوش مسرت نہ رہے غم
انسان کو جینے کی تمنا نہ رہے گی
اک روز تو دیکھے گا جہنم کو بھی انساں
جنت بھی تری ایک فسانہ نہ رہے گی
ہو دل میں زمانے کو بدلنے کا اگر عزم
ہونٹوں پہ یہ فریاد زمانہ نہ رہے گی

نازاں ہے گھٹا چاند کو آغوش میں لے کر
گو رات یہ انداز حسیں جھوم رہی ہے

تم سے کسی صلے کی تمنا نہیں مجھے
سودا اگر ہی وہ عشق ہے میری نگاہ میں

خون سے شمع جلا لے اے اندھیروں کے مکیں
اب توقع نہ رکھ افلاک کے مہ پاروں سے
حسن سے تم نے قیامت تو چھپا لی ہے مگر
زلزلے دوقت کے ایوان میں ڈالے ہیں نے

مجھے اپنی نوازش پر بڑا اصرار ہے ساقی
تری اس دلنوازی سے مجھے انکار ہے ساقی
وہی اپنوں سے بے طرفی وہی اوروں سے ہمدردی
تری محفل ابھی تک محفل اغیار ہے ساقی

کیسے کیسے مجھے الزام دیئے جاتے ہیں
وہ مجھے مفت میں بدنام کئے جاتے ہیں

پروفیسر ہمایون کبیر

ہماری تعلیم کی خوبیاں اور خرابیاں

ہماری تعلیم کے موجودہ انتظام کی غلط وجوہ کی بنا پر مذمت کی جاتی ہے اس کی مذمت اس لیے نہیں کی جاتی کہ تعلیم کے لیے کافی سہولتیں موجود نہیں بلکہ اس لیے کہ گذشتہ زمانے کی طرح تعلیم پانے والوں کو روزگار ملنا یقینی نہیں ہوتا۔

اس بات کے متعلق دلایل پیش کی جا سکتی ہیں کہ یہ تمام نکتہ چینی جائز نہیں۔ اگرچہ ہندستان میں اس وقت ابتدائی تعلیم کے مرحلے پر لکھائی اور پڑھائی پر ہی زور دیا جاتا ہے لیکن اس امر سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی بھی طریقہ تعلیم ہو یہ دونوں امور بنیادی طور پر لازم تصور کیے جاتے ہیں۔ اس بات میں بھی کوئی صداقت نہیں کہ اس طریقہ تعلیم سے اسکولوں کے بچوں میں اچھی عادتیں اور شعار پیدا نہیں ہوتے اگر پھر بھی یہ کامیاب ثابت نہیں ہوتا تو اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اساتذہ قابلیت کے معیار پر پورے نہیں اترتے اور دوسرے اسکولوں میں طلبا کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ ان کے لیے جسمانی سہولتیں جو نہایت ضروری ہیں۔ مثلاً رہایش کھیلوں کے میدان، سازوسامان کتابیں اور دوسری چیزیں فراہم نہیں کی جا سکتیں۔

ثانوی تعلیم کے متعلق جو نکتہ چینی کی جا رہی ہے کہ وہ بے حد ناجائز ہے۔ ثانوی تعلیم ابھی بڑی حد تک علمی اور کتابی ہے اور ایک ہی طریقے پر دی جا رہی ہے۔ البتہ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ تعلیم کا موجودہ اصول کہ جوان سال طلبا کو ان کے رجحانات اور مذاق کے مطابق مختلف طریقوں پر تعلیم دی جانی چاہیے۔ مقابلتاً حال ہی میں اپنایا گیا ہے ابھی تک تعلیم کو علمی تنقید اور تبصرے کے مترادف ہی خیال کیا جاتا تھا اور اس بات پر حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں کہ انسان کو جو دوسری مخلوق پر برتری حاصل ہے وہ اس کی علمی اور ذہنی قابلیت کا ہی نتیجہ ہے۔ اس لیے ابتدائی تعلیم کی طرح ثانوی تعلیم کی خامیاں دور کرنے کے لیے بھی ہمیں اساتذہ کے معیار قابلیت کو بلند کرنے طلبا کے مقابلے میں اساتذہ کی تعداد میں اضافہ اور اسکولوں میں بنیادی سہولتوں کی فراہمی ایسے امور کی طرف توجہ کرنی پڑے گی۔

اسی طرح یہ اعتراض بھی صحیح نہیں کہ بحالات موجودہ اعلا تعلیم کا مقصد صرف کلرک پیدا کرنا ہے تعلیم کے علمی پہلو کو موجودہ صورت میں جو غیر مناسب اہمیت دی جاتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا مقصد بالکل مختلف ہے۔ ایک کلرک کی تربیت کے لیے علمی فلسفہ، اعلا معیار کا حساب اور سیاسی بحث اور مباحثے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندستانی ذہن کو مغرب کے سائنسی علم وفکر کے ساتھ وابستہ کرنے سے ہندستان میں علوم وفنون کے احیا میں مدد ملتی ہے۔ پھر یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ ہندستان میں قومی جذبے کو بیدار کرنے میں یورپ کے سیاسی علم وفکر اور تاریخ کو بڑا دخل حاصل تھا۔ اس کی وجہ سے ہی آخر کار ہندستان کو آزادی نصیب ہوئی۔ اس کے متعلق زیادہ دلایل دینے کی ضرورت نہیں اور ہم یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں گے کہ کئی خامیوں کے باوجود اعلا تعلیم کی وجہ سے ہندستان میں اتحاد کے جذبے کو ترقی اور تقویت حاصل ہوئی۔

روغن قاز

تمکین کاظمی

عرب میں اونٹ زیادہ ہوتے ہیں اور عرب کے اونٹوں کو خارش بھی بہت ہوتی ہے اور اونٹوں کی خارش کی واحد دوائی وہاں روغن خار ہے۔ چونکہ خارش بڑا بے تاب کن مرض ہوتا ہے اور خارشتی حصے میں اکساہٹ اور جلن زیادہ ہوتی ہے اور جب تک اس حصے کو کھجایا نہ جائے یہ جلن کم نہیں ہوتی۔ اس لیے اونٹ اس مرض سے بہت مجبور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کی گردن گو لمبی ہوتی ہے مگر وہ اپنے مونھ سے سارے حصہ جسم کو کھجا نہیں سکتا۔ اور پھر دم تو برائے نام ہی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں روغن خار اونٹ کے لیے اکسیر ثابت ہوتا ہے۔ اور جو شخص بھی خارشتی اونٹ پر روغن خار لگا دے یا ملے اونٹ اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور اس کا اتنا مطیع اور فرماں بردار ہو جاتا ہے کہ اس شخص کے پیچھے پیچھے پھرنے لگتا ہے اس روغن خار کو ہندستان اور ایران والوں نے "قاز" بنا دیا۔ اور "روغن قاز ملنا" ایک ضرب المثل بنا دی جو کسی کو مطیع اور فرماں بردار بنانے کے موقع پر بولی جاتی ہے۔ اس کے بعد بلکل اسی مفہوم میں ایک اور کہاوت کہی جانے لگی۔ مسکا لگانا یا ملنا، اس کا محل استعمال اور مفہوم بالکل وہی ہے جو روغن قاز کا ہے۔

انسان نہایت خدپسند واقع ہوا ہے۔ خدپسندی اور خدستائی اس کی فطرت میں ہے۔ آپ کسی شخص کو ناپسند کرتے ہیں اور پھر اسے لاکھوں روپیے بھی دیں تو بھی وہ اتنا خوش نہ ہوگا جتنا کہ آپ اسے کچھ نہ دیں مگر اس کی تعریف و توصیف کر دیں تو خوش ہوتا ہے۔ دلی کی تاریخوں میں یہ واقعہ لکھا ہوا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے مشہور جاہ سالار اور وزیر خان خاناں کے پاس ایک مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر لے آیا خانخاناں دربار جانے کے لیے سوار ہو رہے تھے ایک نظر تصویر دیکھی، اور اپنے دیوان کو خریدنے کا حکم دے کر چلا گئے۔ دیوان جی نے قیمت پوچھی تو مصور نے کہا میں جانتا ہوں کہ خانخاناں سے اس تصویر کے متعلق بات چیت کر دوں۔ اگر انہوں نے اس کی خوبی کو محسوس کیا ہے اور خوبی کی بنا پر خرید رہے ہیں تو اس کی قیمت لوں۔ ورنہ وہ اس تصویر کو محض شان امارت یا میری امداد کی خاطر خرید رہے ہیں تو قیمت نہ لوں۔ دیوان جی نے مصور کو ٹھہرا لیا۔ جب خانخاناں دربار سے واپس ہوئے تو دیوان نے مصور کا قصہ سنایا۔ خانخاناں نے مصور کو بار یاب کیا اور کہا تم نے جو تصویر بنائی ہے ہمیں پسند آئی۔ اس میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ رنگ آمیزی تم نے بڑی اچھی کی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تم نے جس عورت کو غسل کرتے ہوئے بتایا ہے اس کا تناسب بھی خوب ہے اور خادمہ کے جھانوے سے تلوے رگڑنے پر جو گدگدی پیدا ہو رہی ہے اس کا اظہار تم نے اس عورت کے چہرے سے کیا ہے یہ خاص چیز ہے جسے ہم نے پسند کیا ہے" مصور نے عرض کیا "حضور! اس تصویر کو میں نے یہاں کے بیشتر امرا کے ملاحظے میں پیش کیا ہے۔ مگر کسی امیر نے بھی ان خوبیوں کو محسوس نہیں کیا اس لیے میں نے نہیں بیچی۔ اب جو حضور نے اس کمال مصوری کو محسوس فرمایا اور اسے پسند کیا ہے تو میری طرف سے اس تصویر کو بطور "نذر" قبول فرمائیے۔ میں قیمت کا بھوکا نہیں۔ قدردانی کا خواہاں ہوں" خانخاناں بڑے مبصر تھے۔ انہوں نے تصویر بطور نذر قبول کر لی مصور کی بڑی تعریف کی۔ اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور جب وہ واپس جانے لگا تو ایک لاکھ روپیے اسے

سرفراز کیا۔ آپ یقین مانیں کہ اس مصور کو ایک لاکھ روپے پاکر اتنی خوشی نہیں ہوئی ہوگی جتنی خان خاناں کی تعریف اور قدر افزائی سے ہوئی۔ یہ انسانی فطرت کا راز ہے اور یہ ایسا راز ہے جسے سب جانتے ہیں مگر کام اس سے بہت کم لوگ لیتے ہیں۔

ہر انسان چاہے چھوٹا ہو یا بڑا یہی چاہتا ہے کہ اس کی ہر چیز پسند کی جائے۔ اسے سراہا جائے۔ اس کی داد دی جائے۔ مشہور ہے کہ ایک عورت نے چاندی کے توڑے بنوائے۔ پاؤں میں پہن کر گھومتی رہی مگر کسی نے تعریف کی اور نہ پوچھا، دو ایک دن تو اس نے صبر کیا۔ مگر اس سے زیادہ ضبط نہ کر سکی۔ اتفاق سے ان دنوں کوئی میلا جاترا عرس وغیرہ بھی ہونے والا نہیں تھا۔ اور نہ ہی پڑوس یا گاؤں میں کسی کی شادی یا اور کوئی تقریب ہو رہی تھی جو لوگ اکٹھے ہوتے اور یہ اٹھلاتی ہوئی گذرتی تو توڑے دیکھتے اس لیے اس نے خود لوگوں کو جمع کرنا چاہا۔ کسی کی شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اور کوئی تقریب یا طریقہ سمجھ میں نہیں آیا جھٹ اپنے گھر کے چھپر میں آگ لگا سامنے بیٹھ کر لگی رونے اور دونوں پاؤں آگے رکھے تاکہ آنے والوں کی نظر پاؤں پر پڑے۔ جوں ہی دھواں اٹھا اور شعلے بلند ہوئے لوگ جمع ہونے لگے۔ اور سب مل کر آگ بجھانے۔ جب آگ بجھانے والوں کا مجمع خاصا ہو گیا اور آگ پر قابو پا لیا گیا تو لوگوں کی توجہ آگ کی طرف سے ہٹی اور وہ اس عورت کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہر شخص نے ہمدردی کی بعضوں نے وجہ پوچھی، بعضوں نے تسلی دلاسا دیا۔ مگر ایک شخص کی نظر توڑوں پر بھی پڑ گئی۔ اور اس نے پوچھا "یہ توڑے کب بنوائے؟ یہ تو بڑے اچھے ہیں۔" اس استفسار پر توڑے والی کو نہ صرف سکون ملا بلکہ جھنجھلاہٹ بھی ہونے لگی اور بگڑ کر کہنے لگیں "کم بخت! کل پوچھ لیتا تو میں گھر کیوں جلاتی؟" اس قصے کو آپ غلط سمجھ کر بھول نہ جائیں یہ فطرت انسانی کا گہرا راز اور نفسیات کا بڑا اہم مسئلہ ہے۔

بمبئی کی ایک بہت بڑی ہوٹل کے مالک تھے جن کا تعلق حیدرآباد سے بھی تھا مشہور ہے کہ کسی بہت بڑے شخص کی دعوت کی اور اسے ایک چھوٹے سے اسٹیمر میں بٹھا کر تفریح کناں دریا میں بھی لے گئے اور آپ نے معزز مہمان کی تواضع اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر کرنی چاہی۔ مگر جب اسٹو جلانے لگے تو وہ خراب پایا گیا جھٹ آپ نے جیب میں سے نوٹوں کا گڈا نکالا اور جلانا شروع کر دیا۔ جب جیب خالی ہو گئی تو قلمدان منگوایا۔ اور ہزاروں نوٹ جلا کر چائے بنائی اور مہمان کو پلائی۔ فرمایئے ایک پیالی چائے کتنے ہزاروں روپیے کی ہوگی۔ یہ کیا تھا شان امارت کا اظہار۔ اور اپنی خود پسندی کی تسکین اور پھر یہ شہرت کہ نوٹوں کو جلا کر چائے بنائی ہے! ممکن ہے کہ لوگ اس قصے کو بھی گپ خیال کریں۔ مگر نہیں یہ واقعہ اور بالکل صحیح واقعہ ہے یہ نوٹ جلانے والے بزرگ حیدرآباد ہی میں رہتے ہیں اور میں ان کی خدمت میں خاصا رسوخ رکھتا تھا۔ ان کی فطرت کا میں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بالکل اسی ڈھب کے آدمی تھے کہ ذرا سی نمود و نمائش کے لیے گھر پھونک دیں۔

یہ دونوں قصے میں نے اس لیے سنائے ہیں کہ آپ سمجھ جائیں کہ جاہل ہو یا تعلیم یافتہ امیر ہو یا غریب سبھوں کو اپنی "انا" کی تسکین اور جذبہ خودستائی کی تشفی مقصود ہوتی ہے۔

میکسیکو کے محل سالون ٹیپ میں جنرل اوبرگان کا جو مجسمہ نصب ہے اس کے نیچے یہ مقولہ کندہ ہے۔

"دشمن سے نہ ڈرو جو تم پر حملہ آور ہو رہا ہے
اس دوست سے ڈرو جو تمہاری خوشامد اور
چاپلوسی کرتا ہو۔"

انگلستان کے قصر بکنگہم کے کتب خانے میں چند تختیاں بہترین مقولے کھدوا کر لگائی گئی ہیں جن میں سے ایک پہ یہ عبارت ہے۔

"اے خدا مجھے ناواجبی تعریف کرنے اور سننے سے بچا"

خدستائی کی تمنائیں تو ہر انسان میں ہوتی ہے مگر بعض میں کم اور بعض میں زیادہ ہوتی ہے جہاں تک میں نے غور کیا ہے علم اور عمل اس جذبے میں توازن پیدا کر دیتا ہے۔ علما اس مرض میں کم اور عملی لوگ ان سے کم مبتلا نظر آئے۔ جہلا اور کم تعلیم یافتہ طبقہ اس میں زیادہ مبتلا پایا گیا اور لو دولتے خصوصیت سے بری طرح مبتلا نظر آئے۔ آپ نے بادشاہوں کے قصے سنے ہوں گے ان بیچاروں کا حال خارشتی اونٹوں کا سا ہوتا تھا کہ انہیں دن رات خارش ہوتی رہتی اور تاوقتیکہ ان پر روغن خارزنہ ملا جائے چین نہ آتا۔ چنانچہ مصاحبین کے گروہ کے گروہ اس فرض کو انجام دیتے اور یہ قول سعدی شیرازی بادشاہ کہتا کہ "یہ دن نہیں رات ہے" تو مصاحبین فوراً چاند اور تارے بھی دکھانے لگتے۔ چنانچہ اس بیماری نے بادشاہوں کے ساتھ امرا اور خوشباش لوگوں پر بھی اثر کر کے سبھوں کو مبتلا کر لیا تھا ان کا اثر عوام پر بھی ہو گیا تھا اور ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ میری منت خوشامد کی جائے۔ اور مجھے سراہا جائے۔

ہمارے ایک بزرگ نے اس فلسفے کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ ؎

جانور فربہ شود از راہ نوش

آدمی فربہ شود از راہ گوش

یہ خوشامد پسندی دوسرے معنی میں ایک بیماری ہے، جس سے دل و دماغ بالراست متاثر رہتے ہیں اور کان کے ذریعے اس بیماری کا علاج ہو سکتا ہے مگر نہیں یہ علاج نہیں بلکہ اس اشتہا کی تسکین ہے جو خدستائی کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ جس کا ذریعہ کان ہیں۔ جس طرح سے کہ بھوکے کو کھانے کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کی تکمیل مونھ کے ذریعے ہوتی ہے اسی طرح اس مرض میں بھی مریض کو ایک قسم کی بھوک ہی رہتی ہے اور جس قدر تعریف و توصیف کانوں سے سنتا ہے اتنا ہی اس کو لذت و قوت حاصل ہوتی ہے اور وہ پھولتا جاتا ہے۔

بریڈلے کا خیال ہے کہ "فطری احتیاجات و اشتہاآت کی تشفی ہی سے ہماری ذات کی بڑی حد تک تکمیل ہوتی ہے ان احتیاجات میں بدن اور ذہن و روح دونوں کی ضروریات شامل ہیں اور ان کی تکمیل سے لذت پیدا ہوتی ہے۔ اب رہی یہ بحث کہ احتیاجات فطری ہیں یا غیر فطری؟ اور اس سے بقائے روح و بدن ہے یا نہیں بلکل الگ ہے ہم اسے حضرات فلسفا کے لیے چھوڑ دیتے ہیں"

بظاہر یہ ایک مذموم جذبہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی تعریف سے خوش ہو مگر آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ خدپسندی اور خدستائی فطرت میں داخل ہے۔ آدمی تو خیر آدمی ہے جانوروں میں بھی یہ جذبہ پایا جاتا ہے آپ گھوڑے کو تھپک تھپا کر شاباشی دیں تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ ایک انداز تفاخر سے اپنی گردن خم کر لے گا۔ اور ایک خاص طرح ہنہنائے گا۔ اس طرح بیشتر پالتو جانور اس جذبے سے متاثر نظر آئیں گے غور کیجیے جب جانوروں میں یہ جذبہ موجود ہو تو انسان میں کیوں نہ ہو؟

چھوٹا مونھ بڑی بات ہے مگر کسی نے بلکل صحی کہا ہے کہ

ع سچ تو یہ ہے کہ خوشامد سے خدا بھی راضی!

ساری الہامی کتابیں دیکھیے اللہ میاں نے ہر جگہ اپنی بڑائی ظاہر کی ہے اور اونٹ سے لے کر چیونٹی تک کی تخلیق پہ فخر ہی کیا ہے۔ پھر غور فرمایئے جب اللہ میاں میں یہ جذبہ موجود ہو تو بندوں میں کیوں نہ ہو۔ اس لیے پیغمبروں نے اللہ کے بعد ہی اپنا نام رٹنے کا حکم دیا اور بادشاہوں نے اللہ رسول کے بعد اپنا نام خطبے میں شریک

کر ڈالا۔ پیر و مرشد بھی تو روحانی مملکت کے شہنشاہ ہیں انہوں نے بجائے بادشاہ کے خدا رسول کے بعد اپنا اسم پاک شریک ورد کر دیا بلکہ جب مرید پہلے پہل آیا تو انہوں نے اللہ رسول کو نہ وہی رکھا۔ اپنی ہی تصویر دیدی کہ خیال تصور شیخ کرتے رہو۔ جب ہم تمہیں کامل پائیں گے تو اللہ اور رسول سے ملائیں گے۔

اس خشامد پسندی اور خدپرستی سے دنیا کو نقصان بھی پہنچا اور نفع بھی۔ اب یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ نفع زیادہ ہوا یا نقصان؟ مگر واقعات دونوں قسم کے سامنے آتے ہیں۔ بعض حکما محض اس لیے قتل کر دیے گئے کہ انہوں نے بعض امرا یا بادشاہوں کی مدح و ستائش نہیں کی۔ یا ان کے حسب منشا کام نہیں کیا۔ بعض علما کو بھی اسی الزام میں مروایا گیا۔ اور بعض عمدا عمدا کتابیں جلوا دی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بادشاہوں وزیروں اور امیروں نے لاکھوں حکما، علما، شعرا کی سرپرستی بھی کی۔ انہیں فکر دنیا سے مستغنی کر دیا۔ اور وہ لوگ اطمینان سے بیٹھ کر علمی ادبی خدمات انجام دیتے رہے بہترین تراجم کرائے عمدا ترین کتابیں لکھوائیں۔ نفیس ترین کارنامے محفوظ کرا دیے۔ فردوسی سے داغ اور جلیل تک لاکھوں شعرا انہیں خوشامد پسند بادشاہوں کے نمک پروردہ تھے "شاہنامہ" جیسا لافانی شاہکار خشامد پسند محمود غزنوی ہی کی وجہ سے یادگار ہے۔ سعدی کی گلستاں مولانا روم کی مثنوی، ابن المقفع کی کلیلہ دمنہ اور بعض ہندی شعرا کی بہترین تصانیف انہیں خد پسند بادشاہوں اور راجاؤں کی مرہون منت ہیں۔

اردو کے بہترین شعرا بادشاہوں امیروں اور رئیسوں ہی کی وجہ سے فارغ البال رہے اور ان کے دیوان انہیں لوگوں کی امداد اور توجہ کا نتیجہ ہیں۔ دکن میں ولی۔ داؤد سراج آزاد، شفیق، عاجز شاہ، تجلی ایمان فیض، فیاض باقی، شاد، عزیز، کیفی، توفیق، صفی سب ہی بادشاہوں وزیروں اور امیروں کی وجہ سے شاعری کر سکے ورنا ان لوگوں کی شاعری کا پتا بھی نہیں لگتا۔

میر تقی میر۔ منت، درد، جرات، مصحفی، مومن، غالب ذوق، آتش، ناسخ، اسیر جلال، داغ، امیر، ریاض، کوثر، جلیل، فانی، اکبر سب ہی کسی نہ کسی سے وابستہ رہے یا تو بعض امرا نے سرپرستی کی یا وظیفہ دیا، ملازمتیں دیں یا یوں ہی بلا نظر تنخواہ نوازتے رہے۔ بہر حال ان لوگوں کی عمروں کا بیشتر حصہ امداد و اعانت ہی کی وجہ سے بسر ہوا۔

علم و حکمت، فلسفہ و منطق ادب اور سیر کی بہترین کتابیں انہیں خد پسند بادشاہوں اور امیروں کے ناموں سے معنون ہوئیں اور اب تک لوگوں کو ان کتابوں سے فیض پہنچ رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہوا کہ بعض تنخواہ یاب شعرا یا ادبا نے اپنے دیوان یا تصانیف ان امرا کی نذر کر دیے اور ان شہرت کے بھوکوں نے ان کتابوں کو اپنے نام سے چھپوا لیا۔ مگر اس میں ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ شاعر یا ادیب اپنے نکمے پن اور افلاس و تنگدستی کی وجہ سے کتاب یا دیوان بیچ لے تو خریدار کا کیا قصور ہے؟ اس نے روپیہ دے کر لیا اور اپنے نام سے شہرت دی۔ مولانا شبلی نے بعض کتابیں لکھ کر بیچ دیں، جو دوسروں کے نام سے چھپیں۔ بعض لوگوں نے شعرا کو نوکر ہی اس لیے رکھا تھا کہ غزلیں کہدیا کریں۔ یہ تو خیر یہیں اپنا ہندستان میں ہوا ہے۔ یورپ میں بھی تو ہوتا ہے۔ وہاں تو باقاعدہ ادارے ہیں جو فرمائش پر کتابوں کی کتابیں مرتب کر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جنہیں خریدار اپنے نام سے چھپوا لیتا ہے۔

یہ تو تھیں علمی ادبی باتیں۔ اب ذرا عملی باتیں بھی سن لیجیے۔ جس طرح کہ ایک شاعر فطری طور پر موزونی طبع لے کر پیدا ہوتا ہے، بالکل اسی طرح لوگوں میں خشامد و چاپلوسی کرنے اور روغن قاز ملنے کا مادہ فطری ہوتا ہے۔ اور وہ

اس عمدگی سے خشامد کرتے اور روغن قاز ملتے ہیں کہ اچھے اچھے نفسیات داں حیران رہ جاتے ہیں۔ بدنصیبی سے میں ایسے لوگوں سے بہت زیادہ واقف ہوں۔ چند بزرگوں کا حال آپ بھی سن لیجئے۔

ایک صاحب نے جو واجبی تعلیم یافتہ تھے اس خصوص میں خاص دماغ پایا تھا۔ انہوں نے معمولی اہلکاری سے ترقی کرتے کرتے گزیٹیڈ خدمت تک حاصل کر لی۔ مگر بلند ہمتی پھر بھی قناعت نہیں کرنے دیتی تھی۔ ایک دفعہ ترقی کا سلسلہ اٹھا تو آپ نے اپنے مقتدر عہدے دار کو اس طرح متاثر کیا کہ ایک نئی موٹر خریدی، اور اس میں پھولوں کی جھنگیر اور مٹھائی کی کشتی رکھ کر خالی موٹر لیے ہوئے عہدیدار عالی کے گھر پہنچے، اور اس سے عرض کیا کہ فدوی نے نئی موٹر خریدی ہے۔ سرکار اس میں تشریف رکھ کر درگاہ شریف تشریف لے چلیں۔ اس عہدے دار نے لاکھ انکار کیا۔ مگر انہوں نے صاف کہدیا کہ جب تک سرکار نئی موٹر میں قدم نہ رکھیں میں اس میں نہیں بیٹھوں گا۔ چنانچہ مجبوراً انہوں نے موٹر میں بیٹھ کر درگاہ شریف کی زیارت کی۔ پھول چڑھائے فاتحہ دی اور دوسرے ہی روز ان صاحب کی ترقی کی تجویز بھی کی۔ انہیں عہدے دار کی بیوی اللہ کو پیاری ہوگئیں تو ایک صاحب نے مرحومہ کو جنت میں دیکھا۔ اور اپنا خواب ان کو سنایا۔ پھر کیا تھا نہ صرف فرسٹ گریڈ پر ترقی ملی بلکہ پوری تنخواہ کا وظیفہ بھی ہو گیا۔ اور مکان کی تعمیر کے لیے اس برگزیدہ عہدیدار نے کئی ہزار روپیے بھی دلائے۔

ایک انگریز عالی عہدے دار دورہ کرتے ہوئے ایک تعلقے میں داخل ہوئے تو ٹھیک دوپہر کے وقت ایک ندی کے کنارے ان کی موٹر خراب ہوگئی۔ اور ایسی شدید خراب ہوئی کہ چلنے کا نام بھی نہ لیتی تھی۔ ابھی ابھی گھنٹے کی دوپہر کی دھوپ صاحب بہادر کی چوٹی کا پسینہ ایڑی تک پہنچا رہی تھی کہ تحصیلدار صاحب دوڑتے ہوئے آئے۔ اور سراسیمگی کے عالم میں ایک طرف بچھائے اور دس ہی منٹ میں صاحب بہادر سے امرائی میں چلنے کے لیے عرض کیا اور صاحب کو امرائی میں لے جا کر ایسے جھنڈ میں بٹھا دیا جو نہایت ہی ٹھنڈا اور فرحت انگیز تھا۔ اور تھوڑی ہی دیر کے بعد میزیں جمائی گئیں اور بہترین لنچ صاحب کو کھلایا گیا۔ جب صاحب لنچ سے فارغ ہوئے تو موٹر بھی درست تھی۔ اور صاحب ٹھنڈے ٹھنڈے براج رہے تھے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ اتفاق تھا۔ یہ حادثہ اتفاقی نہیں بلکہ سازش کا نتیجہ تھا۔ تحصیلدار نے پہلے سے سارے انتظام کر رکھے تھے۔ صاحب کے ڈرائیور کو ملا کر اسے آمادہ کیا گیا تھا کہ یہاں موٹر روک دے۔ اور یہ باور کرائے کہ خراب ہوگئی ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مگر صاحب بہادر اسے اتفاقی حادثہ سمجھتے رہے اور تحصیلدار کے انتظام اور صلاحیت کے اتنے قائل ہوگئے کہ دورے سے واپس جاتے ہی دوم تعلقداری پر ترقی دی اور پھر چند ہی سال کے بعد اول تعلقدار کر دیا جو بعد کو صوبے دار ہوگئے۔ یہ ذرا بڑیا قسم کے "خشامدی" تھے۔ ان کے بعد والے لوگوں کی تو کمی نہیں۔ اور کئی ایک ٹولیاں ان کی ہمیشہ تیار رہی اور اب تک ہیں۔

میں ایسے بزرگوں سے ذاتی طور پر واقف ہوں۔ جنہوں نے صرف اپنی خشامد اور چاپلوسی سے بڑی ترقی کی اور اب خوش حال ہیں۔ ہر طبقے میں اس قسم کے بزرگ موجود ہیں۔ ملازمت وکالت تجارت ٹھیکیداری انتہا یہ کہ ادب اور اتنا مین تک یہ لوگ اسی خشامد اور

چاپلوسی سے کام چلا لیتے ہیں، اور خوب چلاتے ہیں۔

میرے ایک دوست بڑے کنٹراکٹر تھے جنگ کے زمانے میں ایک انگریز سے انہیں ٹھیکا منظور کرانا تھا اس لیے انہوں نے صاحب بہادر کو تیتر کا شکار کرایا۔ وہ اس طرح کہ ایک باغ میں جہاں گنجان درخت تھے پر قینچ کیے ہوئے یعنی پر کاٹے ہوئے تیتر ہزاروں کی تعداد میں چھڑوا دیے۔ یہ غریب تیتر صرف پھدک سکتے تھے۔ اڑ نہ سکتے تھے کیونکہ ان کے پر کاٹ دیے گئے تھے۔ صاحب بہادر نے ایک ایک فائر میں پچاس پچاس تیتر شکار کیے اور بہت خوش تھے کہ واہ رے میں کیا شکاری ہوں۔ انہیں کیا پتا تھا کہ اس طرح تیتر ادھ موے اور پر کٹے تھے۔ تیر ان صاحب نے کام نکال لیا۔ اور خوب نکالا۔ اس طرح عہدے داروں کو فراہم کر کے انہوں نے خوب ترقی۔

میرے ایک دوست ایسے وکیل تھے جن کی وکالت چل نہیں رہی تھی۔ انہوں نے ایک یتیم خانا قایم کر لیا اور ایک سشن جج کو یتیم خانہ کا سرپرست بنا دیا۔ اور گھڑی گھڑی یتیم خانے کا رجسٹر لے کر ان کے پاس آنے جانے لگے بلکہ ایک دفعہ جج صاحب کے ساتھ دورے پر بھی ہو آئے۔ بس پھر کیا تھا سشن کے مقدمات انہیں خوب ملنے لگے۔ اور ان کی وکالت چمک گئی بعض بڑی بڑی فرموں کے مالک فرم دار عہدے داروں کی خشامد کر کے ڈریس سامان بجلی کی فٹنگ وغیرہ کے آرڈر اتنے لے لیتے ہیں کہ ان کا کاروبار چمک جاتا ہے۔ ایسے احباب بعد کے فضل سے اب بھی موجود ہیں۔

ادب اور انشا کے خشامدیوں کا حال کیا عرض کروں ایک بزرگ نے کمال کیا کہ اپنی کلیات میں سے ہر ردیف کی چند چند غزلیں نکال کر ایک دیوان مکمل کر دیا اور اسے ایک معتمد کے نام سے چھپا کر سارے نسخے گذران دیے۔ معتمد صاحب نے اس دیوان کو بکمال افتخار و تکبر تقسیم کر دیا۔

اور ان بزرگ کے بیٹے کا تقرر دوم تعلقداری پر ہوگیا۔

یہ ایسے ٹھکلے ہیں جو معمولی "روغن قاز" ملنے والے کر لیتے ہیں۔ مگر خاص دماغ دار لوگ بڑی بڑی ترکیبیں کرتے ہیں۔ ایک بہت بڑے عہدے دار کی مدت ملازمت ختم ہو رہی تھی۔ توسیع کے امکانات فی صدی پچانوے تھے امروز فردا میں احکامات کی وصولی کی توقع تھی کہ ایک صاحب کو دور کی سوجھی اور انہوں نے صبح صبح بنگلے پر جا کر اطلاع دی کہ گذشتہ رات میرے خاب میں فلاں بزرگ تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ ہم نے توسیع منظور کر دی ہے اللہ مبارک کرے۔ ان عہدے دار نے ان صاحب کا نام پتا نوٹ کر لیا۔ اور چونکہ نہایت ہی قبر پرست واقع ہوے تھے اس لیے یقین بھی کر لیا۔ اتفاق سے نو دس بجے ٹیلیفون پر انہیں مبارک باد پہنچی کہ آپ کی توسیع منظور ہو گئی ہے پھر کیا تھا۔ ان خاب دیکھنے والے صاحب کا طوطی بولنے لگا۔ اور انہوں نے نہ صرف نوکری پائی بلکہ ترقی پر ترقی کی اور خاصی ترقی کی۔

ترانۂ دل

اعتبار الملک جناب دل شاہجہاں پوری کا مجموعہ کلام تازہ موسوم بہ ترانۂ دل مع نعتیہ دل اعلیٰ کاغذ بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ بہت جلد لکھنو سے شایع ہو رہا ہے۔ ضخامت ۳۵۰ صفحات۔ مجلد قیمت ۸ روپے جدید بسیط مقدمہ علامہ نیاز فتحپوری کا بھی شامل ہے۔ تا بقین فوراً آرڈر بھیجیں ورنہ ممکن ہے کہ طباعت ثانی کا انتظار کرنا پڑے۔

پتا
محلہ ہاتھی تھان۔ شاہجہاں پور (یوپی)

پنجابی ڈرامے کا ارتقا

۱-۱

سرزمین پنجاب میں ڈرامے کی نشو ونما بڑی حد تک عوامی روایات کی مرہون منت ہے یوں تو سنسکرت ڈراموں کے ترجمے بھی ہوئے لیکن ان کا اثر قطعی عبوری رہا۔ بھائی ویر سنگھ نے سکھ مت کے دھارمک مقاصد اور بنیادی خیالات کو ڈرامے کے روپ میں پیش کیا لیکن یہ ڈرامے اسٹیج کرنے کی بہ نسبت پڑھنے کے لیے لکھے گئے تھے۔

بہر حال پنجاب میں لوک ڈرامے کی روایات کے بیج ہمیشہ پائے جاتے رہے۔ گویوں کا ایک گروہ جسے "ڈھاڈی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے گاؤں گاؤں گھوم کر رزمیہ نظموں کے سورماؤں، سکھ گوروؤں اور عوامی کہانیوں کے ہیروؤں کے بارے میں گیت سنایا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ خانہ بدوش بھانڈ اور مراثی بھی تھے جو نہ صرف افسانے سنایا کرتے بلکہ کہانیوں کو ڈراموں کے رنگ میں ایکٹنگ کے ذریعے پیش کیا کرتے تھے ان کے تاریخی قصے عموماً زبانی ہوا کرتے۔

جدید ڈرامے کی روایات کی داغ بیل پروفیسر آئی۔ سی نندا کے ہاتھوں پڑی جنہوں نے ۱۹۱۴ء میں پہلا ڈراما لکھا۔ یہ ڈراما ایک نئی نویلی دلہن اور ہمارے سماج میں اس کی قسمت کے ارد گرد گھومتا ہے۔ اس کے بعد بھی موصوف نے کئی ڈرامے لکھے۔ یہ تمام کے تمام سماجی موضوعات سے بحث کرتے ہیں۔ پروفیسر نندا نے ایک ایکٹ کے ڈرامے اور طویل ڈرامے بھی لکھے ہیں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان جذبات پر ڈراموں کی پرانی روایات کی دیوار ڈھا دی جن میں جابجا گیت ہوتے ہیں۔ پنجاب میں یہ چیز ہندستانی کی خصوصیت تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ان گنت تصانیف کے ذریعے ڈرامے کے روپ کو مقبول بنایا۔ خصوصاً کالجوں میں ان کی مقبولیت بہت بڑھ گئی۔ نندا کے بعد ہرچرن سنگھ موہن سنگھ، روشن لال آہوجا، امریک سنگھ، گوردیال سنگھ پھول بلبیر سنگھ جی۔ ایس کھوسلا اور بلونت گارگی نے ڈراما نویسی میں شہرت حاصل کی۔

گارگی پنجابی ڈراما نویسوں میں ایسی حیثیت کے مالک ہیں جن سے دوسرے ہمعصر ڈراما نگاروں نے خوشہ چینی کی ہے۔ گارگی نے ایکانکی ڈرامے بڑی تعداد میں لکھے ہیں۔ آدھ درجن سے زیادہ طویل ڈرامے ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ انہوں نے مغربی طرز اور ڈھنگ کو تو اپنا لیا ہے لیکن موضوع کے لحاظ سے وہ پنجاب کی سرزمین کا عکس پیش کرتے ہیں۔ جن میں یہی روایات کی خوب صورتی اور قوت کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ ان کے ڈرامے "کیسرو" اور "کنک دی بلی" پنجاب کے دیہی علاقوں کا خوب صورت مرقع پیش کرتے ہیں۔ ان کا ڈراما "لوہا کٹ" گاؤں کے لوہار کے ہتھوڑوں کی صدا سے گونجتا ہے۔

پنجابی ڈرامے میں سماجی حقیقت پسندی کی روایات کے ساتھ ساتھ ایک ایکٹ کی غنائی تمثیل نگاری کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شیلا بھاٹیا کا نام سب سے اہم ہے۔ ان کے گیتوں میں تغزل بھی ہوتا ہے۔ اور غنائیت بھی۔

چنانچہ انہوں نے تمثیل نگاری کے ذریعے ڈرامے کے ڈھانچے میں دھرتی کی محبت اور گیت کا پریم بھر دیا ہے

پنسلین کا موجد

ال۔ لوڈو ویسی

لندن کے پیڈنگٹن ڈسٹرکٹ میں واقع سینٹ میری ہسپتال کے ایک دروازے پر "رائیٹ فلیمنگ انسٹی ٹیوٹ آف مائیکرو بیالوجی" کے شبد لکھے ہیں۔ یہ انسٹی ٹیوٹ دنیا کے دو عظیم ماہرین جراثیم اور برطانوی طب کے ایک شاندار دور کی یادگار ہے۔ ایلمر اتھ رائیٹ نے یہ دریافت کیا تھا کہ ٹیکے کے ذریعے کس طرح ٹائیفائیڈ کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔ اور الیگزینڈر فلیمنگ نے پنسلین ایجاد کی۔

رائیٹ فلیمنگ کا گرو تھا۔ اس کو انتقال کیے عرصا ہوا اور حال ہی میں ۷۳ سال کی عمر میں فلیمنگ بھی انتقال کر گیا۔ مرنے سے پہلے اعلان کیا تھا کہ وہ رائیٹ فلیمنگ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائیرکٹر کے عہدے سے ریٹائیر ہو رہے ہیں۔

فلیمنگ کا باپ اسکاٹ لینڈ کا ایک کسان تھا۔ ۱۴ سال کی عمر میں فلیمنگ تعلیم حاصل کرنے لندن گیا۔ اور اسکولی تعلیم ختم کرنے کے بعد ایک جہازی دفتر میں کام کرنے لگا۔ تھوڑی سی رقم جو اسے ورثے میں ملی تھی اس کی مدد سے وہ سنہ ۱۹۰۱ء میں سینٹ میری ہسپتال میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے لگا۔ اور ایک طالب علم کی حیثیت سے شاندار کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد وہ رائیٹ کی نگرانی میں کام کرنے والی ریسرچ ٹیم میں شامل ہو گیا جبکہ وہ داخل ہوا ہے اس وقت سینٹ میری ہسپتال میں رائیٹ کی تجربہ گاہ، دنیا بھر کے ڈاکٹروں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اور ان کے حیران کن طبی نظریوں نے برنارڈ شا کو "ڈاکٹر کی مشکل" نام کی کتاب کے لیے مواد مہیا کیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران فلیمنگ رائیٹ کی ٹیم کے ساتھ فرانس گیا۔ اور وہاں اس نے سڑانڈ پیدا کرنے والے اور پیپ بھرے زخموں کا جن کی وجہ سے بے شمار جانیں ضائع ہو رہی تھیں مطالعا کیا۔ اس کے تجربے جنہیں اب "کلاسیکی" حیثیت حاصل ہے۔ دافع عفونت کیمیاوی دواؤں کی صورت میں بہ شکل یقین بدل گئے اور اسی ہستی نے دنیا کے لیے ایک نہایت کارآمد اور موثر دافع عفونت دوا۔ پنسلین۔ ایجاد کی۔

سنہ ۱۹۲۸ء کی بات ہے کہ وہ ایک تجرباتی پلیٹ میں جراثیم کی نشو نما کا مطالعا کر رہا تھا۔ اس پلیٹ پر پھپوند کا ایک چھوٹا سا نشان پڑ گیا۔ اور اس جگہ کے جراثیم ہلاک ہو گئے۔ پلیٹ خراب ہو گیا۔ اس نے لکھا ہے کہ "خراب پلیٹ کو پھینکنے کی بجائے میں نے اس کا مشاہدا کیا۔" جس چیز نے اس پلیٹ کو خراب کر دیا تھا وہی پنسلین کی ایجاد کی بنیاد قرار پائی۔

اس نے بڑی کوشش کی کہ وہ پنسلین کو دافع عفونت کی ایک عام دوا بنانے کا کوئی طریقا تلاش کرے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ "میں اکیلا تھا۔ لیباریٹری کے بعض جونیر سائنس دانوں کی مدد سے تھوڑا بہت کام کیا۔ پنسلین کے متعلق ہم نے بہت سی باتیں معلوم کر لیں لیکن اس کے آگے نہ جا سکے۔"

اس عرصے میں لندن اسکول آف ہائی جین اینڈ ٹراپیکل میڈیسن کے پروفیسر ہیرلڈ ریس ٹرک نے پنسلین کے متعلق فلیمنگ کا ایک مضمون کسی سائنٹفک جرنل میں پڑھا۔ اور اس نے فلیمنگ کی دریافت کی ہوئی چیز کے متعلق تحقیق کرنے کا فیصلا کیا۔ لیکن یہ شخص بھی کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکا۔

سنہ ۳۲ء میں آکسفورڈ کے سر ولیم ڈن اسکول آف پیتھالوجی کے پروفیسر ہاورڈ فلوری اور ڈاکٹر ای۔ بی۔ چین نے پنسلین کے متعلق تحقیقات کرنے کا فیصلا کیا۔ سنہ [illegible] میں

جب دوسری جنگ زوروں پر تھی فلورے نے ۵۰ چوہوں کو زہریلے جراثیم کا ایک سخت انجکشن دیا۔ ان میں ۲۵ چوہوں کا علاج نہیں کیا گیا تھا۔ اور باقی ۲۵ کو پنسلین دی گئی۔ جن چوہوں کا علاج نہیں کیا گیا تھا وہ ۱۶ گھنٹوں کے اندر مر گئے۔ اور جن کو پنسلین دی گئی تھی ان میں ایک کے سوا باقی سب بچ گئے۔ فلورے نے ٹیلیفون پر اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ "یہ تو ایک معجزا ہے" اور یہ واقعی ایک معجزا تھا۔ پنسلین کی مدد سے دوسری جنگ عظیم کے بے شمار زخمیوں کو بچا لیا گیا۔

آج ۲۵ سال بعد پنسلین کا گھر گھر میں چرچا ہے اور دنیا کے ہر حصے میں ان گنت لوگوں نے اس کی جان بچانے والی طاقت کا تجربا کیا ہے اس کامیابی پر فلیمنگ فلورے اور چین کو نوبل پرائز ملا۔ جو کام فلیمنگ نے لندن کے سینٹ میری ہسپتال میں شروع کیا تھا اسے آسٹریلوی باشندے فلورے اور چین (یورپی یہودی جس نے برطانیا میں پناہ لی تھی) نے آکسفورڈ میں پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ اور ان کے ریسرچ کرنے والوں کی ایک شاندار ٹیم نے جسے اب آکسفورڈ ٹیم کہا جاتا ہے مدد کی تھی۔

نادر ہندستانی ٹکٹ

حال ہی میں لندن کے ایک فرم کے نیلام گھر میں چار آنے والا سو سال پرانا ایک ٹکٹ جس پر ملکا وکٹوریا کا چہرا الٹا چھپا ہوا ہے۔ فروخت کیا گیا اور اس کے خوش قسمت مالک نے ۲۵۰ پونڈ قیمت وصول کی۔ یہ ٹکٹ حال ہی میں اسکول کی ایک لڑکی کے جمع کیے ہوئے ٹکٹوں میں سے ملا تھا۔

کل ہند وارثی مشاعرہ

(لکھنو)

(سال نمبر ۱۵)

آل انڈیا انجمن وارثی کا اکیاونواں سالانا کل ہند مشاعرہ جس میں ممالک غیر کے بھی متعدد فارسی گو شعرا شرکت فرماتے رہتے ہیں اپنی تمام روایتی اور تاریخی خصوصیات کے ساتھ حسب دستور ۲ اپریل ۱۹۵۵ء کی شب میں قایم رہ کر دوسرے دن (دوپہر تک) ختم ہوگا۔ امسال بھی مثل پچھلے برسوں کے انہیں طرحوں اور تاریخ پر حسب ذیل مقامات میں وارثی مشاعرے ہوں گے۔

بمبئی - عدن - خان یونس - کراچی - راولپنڈی
حیدرآباد - کلکتا - ڈھاکا - چاٹگام - رنگون -

(یہ مشاعرے مرکزی مشاعرہ لکھنو کے علاوا ہوں گے)

پہلا دور فارسی مصرع طرح :-

"یہ ہر سوے جمال یار طرح آستاں دارد"

دوسرا - اردو :-

ہر اک جانب نظر آیا اوہیں کا آستاں ہم کو

ارباب ذوق وشوق سے شرکت کی استدعا کی جاتی ہے - داخلا بذریعہ پاس فری ہوگا جو حسب طلب ارسال کیے جاتے ہیں۔ قبل سے تشریف آوری کی اطلاع پر قیام وطعام کا انتظام رہے گا۔

الداعیان

شاہ بیدل وارثی ناظم مشاعرہ۔ علی وارث راہی وارثی۔ محمد طلحہ ایڈوکیٹ (لکھنو) محمد ظہور وکیل۔ پروفیسر سلام سندیلوی۔ جعفر سندیلوی نائب منجانب: مولانا سید انور موہانی وارثی بانی انجمن وارثی مشاعرہ کے متعلق خط وکتابت کا پتا :-

ناظم مشاعرہ وارثی - دفتر جام جہاں نما مولوی گنج لکھنو (یو پی)

تائی وان

(فارموسا) چین ہان سینگ

ایک چمکیلے اور صاف دن کو صوبا فوکین کے ساحل سے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کوئی بھی شخص دور افتادہ کوہستانی سلسلے کی ایک مدھم لکیر کو پہچان سکتا ہے۔ یہ کوہستانی سلسلا شمال سے جنوب کی طرف لگ بھگ ۲۳۶ میل تک پھیلا ہوا ہے اس کی ۶۲ چوٹیاں ہیں جو ۹ ہزار فٹ سے بھی زیادہ بلند ہیں۔ اور ایک چوٹی تو سمندر کی سطح سے ۱۲۹۵۰ فٹ اونچی ہے۔ تائی وان کے اوپر کا پرشکوہ آسمان کچھ اسی طرح کا ہے جو چین کا سب سے بڑا جزیرا اور اور سب سے چھوٹا صوبا ہے۔ اسے عارضی طور پر بیرونی قوتوں نے مادر وطن چین سے الگ کر رکھا ہے۔ اور ہمارے عوام اسے آزاد کرانے کا تہیا کر چکے ہیں۔

پہاڑوں کے دامن میں واقع تائی وان کے زرخیز مغربی میدان، چاول، گنے، انناس اور لیموں کی نہایت اچھی فصل فراہم کرتے ہیں۔ شمال مغرب کی ایک وادی اپنی چائے کے لیے بہت مشہور ہے۔ تائی وان کا ۲/۳ جزیرا جنگلات سے اٹا پڑا ہے۔ جو دوسری اشیا کے علاوہ دنیا کا ۷۰ فی صدی کافور اور کافور کا تیل پیدا کرتے ہیں۔ اس جزیرے کے حیرت میں ڈال دینے والے ارضی منظروں اور اس کی گھنی ہریالی ہی نے پرتگیز جہازرانوں کو جنھوں نے پہلی مرتبا اس کو ۱۵۹۰ء میں دریافت کیا تھا اسے "الہا فارموسا" (خوب صورت جزیرا) کا نام دینے پر مجبور کیا تھا۔

میدانی اور جنگلاتی فصلوں کے علاوہ تائی وان وافر معدنی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ شمال مغربی وادی میں اندازاً ۴۰ کروڑ ٹن کوئلا ہے جنوب میں تیل کے چشمے ہیں اور انتہائی شمال میں گندک اور سونا ہے اور مشرقی ساحل پر آگ سے محفوظ رہنے والی دھاتیں ہیں المونیم کا خام مواد باکسائیٹ بھی وافر مقدار میں موجود ہے۔

ایک ریلوے لائین بھی جزیرے کا احاطا کیے ہوے ہے۔ صرف دو مقامات پر خلا ہے۔ جہاں اس کے جغرافیائی حالات نے ریلوے لائن کی تعمیر کو دشوار بنا دیا ہے۔ شاہراہیں تو اس جزیرے کو مکمل طور پر اپنے گھیرے میں لی ہوئی ہیں یہ شاہراہیں دنیا کی بعض نہایت ہی پرمنظر عمودی چٹانوں میں سے گذرتی ہیں۔ تائی وان کی دو بڑی بندرگاہیں ہیں۔ شمال میں کی لنگ اور جنوب میں کاوشونگ (تاکاو) دونوں بندرگاہیں تجارت کا مرکز ہیں اور صوبا فوکین کے جزیرے اموائے سے روایتی طور پر ملی ہوئی ہیں۔ یہ دونوں بندرگاہیں بین قومی جہازرانی کے لیے بڑی موزوں ہیں یہ دونوں بندرگاہیں فوجی اہمیت کے اعتبار سے اپنے تائی وان کے محافظ بحری اڈے ہیں۔

تائی وان کے لوگ

قدیم چینی تاریخ میں تائی وان کے بہت سے نام ملتے ہیں۔ اس کا موجودہ نام "تائی وان" سترھویں صدی کے آخری نصف میں پڑا تھا۔ لگ بھگ ۹۷ فی صدی آبادی اب جو ۸۰ لاکھ سے بھی زیادہ ہے چینی لوگوں کی ہے اور ان کے آبا و اجداد نویں صدی کے بعد سے صوبا فوکین اور صوبا کوانگ تنگ سے آکر یہاں آباد ہوے تھے باقی ۳ فی صدی آبادی کاوشان قومی اقلیت کے ۲ لاکھ ۴۰ ہزار نفوس پر مشتمل ہے یہ لوگ ملایا کے باشندوں کی نسلیں ہیں جو کوانگ تنگ کے شمال مشرقی ساحل جزیرا ہے نان۔ ساٹرا بورنیو اور فلپائین سے آکر یہاں چھٹی صدی میں آباد ہوے تھے۔ پتھر کی کلہاڑیاں، برتن اور

تائی وان کے پتھر کے زمانے کے دوسرے باقیات جن کو آثار قدیمہ کے ماہرین نے دریافت کیا ہے برعظیم چین کی اشیا سے ملتے جلتے ہیں۔ کاوشان قومیت کے لوگوں کی ابھی تک اپنی کوئی تحریری زبان نہیں ہے۔ تائی وان کے اس سے بھی پہلے کے باشندے شل لان کیا و قبیلے کے لوگ ہیں جو لیو چیو جزیروں سے آئے تھے جن میں اوکی ناوہ جزیرا سب سے بڑا ہے یہ لوگ اب نیست و نابود ہو چکے ہیں۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ ان ولندیزی افسروں نے ان کو دیکھا تھا۔ جو تین سو سال ہوئے تائی وان میں آئے تھے۔

کاوشان اقلیت کے نام کا مطلب "بلند پہاڑ" ہے یہ لوگ اپنی حب وطنی اور حوصلا مندی کے لیے بہت مشہور ہیں۔ حالیہ تاریخ میں انہوں نے چینی عوام کے دوش بدوش بیرونی حملا آوروں اور گھریلو ستم رانوں کے خلاف مسلسل جنگ کی ہے۔ کاوشان لوگ اگرچہ آبادی کا ایک قلیل حصا ہیں لیکن ان کے ۵۰۰ گاوں ایسے پہاڑی علاقوں میں بکھرے پڑے ہیں جو تائی وان کا نصف سے زاید حصا ہیں۔ کاوشان قومیت کے آمی اور یے وانگ قبیلے مشرقی سمندر کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اور تائیور قبیلے شمال میں اور تسوو و لوننگ اور سائینت قبیلے دور افتادا اندرونی تائی وان میں اقامت گزیں ہیں۔ یامی قبیلا ہنگ تاولو نام کے ٹاپو میں آباد ہے۔ جو جنوب مشرق میں ۵۰ بحری میلوں کی دوری پر واقع ہے یہ سب قبیلے پرانے طریقوں سے تارو اور مکئی کی کاشت کرتے ہیں اور ان کی روزی میں شکار ابھی تک ایک اہم حصا ادا کرتا ہے صرف آمی اور یے وانگ قبیلوں کی اپنی زمین ہے۔

چند تاریخی حقایق

تیسری صدی کی تاریخی دستاویزوں سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ چینی عوام تائی وان کی جانب سمندر کے رستے سفر کیا کرتے تھے۔ اور ساتویں صدی میں کاوشان قبیلوں کے لوگوں کی چین میں آمد کا ذکر ملتا ہے نویں صدی کے اوایل میں جب تائی وان اور جزایر پینگ جو (پیسکوڈورس) کے ساتھ سوتیوں کی تجارت کا آغاز ہوا تو شیء چین دوانی ایک چینی نے یہاں آباد ہونے والے مہاجروں کے پہلے دستے کی رہنمائی کی۔ مہاجروں کی دوسری لہر بارہویں سے چودھویں صدی تک جاری رہی۔ جب بہت سے لوگوں نے منگول اور تاتار حملا آوروں سے بچنے کے لیے تائی وان پہنچ کر آزادی حاصل کرنا چاہی۔

چودھویں صدی میں پیسکوڈورز (جزایر پینگ جو) پر ایک باقاعدا چینی نظم و نسق صوبا فوکین کی کاونٹیوں میں سے ایک کاونٹی کے تحت پایا جاتا تھا۔ سولہویں صدی کے آخر میں جزایر پینگ جو اور تائی وان میں ان علاقوں کو جنگ باز حکمران ہدے یوشی تویو توحی کے تحت جاپانیوں کی جانب سے حملے سے محفوظ رکھنے کے لیے فوجی چوکیاں قایم کی گئیں۔ جنگ باز حکمران ہدے یوشی تویو توحی کوریا کو اپنے قدموں تلے روند چکا تھا۔ اور جنوب کی طرف اپنی مملکت توسیع دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

سترہویں صدی کے اوایل میں یورپ کی بحری طاقتوں نے بحرالکاہل کے علاقوں پر قبضا اور لوٹ مار کا آغاز کیا ایک ہسپانوی فوج ڈان انطونیو کارینو ڈی ویلڈس کی کمان کے تحت ۱۶۲۶ء میں فلپائین کی جانب سے شمال مشرقی تائی وان میں پہنچی اور اس نے وہاں ۱۶ سال تک اپنی حکومت قایم رکھی۔ اور کیسی ڈور (موجودا نام ہو دے) سانتو ڈومنگو (موجودا نام تام سوئی) اور سان سالوے ڈور (موجودا نام کی لنگ) نام کی بندرگاہوں کی بنیاد رکھی۔ تام سوئی کی لنگ اور تائی پیہ کو ملانے والی سڑکیں بھی تعمیر کی گئیں۔ جزیرے پر مقیم ہسپانوی باشندے چونکے کبھی ۵۰۰ سے زیادا نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے یہ کام چینی باشندوں نے کیا۔

اسی اثنا میں ۱۶۲۴ء کے آغاز میں ولندیزی باشندے جنوبی تائی وان میں اقامت گزیں ہو گئے۔ ولندیزیوں نے ہسپانویوں کو مار بھگایا۔ اور اس جزیرے پر ۳۸ سال تک رہے زی لانڈیا (موجودہ نام۔ ان پنگ) اور پراوینڈنشیا (موجودہ نام تائی نان) کو ان کی زیر ہدایت تعمیر کیا گیا۔ ان کی محافظ فوج کی گنتی ۲۲۰۰ تھی۔ افسروں، تاجروں اور افریقی غلاموں کی تعداد لگ بھگ ۶۰۰ تھی۔ ساتھ ہی ساتھ تائی وان میں اس وقت ایک لاکھ کے قریب چینی تھے۔ ہالینڈ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے استحصال اور جبر کے خلاف ایک بہت بڑی کسان بغاوت ۱۶۵۲ء میں کو ہوائی یی (ولندیزی جسے بودیٹ کہتے تھے) کی قیادت میں بھڑک اٹھی۔ باغیوں نے پراونڈنشیا پر حملا کیا اور اس لڑائی میں لگ بھگ ۴ ہزار باغی کام آئے جن میں کو بھی شامل تھا۔ بعد میں ولندیزیوں نے مزید ایک ہزار باغیوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد قومی ہیرو چینگ چین۔کنگ نے (جو کاکینگا کے نام سے بھی مشہور رہے) جس کے والد تائی وان میں اقامت گزیں ہو چکے تھے۔ اور جنھوں نے چین کے مانچو شاہی خاندان کی مزاحمت کی تھی۔ ولندیزیوں کو ہتھیار ڈالنے اور جزیرے سے نکل جانے پر مجبور کیا۔

چینگ چین کنگ نے ہجرت کی تیسری لہر کو تیز تر کیا جو سترویں صدی کے آخر تک جاری رہی۔ یہاں آباد ہونے والوں کو زر نقد دیا جاتا تھا اور ہر تین آدمیوں کو کھیت جوتنے کے لیے مویشی دیے جاتے تھے۔ ۱۶۸۰ء تک تائی وان کی چینی آبادی ۲ لاکھ سے بھی بڑھ گئی۔

چینگ چین یعنی چینگ چین کنگ کے بیٹے کے تحت سمندر کے رستے تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ جاپان، سیام، ہند چینی اور فلپائین کے ساتھ تجارت کے لیے بڑے بڑے جہاز تعمیر کیے گئے۔ تائی وان سکے بنانے اور توپ خانے کے لیے تانبا درآمد کرتا تھا اور شکر نمک گندھک اور سونا برآمد کرتا تھا۔ یوئین ہو صوبا چیکیانگ کے ایک دولت مند تاجر نے جزیرے کے شمالی حصے میں گندک کی کانوں کو توسیع دی اس کا روزنامچا "تائی وان کی معیشت کی نہایت اچھی تفصیل پیش کرتا ہے۔

۱۶۸۳ء میں چین کنگ کے پوتے چین کے شوانگ نے مانچو شاہی خاندان کے ساتھ صلح کر لی۔ جو اس وقت پیکنگ میں حکمرانی کر رہا تھا۔ ۱۶۸۴ء میں انتظامی پیمانے کے اعتبار سے تائی وان کو پری فیکٹ (پولیس فسر) کے زیر حکومت ضلع (کاونٹی اور صوبے کی درمیانی اکائی) کا درجا دیدیا گیا۔ سابق منگ شاہی خاندان کے عہد حکومت میں بہت سے محب وطن چونکہ تائی وان چلے آئے تھے۔ اس لیے مانچو شاہی خاندان نے سیاسی وجوہ کی بنا پر چین کی سرزمین سے ہجرت پر پابندی لگا دی۔ یہ پابندی قانون کی کتابوں میں ۱۹۰ سال یعنی ۱۸۷۴ء تک باقی رہی لیکن اس مدت کے دوران صوبا کوانگ تنگ اور صوبا فوکین سے مہاجروں کی چوتھی لہر یہاں آنا شروع ہوئی۔ ۱۷۲۲ء تک فوکین کے لوگوں نے تائی پیہ کے گرد و نواح کے شمالی علاقے میں نئے آباد ہونے کے کام کو مکمل کر لیا۔ اور کینٹن کے لوگوں نے شنچو کے ارد گرد جنوب میں ایسا کیا۔ ایک علاقے کے بعد دوسرا علاقا زیر کاشت لایا گیا۔ انیسویں صدی کے وسط میں تائی وان کی آبادی ۲۰ لاکھ سے بھی بڑھ گئی۔

۱۸۸۵ء میں تائی وان کا جزیرا اپنے حقوق کے سلسلے میں ایک صوبا بن گیا اور لیو منگ چوانگ کو اس کا پہلا گورنر مقرر کیا گیا اس بات نے ہجرت کی پانچویں لہر کو شروع دیا۔ ہجرت پر سے پابندی کو بہت پہلے اٹھایا جا چکا تھا۔ ہجرت کی اب سرکاری طور پر حوصلا افزائی کی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ امداد بھی دی جاتی تھی۔ اب آبادی پہلے سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی۔ زمین کے لگان کی فراہمی بندرگاہوں اور دفاعی انتظامات کو جدید تر بنا دیا گیا۔ ۱۸۹۱ء میں کی لنگ سے تائی پیہ تک جانے والی ریلوے لائن کھولی گئی۔

اسی اثنا میں بدیسی طاقتوں نے تائی وان پر ایک دفعا پھر للچائی ہوئی نگاہیں ڈالنا شروع کر دیں۔ کیونکہ کمزور بدعنوان اور جعلساز مانچو سرکار اس جزیرے کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔ سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۸۶۰ء میں امریکی تاجروں افسروں اور مدبروں نے اسے امریکا کے لیے چھین لینا چاہا پہلے تو انہوں نے کاوشیونگ پر امریکی جھنڈا لہرایا۔ اور پھر سمندر کے رستے اس پر فوجیں اتار دیں۔ سنہ ۱۸۷۴ء میں جاپانیوں نے امریکا کی سازش پا کر ابتدائی مگر لاحاصل حملا کیا۔ آخرکار سنہ ۹۵-۱۸۹۴ء کی پہلی چین جاپان جنگ کے نتیجے کے طور پر غدار لی ہنگ چانگ نے جو اس وقت چین کے بدیسی تعلقات کا افسر اعلا تھا۔ تائی وان کو جاپان کے حوالے کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دی۔

چینیوں اور کاوشان قبیلے کے لوگوں نے جو حملا آوروں کا مقابلا کرنے کی پرغرور وطن پرستانا روایات رکھتے تھے۔ اس توہین آمیز فعل پر اپنی ناراضامندی کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنی ایک فوج بنائی اور سنہ ۱۸۹۵ء کی سردیوں میں بہت سی لڑائیاں لڑیں۔ آخرکار جاپانی فوجوں کے ہاتھوں انہیں شکست ہوئی۔ سنہ ۱۸۹۷ء اور سنہ ۱۹۴۵ء کے درمیان تائی وان میں جاپانیوں کی فوجی اور شہری آبادی ۳ لاک ۲۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس نصف صدی کی مدت میں جاپان کے خلاف بیس بغاوتیں ظہور میں آئیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں کاوشان عمارتی مزدوروں نے پرائمری اسکول کے ایک استاد ہوا کانگ کی قیادت میں پولیس کے مظالم کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور وو شا اور تائے چنگ پر قبضا کر لیا۔ جاپانیوں نے انہیں پہاڑیوں میں مار بھگایا۔ اور ہوائی جہازوں کے ذریعے ان پر زہریلی گیس چھڑکی۔ جب بہت سے آدمی مارے جا چکے تو ہوا کانگ اور اس کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈالنے کی بجائے خودکشی کر لی۔

سنہ ۱۹۳۴ء اور سنہ ۱۹۴۲ء میں نئی بغاوتیں ہوئیں۔ سنہ ۱۹۴۵ء میں دوسری عالمی جنگ میں جب جاپان نے ہتھیار ڈال دیے تو گوریلا فوجیں منظم کی گئیں۔ جاپانی سامراجیوں نے ملک کو غلام بنانے کی جو کوشش کی تھی یہ اقدامات ان کے خلاف عام مزاحمت کے اجزا تھے۔ تائی وان میں مزاحمت کی جد و جہد کا ہمیشا سے یہ نعرا رہا تھا کہ تائی وان کو پھر سے چین کی سرزمین کے ساتھ ملا دیا جائے۔ جاپانی غلبے کی نصف صدی میں اس مقصد کے لیے اس جزیرے کے لگ بھگ ۵ لاک لوگوں نے اپنی جانیں دیں۔

تلاش

راہی وارثی (جگدیش پوری)

جس طرح رہتی ہے مجھکو ان کی محفل کی تلاش
ان کو بھی رہتی ہے محفل میں مرے دل کی تلاش

دل کو رہتی ہے ہمارے کوئے قاتل کی تلاش
سالک راہ محبت کو ہے منزل کی تلاش

دیکھ لو انجام میری کوششِ ناکام کا
کھینچ لائی ہے مجھے طوفاں میں ساحل کی تلاش

ان کی پلکیں آنسوؤں سے نم نہیں ہیں بے سبب
ناوک قاتل کو اب ہے اپنے بسمل کی تلاش

ان حسینوں کی محبت کیا نہیں جب اعتبار
کیوں کرے عشق حقیقی حسن باطل کی تلاش

مرے سجدے منتظر ہیں آستان یار کے
کیوں مجھے اے شیخ ہو کعبے کی منزل کی تلاش

میرے دل کو ان کے ملنے کی تمنا کیوں نہ ہو
آئینہ کو رہتی ہے اپنے مقابل کی تلاش

گو نہیں وہ ولولے جوش جوانی کے مگر
آج بھی ہے مجھکو راہی حسن کامل کی تلاش

وادی کشمیر موسم خزاں میں

رام سروپ

(ایک دوسرے نقطۂ نظر سے)

میدانی علاقوں میں خزاں کا موسم عموماً غیر مرئی تبدیلیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میدانوں کے قدرتی مناظر یا تو سال بھر زندار رہنے والے سخت پودوں سے یا ایسے درختوں سے بھرپور ہوتے ہیں جن کی پتیاں غیر محسوس طور پر موسم خزاں میں آپ ہی آپ نکل آتی ہیں۔ موسمی پھولوں کی پتیاں بھی سدابہار پودوں کے درمیان خاموشی سے جھڑتی رہتی ہیں۔ مگر وہ موت یا حسن و جمال کا کوئی دیرپا نقش اپنے پیچھے نہیں چھوڑ جاتیں۔ زیادہ تر پہاڑی مقامات پر بھی موسم خزاں برسات اور سردی کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موسم میں دھوپ خوب نکھرتی ہے۔ مگر کشمیر میں موسم خزاں کی کیفیت ہی الگ ہوتی ہے۔ یہاں جھڑنے والی پتیاں خوب صورت مگر خشک ہو جانے والے پھول شبنم آلود دہلیے، گلاب کے خوب صورت پھول، گلابی پیازی رنگ کے بنک پھول اور مختلف رنگ کے دوسرے پھول قدرتی مناظر کے حسن کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ خزاں کا دور طویل اور قابل یادگار ہوتا ہے۔ درخت دو مہینے تک خزاں کا رنگ اختیار کیے رہتے ہیں۔ وادی میں کہرا اور دھوپ کا دور دورا ہوتا ہے۔ لال لال چنار پیلے پیلے اخروٹ اور سرخ شعلہ نما شاہ نانا کے پیڑ جگہ جگہ پائے جاتے ہیں یہ درخت یا تو ہلکے ہلکے جھنڈ میں ہوتے ہیں یا اکیلا تنہا کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ سارا قدرتی منظر فضا میں حسن و جمال کی مستی گھول دیتا ہے۔

وادی کے پیچ و خم میں ٹمٹماتے درختوں کی خوب صورت سی دھند چھائی رہتی ہے۔ اس سیلاب نے فضا میں تبدیلی کردی ہے۔ خزاں پر بتدریج موسم سرما کا رنگ چڑھ گیا ہے۔ چمکیلی دھوپ کے دنوں کی شام غیر متوقع طور پر شدید سردی سے بوجھل ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو تیز تیز ہوا چلنے لگتی ہے۔ اس لیے کشمیر جانے والوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ موٹے ٹویڈ کے کوٹ اور کچھ فالتو کمبل بھی اپنے ساتھ لیتے جائیں۔

جب آدمی طویل قامت درختوں کی شاہراہوں پر چلتا ہے تب وادیوں کا منظر کیسا ہوتا ہے؟ سری نگر قدرے سرد اور رطوبت آمیز ہے لیکن ایک مرتبہ آپ اس شہر سے باہر ہو جائیں تو باہر کی فضا گرم اور حسین معلوم ہونے لگتی ہے۔ اصل میں موسم خزاں کے حسن و جمال اور رنگ روپ کی بہار قدرتی مناظر ہی پیش کرتے ہیں۔ کہیں زعفران کے پھولوں کی شطرنجی بچھی ہوئی ہے تو کہیں پہاڑیوں پر سبلی پیلی چادریں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں گہرا ہرا رنگ اور کہیں کہیں پیلا ہرا رنگ اپنی جھلک دکھاتا ہے بعض مقامات پر شعلہ نما سرخی بھی نمایاں ہو جاتی ہے نیچے زمین پر دور دور تک یا تو پیلے پیلے رنگ کی گھاس کا نرم و گداز فرش بچھا ہوا ہے۔ یا گری پڑی پتیوں کی غشما چادر پھیلی ہوئی ہے۔ بالائی حصے پر جگہ جگہ بادامی قرمزی رنگ زرد رنگ اور سبز رنگ کا امتزاج بھی جھلملاتا ہے۔ دور بہت دور دھندلی روشنی بھی برگ و گل سے اٹکھیلیاں کھیلتی رہتی ہے۔ نیچے ڈھور ڈانگر، گھوڑے اور بھیڑیں گیلی گیلی گھاس کی تلاش میں بھٹک رہی ہیں۔ وادی کے نچلے حصے میں دھند گہری ہوتی جاتی ہے۔ اور درختوں کے سرے پر پناہ لیتی دکھائی دیتی ہے۔ سفید چھلکوں والے لمبے لمبے درخت جو زرد اور لے برگ

شاخیں اور نیلے پیلے سرے کڑی ریاضت اور نیاگ کا مرقع پیش کرتے ہیں۔

جوں جوں آپ برفانی پہاڑیوں کے قریب ہوتے جاتے کوہستانی جمال کا نقش اور نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ناہموار چٹانوں پر برف کی تہ جمی ہوئی رہے۔ پہاڑوں پر جابجا سفید دھاریاں سی پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر وادی کا ہوائی منظر کیسا ہے۔ اگر آپ پٹھان کوٹ سے سری نگر تک ہوائی سفر کرنا چاہتے ہیں تو پوری وادی بڑا خوشنما منظر پیش کرے گی۔ جب آپ درہ بانہال سے گذریں گے تو پہاڑیوں کا منظر تیزی سے بدلتا دکھائی دیگا۔ پھیکے پھیکے رنگ کے پہاڑ کی بجائے کوہستانی دامن میں صنوبر ہی صنوبر دکھائی دیں گے، اور کھیت پیلے اور سرخ سے نظر آئیں گے۔ پھر آپ کو برفانی پہاڑیوں کا ایک پورا سلسلا ملے گا۔ آپ کو برف کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی محسوس ہوگی اگر آپ زمین کے رستے سے سفر کریں گے تو پہاڑیوں کے پورے سلسلے میں پیر پنچال پر تازہ برف دکھائی دیگی۔

اگرچہ وادی بہت حد تک دھان کی کٹائی سے محروم ہو چکی ہے پھر بھی یہاں کے آبی رستوں پر ہرے ہرے درخت اور گھاس ہے۔ کھیت علم ہندسا کی مختلف شکلیں بناتے ہیں اور ان کی زمین مختلف رنگ کی ہے یہ عجیب و غریب نظارا ہوتا ہے جب آپ کا ہوائی جہاز زمین پر اترتا ہے تو سارے برفانی پہاڑ پر اسرار طریقے پر نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اگر آپ ہوائی رستے ہی سے پٹھان کوٹ واپس جائیں اور فضا بھی ابر آلود ہو تو آپ کو بادل کی سطح سے اوپر اڑنا ہوگا اس وادی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ رنگین قدرتی مناظر کی بجائے آپ کو دور تک روئی کے گالے کی طرح سفید جنگل سے سا لگا رہے گا۔ جہاں جہاں بادل ہلکا ہوتا ہے آپ کو دھند کی مہین چادر سے وادی کی جھلک دکھائی دے گی اور پیلے ہرے اور لال رنگ بے ترتیب سے معلوم ہوں گے۔

جب آپ بانہال کو دوبارہ پار کرلیں تو گویا آپ نے اس قابل دید اور قابل یادگار وادی کو خیرباد کہہ دیا ہے یہاں سے منظر یکسر بدل جاتا ہے نیچے ہری بھری زمین دکھائی دیتی ہے اور دریائے چناب بل کھاتا ہوا چٹانوں سے گذرتا ہے۔

حسنِ تغزل

حبیب ویز (لکھنوی)

حسرت ہے زندگی کی نہ غم موت کا مجھے
کچھ ایسا حسن یار نے بیخود کیا مجھے

اے ہم نفس بتا یہ معما ذرا مجھے
میں تو خدا کو ڈھونڈ رہا ہوں خدا مجھے

یہ موت، زندگی یہ خزاں، یہ بہار، دوست
آتے نظر ہیں سب یہ فریب و فا مجھے

اب تو نہ صبح وصل رہی، اور نہ شام غم
جی بھر کے آج پینے بھی دے ساقیا مجھے

کلیاں کھلیں نشاط کی، پھولوں کی ہے بہار
اے باغباں چمن سے کیا کیوں جدا مجھے

آتے ہی فصل گل ہوا مجھکو قفس نصیب
صیاد لے گیا ہے اسیر بلا مجھے

میں چشمہ حیات کو سمجھا کیا سراب
موج شراب مرگ ہے آب بقا مجھے

تم جان آرزو ہو مری جان آرزو
پھر کیا سمجھ کے تم نے کہا بیوفا مجھے

میخانہ میں یہ مرتبا حاصل کسے حبیب
ساقی نے اپنے ہاتھ سے ساغر دیا مجھے

ارتقائے ادبیات

حافظ محمد امام (اکبر آبادی)

علم ادب ایک ایسا وسیع اور عمیق سمندر ہے جس کی تہ نظر نہیں آتی۔ جس طرح سمندر کے کنارے آسمان سے ملے ہوئے نظر آتے ہیں اسی طرح علم ادب کے کنارے کائنات کا احاطہ کیے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ بلکہ ادب کی نظر میں تو ساری کائنات ایک بیضہ مور سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی یہ سمندر تو اس کے مقابلے پر ایک چھوٹے سے چھوٹے قطرے کے برابر کیا، ایک غیر مرئی چیز ہوئی۔

ادب کی تعریف میں کسے معلوم کہ کتنے دماغوں کا خون اور کتنے چراغوں کا تیل خشک ہو چکا ہے، کتنی زبانیں لال اور کتنے قلم فرسودہ ہو چکے ہیں۔ لیکن تعریف ہے کہ ختم نہیں ہو پاتی۔ مختلف زاویوں سے تنقیدیں ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ مختلف طریقوں سے رائے زنی کی گئی اور کی جا رہی ہے۔ بال کی کھال نکالی جا چکی ہے۔ تشریحیں اور تفسیریں آ رہی ہیں۔ بڑی حد تک انسان صحیح نتیجے تک پہنچ بھی چکا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ علم ادب ہی نے اس تاریک گھر کو روشن کیا ہے۔ اس نے انسانی دماغ کو بالیدگی بخشی ہے اس سے آدمی انسان بنا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جس طرح انسان کے اندر مختلف قوتیں ہیں اسی طرح اس کے اندر ایک شعوری قوت بھی ہے۔ یہ شعوری قوت یقیناً ازلی ہے اس قوت سے کوئی انسان خالی نہیں لیکن اس کے بھی درجے ہیں یعنی کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ کسی میں بہت زیادہ۔ اور کسی میں سب سے زیادہ۔ پھر جس میں سب سے زیادہ یہ جذبہ ہوتا ہے وہی شاعر و ادیب کہلاتا ہے۔

شاعر و ادیب کا کام کیا ہے۔ ناتوانی کو توانائی سے بدل دینا۔ بزدلی کو حوصلہ افزائی میں تبدیل کر دینا۔ پست اخلاقی کو بلند اخلاقی میں اور آدمیت کو انسانیت کے جامے میں لے آنا اور پھر سارے ماحول پر چھا جانا ہے۔

حیات انسانی اول اول کس ماحول میں تھی؟ برہنہ جسم کے ساتھ درختوں کے نیچے اور پہاڑوں کے بھٹوں میں رہتی تھی۔ یا جنگلوں میں ماری ماری پھرتی تھی۔ شعور ابھرا اور اس نے اس کے آگے پیچھے پتے بندھوا دیے اور ابھرا تو لنگوٹی پھر دھوتی کسوا دی۔ اور آگے بڑھا تو لباس آرائی کے طریقے سکھائے۔ پھر پتھر کی رگڑ سے آگ پیدا کرا دی۔ غرضکہ جس درجہ شعور بڑھتا گیا تعمیر و تمدن میں اشارے اور کنایوں میں بانی کی لوچ و لچک میں اور حرکات و سکنات میں ترقی اور دماغ میں بالیدگی و بلندی پیدا ہوتی رہی۔ پھر اس شعور نے جب ایک قدم اور آگے بڑھایا تو زبان کے اشاروں نے ایک بولی کی صورت اختیار کر لی۔ پھر مدت مدید کے بعد اسی بولی نے ایک علمی شکل اختیار کی۔ اور اس کا نام علم ادب پڑا۔

ایک مخصوص جماعت نے ہر ہر مقام پر اس کو نوازا۔ اس کی پرورش کی۔ مناظر فطرت کے نقوش پیش کیے۔ گل و بلبل کی باتیں کیں۔ آب و ہوا خاک و آگ کی مزاجی کیفیت سے روشناس کرایا۔ انسانی جذبات کی ترجمانی کی۔ حیات و ممات کا فلسفہ پیش کیا۔ غیر متکلم کو متکلم غیر ذی روح کو ذی روح کر دکھایا۔ ذرے میں کائنات اور قطرے میں سمندر پیدا کر دیا۔

بولی جب تک بولی رہی اس کی ترقی میں انسان و قدرت دونوں کا دخل رہا لیکن جب اس نے زبان کی صورت اختیار کی تو اس کی ترقی میں تنہا انسان کا ہاتھ تھا۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا کہ زبان کو علمی درجہ دینے میں اس عہد کی حکومتوں نے مدد نہ کی ہو۔ اور علمی جماعت نے اپنے دماغوں کا خون اور چراغوں کا تیل خشک نہ کیا ہو۔

پھر اہل ادب ہی تو تہذیب و تمدن کے بانی ہوے۔ شاعر و ادیب ہی نے تو اخلاق انسانیت کی بنا ڈالی اسی علم ادب ہی نے تو آدمی کو انسان بنایا!

پھول پر ایک عوامی کی نظر پڑتی ہے تو اس کے موںھ سے واہ واہ کی صدا نکل جاتی ہے یا یہ اس کو توڑ کر اس کی خشبو سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ایک دولت مند اس کو اپنے گلے کا ہار بنا لیتا ہے۔ ایک فلسفی اس کے رنگ و بو پر بحث کرتا ہے اور ایک حکیم اس کے اجزا کا تجزیہ کر کے اس کے خواص بتا دیتا ہے ہر ایک شاعر اس پھول کو دیکھ کر پکارنے لگتا ہے کہ ع

"اے گل بتو خرسندم تو بوے کسے داری"

"بوے کسے داری" کے خیال نے شاعر کے جذبہ شعور کو جب اور آگے بڑھایا تو پھر یہ اس طرح چیخنے لگا کہ ؎

ہے پرے سرحد ادراک کے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یعنی شاعر کے شعور نے جب اس عالم کو ایک تنگ و تاریک زندان سے بھی زیادہ تنگ محسوس کیا اور اس کی رفعت و وسعت کو ایک بیضہ مور کے برابر سمجھا تو اس کا دم گھٹنے لگا۔ اور ایک وحشت زدا کی طرح تڑپ کر یہ دعا مانگنے لگا کہ ؎

یارب ز جنوں طرح غم در نظرم ریز
صد بادیہ در قالب دیوار و درم ریز

میرے عقیدے میں تو دنیا کے تمام علوم، علم ادب ہی کی شاخیں ہیں۔ کیونکہ ابتداے آفرینش میں نہ تو علم مذہب تھا نہ علم طب تھا نہ فلسفا تھا نہ نفسیات و فلکیات تھا اور نہ سائنس۔ البتہ ایک شعور تھا۔ جس کے ذریعے ادبیات نے تہذیب نفس کی تعلیم دی۔ اور جس کی ارتقائی صورت آج ہمارے سامنے مختلف علوم میں جلوہ گر ہے حالانکہ یہ ارتقا بھی ابتدا نظر آتا ہے ابھی شاعر و ادیب کے شعور میں خدا جانے کتنی کائناتیں اور پنہاں ہیں، اور کتنے عالم پوشیدہ ہیں۔ جب شاعر کا پہلوے شعور ان کا احاطہ کر لے گا، تب ارتقا کا اطلاق ہو سکے گا۔ اور اغلب ایک عالم کے بعد دوسرا عالم نظر آنے لگے گا۔ فلسفا اور سائنس جو آج ترقی کے بام عروج پر نظر آتے ہیں علم ادب ہی کی تو پیداوار ہیں۔

علم ادب نے جب آدمی کو انسان بنایا تو اس میں کس کا ہاتھ تھا؟ یقیناً پیغامبروں اور رہنماؤں کے شعور کا قوی ہاتھ تھا۔ انہیں کے دم سے انسانیت کا پودا بڑھا اور پھولا پھلا۔ ان کا شعور جب محویت و استغراق اور سوچ بچار کے عالم میں پہنچا تو "رازہاے سربستہ" کے دروازے کھل گئے۔ اور قانون فطرت کے ایک ایک نکتے کو سمجھا، سمجھ کر اپنی اپنی زبانوں میں اس کی اشاعت کی، اور ایسے ایسے شاندار پیرائے میں اس درجہ نازک و لطیف، حسین و جمیل، فصیح و بلیغ الفاظ میں دنیا کو سمجھایا اور بتایا کہ اس مادی دنیا کے انسان کا گروہ نہ ہوتا تو تہذیب و تمدن اور انسانیت بھی نہ ہوتی۔ لیکن اس شاعر اعظم اور صدر اول جماعت نے اپنے اپنے کلاموں میں وہ وہ تخیل و محاکات تشبیہات و استعارات تلمیحات و اصطلاحات سے کام لیا کہ باوجود ہزارہا سال گذر جانے کے آج بھی کروڑہا انسان ان کے پیرو نظر آتے ہیں۔ اور ان کے نام پر جان دیتے ہیں کہ ؎

صورت انسان خدا را دیدہ ام
من خدا را آشکارا دیدہ ام

یا

جہاں غیر از تجلی ہاے ما نیست
کہ بے ما جلوہ نور خدا نیست

ایک مادی انسان اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ یہ سمجھنے سے منزلوں دور ہے۔ اور یہ اس لیے کہ اس کے شعور میں بجز اس کے کچھ نہیں کہ مادے کی بال کی کھال نکالتا ہے، اور اگرچہ یہ بھی بڑے کام کی بات ہے لیکن اس کے اشارے بھی تو اس مقدس و شاعر اعظم کرو نے دیے تھے۔ جس نے کہا تھا کہ اس عالم کے

دو شعبے ہیں۔ ایک عالم شہادت دوسرا عالم غیب۔ پس یہی عالم غیب تو ہے جو اسرار کائنات سے متعلق ہے جس کی خبر شاعر اعظم وحدہٗ لاول نے دی تھی۔ اور جس کا انکشاف آج مادی انسان کر رہا ہے۔ اور کرتا چلا جاتا ہے۔ اور کون بتا سکتا ہے یہ کس منزل تک پہنچ کر دم لے؟ ابھی تو یہ مادی میدان میں دوڑ رہا ہے۔ اور تخریب کی طرف مائل ہے لیکن وقت آئے گا کہ یہ تخریب کو تعمیر میں بدل دے۔ کیونکہ ہر طرف سے ہمارے کانوں میں یہ صدائیں علم ادب پہنچا رہا ہے کہ لوگو مساوات انسانی قائم کر دو۔

پھر چونکہ سماج اشتراکی اقتصادیات پر مبنی ہے اور طبقاتی جد و جہد اس کا بنیادی اصول ہے۔ اور یہی طبقاتی جنگ اقتصادی حالات کا نتیجہ ہے ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ اسی سے انسانی شعور پیدا ہوتا ہے اور اسی سے ہستی کے شعور کا احساس قوی تر ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان مادی اعتبار سے اعلیٰ قسم کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اور اس خواہش کے ساتھ ساتھ اس کا شعور بھی ہستی کی حدود کے دائرے میں رہتا ہے۔

ادب کی اس تحریک کو سمجھنے کے لیے ادب کے فرائض قائم کرنے پڑیں گے اور یہی فرائض بہت ممکن ہے کہ آنے والی نسلوں کی بہت سی آویزشوں کا خاتمہ کر دیں۔ کیونکہ سماج کے فساد میں انسانی طبقوں کی تکرار کا ہاتھ ہے اور انسان ابھی تک اس میں اس درجہ مبتلا ہے کہ ہستی کے راز سے ناآشنا اور اسرار کائنات کے انکشاف سے جیسا کہ چاہیے کامیاب نہیں رہا۔ یا ابھی تخریبی کاموں میں اس درجہ مستغرق ہے کہ تعمیری کاموں کا اس کو احساس تک نہیں۔ اس کو تخریب سے وقت نہیں ملتا کہ غیب کے ان بے شمار رازوں اور بھیدوں کو جو فطرت نے بطور انعام انسان کو بخشے ہیں اور جو ابھی تک وہ خفا میں ہیں کھوتا چلا جائے۔

ادب کا پہلا فرض کیا ہے؟ عوام کو مساوات انسانی کی تربیت دیکر اس کے اخلاق کو بلند سے بلند کر دینا اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جبکہ اس دو ٹنگے حیوان کو کلچر کے بنیادی اصول شاعر و ادیب بتلائے گا۔

دوسرا فرض محنت کا عمل اور دولت و حکومت کا گھمنڈو استبداد ہے آقائی و غلامی سیٹھ اور مزدور کا تصور ہے۔ ادب کے ذریعے ان باتوں کی اشاعت کی جائے۔

ادب کا تیسرا فرض یہ ہے کہ توہم پرستی کو زور قلم سے یک لخت مٹا دیا جائے کیونکہ اسی چیز نے انسان کو مطلق بنا کر گیان دھیان کی طرف رجوع کر کے مابعد الطبیعاتی بنا کر یہ سبق دیا ہے کہ انسان کا مقصد حیات یہی ہے کہ وہ فلکیات کے مطالعے میں ہیئت کے مشاہدے میں عناصر فطرت کی تقسیم میں فرشتے و شیاطین اور جنت و دوزخ کے تصور میں خدا کو تلاش کرے حالانکہ نہ انسان ہوتا نہ خدا ہوتا۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

تو ادب کے فرائض یہی ہیں کہ وہ ان روایتی باتوں کو مٹا کر انسان کو شاہراہ عمل پر لائے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہے عمل ہے عمل ہی کا دوسرا نام زندگی ہے۔ اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ حیات کے حصول کے لیے ہر ذرا ہر وقت سرگرم عمل ہے۔ عمل ہی سے انسانی کلچر کا سوتا پھوٹتا ہے۔ اسی سے شعور ذات کو ترقی ہوتی ہے۔

پھر جب ذات کا شعور ہو جائے گا کہ میں کون ہوں کیا ہوں مجھے کیا کرنا ہے؟ حیات کا مقصد کیا ہے؟ تو پھر یہ محسوس کر لے گا کہ میری یہ منزل نہیں ہے جہاں میں سانس لے رہا ہوں مجھے تو ابھی بہت آگے بڑھنا ہے بہ خیال شاعر کہ ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

مگر اس ناپاک و نجس رزق سے جس میں انسانی خون کی بو آرہی ہے اس وقت چھٹکارا نصیب ہوگا جبکہ موجودہ دنیا ایک بار مٹ جائے گی چونکہ اشتراکی واقعیت نگاری اس زندگی کی نوٹیشن کرتی ہے جس سے مراد عمل و تخلیق ہے اور جس کا مقصد انسان کی بے اندازہ اصلاحات ہے۔ اس صلاحیت میں انسانی کردار کی صحت اور موت کی نتائیت کے بعد ہی نوامیس فطرت پر فتحیابی حاصل ہو گی۔ اور وہی مقصد حیات ہو گا۔ اس کام کو انجام دینے کے لیے کتنا زمانہ درکار ہو گا یہ شاعر و ادیب کی دماغی صلاحیت پر ہے کہ وہ انسانیت کو ایک خاندانی وحدت میں لا سکے ؎ ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں۔

ماسکو کے صحافیوں کا کلب گھر

گریب بنف

ماسکو کے صحافیوں کا کلب گھر پچھلے ۳۴ سال سے سرگرم کار ہے۔ یہ کلب صحافیوں میں بہت مقبول ہے۔ کلب کی سرگرمیاں مختلف قسم کی ہیں۔ کلب کی عمومی سرگرمیوں کے علاوہ صحافیوں کے فن صحافت کو ترقی دینے اور ان کے علم اور تہذیبی افق کو وسیع تر کرنے کی طرف بڑی گہری توجہ دی جاتی ہے۔ کلب میں صحافت کی دو سالہ تعلیم و تربیت کا انتظام ہے جہاں اخبار کی تاریخ پر اسالیب صحافت پر اور اخباروں اور رسالوں کے شعبہ ادارت میں کام کی تنظیم سے متعلق لیکچر دیے جاتے ہیں اس سال اس تعلیمی کورس میں چار سو کے لگ بھگ نئے صحافی شریک ہونگے۔

صحافت سے متعلق ایک باقاعدہ کورس کے علاوہ صحافیوں کے لیے دلچسپ مسایل پر لیکچروں اور مضامین کے سلسلوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں لسانیات اور زراعتی سوالوں پر کئی لیکچر دیے گئے۔ اور ۱۹۵۵ء میں ممتاز سائنس داں اور دوسرے ماہرین جمالیات سے متعلق لیکچر دینگے۔

صحافیوں کو بین قومی مسایل کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے ان کو برابر بین قومی تبصروں اور جایزوں سے معلوم کرایا جاتا ہے صحافیوں میں ایک خاص روایت یہ ہے کہ وہ بیرون ملک سفر سے واپس آکر کلب میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہیں۔

سوویت صحافی بیرونی پریس کی پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ کلب مختلف ملکوں کی اخباری دنیا سے متعلق خاص شاموں اور نمایشوں کا انعقاد کرتا ہے۔

باہر سے سوویت یونین آنے والے تمام صحافی صحافیوں کے کلب کے مہمان ہوتے ہیں۔ ماسکو کے صحافیوں کو مختلف ملکوں کے صحافیوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے۔ اس سال کے شروع میں چینی صحافیوں کا ایک وفد کلب میں آیا۔ اس وفد نے بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں" جن میں جہاد" کے مدیر عالا نے چینی صحافیوں کے کام کے متعلق روشنی ڈالی۔ اس سال فرانس اور اٹلی کی اخباری دنیا سے متعلق بھی خاص شامیں منعقد ہوئیں۔

اخباری سرگرمیوں سے متعلق تجربوں پر تبادلہ خیالات صحافیوں کے لیے خاص طور پر نئے صحافیوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے کلب میں نیچے بتائے ہوئے بہت سے شعبے قایم ہیں۔ مضامین اور ہلکی پھلکی ادبی چیزیں لکھنے والوں کا شعبہ نامہ نگاروں اور اخباری فوٹو گرافروں کا شعبہ کارخانے کے نامہ نگاروں اور اشاعت گھر کے کارکنوں کا شعبہ وغیرہ وغیرہ۔ بہت سے صحافی ان شعبوں کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں جو باقاعدہ جلسوں کا انتظام کرتے ہیں اور جن میں تجربہ کار صحافی حصہ لیتے ہیں۔ یہ شعبے بحث مباحثے اور مخصوص موضوعات پر خاص شامیں منعقد کرتے ہیں ان شعبوں میں وہ جلسے خاص طور پر کامیاب ہے جن میں مضامین کی ان جلدوں پر بحث ہوئی جو "پراودا" اور "ازویستیا" کے اشاعت گھروں نے شایع کی ہیں اور جو اخبار نویسی میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے علاوہ جلسے بھی بہت کامیاب رہے۔ جن میں صحافیوں کی ڈایری اور اخباری فوٹو گرافروں کی تازہ ترین کارگذاریوں پر بحث کی گئی۔

کلب نئے صحافیوں کے لیے اپنے اسکیموں، مضامین

اور ادبی تخلیقات پر بات چیت کے لیے انفرادی صلاح اور مشورے کا خاص انتظام کرتا ہے۔ کلب کی طرف سے برابر ضلع اور شہر کے اخباروں کے ایڈیٹروں کا "دن" منایا جاتا ہے اور اخباری نمائشوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔

ہفتے میں دو تین بار رقص و موسیقی کی محفلیں جمتی ہیں کلب کے ممبروں کو تھیٹر کے تازہ ایپش کشوں اور اداکاروں کے نئے کارناموں سے مانوس کیا جاتا ہے اداکاروں، موسیقارو اور نغما سازوں سے مسلسل میل جول کی بدولت صحافیوں کو آرٹ کے مسایل کو بہتر طور پر سمجھنے اور کلچر کے اس میدان میں نئی چیزوں کا صحیح یقین کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کلب کے سینما ہال میں صحافیوں کو نئی فلمیں بنانے والوں اور فلمی اداکاروں سے ملنے کے مواقع برابر ملتے رہتے ہیں۔

کلب کے ممبروں کی خواہش کے برابر پچھلے زمانے کے بڑے نغما سازوں کی تخلیقات سے متعلق ان کو معلومات بہم پہنچانے کے لیے موسیقی کا ایک خاص سلسلا شروع کیا گیا لکچروں کے ساتھ ان نغما سازوں کی تخلیقات کے پروگرام بھی پیش کیے۔

کلب کے زیر اہتمام، سیر و سیاحت اور دیہی علاقوں کے سفر میں ہمیشا بڑی دل چسپی لی جاتی ہے۔ ماسکو میں پچاس عجایب گھر اور مستقل نمایشیں ہیں۔ اور ماسکو کے مضافات تاریخی مقامات کے لیے بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ پچھلے سال آرٹ سے متعلق بہت سے دل چسپ لکچروں کے سلسلے منعقد کیے گئے، اور کلب کی طرف سے مشہور تریتیا کوف گیلری کی سیر کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ سیر و سیاحت میں حصا لینے والے صحافی روسی مصوری کی تاریخ اور بعض مصوروں کے فن پاروں سے واقفیت حاصل کریں گے۔ اس کے علاوا کلب اپنے ممبروں کو نئی صنعتی ٹکنیک اور تکنیکی کاموں سے واقف کرنے کے لیے ماسکو کے کارخانوں کی سیر و سیاحت کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔

کلب میں اسٹینوگرافی کی تربیت کا انتظام ہے یہاں بہت سے آرٹ کے شوقیا حلقے قایم ہیں جن میں تھیٹر اور موسیقاروں کے حلقے، بچوں کی ناچ منڈلیاں وغیرا شامل ہیں۔ آرٹ کے شوقیا حلقوں کے ممبر بڑی کامیابی کے ساتھ کلب کے رقص و موسیقی کے ہال میں اپنا فنی پروگرام پیش کرتے ہیں۔

اس مختصر سے مضمون میں کلب کی تمام مختلف قسم کی سرگرمیوں پر وضاحت سے روشنی ڈالنا دشوار ہے وہ تمام لوگ جنھوں نے کلب کا معائینا کیا ہے اس کے دل چسپ کاموں کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ کلب کے ممبروں کی خواہشوں اور مشوروں کے برابر ہم صحافیوں کے کلب کی سرگرمیوں کو اور متنوع بنانے کی کوشش کر رہے ہیں تاکے کلب کی سرگرمیاں اور دل چسپ اور مفید ثابت ہو سکیں۔

○ نئے تقاضوں کا ترجمان ـــــ نئے عزایم کا پیامبر
○ اردو کا مقبول ترین شاعر

اختر انصاری اکبرآبادی

دل رسوا

اپنی جدید غزلوں اور نظموں کا مجموعہ پیش کرتا ہے
قیمت ــــــــــ دو روپیہ

برگ سبز

اردو شاعری کی جدید و قدیم اقدار کا مبلغ

ابو مسلم صحافی

اپنا پہلا مجموعہ کلام پیش کر رہا ہے
قیمت ــــــــــ دو روپیہ

سول ایجنٹ ـــــ مرکز ادب مشن روڈ (کراچی)

یو نیسیس
نیویارک میں طلبا کیلیے ایک بین قومی عمارت

امریکا میں نیویارک کا شہر ایک بین قومی مرکز ہے اب وہاں ادارۂ اقوام متحدہ کی عمارت اور صدر دفتر کی وجہ سے اس شہر کی بین قومی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے یہ تو حال ہی کی بات ہے لیکن اس سے بھی بیشتر سے وہاں مشرق و مغرب کے لوگوں کا جو اجتماع رہتا ہے دنیا کے اور کسی شہر میں نہیں پایا جاتا۔ یہاں مختلف ملکوں کے طالب علموں کے قیام کے لیے ایک عمارت تعمیر کی گئی ہے جس کا کچھ حال نیچے دیا جاتا ہے۔ بین قومی مفاہمت بڑھانے کے لیے ایسے بین قومی ایوانوں کی ہر جگہ ضرورت ہے۔

نیویارک میں کولمبیا یونیورسٹی کے پاس ایک چینی طالب علم کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ اتنے میں نیویارک کا ایک شہری اسے "آداب عرض" کہتا ہوا سامنے سے گذر گیا۔ آداب بجا لانے والا یہ شخص وہاں کے عیسائی نوجوانوں کی انجمن وائی ایم سی۔ اے کا سکریٹری تھا۔ چینی طالب علم کو کسی قدر تعجب ہوا اور وہ سوچنے لگا کہ میں یہاں کئی ہفتوں سے مقیم ہوں اور اس عرصے میں یہ پہلا شخص ہے جس نے آداب و سلام سے میرا خیر مقدم کیا ہے۔

اس چینی نوجوان کو اس بات پر بڑی ذہنی کوفت ہو رہی تھی کہ باہر سے آنے والے طلبا کو امریکا میں بڑی تنہائی محسوس ہوتی ہے اور وہ خود بھی اپنے آپ کو تنہا اور اجنبی سا پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دن برطانیہ، ہندستان، سیام اور ناروے کے چند طالب علموں کو کھانے پر مدعو کیا۔ اور آپس میں میل ملاپ اور بات چیت سے دوستی اور یگانگی کی بنیاد پڑ گئی۔

دھیرے دھیرے ایسی پارٹیاں اور دعوتیں وسعت پاتی گئیں۔ اور کولمبیا یونیورسٹی میں بیرونی طلبا بھی ان میں شرکت کرنے لگے اور اس طرح ایک "انٹر کالجیٹ کاسموپالیٹن کلب" کی بنیاد پڑ گئی۔

اس کلب کے بانیوں کا مقصد یہ تھا کہ مختلف ملکوں کے طالب علم آپس میں مل کر آزادی سے اپنے اپنے خیالات اور احساسات اور معلومات کا تبادلہ کیا کریں کیونکہ آگے چل کر انہی طلبا کو اپنے اپنے ملکوں کی خدمت اور رہنمائی کا اہم فرض ادا کرنا تھا۔

راک فیلر کی امداد

دھیرے دھیرے کلب کے قیام کی خبر جان ڈی راک فیلر تک بھی پہنچی جیسا کہ دنیا جانتی ہے جہاں راک فیلر دنیا کی امیر ترین ہستیوں میں سے ہیں۔ وہاں وہ انتہا درجے کے فیاض مخیر اور رفاہ عام کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے بھی ہیں۔ انہوں نے اس کلب کے لیے کولمبیا یونیورسٹی کے پاس ہی مین ہیٹن میں زمین کا ایک خاصا بڑا قطعہ کلب کو ۱۹۲۳ء میں عطا کیا۔

ظاہر ہے کہ صرف قطعہ زمین کے عطیے سے طلبا کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ اس پر کوئی عمارت بھی تعمیر نہ ہو۔ چنانچہ راک فیلر موصوف نے عمارت کے لیے بھی روپیہ مہیا کر دیا یہ قطعہ زمین مین ہیٹن میں ایک اونچی جگہ پر واقع ہے یہاں سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہڈسن دریا دکھائی دیتا ہے اور اس کے ارد گرد کے خوشنما اور دل کش مناظر سے طبیعت میں بشاشت سی پیدا ہوتی ہے۔

کچھ عرصے کے اندر اندر عمارت کے نقشے وغیرہ تیار ہو گئے

اور تعمیر کا کام بھی شروع ہو گیا۔ سال بھر میں ہی ۱۹۲۴ء میں اس عمارت کی رسم افتتاح انجام دی گئی اور اس کا نام "انٹرنیشنل ہاوس" یعنی بین قومی گھر رکھا گیا۔ اس کی تعمیر میں بڑی سادگی اور صفائی سے کام لیا گیا ہے یہ سیدھی اور مربع عمارت ہے اس طرح امریکا میں بیرونی ملکوں کے طلبا کے لیے قیام گاہ کی تعمیر عمل میں آئی۔ اس کے دروازے کی محراب پر یہ کندہ ہے کہ

"باہمی اخوت اور بھائی چارے کا دروازہ عام ہو۔"

اس بین قومی عمارت میں قیام کرنے والے طلبا اوپر کے کتبے کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے ملک کے طلبا سے میل ملاپ اور دوستی پیدا کرتے ہیں اور بین قومی مفاہمت کو وسعت اور استواری دیتے ہیں۔

یہ عمارت صرف طلبا کی قیام گاہ ہی نہیں بلکہ اس میں کتب خانے دار المطالعے سنگیت اور ناٹک گھر۔ تفریحی سامان اور کھیل کود کی سہولتیں بھی حاصل ہیں۔

اس عمارت میں صرف ایسے طلبا کو قیام کی اجازت ہوتی ہے جو کسی کالج کے طالب علم ہوں اور اس بات کا ٹھوس ثبوت ہونا چاہیے کہ وہ بین قومی ثقافتی اور تہذیبی اور باہمی تعلقات میں پوری دل چسپی رکھتے ہیں۔

یہاں آپس میں علمی ادبی بین قومی معاملات، مذہب فلسفا اور دوسرے مختلف امور کے متعلق مناظرے اور مباحثے وغیرا بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ناٹکوں اور سنگیت وغیرا کا بھی بڑا شاندار اہتمام ہوتا ہے۔

اس بین قومی گھر میں تحقیقی اور ریسرچ کرنے والے معلم پروفیسر اور طالب علم بھی رہ سکتے ہیں۔ جو باہر سے آکر امریکا میں مطالعہ کرتے ہوں۔ اور امریکی طلبا بھی رہتے ہیں یہاں کسی طرح کا نسلی یا قومی یا مذہبی یا سیاسی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ مکمل مساوات کا دور دورا رہتا ہے۔

امریکا میں ایسے ہی دو مرکز اور بھی ہیں۔ ایک اور ایسا ہی بین قومی گھر پیرس فرانس میں بھی ہے یعنی دنیا اس قسم کے کل چار بین قومی ایوان ہیں ان میں سے تین امریکا میں ہی ہیں یعنی کیلی فورنیا یونیورسٹی برکلے اور شکاگو یونیورسٹی میں ایسی عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔

ان میں سے نیویارک کا یہ "بین قومی گھر" سب سے پرانا ہے۔ اور جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے یہ ۱۹۲۴ء میں آج سے تیس برس پہلے قایم ہوا تھا۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس عمارت کا بانی وہی چینی طالب علم تھا جس نے سب سے پہلے دوسرے ملکوں کے چند طلبا کو دعوت پر بلا کر ایک بین قومی کلب کی ابتدا کی تھی اس کا نام ہیری ایڈمنڈ تھا۔

"اس انٹرنیشنل ہاوس" میں کم و بیش ساٹھ ملکوں کے ایک ہزار سے زیادا طالب علم قیام کرتے ہیں۔ اور اس میں اچھا خاصا شہر آباد رہتا ہے۔

دنیا کی ان چاروں بین قومی عمارتوں میں اب تک نصف لاکھ سے بھی زیادا طالب علم رہ چکے ہیں۔ جو مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے ملکوں کی بہتری اور بہبودی کا باعث بنے ہیں۔

ایسے بین قومی گھر آج کی دنیا کے لیے اور بھی اہم اور ضروری ہو گئے ہیں۔ اور آزاد دنیا کے ہر چھوٹے بڑے ملک میں ان کی تعمیر عمل میں آنی چاہیے۔

انسان میں یہ فطری جذبا پایا جاتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتا ہے۔ موجودا زمانے میں اس بین قومی ملاپ اور مفاہمت کی اشد ضرورت ہے، عالمی امن اور بہبودی کا اس پر بھی دار و مدار ہے۔

تبصرے

کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنے ضروری ہیں ورنا تبصرا نہیں کیا جائے گا

تبصرے

کتاب الصلوٰۃ جس طرح ہر کام کی ادائی کے لیے چند خاص اصول اور قاعدے مقرر ہیں اسی طرح نماز کی ادائی کے بھی چند خاص اصول مقرر ہیں اور جب تک ان اصولوں اور قاعدوں کی پابندی کے ساتھ نماز ادا نہ کی جائے وہ نماز درست نہیں ہو سکتی۔ ان قاعدوں کے جتانے کے لیے متعدد حدیثیں تھیں۔ ان کو قواعد کی شکل میں ایک جا کرنے کا خیال سب سے پہلے امام المحدثین حضرت امام احمد بن حنبل کو ہوا۔ اس کتاب کی تالیف کا سبب یوں بیان کیا ہے کہ "یہ کتاب نماز کے بارے میں اور نماز کی عظمت کے بیان میں اور جو باتیں نماز کے کامل ہونے کے لیے لازمی ہیں اور جو نماز کے احکام کے متعلق جن کی مسلمانوں کو بہت سخت ضرورت ہے ان کے بیان میں ہے۔ کیونکہ نماز کو بہت خفیف سمجھا ہے۔ نماز کے حقوق کو برباد کرتے ہیں۔ اور نماز میں امام پر سبقت کرتے ہیں۔" ادائی ارکان نماز کی نزاکت اور بار یکیوں کو اس طرح پر ظاہر کیا گیا ہے کہ "حدیث شریف میں ہے کہ انسان ساٹھ برس تک نماز پڑھتا ہے لیکن پھر بھی اس کی نماز نہیں ہوتی پوچھا گیا کہ کیوں کر نماز نہیں ہوتی فرمایا رکوع پوری طرح سے ادا کرتا ہے اور سجدہ پوری طرح سے ادا نہیں کرتا۔ اگر سجدہ پوری طرح سے ادا کرتا ہے تو رکوع پوری طرح سے ادا نہیں کرتا۔"

کتاب کے شروع میں حضرت امام احمد بن حنبل کی مختصر سی سوانح حیات بھی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ شیخ علی جواد نے کیا ہے۔ ترجمہ سیدھی سادی اور عام بول چال کی زبان میں ہے۔ عوام کے لیے دراصل ایسی ہی صاف اور سلیس زبان کی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

چھوٹے سائز کی یہ مجلد کتاب آرٹ پیپر کے دو رنگی پوش، ۱۶۰ صفحے حجم نفیس اور پاکیزہ لکھائی چھپائی اور بڑھیا چکنے کاغذ کے ساتھ ۱۲ میں نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی (مغربی پاکستان) سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہندستان میں ترسیل زر کا پتا: اشتیاق بک ڈپو دیو بند سہارنپور (یو۔ پی) "ا"

سیرت پاک آنحضرت کی زندگی اور سیرت پاک سے متعلق اب تک ہزاروں ہی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ بشیر محمد شارق دہلوی کی زیر تبصرہ کتاب کو اس سلسلے کی ایک اور کڑی کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب بقول ناشر "بچوں بچیوں لڑکوں لڑکیوں اور بڑوں کے لیے سیرت کی چھوٹی سی ہلکی پھلکی شیریں زبان والی مختصر لیکن جامع کتاب ہے" اور انہیں کے الفاظ میں "جس کا پڑھنا لکھنا سب کے لیے آسان ہے۔ جس سے ہر طبقہ کا شخص ہدایت پا سکتا ہے۔" واقعہ یہ ہے کہ مرتب نے نہایت ہی صاف سلیس اور آسان زبان میں آنحضرت کی زندگی کے حالات اور واقعات قلم بند کیے ہیں۔ جو بچوں اور بڑوں کے لیے یکساں طور پر آسانی کے ساتھ سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ مذہبی نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اہمیت ظاہر ہے اس لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ ہر مسلم گھرانے میں اس کا رہنا ضروری ہے اور دنیا کی ایک عظیم ترین ہستی کے حالات کا لحاظ کرتے دوسرے مذاہب والے بھی اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

چھوٹا سائز۔ مجلد آرٹ پیپر کا دو رنگی گرد پوش۔ حجم ۱۹۲ صفحے کاغذ چکنا لکھائی چھپائی بہتر۔ قیمت عہ ملنے کا پتا کارخانہ تجارت کتب۔ بالمقابل آرام باغ۔ فریئر روڈ۔ کراچی (مغربی پاکستان) ہندستان میں ترسیل زر کا پتا۔ اشتیاق بک ڈپو۔ دیو بند سہارنپور (یو۔ پی) "ا"

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

بی۔ ایم۔ خان۔ ایم۔ اے (عثمانیہ)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانیوالا رسالا

اردو کو بگاڑنے والا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۴۴)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

جلد (۱۵) نمبر (۷)

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان ام۔ اے (عثمانیہ)

خرداد ۱۳۶۴ف اپریل ۱۹۵۵ء

چندا سالانا آٹھ روپے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
حقایق و معارف	اختر موہانی وارثی	۵
جلتے والے سے خطاب	اعتبار الملک ل شاہجہان پوری	۶
فضائیں	فضا (جالندھری)	۷
غزل	حبیب پرویز (لکھنوی)	۸
نیرل عشق	صفی احمد بہاری	۸
ہندستانی ادب	ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی	۹
غزل	رباب دانش	۱۱
کلام صابر	صابر (لکھنوی)	۱۱
عبداللہ ابن المقفع	تمکین کاظمی (حیدرابادی)	۱۲
ہندستان اور ایران کا باہمی رشتا	ڈاکٹر تاراچند	۲۰
سنسکرت ڈرامے کی روایات	ل۔ ا	۲۲
غزل	خنجر (لکھنوی)	۲۳
ترنمات نصیر	نصیر فتح پوری	۲۴
مسٹر ونسٹن چرچل	ولسن ہیریسن	۲۴
سوال زندگی	صابر حسین صابر آردوی	۲۵
۔۔۔۔ کے نام	صبا نقوی	۲۶
مس ہیلن کیلر	یونیس	۲۹
تبصرے	" ا "	۳۱

ہمارے خیالات

ہندستان میں لازمی اور مفت تعلیم مرکزی حکومت کے فرائض میں داخل ہے

وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد توجہ فرمائیں

اگر مرکزی حکومت اپنی بات رکھنا چاہتی ہے۔ اگر حکومت کو اپنے دستور کا خیال اور لحاظ ہے اور حکومت یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ ۱۹۶۰ء تک سارے دیس میں ۱۴ سال کی عمر تک کے بچوں کی تعلیم عام اور مفت ہو جائے۔ اور اگر وہ یہ سمجھتی ہے کہ ملک کے نونہال علم کے زیور سے آراستہ ہو جائیں تو ایک حد تک دیس سے جہالت جیسی لعنت دور ہو جائے گی۔ جہالت کے دور ہو جانے سے ملک میں ترقی اور خوش حالی کا دور دورہ ہو گا۔ زندگی امن چین سے گزرے گی۔ اور سارا دیس ترقی کی ہر منزل نہایت ہی آسانی سے طے کرتا چلا جائے گا۔

یہ کام آسان نہیں بلکہ کٹھن اور بھاری ضرور ہے۔ لیکن اگر مرکزی حکومت کے قابل وزیر تعلیم مولانا ابو الکلام آزاد اگر ہمارے مفید اور سنہرے مشوروں پر دھیان دیں تو کام بالکل ہی آسانی بن سکتا ہے۔ وزیر تعلیم کو ہمارا یہ سنہرا مشورہ ہے کہ جس طرح ہندستان کے بڑے وزیر جواہر لال نہرو نے ضرورت کے لحاظ سے ہندستان کے دستور کی چار دفعات میں ترمیم کروا دی ہے اسی طرح ایک اور اہم ضرورت جتاتے ہوئے وزیر تعلیم بھی اس طرح کا ایک ترمیمی بل منظوری کی غرض سے پارلیمنٹ میں پیش کر دیں اور اس بل میں یہ خواہش کی جائے کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ واقعی ۱۹۶۰ء تک سارے دیس میں ۱۴ سال تک کی عمر کے بچوں کی تعلیم عام اور مفت ہو جائے تو اس خصوص میں مرکزی مواز نے کی مد تعلیمات میں اضافے اور مدد کی غرض سے ضرورت اس بات کی ہے کہ سالانہ ایک لاکھ سے اونچی آمدنی پر ۵ فیصد تعلیمی ٹیکس لگا دیا جائے۔

یہ تو آپ ہم سب ہی جانتے ہیں کہ آبادی کا لحاظ کرتے ساری دنیا میں چین پہلے نمبر پر۔ اس کی آبادی ساٹھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ خانہ جنگی سے پہلے چین میں ان پڑھوں کا دور دورہ تھا مگر اب وہ ترقی کے رستے پر چل رہا ہے اور آزادی کے بعد سے اب تک چین نے تعلیمی اعتبار سے جو بھی ترقی کی ہے وہ دوسرے دیسوں کے لیے مثالی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ترقی کا سب سے بڑا بھید "لازمی اور مفت تعلیم" ہے۔

ہندستان جس طرح رقبے میں چین سے چھوٹا ہے اسی تناسب سے اس کی آبادی بھی گھٹی ہوئی ہے لیکن اس کی آبادی پھر بھی اتنی زیادہ ہے کہ چین کے بعد ہندستان ہی دوسرے نمبر پر آتا ہے۔

ہمارے بڑے وزیر جواہر لال نہرو نے کئی بار اپنی تقریروں میں دہرایا ہے کہ ہمارے دیس کی آبادی ۳۶ کروڑ ہے ہوسکتا ہے کہ عہدے داران مردم شماری کی رائے میں یہ اعداد کچھ ٹھیک سے نہ ہوں اور ان میں کمی زیادتی ہو سکتی ہے مگر ہمیں سو میں سو صحیح اعداد کی اس لیے بھی ضرورت نہیں ہے کہ بہت سی اسکیمیں اور بہت سارے کام قریبی اندازوں پر بھی بن جایا کرتے ہیں۔ اس لیے ہم ۳۶ کا عدد ہی صحیح سمجھ لیتے ہیں ۳۶ کروڑ —— کوئی معمولی عدد نہیں۔ اتنی زیادہ تعداد تو کیڑے مکوڑوں کی بھی نہیں ہوا کرتی۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ہندستان میں کیڑے مکوڑے نما ۳۶ کروڑ —— آدمی ضرور بستے ہیں جن کی ایک بڑی اکثریت افلاس اور جہالت کا شکار ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی کے بعد سے ہماری حکومت اس بات کی کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ افلاس اور جہالت کا دیس دیوالیا ہو جائے مگر یہ بھاری اور کٹھن کام ایک ہی وقت میں کیسے ممکن ہے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دوسرے پانچ سالا منصوبے میں افلاس اور جہالت کو دور کرنے کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے اس کے بعد بھی ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حکومت جیسی کہ کامیابی چاہتی ہے ممکن نہیں اس کی ایک معمولی مثال ہم نیچے پیش کرتے ہیں۔

بمبئی اسمبلی میں ۵۵ تا ۵۶ء کے بجٹ کے دوران صوبے کی تعلیمی ضرورتوں کے لیے وزیر تعلیم ڈنگر راو دلیبائی نے تقریباً ۱۶ کروڑ روپے کی منظوری چاہی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "ہمارے صوبے کی حقیقی تعلیمی ضرورتوں کا لحاظ کرتے یہ رقم بھی ناکافی ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہمارا موازنہ اس سے رقم کی اجازت بھی نہیں دے سکتا۔"

دلیبائی نے آگے چل کر کہا کہ "ہمیں ہندستان کے دستور کے اس نعرے کا خاص طور پر خیال ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ سارے دیس میں ۱۹۶۰ء تک ۱۴ سال کی عمر کے بچوں کی تعلیم مفت اور لازمی ہو جانی چاہیے" وزیر تعلیم نے یہ بھی بتایا کہ "جون ۱۹۵۵ء تک بمبئی کے ایسے تمام دیہاتوں میں جن کی آبادی ۵۰۰ یا اس کے اوپر ہو تعلیم مفت اور لازمی کر دی جائے گی۔ اور سال کے ختم تک تو یہ رفتار اور بھی تیز کر دی جائے گی۔"

حکومت بمبئی کا یہ بڑا ہی اچھا اقدام ہے ہم اس سے بھی واقف ہیں کہ دوسرے صوبے ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ سب ہی صوبے اس طرف دھیان دے رہے ہیں۔ لیکن ان کی مالی مشکلیں تھوڑی بہت رکاوٹ کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ صوبوں کی اپنی ہی ضرورتیں بڑی چڑھی ہوا کرتی ہیں۔ آمدنی سے زیادہ خرچ ہوا کرتا ہے یہی وجہ ہوتی ہے کہ تقریباً ہر صوبے کا موازنہ "خسارے" کا کالا مونھ پیش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں صوبا واری حکومتوں سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ تعلیم پر زیادہ سے زیادہ پیسا خرچ کریں چونکہ ۱۴ سال کی عمر تک بچوں کی مفت اور لازمی تعلیم دستور ہندستان کا ایک جز ہے اس لحاظ سے اگر مرکزی حکومت اس بھاری اور ذمے دارانہ کام کو اپنے ہات میں لے لے تو صوبے واری حکومتوں کا ایک بھاری بوجھ ہلکا ہو سکتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بڑی حد تک ان کی مالی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔

کام تو صوبا واری حکومتیں ہی کریں گی۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے بجٹ سے سالانا ایک بھاری رقم ہر صوبے کی ضرورت کا لحاظ کرتے تقسیم کر دی جائے۔

اب یہ تیڑھا سوال لازمی طور پر پیدا ہوتا ہے کہ مرکزی موازنہ خسارے میں چل رہا ہے اور مالیات کے قابل وزیر سی۔ ڈی۔ دیشمکھ ہر سال نئی نئی سوچ کر کسی نہ کسی طرح بابجائی کرتے ہیں۔ تب ایسی صورت میں یہ فاضل رقم کہاں سے لائی جائے —— لیکن یہ سوال ٹیڑھا ہے ہم خود

بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں لیکن یہ سوچ سمجھ کر ہی ہم نے اوپر اس کا حل بتا دیا ہے۔ اور یہ حل کچھ زیادہ مشکل نہیں جیسا کہ ہم نے اوپر کے نوٹ میں کھلے شبدوں میں ظاہر کر دیا ہے کہ ضرورت کے تحت ہندستان کے بڑے وزیر جواہر لال نہرو نے ایک بار نہیں بلکہ چار مرتبہ ہندستان کے دستور کی دفعات میں ترمیمیں منظور کروائی ہیں۔ چونکہ وہ ضرورت ایسی جانتے کہ پارلیمنٹ کے ممبروں کو ماننی ہی پڑتی۔ اسی طرح وزیر تعلیم کو بھی چاہیے کہ ہمارے گنائے ہوئے وچاروں کی روشنی میں "تعلیمی ٹیکس بل" کے نام سے پارلیمنٹ میں ایک مسودا منظوری کی غرض سے پیش کریں اور اس کی بڑی چڑی اہمیت کو جتاتے ہوئے بل کو منظور کروانے کی غرض سے اپنی تمام تر صلاحیتیں قابلیتیں اور سب سے بڑھ کر اپنے مشہور فن خطابت کی ساری قوت صرف کر ڈالیں' ایسی صورت میں یہ آشا کی جا سکتی ہے کہ مولانا کی جادو بیانی کا وار چل ہی جائے گا۔

بہر حال یہ ضروری ہے کہ "تعلیمی ٹیکس بل" کسی نہ کسی طرح منظور کروایا جائے۔ یہ ایک بھلا کام ہے اور اس میں ساری جنتا کی بھلائی ہی کا تو سوال ہے! ایسے مستقل اور ضروری کام چندوں یا عطیوں سے نہیں چلائے جا سکتے۔ اس کے لیے تو قانون کے بااثر ڈنڈے ہی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی اس بل کی اہمیت ظاہر ہے۔ یقین ہے کہ مولانا آزاد اس کی اہمیت کو ضرور محسوس فرمائیں گے۔

ستّر ہزار بچے بے تعلیم ہیں

غالباً وزیر تعلیم مولانا آزاد اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ بمبئی صوبے میں اس وقت تقریباً ۷۰ ہزار بچے بے تعلیم ہیں۔ ان کے بے تعلیم ہونے کا بڑا سبب ان کے ماں باپ کی غربت، افلاس اور ناداری ہے۔ کیا معلوم کتنوں کے ماں باپ تنگی کی زندگی بسر کر رہے ہوں اور کتنوں ہی کے ماں باپ بھوک اور فاقہ کشی کے ساتھ گذار رہے ہوں۔ ایسے غریبوں سے کیا آشا کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو تعلیم دلائیں گے۔ ایسوں کی مائی باپ تو حکومت ہی ہوا کرتی ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ ان بے سہاروں کو اپنی آغوش میں لے لے۔ اور نہ صرف ان کی تعلیم و تربیت بلکہ ان کے کھانے پینے اور کپڑے لتے کی طرف بھی دھیان دے اگر حکومت ان کی طرف سے غفلت برتے گی تو ان نونہالوں کی ابھرنے اور پنپنے والی زندگیاں ٹھٹھر کر رہ جائیں گی۔ سوال صرف بمبئی کے ۷۰ ہزار بے تعلیم بچوں کا نہیں ہے' بلکہ دیس کے ہر صوبے اور اسٹیٹ میں ایسے کئی ستّر ہزار مجبوریوں کے سبب تعلیم کی نعمت سے محروم ہیں۔ اس طرح یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے دیس کے لاکھوں ہی بچوں کو تعلیم کی دولت سے محروم رکھنا ایک قسم کا انیائے اور پاپ ہے' جس کی تمام تر ذمے داری حکومت پر آتی ہے ——

—— اور پھر حکومت کو اس پر بھی غور کرنا ہے کہ ان لاکھوں ہی بے تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں میں نہ معلوم کتنے ہی قابل دماغ ہوں ان میں ادیب اور شاعر بھی ہوں گے' انہیں میں تاریخ داں اور فلسفی ہوں گے۔ سائنس دانی بھی ہوں گے اور انہیں میں انجنیر بھی ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ تعلیم نہ پانے کے سبب ان کے جوہر ابھرنے نہیں پائیں گے اور گمنامی کی زندگی گذار کر چلتے بنیں گے۔ چنانچہ اس لحاظ سے بھی مرکزی حکومت اور خصوصاً مرکزی وزارت تعلیم پر بڑی بھاری ذمے داری عاید ہوتی ہے۔ کہ وہ سارے دیس میں تعلیم مفت اور عام کر دے۔ تاکہ ملک کو ہر سال زیادہ سے زیادہ اعلیٰ تعلیم یافتہ قابل دماغ مل سکیں۔ جو اپنی منجھی ہوئی صلاحیتوں سے دیس کی بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ سیوا کر سکیں ——

ہمیں آشا ہے کہ مرکزی حکومت ہندستان آیندا موازنے سے پہلے ہمارے ان وچاروں پر ضرور دھیان دے گی۔

نوٹ: کاتب صاحب کے بیمار پڑ جانے سے اس نمبر کی اشاعت میں غیر معمولی دیر ہو گئی۔ جس کا ادارے کو بے حد افسوس ہے۔

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی (لکھنوی)

تمام عالم ہستی سے ہو گئے بیگانہ
تمام ہستیٔ عاشق نثار جانانہ

گئے وہ دن کہ تھا صحرا نورد دیوانہ
پکارتا ترے وحشی کو اب ہے ویرانہ

اسے نہ مے کی ضرورت نہ فکر میخانہ
جو سمجھے دور فلک کو بھی دور پیمانہ

اک انقلاب کی بنتی ہیں سرخیاں لاکھوں
بدلتا رہتا ہے دنیا کا یوں ہی افسانہ

حریم ناز کے پردے ابھی اٹھے بھی نہ تھے
کہ ہو گئی نگہ شوق مجھ سے بیگانہ

تمام حسن کے جلوے تمام ذوق نظر
نثار جنبش برق جمال جانانہ

فلک جناب، ملک بارگاہ عرش مقام
عجیب ہے نام خدا۔ یار کا بھی کاشانہ

چراغ ایک ہے روشن ہے دو گھروں میں مگر
بنی ہے شمع حرم، رونق صنم خانہ

ہزاروں منزلیں راہ طلب میں تھیں اسکی
کسی کو مل گیا کعبہ کسی کو بت خانہ

بتا دے وسعت کونین سے کہاں کہدیں
ذرا سی لائے ہیں ہم خاک کوئے جانانہ

جمال یار ذرا اور وسعتوں پہ نظر
کہ برق طور ہے پھر بھی چراغ کاشانہ

جو بیکسوں کی زباں بھی سمجھ نہیں سکتے
خدا کی شان بنے ہیں وہ پیر میخانہ

چراغ دیر و حرم کو تھا امتیاز طلب
سمجھ سکا نہ تجلی کا فرق پروانہ

تری نظر بھی جہاں تک پہنچ نہیں سکتی
ہے اس مقام پہ زاہد خراب میخانہ

ہوئی ہے ختم مری داستان غم، مگر
مری وفاؤں کا اب تم کہو گے افسانہ

نشاں بھی بزم طرب کا سحر کو مل نہ سکا
نہ شمع تھی نہ وہ محفل نہ خاک پروانہ

اٹھاؤں سر کو نہ واللہ حشر تک افقر
ملے جو سجدے کو دامان پیر میخانہ

جانے والے سے خطاب

اعتبار الملک دل شاہجہانپوری

[illegible]

دستور یہی ہے عالم کا آتے ہیں یہاں جانے والے
بیچین ہو کیوں آنسو پوچھو یہ کون ہمیں سمجھاتا ہے

ڈوبے کہ بچی اپنی کشتی گھبرا کے خدا پر چھوڑ دیا
ہم روک سکیں ممکن ہی نہیں اک طوفاں امڈا آتا ہے

وہ چشم کرم کا لطف کہاں تھا صدیقی کا اب جاکر
جب یاد تمہاری آتی ہے بیچین کوئی ہو جاتا ہے

[illegible]

طغیانی بحر الفت میں کیا میرے سفینے کی ہستی
پہنچے گا یہ کیونکر ساحل تک منجدھار ہی میں ڈبو دیا جاتا ہے

نظروں کا سہارا کون پہنچوں بھی تو کیونکر منزل تک
گھبرا کے جدھر رخ کرتا ہوں ہر نقش قدم مٹتا جاتا ہے

پیکاں ہے کہ نشتر یا خنجر اے عشق اسے میں کیا سمجھوں
اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے رہ رہ کے کوئی تڑپاتا ہے

[illegible]

مختار ہیں وہ مجبور ہے دل گریہ کیلئے کچھ قید نہیں
جانے میں اگر ان کی مرضی ہم کو بھی تو رونا آتا ہے

ساقی ہے ادھر واعظ ہے ادھر رحمت ہے ادھر
بے کیف رہوں یہ مشکل ہے پیتا ہوں تو دل تھراتا ہے

یہ اہل نظر کا ایما ہے انداز بیاں بدلوا دے دل
جو شعر اثر میں ڈوبا ہو وہ جان غزل بن جاتا ہے

فضائیں

فضاؔ جالندھری

رہِ عشق میں امتحاں اور بھی ہیں
مرے سامنے آسماں اور بھی ہیں

غبارِ سرِ رہگزر کہہ رہا ہے
پسِ کارواں کارواں اور بھی ہیں

گلہ جورِ صیاد کا کرنے والے
ہزاروں مرے ہمزباں اور بھی ہیں

مسلسل حوادث میں ہم نے یہ جانا
نہ آسماں، آسماں اور بھی ہیں

بہت دور اس سرحدِ آب و گل سے
غمِ عشق کے رازداں اور بھی ہیں

صنم خانہ و دیر بیت الحرم کیا
ترے سینکڑوں آستاں اور بھی ہیں

نہیں تشنۂ گفتگو دردِ پنہاں
کہ اس درد کے ترجماں اور بھی ہیں

مہ و مہر و انجم پہ کیا منحصر ہے
کسی خود نما کے نشاں اور بھی ہیں

یہی ایک عشرت گہہ آب و گل کیا
چمن اور بھی گلستاں اور بھی ہیں

اگر جل گیا ہے نشیمن تو کیا غم
چمن میں فضاؔ آشیاں اور بھی ہیں

غزل

دیکھو بہار آکے دل داغدار کی
یہ بھی ہے اک روش چمن روزگار کی
مجبور ہو کے اب یہ روش اختیار کی
چپ بیٹھے تکتے رہتے ہیں صورت کو یار کی
شکر کہ بزم غیر میں آمد ہے یار کی
ہم اٹھ گئے کہ بات نہ تھی اختیار کی
قاصد نے آکے ایسا سنایا جواب صاف
بس آس توڑ دی دل امیدوار کی
آئے بھی میرے پاس تو آئے نقاب میں
ملنے پہ بھی خلش نہ گئی انتظار کی
ہم سے نہ پوچھ شیخ۔ ذرا پی کے دیکھ لے
تعریف خود کرے گا مئے خوشگوار کی
میری نگاہ یاس عجب کام کر گئی
تصویر کھینچ لی مرے قاتل کے وار کی
شوق وصال یار، کبھی اشتیاق دید
پر لطف تھی ہر ایک گھڑی انتظار کی
خاطر سے دل کی بزم عدو دیکھنی پڑی
جو بات ماننے کی نہ تھی اختیار کی
روتے کبھی تڑپتے کبھی۔ لوٹتے کبھی
مر مر کے ختم ہم نے شب انتظار کی
بسمل سسک رہا ہے نہ رکھ تیغ نیام میں
قاتل کسر ہے باقی فقط ایک وار کی
قاصد کے ساتھ ساتھ چلیں ہم بھی اے حبیب
تکلیف کیوں اٹھائیں عبث انتظار کی

حبیب پرویز وارثی (لکھنوی)

منزل عشق

بول رہا ہے دور پپیہا
جھوم رہی ہے شاخ تمنا
اشک ندامت توبہ توبہ
بھول ہوئی جو تم کو چھیڑا
اشک محبت اللہ اللہ
پھول کھلے ہیں گودیں کیا کیا
ذرا ذرا حسن کا عالم
بنا بنا درس تماشا
حسن کی منزل عشق کا مسکن
دل کی امانت برق تجلی
عشق ہے منزل اہل جنوں کی
عقل و خرد کا اس میں گذر کیا
شیوہ حسن و عشق وہی ہے
ناز تمہارا، عجز ہمارا
ہجر کی شب بھی کاٹ دی ہنس کر
اللہ اللہ حوصلا اپنا
عشق ہے پیارے کھیل نہیں ہے
ساتھ ہمارا سوچ کے دینا
ایک نظر جو جھک گئی اٹھ کر
تم کیا جانو کہہ گئی کیا کیا
عشق کی لذت پوچھیے مجھ سے
اہل ہوس کو اس کی خبر کیا
دعوی عشق اور عرض تمنا
آج صفی یہ تم کو ہوا کیا

صفی احمد (بہاری)

ہندستانی ادب

ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی

ہندستانی ادب بہ حیثیت مجموعی وسعت۔ تنوع اور لطافت کے لحاظ سے ہمارا بیش بہا سرمایا ہے۔ جو نہ صرف ہندستانی عوام بلکے بنی نوع انسان کو ورثے میں ملا ہے۔ ہندستانی ادب ویدوں سے شروع ہوتا ہے۔ جو محتاط اندازے کے برابر ایک ہزار سال قبل مسیح مرتب کیے گئے اور یورپ کے مقابلے ہومر سے کچھ صدیاں پیشتر وجود میں آئے۔ اس کے بعد غیر معمولی طور پر تین ہزار سال سے ہندستان میں ان ادبی کاوشوں کا سلسلا جاری ہے دنیا میں صرف تین اور قومیں یعنی چینی۔ یہودی اور یونانی ایسی ہیں جن کے ادب کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ویدک، سنسکرت، پالی اور چند پراکرتوں میں کئی ایسے شاہکار ہیں جو بنی نوع انسان کا دائمی سرمایا بن چکے ہیں۔ ان میں سے رگ وید، اتھروید۔ اپنشد مہابھارت، رامائن پران ارتھ شاستر اور کام شاستر قابل ذکر ہیں۔ پالی پراکرتی اور سنسکرت زبانوں میں ہندستانی ادب کا ایک خزانا موجود ہے جس میں براہمنی۔ بدھ اور جینی فلسفے کی توضیح کی گئی ہے۔

ہندستانی ادب کی تاریخ کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قدیم اور دوسرا جدید۔ ادب کا دور جدید ایک ہزار سال بعد مسیح کے لگ بھگ شروع ہوتا ہے یہ وہ زمانا ہے جب ہندستان کی سیاسی اور ثقافتی فضا میں کئی ایک عظیم انقلاب آئے اور اتری ہندستان کی آرین زبانیں نیا روپ اختیار کرنے لگیں جو ویدک و کلاسیکل سنسکرت سے ظاہر ہے۔ اسی طرح سنہ ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ اتری ہندستان اور دکن کی موجودا ہندستانی زبانیں اور بولیاں مثلاً سندی۔ کشمیری۔ بنگالی۔ آسامی۔ اڑیا۔ میتھلی مگدھی۔ بھوجپوری۔ کوسالی۔ برج بھاشا وغیرا ابھی تہذیب اور تزئین کے سانچے میں ڈھلنی شروع ہوئیں۔

عام ادب کے علاوا جو مذہبی ادب موجودا ہندستانی زبانوں میں ملتا ہے اس میں ایک ملا جلا جز پایا جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مہابھارت اور رامائن کی رزمیا نظمیں، بھگوت پران اور پرانوں کی کہانیاں وغیرا بائیبل سے کم حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس عظیم ہندستانی قدیم ورثے کے علاوا ملک کے بہت سے حصوں میں مقامی عقاید اور قصے کہانیاں بھی مقبول عام تھیں اور ان میں براہمنی رنگ بھرا جا رہا تھا۔ جدید ہندستانی ادب کے ابتدائی زمانے میں رومانس اور نظم کی شکل میں بہت سے قصے کہانیاں رائج تھیں جنھوں نے نہ صرف بین صوبجاتی شکل ہی اختیار کی بلکے انہیں ہندستانی اتحاد و یگانگت کا منبع کہا جا سکتا ہے، اور بعد میں اتری ہندستان کی بعض زبانوں مثلاً ہندستانی یا ہندی۔ بنگالی۔ پنجابی اور سندی میں فارسی اور عربی کا جز بھی شامل ہو گیا۔ ہندی زبان کی اردو شکل میں تو یہ عنصر صاف نمایاں تھا۔ سترھویں صدی کے بعد سے تو ایسا بہت سا قابل ستایش ادب ملتا ہے جو مسلمانوں کے مذہبی موضوعات رزم و بزم کی داستانوں جذبۂ عشق اور روایات سے تعلق رکھتا ہے۔

بزم و رزم ہندستان کی جدید زبانوں میں ابتدائی ادب یا تو بزم کی صورت میں تھا یا پھر اس نے رزم کی شکل اختیار کی۔ بزم میں مذہبی عقیدت مندی عشق وغیرا ایسے جذبات کی ترجمانی کی جاتی تھی اور رزم میں دیو مالا روایتی کہانیاں وغیرا بیان کی جاتیں۔ اور بعد میں اسلامی اثر کے ماتحت فارسی اور عربی سے بھی مواد حاصل کیا جاتا رہا۔ بنگالی ادب میں بزم اور رزم کو پدا اور منگل و رنگو

میں اکم اور یورم کا نام دیا جاتا تھا۔ قدیم زمانے کے ہندستانی ادب کا اب کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ولبھ اور دوسرے سنت مہاتماؤں کی سوانح عمریاں بھی زبان زد خلایق ہیں۔ حقیقت میں ان ادبوں میں گہرا رشتہ اور تعلق پایا جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تخیلی زاویہ نگاہ سے علیحدہ علیحدہ شمار کرنا صحیح نہیں۔

قرون وسطیٰ جدید ہندستانی ادب قرون وسطیٰ کی شجاعت کی کہانیوں اور رومان پر مشتمل ہے مثلاً بنگال میں لکھے ہوئے اور اس کی دھرم ٹھاکر کی کہانیوں کا سلسلہ مشہور ہے۔ اسی طرح اڑیسہ میں راجوں مہاراجوں اور خصوصاً پرشوتم دیو اور پدماوتی کے قصے رایج ہیں۔ راجپوتانہ تو شجاعت اور رومان کی کہانیوں کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت رکھتا ہے اور جذبات بھرے گیت یہاں اب بھی بے حد مقبول ہیں۔

اسلامی ادب حمد و نعت اور پیروں اور بزرگوں کے واقعات سے بھرپور ہے اس میں حضرت محمد کے عظیم الشان اور محیر العقول کارنامے خاص طور پر نمایاں ہیں۔ اس ادب میں قصے کہانیاں عام طور پر فارسی یا عربی زبانوں سے لی گئی ہیں ان میں سے "شاہنامہ" اور اسکندر اعظم کے معرکے قابل ذکر ہیں اسی طرح صوفی فلسفے اور روحانی کلچر بھی اس ادب کا ایک حصہ ہے جسے ہندوؤں کے مذہبی فرقوں نے بھی احترام سے قبول کیا۔ اور اسی طرح تیرہویں صدی کے بعد سے آزاد خیال ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم قایم ہو گیا۔ اس کے علاوہ انڑی ہندستان میں ادب کی اور بہت سی شاخیں ادھ ملیا جوتیسیا کی بجائے سی حرفی کی صورت میں ظہور میں آئیں۔ ابتدائی زمانے میں نثر کی طرف شاذ و نادر ہی توجہ کی جاتی تھی۔ البتہ آسامی۔ برج بھاشا اور گجراتی زبانوں میں متعدد سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ پنجابی زبان کے ابتدائی زمانے میں سکھ گروصاحبان کی سوانح عمریاں بھی نثر میں لکھی گئیں۔

بلواسطہ اثرات جدید ہندی آرین ادب میں ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اصلی کتابوں کا مطالعہ ترجموں میں نہیں بلکہ مختلف زبانوں میں کیا جاتا تھا۔ اور اس طرح زبان میں قدرے ترمیم ہوتی رہی۔ اس سلسلے میں کبیر اور میرا بائی کی تصانیف قابل ذکر ہیں۔ قرون وسطیٰ اور دور جدید میں ہندستان کے وسیع علاقے میں ادب اور خیالات جغرافیائی حدود سے بے نیاز بغیر روک ٹوک کے پھیلتے رہے البتہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے زمانے کے مقابلے میں بلاشبہ جدید ہندستانی ادب کا دایرہ پہلے محدود سا تھا لیکن بنگالی۔ ہندی۔ پنجابی سندی وغیرہ زبانوں میں نظم کو عروج حاصل ہوا۔ رزمیہ نظمیں تو خصوصاً نہایت بلند پایے کی ہیں۔ ان کے علاوہ فلسفے کی چند ایک تصانیف مثلاً "چے تنہ چرت امرت" کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔

اس وقت ڈرامے سے لوگ واقف نہ تھے اور ادبی لحاظ سے ہندی آرین زبانوں میں اسے کوئی فروغ حاصل نہیں ہوا۔ البتہ سولویں صدی کی آسامی زبان میں چند ایک قدیم مذہبی ڈرامے پائے جاتے ہیں۔ اور سترویں صدی میں نیپال میں بنگالی۔ میتھلی اور اودھی زبانوں میں ملے جلے چند ڈرامے لکھے گئے۔ ہندستان میں جدید ڈرامے کو زیادہ تر انگریزوں کے زیر اثر انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں فروغ حاصل ہوا۔ اگرچہ بنیادی طور پر سنسکرت ڈرامے کا بھی قدرے اثر پایا جاتا ہے۔ ہندستانی ادب میں سب سے بڑی خامی نثر کی عدم موجودگی ہے یہاں تک کہ آرٹ اور سائنس کا تذکرہ بھی نظم میں کیا جاتا ہے۔ قانون اور علم طب بھی نظم میں ہی ملتا ہے

یورپ سے رابطہ حقیقت میں ہندستان میں علم و فن کے احیا کا زمانہ انگریزی ادب اور

یوریی اسپرٹ کا مرہون منت ہے نہ صرف انگریزی بلکہ قدیم یونان۔ روم۔ فرانس۔ جرمنی۔ روس اور سکنڈے نیویا کے ادیوں سے بھی ہندستانی بہت حدتک متاثر ہوے اور ادب میں ان کے رجحانات سے ایک انقلاب سا آگیا۔

رابندرناتھ ٹیگور جنھیں ۱۹۱۳ء میں نوبل پرائز عطا کیا گیا تھا۔ ہندستانی ادب کی اس نئی اسپرٹ کی روح رواں بن گیے۔ لیکن اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ علم وفن کے احیا میں ہندستان کے قدیم تمدن کو بہت دخل حاصل ہے ہندستان کے ادب میں سنسکرت ایسا خزانا موجود ہے اور موجود ادب کو مشرق اور مغرب کا سنگم کہنا بے جا نہ ہوگا۔ مغربی ممالک نے سنسکرت اور ہندستانی تفکر کی قدر افزائی سے ہندستانیوں کے دلوں میں ایک ولولا سا پیدا کردیا ہے اور تخلیقی ادب کا سہرا بہت حدتک ہندستان کے موجودہ رہنماؤں کے سر ہے۔ جو مشرق اور مغرب کے ملاپ واتحاد کے علمبردار ہیں۔

غزل

رباب دانش

شیشہ کبھی سراب کبھی چشم تر سے میں
کھاتا رہا فریب، فریب نظر سے میں
اے ذوق بندگی ترے جذبے کا شکریا
ٹکرا رہا ہوں اپنی جبیں سنگ در سے میں
جی چاہتا ہے پھر اسی وارفتگی کے ساتھ
دار ورسن کو چوم لوں جذب نظر سے میں
شبنم کے چند قطروں سے حسن بہار کیا
دامن پہ گل کھلاؤں گا خون جگر سے میں
فیض دوام سے نہ سے دانش کو کیا غرض
دست عمل بڑھاتا ہوں زور اثر سے میں

کلام صابر

صابر (لکھنوی)

مسیحائی اپنی مسیحا دکھائیں
میں بیہوش ہوں ہوش میں مجھکو لائیں
جوانی کا عالم اگر وہ دکھائیں
کریں حشر برپا، قیامت اٹھائیں
تو پھر کون تھا زینت بزم دشمن
زیادا نہ بس آپ باتیں بنائیں
چلے آؤ بہر عیادت خدارا
کسی مرنے والے کی سن لو دعائیں
میں اٹھ جاؤں گا خود اٹھانے سے پہلے
نہ اس کے لیے آپ زحمت اٹھائیں
میں حال مریض شب غم کہوں کیا
کہ جب بے اثر ہوں عا کیں دوائیں
وہ ہر بات پر ہم کو یاد آرہے ہیں
بھلائیں تو کس طرح ان کو بھلائیں
میں کب امتحان وفا سے ہوں باہر
محبت مری وہ ضرور آزمائیں
کوئی سننے والا بھی تو ہو جہاں میں
سنائیں غم دل تو کسکو سنائیں
اٹھاتے ہو مجھکو تو یہ بھی بتا دو
تمہاری گلی سے کہاں اٹھکے جائیں
ارے میرے قاتل سنبھلنا سنبھلنا
تجھے ڈھونڈتی ہیں مری التجائیں
مٹانا نہیں میرا آسان صابر
کہیں خود ہی اہل جفا مٹ نہ جائیں

(پہلی قسط)

عبداللہ ابن المقفع

تمکین کاظمی
(حیدرآبادی)

یہ مضمون میں نے انجمن ترقی اردو (کراچی) کو دیا تھا جسے کارپردازان انجمن نے اپنے مجلہ "تاریخ وسیاسیات" بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں شایع کیا۔

تاریخ و سیاسیات کی اشاعت خود نہایت محدود ہے اور پھر ہندستان میں اس کی اشاعت تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے، اس لیے اب اس مضمون کو "ہندستانی ادب" میں شایع کروا رہا ہوں تاکہ برادران وطن اس سے استفادہ کر سکیں۔

(تمکین کاظمی)

عبداللہ ابن المقفع شہر جور کے باشندے تھے یہ جور وہی شہر ہے جو اب فیروزآباد کہلاتا ہے وہ ایک ملت پرست ایرانی تھے جنہوں نے قبول اسلام کے بعد کاتب اور منشی کی حیثیت سے بنی عباس کے دربار میں رسوخ حاصل کیا۔ ان کے نام کے متعلق مورخین کا عام خیال یہ ہے کہ "روزبہ" تھا اور ان کے والد کا نام "دازویہ" مگر صاحب شرح قاموس (تاج العروس) نے ق ف ع کے مادہ میں خود ابن المقفع کی کتاب الیتیمہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ابن المقفع کا نام دازیہ اور ان کے والد کا نام داذجشنس ہے معلوم نہیں کون سا قول درست ہے۔

ابن المقفع کے والد حجاج بن یوسف ثقفی کے زمانے (۷۵ھ تا ۹۵ھ) میں اہل دیوان سررشتہ مال اور تحصیلدار کی حیثیت سے حکومت عراق کے ملازم تھے آخر میں جب کہ وہ عامل خراج فارس تھے حجاج نے ان پر محاسبہ کیا اور خوب پٹوایا۔ کیونکہ ان پر تغلب وتصرف کا الزام تھا۔ اسی زدوکوب میں ان کا ہاتھ ٹوٹ کر ٹیڑھا ہو گیا۔ اسی لیے عربوں نے انہیں المقفع (۱) کا لقب دیا۔

خود عبداللہ ابن المقفع بھی صالح بن عبدالرحمن (۲) سیستانی کی طرف سے سلیمان بن عبدالملک کی خلافت کے زمانے (۹۶ھ تا ۹۹ھ) میں جبکہ صالح خلیفہ کی طرف سے متولی خراج

(۱) قفع، بالفتح، درکشیدہ شدن دست وپاے وجز وآں وبالضم آنانکہ انگشتان او برگشتہ باشد جمع اقفع (منتخب اللباب)

(۲) صالح بن عبدالرحمن سیستانی کے باپ کو فتح سیستان کے وقت (۳۰ھ میں) مسلمانوں نے گرفتار کیا تھا۔ یہ شخص حجاج بن یوسف کا دبیر تھا۔ یہی وہ شخص ہے جس نے دیوان عراق کو جو ۷۸ھ تک پہلوی زبان میں لکھا جاتا تھا محض اپنے رئیس کی رقابت کی وجہ سے عربی زبان میں شروع کر دیا۔ یہ آخری ضرب تھی جو زبان پہلوی پر لگی۔ اور یہ ایسی کاری تھی کہ پہلوی مٹ ہی گئی ۹۶ھ میں سلیمان بن عبدالملک نے اسکو عراق کے خراج کی وصولی کے لیے مامور کیا اور انہیں دنوں اس نے عبداللہ بن المقفع کو اپنی جانب سے متولی خراج دجلہ وبہقباذ مقرر کیا۔ بلاذری ابن المقفع سے بہ دو واسطہ نقل کرتے ہیں کہ ساسانیوں کے عہد میں ہر سال دفاتر بادشاہ کے پاس پیش ہونے اور بادشاہ اس پر دستخط کرتا تھا۔ یہ ایک چسپیدہ اور باہم وصل شدہ اوراق کا ذخیرہ ہوتا تھا جس کے آخر میں بادشاہ کے دستخط لیے جاتے تھے۔ جب خسرو پرویز کا زمانہ آیا تو اس طومار غلیظ کو دیکھ کر اس نے حکم دیا کہ آیندہ سے حسابات معطر اوراق پر زعفران اور گلاب آمیز روشنائی سے لکھے جائیں۔ اس حکم کے بعد سے سارے کاغذات معطر پیش ہونے لگے۔ جب صالح بن عبدالرحمن متصدی خراج ہوا اور ابن المقفع کو اس نے دجلہ اور بہقباذ بھیجا تو ابن المقفع نے جو

تھا۔ ولایات دجلہ یا بہقباذ کے خراج کی وصولی پر مامور رہے ہیں۔(۱)

عبداللہ ابن المقفع اسلام لانے سے پہلے اپنے والد کے ساتھ فارس میں رہتے تھے۔ وہیں انہوں نے علوم قدیما اور زبان پہلوی کی تحصیل کی اور پھر عربی بھی پڑھی اور پہلوی اور عربی ادبیات پر کامل عبور حاصل کیا۔ کہتے ہیں کہ ایک روز وہ کسی گلی میں سے گذر رہے تھے کہ ایک مکتب میں کسی بچے نے پڑھا "الم نجعل الارض مھاداً والجبال اوتاداً"، انہوں نے کھڑے ہو کر پوری سورۃ سنی اور کہا "الحق یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہے" (۲) اس کے بعد عیسیٰ بن علی کے پاس (جو خلیفہ منصور عباسی کا چچا تھا) پہنچے اور کہا "اسلام نے میرے دل میں راہ پائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ہات پر اسلام لاؤں" عیسیٰ نے کہا "یہ کام سرداران قوم اور چار آدمیوں کے سامنے ہو تو بہتر ہے تاکہ عوام کو بھی اس کی اطلاع ہو جائے"۔ چنانچہ اسی رات میں عیسیٰ نے سرداران قوم اور خوش باشان شہر کو اپنے پاس مدعو کیا جب دسترخوان چنا گیا تو عبداللہ ابن المقفع نے جیسا کہ زردشتیوں کا دستور ہے "زمزمہ" (۳) شروع کیا۔ زمزمہ سن کر عیسیٰ نے کہا "جب تم مسلمان ہونا چاہتے ہو تو پھر یہ کیا؟ یہ تو پارسیوں کی سنت ہے۔ ابن المقفع نے جواب دیا "میں ایک رات بھی بغیر کسی مذہب کے نہیں گذار سکتا" جب صبح ہوئی تو عیسیٰ بن علی کے ہات پر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اور اسلامی نام عبداللہ اور کنیت ابو محمد رکھی۔ (۲)

قبول اسلام سے پہلے عبداللہ ابن المقفع کا تعلق خلفائے بنی عباس کے دربار سے تھا۔ اور بصرہ میں یزید بن عمر بن ہبیرہ کے بیٹے داؤد بن یزید کے دبیر تھے (یزید بن عمر مروان حمار آخری خلیفہ اموی کی طرف سے عامل عراق تھا۔ جو ۱۲۸ھ میں مقرر ہوا تھا)

داؤد بن یزید ۱۳۲ھ میں (جبکہ خلافت بنی عباس کی ابتدا تھی اور خلافت بنی امیہ کا انقراض ہو چکا تھا) عباسیوں کے ہاتوں مارا گیا تو ابن المقفع عیسیٰ بن علی کے پاس پہنچ گئے اور مسلمان ہو کر مدت تک کرمان ہی میں عیسیٰ بن علی کے منشی کی حیثیت سے رہے۔ (۳) قیام بصرہ کے زمانے میں جبکہ ابن المقفع عیسیٰ بن علی اور اس کے بھائی سلیمان کے پاس دبیر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور ان کے بچوں کو بھی پڑھاتے تھے۔ خود بھی ابوالجاموش ثور بن یزید اعرابی سے جو فصیح اور بلیغ ترین شخص تھا استفادہ کرتے رہے (۴)

۱۳۷ھ میں عبداللہ بن علی (متوفی ۱۴۷ھ) نے جو خلیفہ منصور کا چچا تھا منصور پر خروج کیا اور اپنے لیے بیعت لینی شروع کی تو منصور نے ابومسلم خراسانی کو ایک بڑا لشکر دے کر بھیجا اور ابومسلم نے نصیبین کے مقام پر جمادی الآخر ۱۳۷ھ میں شکست دی۔ اور عبداللہ بھاگ کھڑا ہوا (۱)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲)

پہلا گوشوارہ یا بحث بھیجوایا تو اس کو معطر کاغذ پر معطر روشنائی سے لکھوایا۔ یہ معطر کاروائی صالح کے پاس پہنچی تو اس نے ہنس کر کہا کہ یہ کام سوائے ابن المقفع کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا کیونکہ وہی ایرانی تہذیب و تمدن کا واحد عالم ہے (کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۲، فتوح البلدان صفحہ ۳۰۰، ۳۰۱، ۴۶۴، ۴۶۵)

(۱) فتوح البلدان ص ۴۶۴، (۲) تاریخ طبرستان تالیف محمد بن حسن بن اسفندیار باب اول قسم اول،

(۳) ایک حمدیہ دعا ہے جو کھانے پہننے اوڑھنے کے وقت مغان (آتش پرست) پڑھتے ہیں (فرہنگ جہانگیری) خود ابن المقفع نے کلیلہ دمنہ باب برزویہ صفحہ ۳۰ میں اس کی اپنی زبانی کہلوایا ہے کہ میری ماں زرگان بیوتات الزنازمہ یعنی علمائے دین زردشت سے تھی (کلیلہ دمنہ بہرام شاہی صفحہ ۴۹)

(۲ و ۳) الفہرست صفحہ ۱۱۸ (۴) الفہرست صفحہ ۴۵،

(۱) ابن الاثیر حوادث ۱۲۷ھ

انہیں سے بصرہ جاکر اپنے بھائیوں عیسٰی اور سلیمان کے پاس چھپ رہا چونکہ سلیمان بصرہ کا حاکم اور منصور کا چچیتا تھا اس لیے اس نے عبداللہ کی سفارش کی اور منصور نے اس شرط پر معاف کرنے کا وعدہ کیا کہ عبداللہ ایک حلف نامہ لکھ دے۔ اس حلف نامہ کی تحریر کے لیے عبداللہ بن علی نے ابن المقفع کو مجبور کیا۔ اور ایسا حلف نامہ لکھنے کی خواہش کی جس سے منصور خوش ہو جائے۔ چنانچہ ابن المقفع نے اپنی فصاحت اور بلاغت کے جوہر دکھائے۔ عبداللہ بن علی کی طرف سے تمام قسمیں ختم کرنے کے بعد ایک ٹیپ کا بند یہ بھی لکھ دیا کہ اگر امیر المومنین (المنصور) اپنے چچا عبداللہ پر خواہ مخواہ چڑھائی کرے تو اس کی بیویوں پر طلاق ہو اس کے جانور وقف اور غلام آزاد ہو جائیں اور مسلمان اس کی بیعت سے خارج ہوں۔ منصور نے حلف نامے کی یہ شرط پڑھی تو اسے بہت برا معلوم ہوا۔ دریافت کیا کہ یہ کس نے لکھا ہے تو کہا گیا ابن المقفع نے! اس دن سے منصور کے دل میں ابن المقفع کی طرف سے ایک گرہ پڑ گئی۔

رمضان ۱۳۹ھ میں منصور نے سلیمان کو بصرہ سے معزول کر کے سفیان بن معاویہ بن یزید بن مہلب بن ابی صفرہ کو والیٔ بصرہ مقرر کیا۔ سفیان ابن المقفع کا پرانا دشمن تھا اور اس نے قسم کھائی تھی کہ جب موقع پائے گا ابن المقفع کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔ چنانچہ ۱۴۲ھ میں سفیان نے زندقہ اور تشکیک کے الزام لگا کر ابن المقفع کو گرفتار کرایا اور تنور کے سامنے کھڑا کر کے پہلے اس کے ہات پاؤں کٹوا کر تنور میں ڈلوائے۔ پھر بے دست و پا جسد تنور میں جھونکا گیا۔

غریب ابن المقفع کو تنور میں ڈالتے وقت سفیان نے کہا "تیرے مثلہ ہونے کی بحث (۲) مجھ سے نہ ہو گی۔ کیونکہ تو زندیق ہے اور مسلمانوں کو اپنے عقاید فاسدہ سے گمراہ کرتا ہے۔" خلیفہ منصور کو بھی ابن المقفع کے قتل کا کوئی افسوس نہیں ہوا بلکہ وہ خوش ہوا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ ابن المقفع کا قتل منصور ہی کے اشارے سے ہوا۔ ابن المقفع کے خون کا بدلا عیسٰی اور سلیمان نے لینا چاہا۔ مگر اسی سال ان دونوں نے انتقال کیا۔ اور ابن المقفع کا خون ہدر ہو گیا۔

ابن المقفع اور ایرانیت

ابن المقفع کے حالات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایرانی نژاد تھے۔ بلکہ ان کے ایرانی ماحول کے اثرات ان پر اتنے گہرے تھے کہ وہ باوجود اسلام اختیار کرنے کے قدیم آئین پر بھی عمل پیرا تھے۔ عیسٰی بن علی اور سلیمان انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور ان کی اس خصوصیت سے واقف ہونے کے باوجود اس پر معترض نہ تھے۔

انقراض سلسلہ ساسانیہ کے بعد ایرانیوں نے اسلام قبول کر لیا مگر چونکہ ان کی اصل "مزدیسنی یا "بہ دین" تھی۔ اس لیے ان میں خاص ملت پیدا ہو گئی جو اسلام کے منافی نہ تھی مگر اسے متعصب عربوں نے نہیں سمجھا۔ اور نہ صرف انہوں نے ملت عجم کی یادگاروں کو آثار دین زرتشتی یا آئین مانوی کہہ کر ڈھایا بلکہ کفر و الحاد کے الزام لگا کر بہت نازیبا حرکتیں کیں اور مذہب کی آڑ میں ان مظالم کو حق بجانب ثابت کرنا چاہا یہ حال دیکھ کر وہ ایرانی جو اسلام قبول تو کر چکے تھے مگر انہیں ابھی تک اسلام سے کوئی دلچسپی یا لگاؤ پیدا نہیں ہوا تھا۔ مایل بہ ارتداد ہو گئے اور منافقت شروع کی چنانچہ انہوں نے ایک ایسی جماعت بنا ڈالی جس کی بنا تعصب پر تھی۔ اور وہ ایرانی قوم کی درخشاں تاریخ اور اس کی عظمت جلالت اور قدامت کو عرب اور بنی امیہ کے مقابل پیش کرنے لگے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عرب لوگ غیر عرب عنصر کو ذلیل

---

(۱) ابن الاثیر حوادث ۱۲۷ھ

(۲) غالباً "بازپرس" (مدیر)

وخوار سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عجم کی اصطلاح ان کے لیے وضع کی تھی۔ اور ایرانیوں کو خصوصاً ذلیل نظروں[1] سے دیکھتے اور حقارت سے عجمی کہتے تھے۔ اسی عربی طرز عمل کا یہ رد عمل تھا۔ اس جماعت نے زبان اور قلم سے ایرانی ملت کے احیا کی کوشش شروع کی۔ حیات ملی و روح قومیت کو ایرانی کالبد میں جو مسلمانوں اور عربوں کے استیلا اور سیاست کے نیچے میں پھنسا ہوا تھا۔ زندہ رکھنے کی کوشش کی اور باوجود الزام واتہام مخالفت اور قتل وخونریزی کے وہ اپنے ذھن میں لگے رہے۔

ابن المقفع اسی جماعت کے ایک رکن تھے جو ہر وقت اپنا تعلق ایران کے گذشتہ آثار اور آئین سے ظاہر کرتی تھی اور اسی ذھن میں اس نے بہت سی کتابیں ادب سیر اور تاریخ ایران قدیم عہد ساسانیان سے متعلق تالیف اور عربی میں پہلوی زبان سے ترجمہ کیں۔ اور اپنی قوم کی فضیلت اور علو نسب کو تاریخ احکم اور امثال وآداب کے ذریعے سے ظاہر کرتی رہی۔ ابن المقفع چونکہ اسی جماعت کے سرگرم رکن تھے اس لیے انہوں نے ایران قدیم کا تعارف عربوں سے کرایا اور ادبیات ایران قدیم کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ ان کا حقیقی کام وہ تراجم تاریخ ایران ہیں۔ جو پہلوی زبان سے عربی میں کیے گئے۔ اور نقل در نقل ہو کر محفوظ اور دست برد روزگار سے بچ گئے۔ یہ ایک ناقابل فراموش خدمت تھی جو عربی ادب کی ابن المقفع نے کی۔ گو ان کا منشا ایرانی ثقافتی روایات کا تحفظ اور ایرانی برتری کی تشہیر تھا مگر چونکہ عربی ادب میں پے درپے اضافے کیے گئے۔ اور عربی زبان کو ایرانی تہذیب وتمدن سے روشناس کرایا گیا۔ اس لیے یہ اضافہ ادب عربی میں بھی ہوا۔

ابن المقفع کو لوگ مانویہ (مانی پرست کہتے ہیں[1]) اور بعضوں نے انہیں زندیق (۲) (پیرو دین مانی) بھی کہا ہے۔ ان دنوں زندیق کے وہ معنی نہ لیے جاتے تھے جو آج کل مستعمل ہیں۔ بلکہ اس زمانے میں زندیق کے معنی ہوتے تھے متدین بہ دین مانی!

منصور اور دوسرے لوگوں کی خصومت کی وجہ ابن المقفع کی ملت پرستی تھی چونکہ اکثر مورخین کو فرقہ مانویہ اور زرتشتی میں تمیز نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے ابن المقفع کو زرتشتی لکھ دیا ہے مشہور ہے کہ ایک دفعہ زندیقوں کی ایک جماعت گرفتار کر کے لے جائی جا رہی تھی جن میں ابن المقفع کا بیٹا بھی تھا جب یہ لوگ ابن المقفع کے سامنے سے گذرے تو انہوں نے اس ڈر سے کہ کہیں انہیں بھی ان زندیقوں میں سے نہ سمجھا جائے ان لوگوں کو سلام نہیں کیا بلکہ یہ شعر پڑھے۔

یا بیت عاتکۃ الذی اتغزل حذر العدی وبہ الفؤاد موکل
انی لامنحک الصدود وانی قسماً الیک مع الصدود لا مکل[1]

---

(۱) ابوریحان بیرونی۔ کتاب تحقیق ما للہند صفحہ ۶

(۲) بووان (BOVAN) کی تحقیق ہے کہ پہلوی "زندیق" کو عربوں نے زندیک بنا دیا۔ جو بعد کو زندیق (صدیق) ہو گیا۔ یہ ایک جماعت علما اور دین مانویہ کے بزرگوں کی تھی جو اہد ذہنی تھے۔ ان کے علاوہ ان چار شنوں اسماعین، ۲ معلین، ۳ سمثمین، ۴ قسیسین کو بھی جو مانویہ ہی تھے زندیق ہی کہا جاتا تھا (الآثار الباقیہ صفحہ ۲۰۷ و ۲۰۸ و الفہرست صفحہ ۳۳۲) چونکہ مسلمان مانویہ طبقے کو بے دین کہتے تھے اس لیے زندیق بہ معنی بے دین استعمال ہونے لگا ورنہ زندیق کے حقیقی معنی کافر و بے دین نہیں بلکہ صدیق کے ہیں۔

(۱) یہ دونوں شعر احوص بن محمد انصاری کے ایک قصیدے کے ہیں۔ جو ایک مشہور شاعر اور خلفائے اموی کا مداح تھا۔ یہ قصیدہ اس نے عمر بن عبد العزیز کی مدح میں کہا تھا جو کتاب الاغانی صفحہ ۱۹۶ و ۱۹۷ جلد ۱۸ پر موجود ہے اور یہ قول ابن عبد ربہ (متوفی ۳۲۸ھ) صاحب عقد الفرید (ص ۳۱۱ ج ۲) عبد اللہ بن معاویہ کی لڑکی کا نام عاتکہ تھا جس سے تشبیب کی گئی ہے مگر صاحب کتاب الاغانی نے اس کو عبد اللہ بن یزید بن معاویہ کی لڑکی لکھا ہے۔

یعنی اے خانہ عاتکہ (کہ جس سے دشمنوں کے خوف سے میں نے کنارا کشی اختیار کی ہے مگر) میرا دل تجھ سے بندھا ہوا ہے گو میں تجھ سے روگرداں ہوں مگر قسم کھاتا ہوں کہ باوجود روگرانی کے تیری طرف مایل ہوں۔

سید مرتضیٰ نے اپنی امالی میں جو "غرر و درر" کے نام سے مشہور ہے لکھا ہے کہ یہ شعر ابن المقفع نے اسلام قبول کرنے کے بعد ایک آتش کدہ (۲) پر سے گذرتے ہوئے اسے دیکھ کر پڑھے تھے۔ چنانچہ اس روایت کو چند مورخین نے بھی نقل کیا ہے۔ (۳)

ابن المقفع نہ صرف ادیب و انشاپرداز تھے بلکہ شاعر بھی تھے مگر شعر بہت کم کہتے تھے۔ چنانچہ یہ تین شعر ان کے مشہور ہیں۔

رزئنا ابا عمرو و لا حی مثلہ　فللہ خلتہ ما فی السداد لھا طمع

فان تک قد فارقتنا و ترکتنا　ذوی خلة ما فی السداد لھا طمع

فقد جر نفعاً فقدنا لک اننا　امنا علی کل الرزایا من الجزع (۴)

کہتے ہیں کہ یہ شعر ابن المقفع نے ابوعمرو بن العلا (متوفی ۱۵۴ھ یا ۱۵۶ھ یا ۱۵۷ یا ۱۵۹) کے مرثیہ میں کہے ہیں یا یحییٰ ابن زیاد عبید اللہ حارثی خلیفہ سفاح عباسی کے ماموں زاد بھائی کے مرثیہ میں کہے ہیں مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عبدالکریم بن ابی العوجا زندیق کے مرثیہ کہے ہیں۔ (۱)

پہلا قول مردود ہے کیونکہ ابوعمرو بن العلا نے ابن المقفع کے قتل کے بعد انتقال کیا ہے اس لیے یہ شعر یا تو ابن ابی العوجا زندیق یا پھر یحییٰ بن زیاد حارثی کے مرثیہ میں جو ابن المقفع کا دوست تھا کہے گئے ہیں۔ ابن ابی العوجا زندیق سے بھی ابن المقفع کے مراسم ہوں گے۔ مگر یحییٰ بن زیاد سے بے انتہا دوستی تھی۔ چنانچہ صاحب آغانی کا بیان ہے کہ ابن المقفع مطیع بن ایاس شاعر اور والبۃ بن الحباب اور یحییٰ بن زیاد آپس میں ایک دوسرے کے لیے انتہا دوست تھے اور ایک دوسرے پر جان و مال فدا کرتے تھے اور یہ چاروں زندقہ یعنی دین مانی سے متہم تھے۔ (۲)

ثعلب یعنی ابوالعباس احمد بن یحییٰ جو عرب کا بڑا ادیب تھا کہتا ہے کہ آخری شعر ابن المقفع کی اس مذہبی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ جو وہ خیر کو شر سے ممزوج سمجھتے تھے۔ اور شر کو خیر سے (۳)

ثعلب نے جس مذہب کی طرف اشارا کیا ہے وہ مذہب مانا تو یہ تھا جس سے ابن المقفع متہم تھے۔

عقاید و اخلاق

ابن المقفع ادب اور بلاغت تاریخ و سیر اور اعلام مشاہیر میں بڑی فضیلت رکھتے تھے۔ یہی وجہ اہل فضل ادب ہو ان سے ارادت کی تھی اور یہ لوگ ہمیشہ انہیں گھیرے رہتے تھے۔ مگر جن لوگوں کی طبیعت میں حسد تھا وہ باوجود اس علم و فضل کے ان کو زندیق کہہ کر ذلیل کرنا چاہتے تھے۔

ابن المقفع اپنی گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کی عادت سے بھی مجبور رہتے۔ انہیں شور و شغب اور دربار داری کا شوق نہ تھا۔ کم ظرفوں اور تہی مغزوں کو جمع کرکے داد فضیلت لینا پسند نہ تھا۔ چند اہل علم و فضل دوست تھے جن کے ساتھ وہ زیادہ رہتے تھے اس کنارا کشی کو لوگوں نے دشمنی پر محمول کرکے مشہور کر دیا کہ یہ زندیقوں کی جماعت ہے جو علیحدہ بیٹھ کر شراب پیتی اور ہزل گوئی کرتی ہے۔ چنانچہ صاحب آغانی (۱) نے ابوعثمان عمرو بن بحر جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کا قول نقل کیا ہے کہ ابن المقفع اور چند دوسرے علما و شعرا و رواۃ واد با ایک ساتھ بیٹھ کر شراب پیتے شعر کہتے اور ہزل و ہجو سے تک

(۲) غرر و درر ص ۹۴ ج ۱،
(۳) تاریخ طبرستان و رشید و طواط و یاقوت، معجم الادبا ص ۷۷، ج ۳،
(۴) شرح حماسہ ص ۱۷۲، ج ۲،

(۱) ابن خلکان ص ۴۲۲، ج ۱،
(۲) آغانی ص ۱۴۴، ج ۱۶
(۳) غرر و درر سید مرتضیٰ ص ۹۴، ج ۱،
(۱) کتاب آغانی صفحہ ۱۴۸-۱۴۹ جلد ۱۶

دریغ نہ کرتے تھے۔ یہ سب دین کے معاملے میں متہم تھے"

جاحظ کے متعلق جو اس کے راوی ہیں یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ بھی اس اتہام سے بری نہ تھے۔ لوگ ان کے متعلق بھی یہی کہتے تھے۔ جو ابن المقفع اور اس کے ساتھیوں کے متعلق کہا جاتا تھا۔

ان بندرا ادیبوں اور عالموں پر جو زندقہ کا الزام لگایا جاتا تھا وہ محض اس لیے تھا کہ وہ جو کچھ کہتے تھے عوام کی سمجھ سے باہر تھا اور وہ عوام کو اپنی محفل خاص میں جگہ دیتے نہ تھے۔ اسی لیے ان کی سیدھی باتیں لوگوں کو الٹی نظر آتیں۔ اور ان کے شعر ہزل اور ان کی بذلہ سنجی اور خوش مذاقی ہجو کہی جانے لگی۔ حمد اللہ مستوفی صاحب تاریخ گزیدہ (۲) لکھتے ہیں:-

"قوم زنادقہ خلیفہ ہادی کے عہد میں بہت قوی ہو گئی تھی۔ ان میں عبد اللہ ابن المقفع مصنف کلیلہ دمنہ عربی اور صالح بن عبد القدوس اور عبد اللہ بن داود (سفاح کا چچازاد بھائی) اور عبد اللہ ہاشمی شریک تھے جو چاہتے تھے کہ نقیض قرآن لکھیں۔ ابن المقفع جو افصح الفصحا اور اعلم العلما تھا چھ مہینے تک اس کی کوشش کرتا رہا اور ایک کمرہ مسودوں سے بھر دیا۔ مگر ایک آیت کی نقیض بھی نہ کر سکا۔ سچ ہے مخلوق کہاں اور خداوندی کدھر! ہادی ان لوگوں کے حال سے واقف تھا۔ اس لیے اس نے ان سبھوں کو قتل کرا دیا۔"

آگے چل کر حمد اللہ مزید فرماتے ہیں۔

"ابن المقفع فارسی صاحب کلیلہ و دمنہ عربی معاصر ابو جعفر اور مہدی (فرزند خلیفہ ابو جعفر) تھا اور ہادی کے عہد میں اس وجہ سے کہ وہ قرآن کی نقیض کر رہا تھا مارا گیا" (۱)

حقیقت یہ ہے کہ حمد اللہ کے دونوں بیانات غلط ہیں جو بغیر تحقیق کیے لکھے گئے ہیں کیونکہ ابن المقفع زمانہ خلافت مہدی (۱۵۸ - ۱۶۹) و ہادی (۱۶۹ - ۱۷۰) میں نہ تھے بلکہ ان کو ۱۴۲ھ ہی میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اب رہی معارضہ قرآن کی تہمت سو وہ ابن المقفع پر ان کے قتل کے پانچ سال بعد لگائی گئی ہے۔ معاصرانہ تاریخوں میں یہ الزام نہیں آتا کہ جس سے ظاہر ہے کہ یہ بہتان بعد میں تراشا گیا ہے اور ان لوگوں نے اس کو شہرت دی ہے جو ابن المقفع کے حالات سے واقف نہ تھے۔

میں یہ نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ زندیقیت کی تہمت کو ابن المقفع اور ان کے ساتھیوں پر سے اٹھا دوں اور یہ ثابت کروں کہ وہ بڑے متدین اور پکے مسلمان تھے اور کوئی شک و شبہ ان کے اسلامی عقاید میں نہ تھا۔ بلکہ میں صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ابن المقفع پر زندیقیت کی تہمت صرف اس لیے دھری جاتی ہے کہ وہ آداب قومی اور اپنے اجداد کے عقاید کے اظہار میں بہت بے باک تھے۔ اور ان کے دل میں وطن پرستی کا جذبہ تھا تو یہ ظلم ہے۔ کیوں کہ یہ جذبات ہر شریف آدمی میں ہونے چاہئیں۔ اور یہ وہ جوہر ہے جو ایک روشن دماغ شخص اور آزاد منش عالم کے لیے باعث صد فخر و ناز ہے۔

ابن المقفع کی زندیقیت اتنی مشہور ہو چکی تھی کہ خلیفہ مہدی کہتا تھا کہ زنادقہ کی کوئی کتاب ایسی نہیں پڑھی جو ابن المقفع کی لکھی ہوئی نہ ہو" (۱) اس بیان سے مسعودی (۲) کے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ "ابن المقفع نے چند کتابیں مانی اور ابن دیصان (۱) اور مرقیون (۳) کی عربی میں ترجمہ

(۲) تاریخ گزیدہ صفحہ ۳۰۰ - ۳۰۱

(۱) تاریخ گزیدہ ص ۳۰۰ و ۳۰۱

(۲) ابن خلکان ص ۱۶۴ ج ۱۔ (۳) مسعودی ص ۲۹۳ ج ۸۔

(۱) ابن دیصان (۱۵۴ - ۲۲۲ م) قدیم فلسفیوں میں سے ہے جو ایڈیسا اور بین نہرین میں رہتا تھا جس کی دشمنی اپنے عہد کے ایک اور فلسفی مرقیون سے بہت مشہور ہے۔

(۳) BARDESANE اور MARCION دونوں عیسائی اور دو علیحدہ علیحدہ فرقوں کے بانی تھے۔ جو دیصانیہ اور مرقونیہ کے نام سے مشہور اور عقیدۂ ثنویت کے حامل تھے۔ ان کے عقاید چونکہ مانی سے ملتے جلتے تھے۔ اس لیے ان دونوں کو مانی کا پیش رو سمجھا

- ENCY-ISLAM II 392. D. BURKITT RELIGION OF THE MANICHEES. P. 74-86

کی تھیں۔"

ابن المقفع اور خلیل بن احمد (متوفی سنہ ۱۷۰ھ) واضع علم عروض ایک دوسرے سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔ کسی فاضل نے ان دونوں کو ایک جگہ بلا کر ملا دیا۔ اور اس ملاقات کے بعد خلیل بن احمد سے پوچھا کہ تم نے ابن المقفع کو کیسا پایا تو انہوں نے کہا "اس کو اس کے علم سے زیادہ پایا۔" پھر انہوں نے ابن المقفع سے خلیل بن احمد کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا "اس کی عقل کو اس کے علم سے زیادہ پایا"، (۳) مگر بعد میں جب بار لوگوں نے آغانی کی اس عبارت کو نقل کرنا چاہا تو اس میں تصرف کر کے لکھا۔ خلیل نے کہا "ابن المقفع اس کی عقل سے زیادہ ہے اور ابن المقفع نے کہا خلیل کی عقل اس کے علم سے بڑھی ہوئی ہے۔" (۴)

ابن المقفع کے دوستوں کی تعداد خاصی تھی۔ اس کے ہم عصر علما اور فضلا سب ہی اس کے دوست تھے۔ مگر بعض لوگوں سے اس کے بہت ہی خاص مراسم تھے۔ جن میں ایک عبد الحمید بن یحیی ایران کے مشہور کاتب تھے جو بنو امیہ کے آخری دور کے کئی خلفا کے کاتب رہ چکے تھے اور آخر میں مروان حمار آخری خلیفہ اموی کی کتابت بھی کی تھی جو ۱۳۲ھ میں بنی عباس یا ابو مسلم کے ہاتھوں قتل ہوا۔ یہی وہ عبد الحمید ہیں جنہیں فضلائے وقت فن انشا کا موجد مانتے اور کہتے تھے۔ "فتحت بعبد الحمید وختمت بابن العمید" (یا ابن العمید ہی ابو الفضل محمد بن العمید وزیر رکن الدولہ دیلمی ہیں۔ جنہوں نے ۳۶۰ھ میں وفات پائی، اور صاحب بن عباد انہیں کے بنائے ہوئے تھے۔ جو بعد کو کاتب اور وزیر ہوئے)

مروان کے قتل کے بعد عبد الحمید بھاگ کر الجزیرہ (شمال بین النہرین) کے ایک شہر میں جا چھپے۔ اتفاق سے ابن المقفع بھی وہیں تھے۔ دونوں اکٹھے ہو گئے۔ بنی عباس کے جاسوس عبد الحمید کا تعاقب کر رہے تھے۔ اس مکان کا پتہ چلا کر وہ لوگ جا پہنچے۔ جب گرفتار کرنے والے مکان میں داخل ہوئے تو صرف دو آدمی تھے۔ ایک ابن المقفع اور دوسرے عبد الحمید مگر گرفتار کرنے والے عبد الحمید کو پوچھنے لگے کہ ان دونوں میں سے کون ہے کیونکہ وہ پہچانتے نہ تھے۔ پہلے ابن المقفع نے کہا میں عبد الحمید ہوں مجھے گرفتار کر لو۔ پھر عبد الحمید نے کہا نہیں میں ہوں مجھے گرفتار کر لو۔ ہر ایک اپنے آپ کو گرفتار کرانا چاہتا تھا۔ سپاہی حیران تھے کہ کیا کریں۔ چنانچہ ایک شخص باہر جا کر عبد الحمید کے کسی صورت آشنا کو بلا لایا۔ تب کہیں گرفتاری ہوئی۔ اور اس غریب کو بڑی تکلیف دے کر قتل کیا گیا۔ (۱)

اس واقعہ سے ابن المقفع کی جاں نثاری، دوستی وضع داری اور شرافت نفس کا پتہ چلتا ہے۔ ایک دوست کی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو جلاد کے حوالے کر دینا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ دوستی کے معاملے میں ابن المقفع بڑے وسیع المشرب تھے۔ چنانچہ اپنی کتاب الادب الصغیر میں لکھتے ہیں۔

> "دنیا کی کوئی مسرت ایسی نہیں ہے جو دوستوں کی صحبت کے برابر ہو اور نہ کوئی غم ایسا ہے جو دوستوں کے فراق کا مقابلہ کر سکے۔"

"ابن المقفع کی عادت تھی کہ ہمسائے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھتے اور اکثر اسی کے سائے میں سو بھی جاتے۔ ایک دفعہ انہیں معلوم ہوا کہ ان کا ہمسایا قرض کی زیادتی کی وجہ سے مکان فروخت کر رہا ہے تو بے چین ہو گئے، اور جو قیمت مشخص ہوئی تھی پڑوسی کے پاس بھجوا دی اور کہلوایا مکان فروخت نہ کرو بلکہ اس رقم سے اپنے قرضے ادا کرو۔" (۲)

یہ اس زندیق، دہریہ، لامذہب اور منافق کا کردار

(۱) ابن خلکان صفحہ ۴۳۳، ج ۱۔

(۲) عیون الاخبار ص ۳۴۹۔

(۳) آغانی ص ۷۶، ج ۱۸

(۴) ابن خلکان ص ۱۶۴، ج ۱، ومعجم الادبا ص ۱۷۷، ج ۳ وتاریخ طبرستان

ہے جیسے برا کہتے ہوئے ہمارے متعصب مورخین نہیں تھکتے اگر اس زمانے کے منافقین، دہریوں لامذہبوں کا یہ کردار تھا تو وہ ان علماء سوء سے اچھے تھے جو انہیں دنوں موجود تھے اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے حد درجہ گرے ہوئے تھے۔

بیہقی نے کتاب المحاسن والمساوی میں لکھا ہے کہ ایک حاجت مند ابن المقفع سے ملنے گیا مگر دربان نے اندر جانے سے روکا۔ اس شخص نے یہ شعر کاغذ پر لکھ کر بھجوا دیا۔

ہل لذی حاجۃ الیک سبیل
و قلیل تلبثی لا کثیر

ابن المقفع نے یہ شعر پڑھ کر جواب میں یہ شعر لکھا:

انت یا صاحب الکتاب ثقیل
وقلیل من الثقیل کثیر

مگر وہ بھی کوئی معمولی شخص نہ تھا۔ اس نے پھر یہ شعر لکھ کر بھجوایا۔

قد بدات الجواب منک بفحش
انت بالفحش والبذاء جدیر

ابن المقفع نے اس شعر کو پڑھ کر ہنستے ہوئے اس شخص کو بلا لیا۔ اور اس کی حاجت پوری کر دی۔ (۱)

معن بن زائدہ ابن المقفع کے ہم عصروں میں بڑا فیاض اور داد و دہش کرنے والا شخص تھا۔ اور ابن المقفع بھی فیاضی اور سیر چشمی میں ان کے برابر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ صاحب آغانی نے "سلامۃ الزرقاء اور سعدۃ (یہ دونوں ابن رامین کی کنیزیں تھیں۔) کے حالات میں لکھا ہے کہ:۔

"ایک روز معن بن زائدہ روح بن حاتم اور ابن المقفع مل کر رامین کے گھر پہنچے۔ مجلس نشاط گرم ہوئی۔ زرقاء اور سعدہ نے کچھ ایسا بھایا کہ معن اور روح نے اشرفیوں کی تھیلیوں کے منہ کھول دیے۔ اتفاقاً ابن المقفع کے ساتھ روپیہ نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ایک مکان کا قبالہ لکھ کر دے دیا اور پھر گھر جا کر ایک ہزار اشرفیاں اونٹ پر بار کر کے ان دونوں کو بھجوا دیں (۲)"

صاحب تاریخ طبرستان جاحظ کی البیان والتبیین اور ابن قتیبہ کی عیون الاخبار نقل کرتے ہیں کہ ابن المقفع کسی مطالبے کی علت میں گرفتار ہوئے اور صاحب الخراج نے شکنجے میں کھینچا تو ابن المقفع نے اس سے کہا کہ جو رقم میری طرف نکلتی ہے وہ تم اپنی طرف سے جمع کرا دو تو میں قید سے چھوٹتے ہی تمہیں اس رقم سے تگنی رقم ادا کر دوں گا۔ چونکہ ابن المقفع کی پابندی زبان اور وعدہ وفائی مشہور تھی اس لیے صاحب الخراج نے وہ رقم اپنے پاس سے ادا کر دی اور ابن المقفع نے نجات پا کر اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

جاحظ نے ایک پرلطف واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز ایک بوڑھے نے آکر ابن المقفع کو دعوت دی اور کہا کہ مہربانی کر کے رات کا کھانا میرے گھر پر کھائیے اور یہ بھی کہا کہ یہ خیال نہ کیجیے کہ میں نے کچھ تکلف کیا ہوگا۔ جو کچھ بھی حاضر ہے گا پیش کر دوں گا۔ چنانچہ ابن المقفع نے اس دعوت کو قبول کر لیا۔ اور وقت پر جا پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں کہ روٹی کے چند سوکھے ٹکڑے اور تھوڑا سا نمک دسترخوان پر رکھا ہوا ہے۔۔۔ ابن المقفع ابھی اس دسترخوان ہی کو دیکھ رہے تھے کہ دروازے پر ایک فقیر نے آکر آواز دی اس پر صاحب خانہ نے بگڑ کر کہا "خدا کی قسم اگر میں اٹھوں تو تیرے کو نچے کاٹ دوں" یہ سن کر ابن المقفع نے فقیر کو مخاطب کر کے کہا "اگر تو یہ جانتا کہ یہ شخص وفائے عہد اور پابندی قول میں کتنا سچا ہے اور مجھ سے کتنی سچائی سے وعدہ پورا کیا ہے تو تو اس کی سچائی پر بھروسہ کر کے ایک لفظ بھی نہ کہتا اور فوراً چلا جاتا۔"

کتاب البیان والتبیین (۱) و کتاب البخلاء (۲) میں اس بوڑھے کا [illegible] (باقی)

(۱) المحاسن والمساوی ص ۳۲ و ۳۳)

(۱) آغانی صفحہ ۱۳۲ جلد ۱۳ (۱) ص ۱۰۲ ج ۲ (۲) ص ۱۳۰-۱۳۱ (۳) ص ۲۳۲ ج ۲

ہندستان اور ایران کا باہمی رشتا

ڈاکٹر تارا چند

ہندستان اور ایران کا باہمی تعلق قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ یقینی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دونوں ملکوں کے تعلقات ہندستان کی تاریخ میں آریوں کے عہد سے پہلے کے زمانے سے چلے آتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں آثار قدیما کی کھوج کرنے والی کئی جماعتوں نے جو دریافتیں کی ہیں ان کے نتیجے کے طور پر "ہندستانی ایرانی" الفاظ کو نئے اور مخصوص معنی حاصل ہوگئے ہیں۔ ایرانی مورخوں نے اپنے ملک کی قدیم تاریخ کی کھوج کے دوران یہ دریافت کیا ہے کہ ان کی تہذیب کے بہت سے خد و خال ایک طرف وادی سندھ کی تہذیب سے اور دوسری طرف عراقی سیمریا تہذیب سے قریبی رشتا رکھتے ہیں۔

رگ وید سے قبل کے زمانے سے لے کر دونوں ملکوں کے عوام کے مابین مسلسل اور غیر منقطع تعلق چلا آیا ہے۔ آریوں کے بعد یونانی بھی ایران کے رستے ہندستان میں آئے۔ بدھ مت کے زمانۂ عروج میں بھارت میں وادی گنگا کے میدانوں سے ہر طبقے کے لوگوں کی اتر پچھم اور اتر پورب کے ملکوں کی جانب نمایاں نقل و حرکت جاری رہی۔ ایران کے رستے ہندستانی ریشم کی تجارت نے پچھمی ملکوں میں جو فروغ حاصل کیا۔ اس سے نہ صرف تجارتی بلکہ آرٹ اور کلچر کے تعلقات بھی زیادہ گہرے ہوگئے۔ اس کے بعد مغلوں کے زمانے میں دونوں ملکوں کے لوگوں میں قریبی رشتا قایم ہوگیا بلکہ ہندستانی تاریخ کے برطانوی دور میں بھی سیاسی اور دوسرے وجوہ کے زیر اثر ایران کے ساتھ خاصی دل چسپی بنی رہی۔

باہمی اثرات

ہندستان اور ایران میں علم و ادب کی جو دستاویزات اور تصانیف اور آرٹ کی جو مختلف شکلیں پائی گئی ہیں وہ اس پر کافی روشنی ڈالتی ہیں کہ دونوں ملکوں کے علما، فنکاروں اور عام لوگوں نے ایک دوسرے پر کتنے گہرے اثرات ڈالے۔ ایک ہندستانی تاریخ داں کے لیے اور خاص کر جسے مغل عہد کی تاریخ سے دل چسپی ہو، یہ لازمی ہے کہ اسے فارسی زبان میں دسترس حاصل ہو۔ اسی طرح ایرانی مورخوں کے لیے اپنے ملک کی دور قدیم کی تاریخ کو سمجھنے کی غرض سے یہ نہایت اشد ضروری ہے کہ وہ سنسکرت اور پراکرت جانتے ہوں۔ ہندستان کے لوگوں کو یہ جان کر فخر و مسرت حاصل ہوگی کہ تہران یونیورسٹی میں لسانیت کے ماہرین کا ایک گروہ پروفیسر پورے داؤد کی زیر رہنمائی ویدوں اور اوستا کے متن کے بارے میں کھوج کا کام کر رہا ہے اس کام میں وہ سنسکرت کے مشہور عالم ڈاکٹر کنہان راجا کے تعاون اور رہنمائی سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔

پارسیوں کا رشتا

پارسی لوگ اصل میں ایران سے ہندستان میں آئے تھے۔ بعد میں انہوں نے یہاں جائے پناہ حاصل کر کے سکونت اختیار کر لی۔ دونوں ملکوں کی تاریخ اور تہذیب کے مابین پارسی ایک نہایت اہم اور مفید کڑی کا کام دیتے ہیں۔ نہ صرف ان کا لفظ اور جملے بلکہ ہندوؤں کے ویدوں اور پارسیوں کی "اوستا" کے پورے کے پورے بند اس امر کی واضح شہادت دیتے ہیں کہ سنہ عیسوی کے آغاز سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے کے قدیم زمانے سے بھی پہلے جب ہندو اور ایرانی ایک دوسرے

سے جدا ہوے اور دونوں نے اپنی اپنی علحدا حیثیت اختیار کرلی بھی دونوں کے آبا و اجداد کے مابین گہرے تعلقات موجود تھے۔ فارسی الفاظ اور جملوں کے ماخذ و مخارج اور ان کی اہمیت کی تشریح کرنے کی غرض سے فرہنگ اور لغات مرتب کرنے کے لیے ایران میں قابل قدر کام ہو رہا ہے اس سلسلے میں ہندستان اور ایران کی قدیم مستند کتابوں کا معائینا کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ ضرورت محسوس کی گئی ہے کہ بعض الفاظ وغیرہ جو عربی اور اسلامی مصدروں سے ماخوذ ہیں، ان کے موجودہ مفہوم پر نظر ثانی کی جاے۔ اس کام کی تکمیل دونوں ملکوں کے کلچر کو بہتر طریق پر سمجھنے میں بے حد معاون ہوگی۔

ہندستانی زبان

ہندستانی زبان صاف طور پر فارسی اور ہندستان کی دوسری زبانوں کے ملاپ کی یاد دلاتی ہے۔ اس کے ماخذ اور ترقی کا مطالعا نہ صرف فارسی اور یہاں کے الفاظ بلکے دونوں ملکوں کے عوام کے فکر و تخیل کے باہمی میل ملاپ کا مظہر ہے اس کے علاوہ یہ مطالعا ہندستانی لوگوں کے لیے فردوسی۔ سعدی، حافظ اور رومی جیسے ایرانی شعرا کے بلند پایا کلام کو سمجھنے کے لیے ایک نہایت مفید ذریعا بنتا ہے۔

ہندستان اور ایران پر البیرونی کا احسان

دونوں ملکوں کے مورخ ابوریحان البیرونی کے بے حد ممنون ہیں۔ اس کی تصانیف "قدیم اقوام کا تاریخی شجرہ" اور "ہندستان" دونوں ہی ہندستانی، اسلامی اور یونانی علوم اور کلچروں سے متعلق بیش قیمت معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ البیرونی نے تحصیل علم کی خاطر کئی مقامات کی سیاحت کی تھی اپنے سفر کے دوران وہ علاوہ دوسرے مقامات کے بنارس اور کشمیر بھی گیا تھا، جہاں اسے اہم سنکرت کتب کا مطالعا کرنے کا بہت کافی موقع حاصل ہوا۔ چونکے وہ علم نجوم میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اور سلطان محمود کے دربار میں جوتشی کی خدمات بھی انجام دیتا رہا۔ اس لیے البیرونی نے "برہم سدھانتا" اور اسی قسم کی دوسری نہایت مشکل اور پیچیدہ سنسکرت کتابوں کا گہرا مطالعا کیا اور ان میں دسترس حاصل کی۔

دربار اکبری

اکبر کے عہد میں مہابھارت اور راماین جیسی رزمیا کتابوں کے علاوہ علم ریاضی سے متعلق بھاسکر اچاریا کے رسالے "لیلاوتی" جیسی سنسکرت کتابوں کا فارسی زبان میں ترجما کیا گیا۔ چودویں صدی میں فارسی تصنیف "طوطی نامہ" "نے تنک پتی" (طوطے کی ستر کہانیاں) اور "کتھاسرت ساگر" (کہانیوں کا سمندر) جیسی سنکرت تصانیف سے دنیا کو روشناس کرایا۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جو اس حقیقت کی مظہر ہوں گی کہ بھارت اور ایران کے درمیان وسیع علمی اور ادبی تعلقات برابر قایم رہے۔ یہ تعلقات صرف شعر و سخن اور ادبی کتب ہی تک محدود ہی نہ رہے۔ بلکے ان کا دایرا فنون لطیفا اور فن تعمیر تک پھیلا ہوا ہے۔

ایرانی اخبار نویسوں کے تاثرات

کچھ عرصا پہلے ایرانی اخبار نویسوں کا ایک وفد ہندستان آیا تھا۔ اس وفد کے لیڈر نے اس حقیقت پر اظہار مسرت کیا تھا کہ ہندستان کے لوگ فارسی کے مطالعے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ "ہمارا ادب ہندستانی کلچر کے ساتھ گھل مل گیا ہے اور اس کی مثالیں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں۔ لائبریریوں، یونیورسٹیوں، محلات، مسجدوں مندروں اور عمارتوں میں ہمیں فارسی علم و ادب اور آرٹ کا حسن جلوا نما نظر آتا ہے"۔

تجدید تعلقات

حصول آزادی کے بعد ہندستان کے لوگوں میں قدرتی طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی رہی ہے کہ ایران کے ساتھ ثقافتی تعلقات کی تجدید کی جاے اور ان کو بڑھایا جاے اس مقصد کے حصول کے لیے فارسی ادب کے بارے میں مذاکرات کی محفلیں منعقد کی گئیں جن میں ہندستانی اور ایرانی دونوں شامل ہوے۔ بہت عرصا نہیں گذرا جب ہندستانی نے فردوسی اور البیرونی دونوں کی برسی [illegible]

سنسکرت ڈرامے کی روایات

ا۔ ا

یورپ کالیداس کے شاہکار سے اس وقت لطف اندوز ہوا جبکہ سر ولیم جونس نے ۱۷۸۹ء میں اس کا ترجمہ کیا اس ڈرامے سے جرمن شاعر گوئٹے حد درجے متاثر ہوا اور شاید "شکنتلا" کی تمہید نے گوئٹے کو "فاوسٹ" کی تمہید لکھنے پر اکسایا۔ آج شکنتلا کا شمار دنیا بھر کے مشہور ترین ڈراموں میں ہوتا ہے۔

کالیداس کی تصانیف سنسکرت ڈراموں کی روایات کا روشن پہلو تو ہیں لیکن ان کی ساری باتیں ان میں موجود نہیں ہیں۔ کالیداس نے اپنی ایک تصنیف کی تمہید میں لکھا ہے "کیا ہم بھاسا سومِلا اور کوی پتر جیسے مشہور و معروف مصنفین کی تصانیف کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ کیا سامعین کالیداس جیسے جدید دور کے شاعر کی تصنیف کو احترام کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں"۔

جہاں تک سنسکرت ڈرامے کی روایات کا تعلق ہے ہم اس سلسلے میں صرف قیاس کر سکتے ہیں لیکن یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہہ سکتے۔ ایک لحاظ سے ہندستانی ڈراما اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ وید۔ کیونکہ رگ وید میں متعدد شلوک مکالمے کی شکل میں ہیں۔ اس طرح ان میں ڈرامے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ بھارتی روایات میں ڈرامے کے دوسرے ذرائع غالباً قربانیوں اور تہواروں کی رسوم، ناچ اور رزمیہ نظموں کے عوامی گیت ہیں۔

چینی ترکستان میں ماہرین آثار قدیمہ نے کھجور کے پتوں پر تین ڈراموں کے حصوں کے مسودے دریافت کیے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ ڈرامے کی روایات بہت قدیم ہیں۔ ان میں سے ایک ڈراما تو اشوگھوش کا ہے جو بدھوں کی روایات کے مطابق کنشک کے دربار کا شاعر تھا۔ اس ڈرامے کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اس میں پختگی ہے۔ جو اس بات کی آئینہ دار ہے کہ ڈرامے کی روایات عرصے سے قائم تھیں۔ سنسکرت ڈراما نویسوں میں بھاسا، بھاو بھوتی، شدرکا، وشاکھ دت اور شری ہرش بڑی شہرت کے مالک ہیں۔

جہاں تک روپ کا تعلق ہے سنسکرت ڈراما دنیا کے دوسرے ڈراموں کی بہترین روایات سے لگا کھاتا ہے۔ مثلاً "وید وشاکا" ملکا الزبتھ کے عہد کے ڈراموں کے "احمق" آدمی سے مختلف رول ادا نہیں کرتا۔ اس طرح ملکا الزبتھ کے دور کے اسٹیج کی طرح سنسکرت کا اسٹیج بھی بڑی بڑی سینریوں سے خالی رہتا تھا۔ بڑے بڑے مناظر کا احساس ایسے اشعار سے کرایا جاتا تھا جو سامعین کے دل و دماغ اور تخیل کو متاثر کرتے تھے۔

اگر دنیا کے دوسرے ڈراموں کی روایات سے سنسکرت ڈرامے کا مقابلہ کیا جائے تو اس کا سب سے امتیازی پہلو یہ ہوگا کہ وہ آخر میں المیہ نہیں پیش کرتا۔ مغربی مفکرین عام طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندستانی فلسفے میں دنیا کی نفی کا احساس پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ سنسکرت کے چند طربیہ ڈرامے یورپ کے زیادہ سے زیادہ امزاحیہ ڈراموں کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سدرا کا ایک ڈراما "مٹی کی گاڑی ہے" جس میں ایک جواری قرضخواہوں کو ٹالنے کے لیے بت بن جاتا ہے اس کے قرض خواہ چٹکی لیتے ہیں تاکہ یہ پتا چل سکے کہ آیا واقعی یہ پتھر ہے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ وہ قرضدار کی جستجو ترک

کر دیتے ہیں۔ اور جو کھیلنے میں معروف ہو جاتے ہیں جب کھیل رنگ پر آتا ہے تو "بت" اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ آخرکار وہ اپنا بھید اپنے آپ کھول دیتا ہے تاکہ کھیل میں شریک ہو سکے۔

جہاں تک "حزنیا" کا تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ سنسکرت ڈراما "حزنیا" کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں کرتا لیکن وہ آخر میں فتح پر یقین رکھتا ہے۔ یونانی ڈرامے نے اس مسئلے کو بھی حل نہیں کیا۔

سنسکرت ڈرامے میں یہ نظریہ پایا جاتا ہے کہ فرد اپنے اعمال (کرم) کا ذمے دار ہے اور فرد ہی اپنی قسمت کا معمار بھی ہے "شکنتلا" میں "حزنیا" ہے لیکن یہ "حزنیا" ڈرامے کے وسط میں ہے۔ آخر میں شکنتلا معصوم محبت کی کہانی ہے جو مصایب سے قوت اور پاکیزگی حاصل کرتی ہے۔

غزل

خنجر (لکھنوی)

تم نے جب وار کیا تیر نظر سے پہلے
ہم نے آگاہ کیا دل کو جگر سے پہلے

آرزو یہ ہے کہ اک مرتبہ پھر تم دیکھو
جس طرح دیکھا تھا دزدیدہ نظر سے پہلے

الجھکے ساحل ہی کی موجوں نے مری کشتی کو
غرق دریا کیا طوفاں کے بھنور سے پہلے

ناوک یار تو اب رہتا ہے دل میں مہماں
دشمنی رکھتا تھا جو قلب و جگر سے پہلے

اب تو کر سکتے نہیں اس کی جفاؤں کا گلا
اس ستمگر نے زباں کاٹ لی سر سے پہلے

یہ بھی احسان اجل مجھ پہ ہوا اے خنجر
آگئی جو شب ہجراں کی سحر سے پہلے

ترنمات نصیر

نصیر (فتح پوری)

ترے در پر نہ جانے کی قسم کھائی مگر تو کیا ہوگا!
قضا کوچہ میں تیرے کھینچ کر لائی تو کیا ہوگا

دم رحلت نہ چار آنکھیں کرو تم مرنے والے سے
تمہاری شکل آنکھوں میں اتر آئی تو کیا ہوگا

اسیران قفس کو کیا غرض اس سے چمن والو
بہار آئی تو کیا ہوگا؟ خزاں آئی تو کیا ہوگا

لیے تو جا رہا ہے مجکو بزم یار میں اے دل
عدو نے اس کے پہلو میں جگہ پائی تو کیا ہوگا

کیے لیتے ہیں اے دل صبر روز حشر تک لیکن
سر محشر نہ داد عشق گر پائی تو کیا ہوگا

نگہبان در زنداں خدارا یہ تو بتلا دے
جو مجبور اسیر نے کی جبیں سائی تو کیا ہوگا!

میں چپ بیٹھا ہوا ہوں طالب بھی نہیں ساقی
مگر ایسے میں آ جائے جو انگڑائی تو کیا ہوگا!

نہیں سوز و گداز عشق دل میں جب نصیر اپنے
شبیہ یار لوح دل پہ کھنچوائی تو کیا ہوگا؟

سرونسٹن چرچل

ولسن ہیرسن

۳۰ نومبر ۱۹۵۴ء کو سرونسٹن چرچل کی ۸۰ ویں سالگرہ منائی گئی۔ نیچے کے مضمون میں اسپیکٹیٹر کے سابق ایڈیٹر ولسن ہیرسن نے برطانوی سابق وزیر اعظم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں سرونسٹن چرچل کو ایک لازوال جگہ حاصل ہے ان کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں وہ سپاہی ہیں، انتہا پسند لبرل اور قدرے متامل قدامت پسند ہیں۔ تجربہ کار مدبر اور منتظم ہیں۔ خداداد قابلیت رکھنے والے مصنف، اور لاثانی مقرر ہیں۔ برطانیہ کے اس پیر ۸۰ سالہ کی شخصیت میں آپ کو یہ تمام خصوصیات نظر آئیں گی۔ ان خوبیوں نے انہیں دنیا کا سب سے بڑا شہری بنا دیا ہے۔ ان کی قدرتی طاقت میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایک سرگرم زندگی سے انہیں اب بھی پیار ہے۔

۱۹۳۹ء تک وہ صرف اپنی تیزی طبع اور تلون مزاج کی وجہ سے مشہور تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں لائیڈ جارج کی شخصیت کے سامنے ان کی آب وتاب نکھر نہ سکی۔ اور اس کے بعد ان کی تقریروں کے تیر بالڈون کے سیدے سادے شبدوں کے سامنے اکثر بے اثر ثابت ہوتے تھے۔

آخر وہ گھڑی آپہنچی جب برطانوی قوم کو چرچل خدمات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دوسری بڑی جنگ شروع تھی برطانیہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس نازک موقع پر سرونسٹن چرچل نے اپنی قوم کے لیے وہ کام کیا جو ارل آف چیتھم (ولیم پٹ) نے بھی کبھی نہیں کیا تھا۔ ولیم پٹ کے زمانے میں برطانیہ کم سے کم بیرونی حملے سے تو محفوظ تھا لیکن چرچل کے زمانے میں حملے کا حقیقی خطرہ تھا۔

وہ کونسی خوبیاں تھیں جنہوں نے برطانوی تاریخ میں چرچل کو جنگ کے زمانے کا ایک لاثانی وزیر اعظم بنا دیا۔ سرونسٹن چرچل کی سب سے بڑی خوبی ان کی ہمت تھی۔ وہ شکست کو تصور میں بھی نہیں لا سکتے تھے۔ "جنگ برطانیہ" جب اپنی انتہا پر تھی تو انہوں نے پوچھا کہ "برطانیہ کی ریزرو فوجیں کتنی ہیں۔ جواب ملا۔ کچھ بھی نہیں" اس حالت میں برطانیہ کی فتح پر یقین رکھنا ایک عام انسان کا کام نہیں تھا۔ ایک بار پہلے بھی انہوں نے یہ سوال کیا تھا۔ جرمنی کی فوجیں فرانسیسی مورچابندیوں کو توڑ کر ملک میں داخل ہو رہی تھیں فرانس اپنے دفاع کے خلا کو پر کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت سرونسٹن چرچل نے پوچھا تھا کہ فرانس کے پاس ریزرو فوجیں کتنی ہیں۔ جواب ملا تھا۔ "کچھ بھی نہیں" وہ شاید اس وقت فرانس کے متعلق مایوس ہو گئے ہوں لیکن وہ اپنے ملک کے متعلق کبھی بھی مایوس نہیں ہو سکتے تھے

وہ صحیح معنی میں ایک قومی رہنما ہیں۔ انہوں نے اپنی جادو اثر تقریروں سے عوام کے حوصلوں کو بلند کیا۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے سرونسٹن چرچل نے کہا۔ "میرے پاس خون محنت، آنسوؤں اور پسینے کے سوا تمہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ آؤ ہم اپنے فرائض انجام دیں۔۔۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر برطانوی سلطنت اور دولت مشترکہ ایک ہزار سال تک زندہ رہی۔ اس وقت تک بھی لوگ

یہ کہیں گے کہ ہماری تاریخ کی یہ بہترین گھڑی تھی" چرچل کے یہ شبد صفحۂ تاریخ پر لکھے جا چکے ہیں۔ ان کی تقریروں نے فتح حاصل کرنے میں جتنا اہم پارٹ ادا کیا اتنا شاید ہی کسی کی تقریر والے کیا ہو۔ لیکن جنگ کے بعد اس شخص کو جس نے قوم کو بچایا تھا حکومت سے الگ کر دیا گیا۔ دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

لیکن سرونسٹن چرچل نے دل میں کینے کو کبھی بھی جگہ نہیں دی ہے انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا بل کی پر زور مخالفت کی تھی۔ لیکن جب یہ بل قانونی شکل اختیار کر گیا تو انھوں نے اس کے خلاف ایک شبد بھی مونھ سے نہیں نکالا۔ صدر آئزن ہاور نے بھی یہ بتایا کہ دوران جنگ سرونسٹن چرچل چاہے کتنا بھی اپنے نقطہ نظر پر زور دیتے تھے لیکن جب کوئی فیصلا ہو جاتا تو وہ اس پر پوری وفاداری کے ساتھ عمل کرتے تھے۔

اب وہ اسی سال کے ہو گئے ہیں اور بحال حالت تک بر سر اقتدار تھے۔ کئی دوسرے سیاست دانوں اور مدبروں نے بھی یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ مثال کے طور پر ۸۰ سال کی عمر میں گلیڈسٹن کو اپنی چوتھی وزارت بنانے کے لیے تین سال تک انتظار کرنا پڑا تھا۔ لیکن ۸۰ سال کے بعد یا اس سے کچھ پہلے عام طور پر لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ آرام کریں۔ لیکن اس پیرانہ سالی کے باوجود انگلستان کے اولو العزم سابق وزیر اعظم نے آرام طلبی کو کبھی بھی گوارا نہ کیا۔ آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جب انہیں اپنا بوجھ کسی دوسرے کے حوالے کرنا ہی پڑا۔ لیکن آنکھوں سے اوجھل وہ کبھی بھی نہیں ہوں گے جب تک وہ زندہ ہیں ان کی اہمیت برقرار رہے گی۔

اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرتا کہ ان میں بعض نقائص بھی ہیں لیکن یہ نقائص ان کی کارگذاریوں کے سامنے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔

ان کی سالگرہ کی خوشیوں کے دوران تمام سیاسی اختلافات بھلا دیے گئے۔ اور ایک ایسی بلند اور بعض اوقات نرالی شخصیت کو جس نے اپنی قوم کی ساٹھ سال تک خدمت کی ہے خراج تحسین پیش کیا گیا۔

سوال زندگی

صابر حسین صابر (آر دی)

زندگی وقت کی رفتار سے کرتی ہے سوال
لذت زیست کے اطوار سے کرتی ہے سوال
کسی شاعر کسی فن کار سے کرتی ہے سوال
حسن اور حسن کے معیار سے کرتی ہے سوال

کیوں شرربار نہیں سوز یقین آدم
نقل و تقلید میں کیوں گم ہے امین آدم

سینۂ دہر میں بھرنے کو ہے پھر جنگ کی آگ
کوئی عفریت سناتا ہے وہی موت کا راگ
وہ بڑھے آتے ہیں ڈسنے کو پھر افلاس کے ناگ
پنجۂ ظلم میں پھر آج سسکتا ہے سہاگ!

پھر بھی تزئین در و بام سخن کرتے ہیں
اپنی افسردہ نمائش کی جتن کرتے ہیں

ہاں وہ احساس جسے زہر ہے امرت کا جام
ناز شب کو سمجھتا ہے جو عشرت کی شام
گرمئی باد خزاں جس کو سکوں بخش پیام
ایسے احساس کو ہم کرتے ہیں سو بار سلام

میرے شاعر یہ زمانے کا تقاضا تو نہیں
رنگ و روپ ہی اک فن کا سہارا تو نہیں!

ع.... کے نام

کاشانۂ غم

صبا نقوی

جان آرزو!

آرزوؤں بھرا سلام! میں جب سے یہاں آیا ہوں میرا بہترین شغل تمہارے خط کا انتظار کرنا ہے۔ انتظار کرتا رہتا ہوں۔ اور یہ انتظار کی گھڑیاں تمہاری زلف سیاہ کی سی دراز اور تمہارے وعدوں کی طرح طویل ہوتی رہتی ہیں امید کی کرن اس وقت پھوٹتی ہے جب میرے جہان پر برسات کی شب سیاہ کی مانند پر پھیلا چکی ہوتی ہے۔ اس گھور اندھیرے میں میں اسی کرن کے سہارے رستا ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تمہاری شان تغافل تسلیم، لیکن یہ ادائے تغافل تو روا نہ رکھو کہ کوئی عمر بھر کے لیے حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا ہو کر رہ جائے۔ یہاں آنے کے بعد مجھے تمہارا صرف ایک خط ملا ہے اور وہ بھی پورے چھ مہینے بعد۔ میرے ڈھیروں خطوط کے جواب میں۔ صرف ایک خط۔ جسے میں نے اپنی پیار کی آرزو بنا کر سینے سے لگا لیا۔ چوم چوم لیا۔ کاش! میں اسے صرف سینے سے لگائے رکھتا۔ تمہارا خط سچ کہ اس پر ان منٹ بوسے ثبت کر دینا جتنے حروف بھی وہ اپنے اندر چھپائے ہوئے تھا۔ اس میں نشتر چھپے ہوتے تھے۔ تم نے مجھے تیز دھار نشتروں کا تحفہ بھیجا تھا۔ یہ تیکھے الفاظ کے زہر میں بجھے ہوئے نشتر سیدے سادے دل میں جا کر پیوست ہو گئے۔ اور گہرائی میں اترتے ہی چلے گئے۔ تمہارے انوکھے تحفے نے اسی دل کی گہرائی ناپ ڈالی۔ جیسے تم کئی بار پہلے سے دیکھ چکی ہو۔ جس پر زمانے کے لگائے ہوئے زخموں سے کوئی جگہ بچ نہیں رہی تھی۔ تمہاری محبت کی گرم و نرم شعاعوں نے ان زخموں کی پرورش کی۔ تمہاری دوری نے انہیں کرید ڈالا۔ اور اب تمہارے بھیجے ہوئے نشتروں نے تو ہر ہر زخم کو جھنجوڑ ڈالا ہے۔ کہ اب انہوں نے ناسوروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ رستے ہوئے ناسور۔ جن کا کوئی چارا نہیں۔ جو ہمیشہ رستے ہی رہیں گے۔

شہلا! کیا تم ان دنوں کو بھلا سکتی ہو۔ جب ہم بہت چھوٹے سے تھے۔ بالکل ناسمجھ بچے۔ لیکن ہمارا کھیل کود۔ دوڑ بھاگ کھانا پینا۔ لکھنا پڑھنا۔ یہاں تک کہ سونا جاگنا بھی ایک جگہ ہوتا تھا۔ آہ! کیا زمانا ہوتا ہے بچپن بھی۔ نہ کسی کی انگشت نمائی کا خوف نہ طعنہ زنی کا ڈر۔ نہ کوئی نگاہ بری طرح گھورتی ہے نہ کسی سوئے ہوئے طوفان کے جاگ اٹھنے کا ڈر ہوتا ہے۔ ان عجیب عجیب دلچسپ کھیلوں کی یادیں کیوں کر بھلائی جا سکتی ہے۔ جنہیں ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر رات دن کھیلے جایا کرتے تھے۔ کتنے لطیف تھے وہ کھیل۔ بھولا پن اور معصومی کا سراپا۔ کیا اب بھی ان کھیلوں کو ایک دفعہ۔ صرف ایک بار۔ دہرا لینا ممکن ہے؟ لیکن نہیں۔ وہ کھیل صرف معصومیت اور بھولے پن کا ورثا ہیں۔ اور ہم اب۔ جوان ہو چکے ہیں۔ دنیا بچپن کے ہر سنجیدہ کھیل کو برداشت کر سکتی ہے اور جوانی کے مذاق کو کبھی نہیں۔ اے کاش! بچپن ہی لوٹ کر ہمیں ایک دفعہ دیکھ لے۔ صرف ایک نظر۔

ہم جوں جوں بڑے ہوتے گئے ہماری محبت کے برگ و بار میں پختگی آتی گئی۔ ہم جوانی کی آغوش میں پہنچ کر بدمست ہو گئے۔ ہماری محبت کا شباب بھی پھوٹ نکلا اور ہر تیز نظر سے خوف کھانے لگا۔ تم وہ زمانا کیوں کر بھلا دو گی؟ جب ہماری ملاقاتوں نے لبادا اوڑھ لیا تھا۔ چھپ کر ملنا ہی زمانے کی مصلحت

تھی۔ نہیں تو کیا باک ہو سکتا تھا لیکن زمانے کی مجبوریاں ہی آڑے آئیں۔ یاد ہے کیسے کیسے ٹھکانے تھے ہمارے! اور بھابی کا گھر۔ کتنی اچھی تھیں ہماری بھابی۔ گرمیوں کی دوپہر کے بھیانک سناٹے کو رونق بخشنے تم میری خبر پاتے ہی وہاں پہنچ جاتی تھیں گھر کے بزرگوں کی آنکھوں پر استراحت کی پٹی باندھ کر بچوں کو مٹھائی کا جل دے کر۔ سینکڑوں خطرے مول لے کر کتنی نڈر ہوتی ہے محبت بھی —— !

انسان کی زندگی میں جوانی کا زمانا اپنے جلو میں سینکڑوں زلزلے اور ہزاروں طوفان لیے داخل ہوتا ہے۔ کس قدر غیر ہموار اور طوفانی دور ہوتا ہے! ان زلزلوں۔ طوفانوں۔ آندھیوں کی آب و تاب گھور گرج اور خوفناکی کو محبت کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ایک محبت کرنے والا جوان شخص کن کن مصیبتوں اور بلاؤں سے دوچار ہوتا ہے۔ اس قدر تند طوفانوں کا حامل ہونے کے باوجود کس قدر خامش اور پُرسکون رکھنا پڑتا ہے۔ اپنی سطح کو ہر طرف خطرا ہی خطرا ہوتا ہے۔ دشمن ہی دشمن۔ زمانے کا ڈر —— رسوائی کا خوف، عزت و ناموس کا خیال۔ سماج کی بندشیں۔ خاندان کا خیال۔ بلائیں ہی بلائیں۔ آفتیں ہی آفتیں۔ پتا بھی کھڑکتا ہے تو طوفانوں کا دل اس زور سے دھڑکتا ہے جیسے ابھی باہر آ رہے گا۔ در و دیوار دشمن نظر آنے لگتے ہیں۔ دنیا کی ہر سرگوشی اپنے متعلق سمجھ لی جاتی ہے —— ہر غیر متعلق قہقہے کا ہدف خود کو بنا لیا جاتا ہے۔ محبت کتنی پُرشور۔ کتنی خامش۔ کتنی نڈر اور کتنی کم دل ہوتی ہے —— :

اوہ! معاف کرنا۔ میں بھی کہاں سے کہاں جا پہنچا۔ کہنا کیا تھا اور قصہ کیا لے بیٹھا۔ لکھنا کیا چاہتا تھا اور لکھ جاتے کیا کچھ گیا ہوں۔ شاید تم انھیں ماضی کی باتیں کہہ کر نفرت سے منہ بنا لو۔ میرے خط کو پھاڑ پھینکو۔ لیکن خدارا ایسا مت کرنا۔ اسے پڑھنا ضرور۔ کوئی فضول قصہ یا فرضی کہانی نہیں ہے۔ تمھاری اپنی باتیں ہیں۔ تمھارے اپنے ماضی کی باتیں۔

لیکن ماضی —— ماضی سے تو تم نفرت کرتی ہو۔ اسے اپنی عمر کے دامن سے جھٹک پھینکنا چاہتی ہو۔ ماضی کی تمام باتوں کو بھی تم حقیر سمجھتی ہو۔ ناسمجھی کی باتیں۔ ہماری محبت بھی تمھاری نظروں میں اب ماضی کا فضول واقعہ ہے۔ ایسا واقعہ جو ذرا برابر اہمیت کا بھی حامل نہ ہو۔ اچھا خیر! ان باتوں کو چھوڑو۔ جو ہوا سو ہو چکا۔ لیکن۔ جو ہو چکا وہ پتھر کی لکیر تو ہے۔ اسے مٹایا کیسے جا سکتا ہے؟ کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے —— !

میں یہاں آیا تو اپنا خزانا اپنی تمام عمر کی پونجی بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ تمھاری محبت میں کھوئے ہوئے سہانے سپنے۔ میرا ہر لمحہ ہر گھڑی۔ ہر پل۔ انھی سپنوں کی رنگینیوں کے سہارے بیت رہا تھا۔ میری زندگی کا ایک ہی سہارا تھا۔ لیکن تمھارے خط نے اسے بھی چھین لیا۔ کاش مجھے بھی یہ خط کبھی نہ ملتا۔ کاش تم مجھے ہمیشا بے خبر رکھتیں۔ کاش میں محبت کی دیوی پر سر جھکائے پھول چڑھائے جاتا۔ اور اس کی آشیرواد کی تمنا نہ کرتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میں نے تمھارے قلم سے لکھا ہوا طوفان بداماں خط پڑھا۔ اس قلم کی برق ساماں تحریر پڑھی جس کی لکھائی کبھی دودھ اور شہد کی نہروں کا منبع تھی۔ اس تحریر نے مجھے اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ تمھیں جواب کے طور پر دو حرف ہی لکھ دوں۔ تم مطمئن ہو گی کہ مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ خامش ہو جانا چاہیے —— بالکل —— ہمیشا کے لیے —— لیکن یہ آخری خط لکھے بغیر چین کیوں کر پا سکتا ہوں۔ زندگی کے ان بقایا دنوں کو کیسے بہلاتا جو صرف تمھاری یاد کے سہارے بسر ہونے والے ہیں۔

شہلا —— میری روح زندگی —— مجھے تم سے —— ایسی آشا ہرگز نہیں تھی —— آہ! میں نے سمجھا تھا —— تم میری ہو —— صرف میری —— ہمیشا کے لیے —— ابد تک کے لیے —— میرے سوا تمھیں کوئی نہیں جیت سکتا —— کوئی جدا نہیں کر سکتا —— کوئی نہیں اپنا سکتا —— لیکن —— یہ خیال۔ آہ! یہ خیال

خام تھا۔ پانی کا بلبلا — کلی کی مسکراہٹ۔ زمانہ ہمیشہ محبت کے آڑے آیا ہے۔ دو پریمیوں کا اکٹھا ہونا اسے ہمیشہ بارگذرا ہے — محبت کی راہ ہمیشہ سنگلاخ چٹانوں میں سے گذری ہے۔ الفت بھرے دلوں کو ہمیشہ خون رونا پڑا ہے۔ لیکن کسی محبوب نے آج تک تم جیسی بیوفائی قایم نہیں کی۔ کوئی گلعذار اپنے چاہنے والے کو یوں لق و دق صحرا میں چھوڑ کر خود نخلستان کی ٹھنڈی چھاؤں میں نہیں جا سویا۔ کسی فتنہ پرداز نے اپنے بنائے ہوئے چمن کو نذر آتش کر کے یوں دور کھڑے ہو کر تماشا نہیں دیکھا۔

کون شخص ہے جسے معاش کی فکر نہ ستاتی ہو۔ میرے طبقے کا کون فرد ہے جسے یہی فکر گھر سے بے گھر نہیں کر دیتی۔ در در کی ٹھوکریں نہیں کھلاتی۔ پیسے پیسے کی خاطر گویوں کے سامنے سینہ کھول کر کھڑا ہونے پر مجبور نہیں کر دیتی۔ مجھے بھی تو اسی خاطر گھر چھوڑنا پڑا تھا — لیکن میرے ساتھ تو زمانہ اس قدر نبرد آزما نہیں تھا — حالات ناسازگار تو نہیں تھے — تمہیں سمندر پار کی بستیوں میں تو نہیں چھوڑ جانا پڑا تھا — اور تم بھی تو خوش تھیں اس پر — تم نے کن امیدوں کے سہارے میں مجھے عارضی طور پر رخصت کیا تھا — اور پھر — خود ہی مجھکو رخصت کر دیا تھا — کیا تمہیں اپنا وہ وعدا یاد ہے جو مجھے رخصت کرتے وقت تم نے کیا تھا — اپنی مرمریں باہوں کو میرے گلے کے گرد ڈال کر — لیکن — نہیں — نہیں — میں تمہیں کوئی وعدا یاد دلانے کے لیے یہ خط نہیں لکھ رہا — میں تمہیں کوئی بات یاد نہیں دلانا چاہتا — یہ خط مجھ سے لکھوایا جا رہا ہے — زبردستی — ایک نامعلوم جذبہ ہے — جو مجھے قلم گھسیٹنے پر مجبور کر رہا ہے ——

میں جانتا ہوں کہ تم میری نہیں ہو — جلیس مجھ پر فوقیت رکھتا ہے — وہ امیر ہے اور میں غریب — وہ کوٹھی میں رہتا ہے اور میں اب تک اپنی کٹیا بھی نہیں بنا سکا ہوں — وہ کئی کاروں کا مالک ہے اور میں ایک سائیکل پر ادھر ادھر بھٹکنے والا — ہاں اس دنیا میں غریب ہونا بھی ایک عظیم ترین گناہ ہے اور میں اس گناہ کا مسلسل مرتکب ہونے والا مجرم — لیکن شاید تمہیں اپنے ماضی کی کوئی بات یاد ہو تو سمجھ سکو کہ ایک غریب آدمی کے پہلو میں بھی دل ہوتا ہے — دھڑکتا پھڑکتا دل — حساس دل — اس دل میں درد بھی پیدا ہوتا ہے — اور — نہیں نہیں — کچھ نہیں — میں کچھ نہیں کہتا — کچھ کہنے کا حق بھی کب ہے مجھے ——؟ تمہارے اور جلیس کے درمیان میری ذات ایک دیوار تھی۔ — میں پردیس میں ہوں — سینکڑوں میل دور — میری پہنچ آتی اونچی نہ پہلے تھی — نہ اب ہے — پہلے صرف — کمتر اور غریب تھا — اب مجبور بھی ہوں۔ اور بے کس بھی — تم دونوں کے لیے ایک روشن شاہراہ جو کسی مستقبل کی رہنمائی کر رہی ہے۔ اس پر گامزن ہو جاؤ — میری چین — میرا سکون میری بہار — میری زندگی — ہر چیز اپنے دامن میں سمیٹ کر لے جاؤ — اور مجھے ماضی کی یادوں کے ویرانے میں بھٹکتا ہوا چھوڑ جاؤ — خدا کے لیے یہ ویرانہ مجھ سے مت چھینو — یہ تمہارے کسی کام نہ آئے گا۔ اس کے کسی حصے میں کسی نخلستان کا نام و نشان نہیں — خدا کرے تمہیں زندگی کی ہر وہ نعمت نصیب ہو جو میرے مقدر نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھین لی ہے

پھر بھی تمہارا اور صرف تمہارا

کاشر آذری

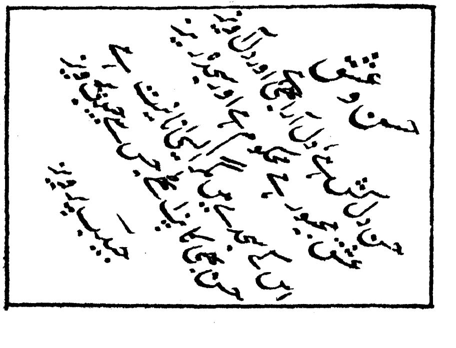

مس ہیلن کیلر

(ایک نئے نقطۂ نظر سے)

یونیس

نپولین بوناپارٹ کے بعد موجودہ صدی کی سب سے زیادہ محیرالعقول ہستی مس ہیلن کیلر ـــــــ
امریکا کی وہ اندھی بہری اور گونگی خاتون جو علم و فضیلت کا مجسمہ ہے۔
دنیا بھر کے اندھوں گونگوں اور بہروں کی بے لوث ہمدرد اور غمگسار۔

امریکا میں ہندستان کے سفیر جی۔ ال مہتا نے اندھی اور بہری مس ہیلن کیلر کے اعزاز میں دیے گئے عصرانے میں کہا کہ "بجا طور پر کہا گیا ہے کہ مس کیلر نے نہ صرف اندھوں اور گونگوں اور بہروں بلکہ ان تینوں نعمتوں سے بہرامند لوگوں کو بھی زندگی کی وہ شاہراہ دکھائی ہے جہاں دھن دولت۔ بھوکوں کے لیے خوراک اور اناج بے گھروں کے لیے گھر، ان پڑھوں کو تعلیم، بیماروں کو شفا اور ساری نوع انسانی کے لیے سکھ چین اور امن کی برکتیں مساوی ہونی چاہئیں۔
ـــــ مس ہیلن کیلر اس خواب کو پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں چنانچہ روایاتی طور پر ہندستان کا فلسفہ بھی یہی ہے اور جب مس کیلر ہندستان آئیں تو انہیں ہندستان کے ساتھ ایک روحانی رشتہ نظر آیا۔

مارک ٹوین نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "نپولین بوناپارٹ اور مس ہیلن کیلر ۱۹ ویں صدی کی نہایت ہی دلچسپ و حیرت انگیز ہستیاں ہیں" اور حقیقت بھی یہی ہے۔

مس ہیلن کیلر اندھی اور بہری ہونے کے باوجود موجودہ دنیا کی نہایت ہی باکمال اور اولوالعزم خاتون ہیں۔ کیلر نہ عالم با عمل اور مصنفہ ہیں بلکہ ایک ممتاز رہنما بھی ہیں۔ اب تک دنیا کے کئی دورے بھی کر چکی ہیں۔ مس کیلر آج کل دنیا کے ایک اور دورے پر ہیں اور ہندستان میں اندھوں، گونگوں اور بہروں کی بہبودی کے کاموں کی توسیع و ترقی کے لیے ممکن اقدامات کریں گی۔

دنیا کی اس بے نظیر اور نوع انسانی کی ہمدرد خاتون کے حالات زندگی بھی کچھ کم دلچسپ نہیں جنہیں نیچے کسی قدر اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

سوانح حیات

ہیلن کیلر ۲۷ر جون ۱۸۸۰ء کو ٹسکمبیا الباما (امریکا) میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں جو امریکی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے والد امریکی خانہ جنگی یعنی ۶۵ - ۱۸۶۰ کے زمانے میں امریکی فوج میں کپتان تھے اور ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ مس ہیلن ایک خوب صورت اور صحت مند لڑکی تھی۔ ابھی صرف چھ مہینے کی تھی کہ اس نے باتیں کرنی شروع کر دی تھیں اور چلنے پھرنے لگی تھی۔ لیکن بدنصیبی دیکھیے کہ ابھی ڈیڑھ برس کی بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ اسے سرسام نے آ کر گھیرا اور اس موذی مرض کا حملہ اتنا شدید ہوا کہ یہ معصوم بچی اندھی گونگی اور بہری ہو گئی۔ اور زندگی کی تین عظیم نعمتوں سے محروم ہو گئی اس حادثے نے قدرتی طور پر لڑکی پر اس قدر گہرا اثر ڈالا کہ وہ سرکش اور وحشی سی بن گئی۔ اور ذرا ذرا سی بات پر غیظ و غضب میں آ جاتی۔

آخر ۶ برس کی عمر میں بوسٹن میں اسے اندھوں کی ایک

درس گاہ میں داخل کیا گیا۔ جہاں ایک معلمہ مس اینی سلوین نے اس لڑکی میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ اس دن سے مس اینی سلوین کی موت تک یہ دونوں کبھی جدا نہیں ہوئے اور لگ بھگ پچاس برس تک اکٹھے رہے۔

مس ہیلن جب پہلے پہل اسکول میں داخل ہوئی تو وہ اندھی گونگی اور بہری ہونے کے باوجود دوسری لڑکیوں اور لڑکوں کے مقابلے میں بہت تندرست اور چاق چوبند تھی۔ چہرا سیب کی طرح سرخ تھا۔ اور ایک پھیری کی طرح سرکش اور چنچل چونچال تھی۔

چند مہینوں کے اندر اندر ہیلن کیلر نے ۴ سو لفظ سیکھ لیے اور بریل طریقے کے مطابق لکھنا بھی شروع کر دیا۔ ہیلن کیلر کی غیر معمولی قابلیت اور خداداد ذہانت و ذکاوت کو دیکھ کر اس کی معلمہ مس سلوین نے ایک دوست کو لکھا کہ "میرے اسکول میں ایک لڑکی کا داخلہ میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس میں حیرت انگیز جوہر اور قوت عمل وارادا پایا جاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں اسے صحیح سانچے میں ڈھال کر سیدھے رستے پر لگا سکوں گی۔"

مس سلوین کی یہ پیش گوئی درست نکلی۔ جلد ہی سارے امریکا میں مس ہیلن کیلر کی شہرت پھیل گئی اور اسے محیر العقول ہستی تصور کیا جانے لگا۔

بولنے کی مشق

جب ہیلن دس برس کی ہوئی تو اس نے بولنے کی مشق شروع کر دی چنانچہ وہ نیویارک میں گونگوں کے ہوریس میں اسکول میں داخل ہوئی۔

ابتدا میں اس کی باتیں ناقابل فہم تھیں لیکن وہ ایک ایک لفظ کئی کئی گھنٹے رٹتی رہتی۔ اس میں ایک خواہش تھی کہ وہ اپنے گھر جا کر اپنی چھوٹی بہن سے کہے "سنو! اب میں نے بولنا سیکھ لیا ہے۔"

آخر ارادے کی اس پکی لڑکی نے بولنا سیکھ ہی لیا اور ایک دن ایسا بھی آیا جب اس نے لوگوں کے اجتماع میں تقریریں کرنی شروع کر دیں۔ اور آج تک یہ سلسلا جاری ہے۔

دوسری زبانوں کا مطالعا

مس ہیلن کیلر نے نہ صرف انگریزی بلکہ اطالوی۔ فرانسیسی اور جرمن زبانوں کا بھی مطالعا کیا ہے۔ اور سنہ ۱۹۰۰ء میں ریڈ کلف کے عالا لتعلیمی ادارے میں داخل ہو گئیں۔ یہاں بھی ایک کی معلمہ مس سلوین اس کے ساتھ تھی۔ اور اس کی ہتیلی پر لکھ کر لیکچروں کا نفس مضمون سمجھاتی اور بتاتی رہی۔ ظاہر ہے یہ انتہائی محنت اور صبر و تحمل کا کام تھا۔ لیکن ہیلن کیلر اور مس سلوین دونوں ڈٹی رہیں۔ اور آخر ۱۹۰۴ء میں ہیلن گریجویٹ بن کر نکلی۔ ساتھ ہی انگریزی کے مضمون میں آنرس بھی پاس کیا۔

پہلی تصنیف

مس ہیلن کیلر نے ریڈ کلف ادارے میں ہی میری زندگی کی کہانی کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جو ایک رسالے لیڈیز ہوم جنرل میں مسلسل چھپتی رہی اس سے ہیلن کی شہرت میں اضافا ہو گیا۔

بعد میں اس نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

"وہ دنیا جس میں میں رہتی ہوں" "میرا مذہب" "ہیلن کیلر اسکاٹ لینڈ میں" "ہمیں اعتقاد رکھنا چاہیے" وغیرا وغیرا

آرٹ اور ادب سے دلچسپی

ہیلن کیلر کو ادب آرٹ شاعری موسیقی مصوری سے گہری دلچسپی ہے۔ ناٹکوں اور سینماؤں میں جاتی ہے۔ اسے پلاٹ ہتیلی پر لکھ کر سمجھایا جاتا ہے۔ موسیقی کا حظ تال اور سر کے زیر و بم کے اٹھاتی ہے۔ بت تراشی۔ فن کاری اور مصوری وغیرا کو وہ اپنے بے حد حساس ہاتوں کے مس سے جانچتی ہے۔

اندھوں گونگوں کی خدمت

جب ہیلن تعلیم سے فارغ ہوئی تو اس نے ملک کے اندھوں، گونگوں بہروں وغیرا کی خدمات اور بہبودی کا بیڑا اٹھایا۔ اور اندھوں کی فلاح و بہبود کی انجمن میں شامل

تبصرہ

دلی کی بپتا | یہ کتاب اصل میں ایک دکھے دل کی آپ بیتی ہے ۱۹۴۷ء کے وہ خونچکاں واقعات ایک ایک کر کے گنائے گئے ہیں، جو دلی اور دلی کے اطراف واکناف میں واقع ہوئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت انسانیت کا نام ونشان مٹ چکا تھا۔ اور ہر چہار طرف وحشت اور بربریت کا زور دورا تھا۔ دلی ماتا ڈاین بنی اپنے ہی بچوں کو پھاڑ کھائے جا رہی تھی ــــ بلا شبہ تاریخ انسانیت میں ۱۹۴۷ء کا زمانہ "کالا دور" کے نام سے یاد کیا جائے گا۔

ہم شاہد احمد دہلوی کی نیت پر کوئی شبہ نہیں کرتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انہوں نے جو بھی لکھا ہے اس کا ایک ایک لفظ حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے۔ اس لحاظ سے ہمیں ان کے بیان سے پورا پورا اتفاق ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود مثالیں پیش کر کے ہم اپنے قلم کو آلودہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے مگر بعض ناگزیر صورتوں میں چند ایک مثالیں پیش کرنے پر ہم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں ــ

یہ سچ ہے کہ دلی میں جو بھی واقعات ہوئے انتہائی اخلاق سوز اور ننگ انسانیت تھے۔ ان کی جتنی بھی برائی کی جائے اور جس حد تک بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ دلی سے ہٹ کر کہیں اور بھی کچھ ہوا یا نہیں ــــ؟ دور کیوں جائیں خود شاہد احمد کے الفاظ میں چند ایک واقعات سن لیجیے ـ!

"ورنہ امرتسر مسلمانوں سے خالی کرایا جاتا اور نہ لاہور پر آفت آتی۔ لاہور کے بعد سارے مشرقی پنجاب میں قتل و غارت گری وبا کی طرح پھیل گئی۔ اس کا اثر مغربی پنجاب پر پڑنا ضروری تھا وہاں بھی کشت وخون شروع ہو گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مظالم دو طرفہ تھے ــــ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ تالی ایک ہات سے نہیں بجتی۔

"...... سبزی منڈی والے ہر آنے والی مصیبت کے لیے تیار رہتے تھے۔ یہاں ایک دم سے بڑا حملا کیا گیا.. روایت یہ ہے کہ حملا آور یہاں ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے..." گویا یہ بدلا حفاظت خود اختیاری کا نتیجا تھا ــــ

"..... ہوا یہ کہ پہاڑ گنج کے مسلمانوں نے حملا آوروں کو اس بری طرح مارا کہ کشتوں کے پشتے لگا دیے ......"

ــــ یعنی مسلمانوں نے ان بے پناہ مظالم کا جواب دیا جو ہندوؤں نے ان پر توڑے تھے مظلوم مسلمانوں کا یہ فعل فطری اور لازمی نتیجا تھا۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا ہے ــ

ان (فوجیوں) کے جانے کے بعد بڑے بھائی ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے۔ اور اس سے اس کارروائی (بندوقیں اور کارتوس زبردستی لے جانے) کی شکایت کی۔ مگر اس نے بے پروائی سے کہا ــ "مسٹر صاحب! اسے غنیمت سمجھیے کہ آپ کے ساتھ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوا، پاکستان جا کر دیکھیے وہاں کیا ہوا ہے" ہو سکتا ہے کہ ڈپٹی کمشنر نے جذبے میں آ کر ایسا طنز کیا ہو ــــ!

جب یہ دلی سے لاہور کے لیے چلے ہیں تو جالندھر کے قریب ان کی ریل پر ہزاروں مسلح غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ اور بقول شاہد! "ہم سے دو ڈبے آگے حملہ کا پورا زور رہا۔ اور تین ڈبے بالکل خالی ہو گئے۔ ان میں لاشیں پڑی تھیں اور باہر کے پلیٹ فارم پر بیسیوں زخمی مرد اور عورتیں پڑے تڑپ رہے تھے...." واقعی حملا آوروں نے نہایت ہی ذلیل کمینی اور انسانیت سوز حرکت کی تھی۔ انہیں اس کی جو بھی سزا دی جاتی ــــ ہم کہتے ہیں کہ کم تھی۔

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

اردو کو بگاڑ [illegible]

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیا)

جلد (۱۵) نمبر (۸)

نیر ۱۳۶۴ف مئی ۱۹۵۵ء

چندا سالانا آٹھ روپے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
حقائق و معارف	افقر موہانی وارثی	۳
ترانۂ دل	دل شاہجہاں پوری	۴
یہ ذرے	اختر انصاری اکبرآبادی ایڈیٹر "مشرب"	۵
غزل	ابو مسلم صحافی	۶
عذر	مشتاق علی بیگ	۷
نوید مسرت	صفی احمد بہاری	۸
غالب	رشید احمد صدیقی	۹
غزل	عظیم (لکھنوی)	۱۳
پپیہا	سالک کرستی	۱۳
یونیورسٹیوں میں طریقۂ تعلیم کی پھر سے تشکیل	پروفیسر ڈی۔ پی۔ مکرجی	۱۴
عبداللہ ابن المقفع	تمکین کاظمی	۱۵
غزل	ناز شاہجہاں پوری	۲۰
غزل	عبدالغفور رشر رندوی	۲۰
سری نگر موسم بہار میں	ا۔ ا	۲۱
جین ایڈمز	یوسیس سکسینی	۲۳
غزل	مادھو پرشاد سکسینہ آزاد (لکھنوی)	۲۴
تامل ڈرامے کی روایات	ا۔ ا	۲۵
غزل	حکیم یوسف اعظمی	۲۶
انسانیت کا جویا	آثم اکبرآبادی	۲۸
غزل	شارب (لکھنوی)	۳۰
"ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے"	ایڈیٹر	۳۱
تبصرے	"ا" اور "ت۔ ک"	۳۲

ہمارے خیالات

گر ہمین مکتب است ہمین ملا — کار طفلاں تمام خواہد شد

حکومت ہندستان کے تمام ذمے دار ماہران تعلیم اس طرف دھیان دیں

کل ہی کی بات ہے کہ ایک صاحب ہم سے ملنے آئے، باتوں باتوں میں بتایا ایک کارنامہ جتایا۔ کہنے لگے فلاں ممتحن سے میں نے وعدا کرلیا تھا کہ اس سال ان کے لڑکے کو کامیاب کروا کے رہوں گا۔ چنانچے میری کوششیں بار آور ہوئیں اور وہ لڑکا سکنڈ کلاس کامیاب ہو گیا۔ ہم نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگے جواب کے پرچوں میں نمبر بڑھوا دیے ۸ کو ۱۸، ۵ کو ۱۵، ۲ کو ۲۲، اور اسی طرح پر ایک ایک عدد کا اضافا کر دینا بائیں ہات کا کھیل ہے۔ بھئی یہ تو ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ راز کے پرچوں میں اس آسانی سے نمبر بڑھا دیے جائیں! ہمارے کرم فرما نے قہقہا لگاتے ہوئے کہا۔ اجی جناب بھولے بھالے ایڈیٹر صاحب! ان ہتھکنڈوں کو آپ کیا جانیں، سو پون سو روپیے کی تو بات ہے نا۔ آپ یقین جانیے پچیس پچاس روپیے میں بھی یہ کام بن سکتا ہے۔ ہم حیران اور پریشان ان کا موںھ تکتے رہ گئے۔ کہا کہ آپ موںھ کیا تک رہے ہیں! اگر یقین نہ ہو تو آزما لیجیے۔ ابھی بعض امتحانات کے نتیجے نکلنا باقی ہیں، امتحان کی اہمیت کا لحاظ کرتے نذرانا رکھ دیجیے اور پھر آپ کا امیدوار سکنڈ کلاس کامیاب!

ان صاحب نے آگے چل کر یہ بھی بتایا کہ یہ دھاندلی نہ صرف دفتری حد تک ہے بلکے بعض ناعاقبت اندیش ممتحن صاحبان تک اس ناپاک اور کوڑی مرض میں مبتلا ہیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ایک اور بات یہ بھی بتائی کہ چند ایک ممتحن تو ایسے بھی ہیں جو محض بلہوسی اور ناپاک ارادوں کے ساتھ اکثر لڑکیوں امیدواروں کے ساتھ غیر معمولی ناواجبی رعایت برتتے ہیں ہمارے لیے یہ انکشافات اچنبے سے کم نہ تھے — ہمارا موںھ کھلا کا کھلا رہ گیا اور واقعی ہم ان مہربان کا موںھ تکتے ہی رہ گئے اور وہ ہماری اس حالت کو دیکھ کر مذاق اڑاتے ہی رہے۔

—— ہمارے مہربان جاہل تو نہیں۔ تھوڑے بہت پڑھے لکھے ضرور ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ خد انھوں نے بھی اسی طرح پرچے دے دلا کر امتحان پاس کر لیا ہو۔ مگر ان کی ساری بات چیت سے ایک بات ضرور نمایاں تھی کہ ان کی اٹھان میں تربیت کی ضرور کمی رہی ہے۔ تب ہی تو وہ ایسی ناپاک اور مہمل باتوں کو فخریا طور پر بار بار دہرا رہے تھے۔ اس خصوص میں ہم نے حکومت ہندستان کے ذمے دار ماہران تعلیم کو بار بار توجہ دلائی ہے کہ وہ نصاب تعلیم میں "تربیت" جیسے اہم مضمون کو بھی شامل کر دیں، ورنا یہ تعلیم ہر سال ملک میں بد اخلاق اور بدکردار تعلیم یافتا افراد کا اضافا کرتی رہے گی۔

ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ مدرسوں وغیرا میں بعض استاد خاص خاص طالب علموں کے ساتھ خصوصی رعایتیں برتتے ہیں اور دوسرے طلبا کے ساتھ ان کا سلوک اور برتاو ناواجبی سا ہوتا ہے ہمیں یہ معلوم کر کے بہت ہی دکھ ہوا کہ بعض ممتحن صاحبان چند ٹکوں کی خاطر اس اعتماد اور بھروسے کا خون کیے دیتے ہیں جو محکمۂ تعلیمات ان پر کرتا ہے۔ سنا ہے کہ چند روپیوں کے لالچ میں امتحان کے سوالات بتلا دیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکے بڑیا معاوضے پر اس کا حل اور جواب بھی لکھوا دیتے ہیں —— بڑے ہی شرم کی بات ہے —— ایسے ناپاک افراد کو خد کو تعلیم یافتا کہتے شرم آنی چاہیے!

یہ سچ ہے کہ اگر مدرسوں کی تعلیم میں ایسی نازیبا روا داری برتی جائے اور مدرس اور ممتحن چوٹا کو بیچنے خصلت کے ہوں تو ان کے زیر اثر رہتے ہوے طالب علم کسی صورت بھی صحیح معنی میں تعلیم یافتا با اخلاق اور باکردار نہیں بن سکتے — ان ناخوشگوار حالات کی روشنی میں ہم سارے ہندستان کی تعلیمی منسٹریوں سے پھر سے ایک مرتبہ پُرزور طریقے پر اپیل کریں گے کہ تعلیمی ڈھانچے میں در آئے اس کوڑھ یا منحوس مرض جو سرایت کر گیا ہے اس کے مہلک اور نہایت ہی خطرناک جراثیم کو چن چن کر ہلاک کیا جائے ورنا ڈر ہے کہ کہیں سارے کا سارا ڈھانچا روگیلا نہ بن جائے۔

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی (لکھنوی)

(یہ غزل ۷ اپریل ۱۹۵۵ء کو سالانہ وارثی مشاعرہ (۵۱) منعقدہ لکھنؤ میں پڑھی گئی تھی)

اٹھانا پردہ کن کا بنا تا رازداں ہم کو
ابھی تک یاد ہے وہ سب سے پہلی داستاں ہم کو

ہوا معلوم اس دم عشق کا راز نہاں ہم کو
ملی جب پہلی ہی منزل پہ مرگ ناگہاں ہم کو

کھٹکتی ہے یہ تقسیم شراب ارغواں ہم کو
پلا سب کو تو جام مے، مگر پیر مغاں ہم کو؟

تجھے بھی کچھ خبر ہے او نشیمن پھونکنے والے
کہ دنیا کہہ رہی ہے اب خراب آشیاں ہم کو

نظر افروز عالم ہے تجلی حسن جاناں کی
نہ دھوکا دیں یہ خورشید کی تابانیاں ہم کو

نگہبان در زنداں ذرا یہ بھی تو بتلا دے
پہنائی جائیں گی ہر روز کب تک بیڑیاں ہم کو

تری غیرت کو اے ناز ستم گر کیا ہوا آخر
ستم ہوتے کرے پامال جور آسماں ہم کو

ہمارے دل سے پوچھے کوئی رفعت تیرے احساں کی
زمیں پر ہم کریں سجدہ۔ جو مانے آسماں ہم کو

لپٹ کر رہ گئی بجلی ہماری آہ سوزاں سے
کہاں جاتی بنا کر سوگوار آشیاں ہم کو

انہیں موجوں میں طوفاں ہے انہیں موجوں میں ساحل ہے
صدا دیتا ہے رہ رہ کر یہ بحر بیکراں ہم کو

گرے آخر گرے بیہوش ہو کر پائے ساقی پر
کیا ایسا خمار مے نے بے تاب و تواں ہم کو

نظر آنے لگی جھکتی جبیں ہر سمت منزل کی
کہاں دھوکا دیا تو نے بھی اے عمر رواں ہم کو

وہ اک لمحہ خیال یار جس میں جلوہ فرما ہو
کہیں بہتر ہے تجھ سے اے حیات جاوداں ہم کو

ہماری وسعت دل کی حقیقت پوچھنے والے
نظر آتے ہیں دو ذرے زمین و آسماں ہم کو

تیمم کر کے گرد کارواں سے سجدہ کرتے ہیں
گیا ہے چھوڑ کر جب سے ہمارا کارواں ہم کو

بتا اے وسعت کون و مکاں اس کو کہاں رکھیں
ذرا سی مل گئی ہے ان کی خاک آستاں ہم کو

شہیدان وفا کا خوں شفق کے رنگ میں لے کر
رلائیگا قیامت تک لہو یہ آسماں ہم کو

چمن چھوٹا۔ وطن چھوٹا۔ ہمارا آشیاں چھوٹا
یہ دن بھی دیکھنا تھا اے خدائے دو جہاں ہم کو

ہمیں حسرت، انہیں شکوہ۔ نظر مصروف نظارا
بتا اے بیخودی پہنچا دیا تو نے کہاں ہم کو

سر محفل ہیں ہم دونوں عجب حسرت سے تکتے ہیں
زبان بے نگاہ کو ہم نگاہ بے زباں ہم کو

شب ہجراں کہیں وہ ہیں کہیں ہم ہیں کہیں دل ہے
یہ کیا تو نے دکھایا انقلاب آسماں ہم کو

بدل لے مرنے والے ہم سے مرگ ناگہاں اپنی
مبارک زندگی تجھکو غم عمر رواں ہم کو

سناتے تھے زمانے کو کبھی ہم داستاں اپنی
زمانہ اب سناتا ہے ہماری داستاں ہم کو

نظر محو نظارا اور ہم آئینۂ حیرت
بنایا جا رہا ہے یوں تماشائے جہاں ہم کو

زمانا ہو گیا چھوڑے ہوئے مے کو مگر افقر
صبوحی یاد آ ہی جاتی ہے وقت اذاں ہم کو

ترانۂ دل

دل شاہجہانپوری

تری طلب کے سوا آرزو کوئی نہ رہی
بڑھے کچھ اور تو اپنی بھی آگہی نہ رہی

خموش ادھر ہوئی اک منتظر کی شمع حیات
ادھر سحر کے ستارے میں روشنی نہ رہی

پھر ایک گردش ساغر بیادگار شباب
کچھ اعتبار نہیں زندگی رہی نہ رہی

وہ مسکراتے ہوئے اس ادا سے گذرے ہیں
چمن میں غیر شگفتہ کوئی کلی نہ رہی

نمود صبح قیامت ہو جس کی ہر ساعت
نگاہ یاس میں وہ شام شام ہی نہ رہی

وہیں پہ ختم ہوئی داستان مہر و وفا
جہاں سے مشق ستم میں کوئی کمی نہ رہی

غریق بحر ہی رہنا کمال عرفاں تھا
ابھر کے پھر ہمیں ساحل سے آگہی نہ رہی

وہی ہیں گل وہی غنچے وہی نسیم بہار
مگر ادائے تبسم میں دلکشی نہ رہی

کرشمہ ہائے ستم تھے مرے ہی دل کے لیے
تری نگاہ میں اب کیوں وہ برہمی نہ رہی

لیا ہے خاک کے ذروں سے درس پامالی
نیاز عشق و وفا میں کوئی کمی نہ رہی

رہا شعور نظر بیخودی کے عالم تک
حدود ہوش میں پہنچے تو آگہی نہ رہی

وہ زندگی ہے حقیقت میں زندگی اے دل
جہاں سے عشق کو پروائے زندگی نہ رہی

یہ ذرّے

اختر انصاری اکبرآبادی
ایڈیٹر "مشرب"

ٹھوکریں کھاتے ہیں جب ذرّے تو کھل جاتی ہے آنکھ
بے پر پرواز اڑتے ہیں بلندی کی طرف

اور جب اٹھتے ہیں گہری نیند کے آغوش سے
اور حقارت سے نظر کرتے ہیں پستی کی طرف

مسکراتی ہے نکھرتی ہے فضائے گرد و پیش
زندگی آتی ہے بڑھ کر کامرانی کی طرف

دوش پر لیتی ہے ہر ذرّے کو پھر موج ہوا
اور پھر بڑھتی ہے بزم سرفرازی کی طرف

نکہت گلزار بھی ہوتی ہے ان کے ہم رکاب
زمزمے آتے ہیں اوج شادمانی کی طرف

بڑھ کے پھر خورشید کی کرنیں بھی لیتی ہیں قدم
اور اپنے ساتھ لے جاتی ہیں ہستی کی طرف

رنگ پھر فردوس سے آتے ہیں ملنے کے لیے!
اور لے آتے ہیں سب کو سربلندی کی طرف

عشرتوں کے عارضی جلوے جو آتے تھے نظر
آ گئے آخر سرور جاودانی کی طرف

اٹھ کے پستی سے جب آ۔۔ پائی ذروں نے حیات
سائے میں قوس قزح کے جگمگائی کائنات

غزل

ابومسلم صحافی

مرے دل کے پھر خفتہ ارمان جاگے
وہ بھاگے جنوں کے وہ نگران بھاگے

ہم اہلِ جنوں کو ہے کیا اس کی چاہت
خرد پیچھے پیچھے رہے، ہم آگے آگے

چلو وہ محبت کی بستی بسائیں
کہ جس کے لیے ہیں دو عالم تیاگے

پریمی پہ پریم اتنا اچھا نہیں ہے
بری ہے یہ چنتا بھی جس من کو لاگے

نہ کر تذکرے تو مری عظمتوں کے
ابھی پست انسان ہیں آنکھوں کے آگے

نہیں رکھتے تابِ سخن بھی صحافی
محبت کے ہوتے ہیں کمزور دھاگے

عذر

مشتاق علی بیگ

ویراں فضا، محزوں تارے، اشکوں کا چراغاں دیکھیں گے
اب ہم بھی شب تنہائی میں، تسکین کے ساماں دیکھیں گے

آ اے دل ناداں ہوش میں آ، اب جلوہ جاناں دیکھیں گے
جس در پہ صدقے ہوتے تھے اس درد کا درماں دیکھیں گے

یہ بحر محبت ہے اے دل ہر شے کو نمایاں دیکھیں گے
ڈوبیں گے تو ساحل دیکھیں گے، ابھریں گے تو طوفاں دیکھیں گے

پھر مست گھٹائیں اٹھی ہیں، پھر جھوم کے بادل آیا ہے
مدہوش نظاروں کے قرباں، اب ہوش کے ساماں دیکھیں گے

بیتاب نگاہیں اٹھتی ہیں، رہ رہ کے کوئی یاد آتا ہے
اب تم ہی کہو شب کے تارو، ہم کب مہ تاباں دیکھیں گے

محبوس پرندوں کو کب تک آخر یہ فضا راس آئے گی
گلشن کی بہاریں دیکھ چکے، اب رونق زنداں دیکھیں گے

تم روٹھ چکے، دل ٹوٹ چکا، مشتاق زمانہ چھوٹ چکا
جن نظروں میں دنیا بستی تھی اب ان میں بیاباں دیکھیں گے

نوید مسرت

صفی احمد بہائی

غم کو ساتھی بنا، درد کو بھول جا
شاعرِ خوش نوا نغمۂ غم نہ گا
میں نے مانا مصائب میں تو ہے گھرا
سازِ دل پر مگر ہنس کے ضربیں لگا
جس طرح بھی کٹے تو یوں ہی گنگنا
شامِ غم کی اداسی میں بھی مسکرا

دوست یہ زندگی درد سے ہے بھری
اپنی دنیا میں غم کی نہ کوئی کمی
اپنا ماحول ہے بیوفا ہی سہی
پھر بھی اپنا ہے تجکو یہی مشورا
جامِ زہراب کی تلخیاں گھونٹ جا
شامِ غم کی اداسی میں بھی مسکرا

زندگی ہے الم زندگی ہے ستم
مجکو تسلیم غم زندگی سے بہم
گرچہ قسمت کی ساری لکیریں ہیں خم
پھر بھی شکووں سے لب کو نہ کر آشنا
دامنِ ضبط کو یوں نہ رسوا بنا
شامِ غم کی اداسی میں بھی مسکرا

میں نے مانا کہ یہ زندگی ہے وبال
ہر قدم پر مصائب کے پھیلے ہیں جال
دل کی ہر اک تمنا ہوئی ہے نڈھال
پھر بھی امید کی دل میں شمعیں جلا
آرزوؤں کی دنیا نئی اک بسا
شامِ غم کی اداسی میں بھی مسکرا

میں نے مانا کہ اب بجھ چکی چاندنی
رات تاریک ہے چھائی ہے تیرگی
اپنی منزل کی ہر اک روش کھو چکی
جذبۂ شوق کو اپنا رہبر بنا
بے محابا قدم راہِ حق میں بڑھا
شامِ غم کی اداسی میں بھی مسکرا

آ ہی جاتا ہے زد میں خزاں کی چمن
لٹ ہی جاتی ہے تاروں کی خوش انجمن
اور چھاتا ہے خورشید پر بھی گہن
حال رہتا کسی کا نہیں ایک سا
دوست اس سے مگر ہو نہ بددل ذرا
شامِ غم کی اداسی میں بھی مسکرا

تیری جاری رہی جو یوں ہی جستجو
بارور ہو گی دل کی ہر اک آرزو
شاخِ امید میں آئیں گے رنگ و بو — آج ویراں ہے گلشنِ دل تو کیا
اک نہ اک دن تو ہوگا ہرا اور بھرا
شامِ غم کی اداسی میں بھی مسکرا

غالب (نثر)

(ایک صاحبِ طرز انشا پرداز کی حیثیت سے)

رشید احمد صدیقی

جس طرح ایک آدمی کی چھاپ دنیا جہاں میں کسی دوسرے آدمی کی انگلی کی چھاپ سے نہیں ملتی اس طرح ایک لکھنے والے کے قلم کی چھاپ دنیا ہے جہاں میں کسی دوسرے آدمی کے قلم کی چھاپ سے نہیں ملتی۔ اس چھاپ سے اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ماہر مجرموں کی اور نقاد، مصنفوں کی شناخت کرتے ہیں۔

بات کھلی ہوئی ہے جس دنیا میں ایک جیسے دو آدمی نہ ہوں وہاں ایک طرح کے دو شاعر یا مصنف کیسے ہوں گے۔

اس اصول کی رو سے ہر لکھنے والا صاحبِ طرز کہا جاسکتا ہے لیکن جس طرح "نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند" اسی طرح ہر لکھنے والا صاحبِ طرز نہیں ہوتا۔ غالبؔ صاحبِ طرز اس لیے مانے جاتے ہیں کہ نثر لکھنے کا جو انداز انہوں نے اختیار کیا وہ خط کتابت اور بول چال میں چھوٹے بڑے سب کے نزدیک بہت مقبول ہوا اور عجب نہیں رہتی دنیا تک مقبول رہے۔

میں اس شاعر یا ادیب کو اصلی معنوں میں صاحبِ طرز نہیں مانتا جس کے لکھنے کے انداز کی صرف چند دنوں واہ واہ رہے۔ صاحبِ طرز اس کو کہتے ہیں جس نے لکھنے کا ایسا انداز دریافت کیا ہو جس میں لکھنے والے کے سلیقے اور شخصیت اور زبان و ادب کے حسن و خوبی کا اظہار ہو۔ اور فن کا احترام ملتا ہو۔ صاحبِ طرز شاعری اور ادب کے شعبدے نہیں دکھاتا۔ ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ صاحبِ طرز ہونے کی سب سے معمولی شرط یہ ہے کہ اس کے طرز کی عمر کے اور نہیں تو صاحبِ طرز کی عمر سے زیادہ ہو۔

بات ذرا دور کی ہے لیکن غیر متعلق نہیں ہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ اصلی صاحبِ طرز وہ ہے جو فن اور زندگی ہی کے رشتوں کو جانتا ہو بلکہ اس رشتے کے اخلاقی تقاضوں کو بھی مانتا ہو۔ اخلاقی تقاضوں کو بیچ میں لانے سے بعض اصحاب بیٹھے بٹھائے چڑ جاتے ہیں۔ موجودہ تقلید میں جو چڑچڑاپن ملتا ہے وہ انہیں دوستوں کی دین ہے۔ فطرت کے تقاضوں اور اخلاق میں بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو متوازن رکھنا انسان کی سب سے بڑی فضیلت اور ذمے داری ہے صرف فطرت کے تقاضوں پر انسانی معاشرے کی عمارات نہیں کھڑی کی جاسکتی۔ سماج کے محسن وہی لوگ قرار پائے ہیں جنہوں نے فطرت کے تقاضوں اور اخلاق کے تقاضوں کو ایک دوسرے سے قریب اور قریب تر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اخلاقی قدروں کی اضافی قدر و قیمت کے مسئلے پر میں اپنے بعض نقادوں کے نقطۂ نظر سے واقف ہوں۔ البتہ اس سے اتفاق نہ کرسکا کہ اضافی اصلی کا ناسخ قرار دیدوں۔ حیوان کی ساری خاصیت یا جبلت انسان میں ملتی ہے کہیں چھپی ہوئی کہیں کھلی ہوئی۔ اس خاصیت کو میں شخصی یا اجتماعی بے راہ روی کا بہانا بنانا ناجائز نہیں سمجھتا۔

اخلاقی قدر و قیمت کے اضافی ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ان قدروں کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں۔ اضافی کا مفہوم توازن کا ہے تضاد کا نہیں۔ سرشتے کا ہے رقابت کا نہیں اخلاق اور مذہب کی قدروں کی حیثیت کتنی ہی اضافی کیوں نہ ہو ان کے گرانمایہ ہونے میں کلام نہیں۔

زندگی، فن، تاریخ، اقتصادیات و اخلاقیات علحدہ علحدہ اکائی نہیں۔ باہمد گر سب یکجا ہیں۔ اصلی صاحبِ طرز وہ ہے جس میں ان تمام عوامل کی کار فرمائی اور خود صاحبِ طرز کی کرشمہ کاری ملے۔ اس کار فرمائی اور کرشمہ کاری پر صاحبِ طرز کے مرتبے کا دار و مدار ہے

نثر میں غالب کے صاحب طرز انشاپرداز ہونے کا سراغ صرف ان کے خطوط میں ملتا ہے۔ ہندستانی میں جس انداز کے خطوط غالب نے لکھے ہیں دو ایک اور لوگوں نے ان سے پہلے بھی لکھے ہیں لیکن ان خطوط کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ ان کے پیشروؤں کا لکھنا اتنا ارادی نہ تھا جتنا اتفاقی۔ غالب نے جس طرح شاعری میں ان کے خطوط میں پہچانے جا سکتے ہیں وہ ان کے خطوط میں ان کی شاعری جھلکتی ہے — دونوں ایک دوسرے کو آئینہ دکھاتے ہیں۔

ایک بہت بڑے نقاد نے بتایا ہے کہ طرز خود صاحب طرز ہوتا ہے۔ غالب کے صاحب طرز ہونے کی نشان دہی اس سے بھی ہوتی ہے کہ ان کے رقعات کے مطالعے سے ان کی شاعری اور زندگی کے تمام داخلی اور خارجی پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے رقعات سے ہم ان کا پورا اعمالنامہ مرتب کر سکتے ہیں۔ الفاظ و عبارت کی دھوم دھام اور تام جھام سے آپ مرعوب نہ ہو جائیں تو خط لکھنے والے کی ذات آپ پہچان لیں گے۔

غالب کے ایسے خطوط بھی ہیں جن سے ان کی شخصیت کے بعض بُرے کمزور پہلو ظاہر ہوتے ہیں۔ ان خطوط پر پردہ ڈالنے اور غالبؔ کو معصوم ثابت کرنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ کوئی آدمی دنیا میں ایسا نہیں ہے جس میں کوئی کمزوری نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ ان کمزوریوں سے عام طور پر لوگ واقف نہ ہوں۔ ہم میں ایسے بھولے بھالے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اپنے ہیرو کی خامیوں میں بھی خوبی تلاش کر لیتے ہیں جس میں ان بھولے بھالے لوگوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ اور ان کے ہیروؤں کی کوئی ذمے داری نہیں لی گئی۔

غالب کے خطوط میں فنی چابک دستی ادب کی چاشنی زندگی کی ہماہمی اور ان کی شخصیت کی رنگارنگی ملتی ہے۔ آپ کے مطالعے سے دوسرے مشاہیر کے بھی خطوط گذرے ہوں گے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان میں اکثر ایسے ہیں جنہوں نے خطوط میں اپنی طرح طرح کی کمزوریوں کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ قابلیت جتانا کمزوری چھپانے کا ایک طریقہ ہے خطوط نگاری کے صحیفے میں پروپیگنڈا بہت بڑا جز قرار دیا گیا ہے۔ غالب کے خطوط کے مطالعے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ خلوت میں بیٹھ کر احتیاط اور ارادے کے ساتھ خط نہ لکھتے ہوں بلکہ کسی بالکونی پر جو شارع عام پر کھلتی ہو۔ بیٹھے ہوئے خطوط بھی لکھ رہے ہوں۔ اور نیچے گذرنے والوں سے دعا سلام بھی کرتے جا رہے ہیں۔ جیسے ہر طرح کے آنے جانے والوں سے شناسائی محبت اور بے تکلفی ہو۔ اور ہر ایک کے لیے ان کے دل میں جگہ ہو۔ جیسے ان کو یقین ہو کہ ہر چھوٹا بڑا ان کو دیکھ کر اور پا کر خوش ہوتا ہو۔ اور یہ بھی خود اس احساس سے خوش ہوں۔ آرٹسٹ ہو یا ادیب اعتبار اور آسودگی کا یہ احساس اس کے لیے بہت بڑی نعمت ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی شخصیت میں اس کا طرز ڈھلتا ہے۔

غالب کی نثر کی تحریریں دو طرح کی ہیں ایک مرصع و مقفیٰ جس میں انہوں نے بعض تقریظیں لکھی ہیں یہ بہت کم ہیں۔ دوسری فطری پر خلوص شائستہ اور شگفتہ جس میں انہوں نے خطوط لکھے ہیں پہلی قسم کے اعتبار سے وہ صاحب طرز نہیں ہیں۔ دوسری کے اعتبار سے یقیناً ہیں پہلی میں انہوں نے رسم پروری کی ہے۔ دوسری میں حق ادا کیا ہے فن کا زندگی کا۔ اپنا ہم سب کا۔

غالب کے رقعات ۳-۴ سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں یہ ہر طرح کے ہیں۔ اور ہر طرح کے لوگوں کے نام ہیں سب کی سیر کرانا آسان نہیں۔ اور کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں اس وقت صرف میر مہدی مجروحؔ کے نام کے خطوط کے جستہ جستہ نمونے جہاں تہاں سے پیش کرتا ہوں۔ رسمی آداب و القاب کہیں نہیں ہیں۔ یہی تو بے تکلفانہ اور مخلصانہ جو اتنے القاب نہیں ہیں جتنے انداز تخاطب۔

۱ ۔ بھائی دیا کہاں ہے جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ ایک ۶۶ سال کا مرد اور ۶۴ برس کی عورت۔ ان دونوں

میں سے ایک بھی ہوتا تو ہم جانتے کہ ہاں وبا آئی تھی "تف برایں وبا"

۔"میری جان یہاں بھی وہی نقشا ہے۔ کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے پانی کا جھجھر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا باتیں کرلیں"

۔جو لیے حال دہلی والو سلام لو۔ جامع مسجد واگذاشت ہوگئی۔ چتلی قبر کی طرف سیڑھیوں پر کبابیوں نے دوکانیں بنالیں۔ انڈا مرغی کبوتر بکنے لگا۔ ۲ر نومبر جمعہ کے دن بہادر شاہ قید فرنگ اور قید جسم سے رہا ہوئے۔ انا اللہ ہمارے پاس شراب آج کی اور ہے۔ کل سے رات کو توی انگیٹھی پر گذارا ہے۔ لوٹی گلاس موقوف، دھوپ میں بیٹھا ہوں۔ یوسف علی خاں اور لالہ ہیرا سنگھ بیٹھے ہیں۔ کھانا تیار رہے ایک دالان میں دھوپ آتی ہے۔ اس میں بیٹھوں گا ہاتھ منہ دھوؤں گا۔ ایک روٹی کا چھلکا سالن میں بھگو کر کھاؤں گا۔ بیسن سے ہات دھوؤں گا۔ باہر آؤں گا۔ پھر اس کے بعد خدا جانے کون آئے گا۔ کیا صحبت ہوگی"

۔ . . . . مولانا غالب علیہ رحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہوں۔ ۵۰۔۔۶۰ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستان خیال کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادہ ناب کی توشہ خانہ میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے ہیں۔

۔اس خط کا انداز ملاحظہ فرمایئے گا۔ مراسلہ میر مہدی کے نام ہے۔ مکالمہ میرن صاحب سے ہے "اے جناب میرن صاحب۔ السلام علیکم۔ حضرت! حضرت آداب لکھو صاحب اجازت ہے۔ میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کو حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہوگئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے۔ صرف پیچش باقی رہ گئی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں۔ آپ پھر کیوں تکلیف کریں نہیں میرن صاحب!

اس کے خط کو آئے بہت دن ہوئے وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیا ہوں گے۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ مجھے تم خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو سبحان اللہ اے لو حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے۔

مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں مہدی کو خط لکھوں کیا عرض کروں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمہارا خط جاوے۔ اجی میں پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ شوق سے خط لکھیے گا۔ میاں بیٹھو ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی تمہاری باتوں میں آگیا۔ اور آج تک سے خط نہیں لکھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ سنو میری مہدی صاحب۔ میرا کچھ گناہ نہیں۔ میرے خط کا جواب لکھو۔ تپ تو رفع ہوگئی۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ بڑی بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے ہی کو نہیں ملتا۔ . . . "

۶ . . . ہاں صاحب کیا چاہتے ہو۔ تم میرے ہم عمر نہیں کہ سلام لکھوں۔ فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافہ کو کریدا کر ومسودہ کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا یعنی تم کو وہ محمد شاہی رسمیں پسند ہیں یہاں خیریت ہے وہاں کی خیریت مطلوب ہے کبھوں بیرنج کیسو۔ ۔ انگلوں کے خطوط کی تحریر یہی طرز تھی۔ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے جب تک یہ نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ پیلے آپکے

ایسے یاراں ہے۔ نخل بے میوہ ہے خانہ بے چوڑہی نہیں ہے چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ زندہ ہیں۔ امر ضروری لکھ لیا۔ زوایدکو اور وقت پر موقوف رکھا۔"

۷ ـ "میر مہدی جیتے رہو۔ آفریں صد ہزار آفریں۔ اردو عبارت لکھنے کا کیا ڈھنگ پیدا کیا ہے کہ مجھکو رشک آنے لگا۔ سنو دلی کی تمام مال متاع ـــــ کی لوٹ پنجاب احاطہ میں کی گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی تو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا مگر میں نے اسکو بحل کیا اللہ برکت دے۔"

۸ ـ "سید صاحب اچھا۔ ڈھکوسلا نکالا ہے۔ بعد القاب کے شکوہ شروع کر دینا۔ برسات کا نام آگیا سو پہلے تو مجملاً سنو ایک غدر کالوں کا ایک ہنگامہ گوروں کا ایک فتنہ انہدام مکانات کا ایک آفت وبا کی ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔ آج اکیسواں دن ہے آفتاب اس طرح نظر آجاتا ہے جس طرح بجلی چمک جاتی ہے۔ رات کو کبھی کبھی اگر تارے دکھائی دیتے ہیں تو لوگ ان کو جگنو سمجھ لیتے ہیں۔ اندھیری راتوں میں چوروں کی بن آئی ہے۔ کوئی دن نہیں کہ دو چار گھر کی چوری کا حال نہ سنا جائے ـــ مبالغہ نہ سمجھنا ہزارہا مکان گر گئے۔ گلی گلی ندی بہہ رہی ہے قصہ مختصر وہ ان کال تھا کہ مینہ نہ برسا۔ اناج نہ پیدا ہوا۔ یہ پن کال ہے پانی ایسا برسا کہ بوے ہوے دانے بہہ گئے۔"

۹ ـ "۔ ۔ ۔ میر مہدی ـ صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے۔ انگیٹھی سامنے رکھی ہے ـ دو حروف لکھتا ہوں۔ ہاتھ تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی نہیں مگر ہائے آتش سیال کہاں۔ کہ جب دو جرعے پی لیے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تو اجد بہم پہنچا۔ ساقی کوثر کا بندہ اور تشنہ لب۔ ہائے غضب۔ ہائے غضب۔"

۱۰ ـ "بھائی کیا پوچھتے ہو۔ کیا لکھوں۔ دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے۔ قلعہ۔ چاندنی چوک ہر روز مجمع جامع مسجد کا۔ ہر ہفتے سیر جمنا پل کی۔ ہر سال میلہ پھول والوں کا یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں۔ ہاں کبھی قلمرو ہند میں اس کا نام تھا۔ دربار عام والے تین آدمی اہل اسلام میں باقی رہ گئے۔ میرٹھ میں مصطفےٰ خان۔ سلطان جی میں مولوی صدرالدین خاں۔ بلی ماروں میں سگ دنیا موسوم اسد تینوں مردود و مطرود و محروم و مغموم"۔

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

۱۱ ـ "اے میر مہدی تجھے شرم نہیں آتی۔ میاں اہل دلی کی زبان ہے تو کس کی زبان کی تعریف کرتا ہے۔ اللہ اللہ دلی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔ واہ رے حسن اعتقاد۔ ارے بندۂ خدا اردو بازار نہ رہا۔ اردو کہاں دلی کہاں۔ واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے چھاونی ہے نہ قلعہ نہ شہر نہ بازار نہ نہر۔ ۔ ۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے تک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے جو ڈھیر پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو ہو کا میدان ہو جائے کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ یا نا تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ دھوبی واڑہ رام جی گنج سعادت خاں کا کٹرہ جرنیل کی بیوی کی حویلی رام جی داس گودام والے کے مکانات صاحب رام کا باغ حویلی ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا۔"

خطوط غالب سے یہ نمونے صرف ایک شخص کے نام کے خطوط سے پیش کیے گئے ہیں اور خط لکھنے کا یہ اولین انداز ہے جس پر ارتقا کا کوئی عمل نہ ہوا تھا لیکن آج بھی جب زبان اتنی منجھ سنور گئی ہے اور خطوط لکھنے میں اچھے سے اچھے ذہن

اور ذوق کی کارفرمائی ملتی ہے اور زندگی و زمانا اتنے گونا گوں انقلابات سے گذر چکے ہیں۔ ان خطوط کا جواب نہیں ملتا۔ دلی کے شعر و ادب اور تاریخ و تہذیب کے طالب علموں کے لیے غالب کے یہ خطوط اپنے اندر بڑی بصیرت رکھتے ہیں بہ قول اصغر مرحوم۔

انداز ہیں جذب اس میں سب شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

اس طرح غالب صرف ایک صاحب طرز نہیں بلکہ اس سے سوا اور بھی بہت کچھ ہیں۔

غزل

عظیم آبادی (لکھنوی)

کوئی ناشاد کوئی شادماں ہوتا ہی رہتا ہے
یہ روزانہ تماشائے جہاں ہوتا ہی رہتا ہے
کسی نے جینے جی تو بات بھی پوچھی نہ دنیا میں
گئے دنیا سے جو ان کا بیاں ہوتا ہی رہتا ہے
غم فرقت ہی پر کب منحصر ہے دل کی بیتابی
دل عشاق میں درد نہاں ہوتا ہی رہتا ہے
اجاڑا باغباں نے اور کبھی صیاد نے تاکا
یوں ہی ویراں ہمارا آشیاں ہوتا ہی رہتا ہے
وہ کہنے کہتے رک جاتے ہیں میرے عرض مطلب پر
یہی تکرار تو زیب داستاں ہوتا ہی رہتا ہے
کوئی سہرا نہ دہاتا ہو تب جب گھر سے نکلتا ہے
ترے عاشق کے مرنے کا گماں ہوتا ہی رہتا ہے
عظیم اب تو بہاروں میں بھی رونا ہے نشیمن کا
خزاں میں تو ملال آشیاں ہوتا ہی رہتا ہے

پپیہا

جب رات کے پچھلے پہروں میں خاموش فضائیں ہوتی ہیں
جب ساری دنیا سوتی ہے، مست پاش ہوائیں ہوتی ہیں
جب چاند ستاروں سے چھنکر اک نور کا سایہ پڑتا ہے
جیسے کہ نویلی دلہن کے گھونگھٹ کی ادائیں ہوتی ہیں
جب رنگ بدلتی ہے دنیا، ظلمت کی جوانی ڈھلتی ہے
جیسے کسی عابد زاہد سے، ناکردہ خطائیں ہوتی ہیں
جب پھول نہا کر شبنم سے، نکہت کی گلابی پیتے ہیں
اس وقت پپیہوں کی سالک باغوں میں صدائیں ہوتی ہیں
کہتے ہیں یہ طائر انساں سے کس غفلت میں تو سوتا ہے
اٹھ صبح ہوئی اور رات گئی کیوں عمر کو اپنی کھوتا ہے
جو درد سے خالی ہوتا ہے، ویران ہے وہ آباد نہیں
حیوان ہے وہ انسان نہیں جس دل میں خدا کی یاد نہیں

سالک کرسنی

یونیورسٹیوں میں طریقہ تعلیم کی پھر سے تشکیل

پروفیسر ڈی۔ پی مکرجی

تعلیمی مسایل حقیقت میں انسان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں تعلیم اور شخصیت کی تکمیل میں زیادہ فرق نہیں اور جب تک شخصیت کی اہمیت اچھی طرح ذہن نشیں نہ ہو جائے اس وقت تک تعلیم ادھوری ہی رہے گی۔ بہر حال ہمیں اپنے تعلیمی نظام کو جاہلوں کی زد سے بچانا مقصود ہے۔

تعلیم میں دو قسم کے اشخاص سے واسطہ پڑتا ہے یعنی طلبا اور اساتذہ۔ طلبا میں بعض خصوصیات مشترکا ہوتی ہیں۔ انہیں ابھی تک دنیا کا تجربا نہیں ہوتا۔ اور یہ زمانا ان کے لیے بہت دشوار اور مشکل سا ہوتا ہے ان کی سب سے بڑی ضرورت شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ طلبا کے لیے یونیورسٹیاں وسطی درس گاہوں کا کام دیتی ہیں۔ اور یونیورسٹیوں نے ابھی تک محض درس گاہوں کی حیثیت سے ہی خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک ان کی اس وسطی حیثیت کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں سماجی راہ نمائی کے احساس کی کمی ہے جس سے ہندستان کے نوجوان کی زندگی وابستہ ہے۔ ایسی حالت میں طلبا کا مسئلہ حیرت کا باعث نہیں ہے۔

طلبا کے مقابل اساتذہ ہیں جن کے اصول زندگی اور آدرش ایک خاص درجے پر پہنچ کر پختہ ہو جاتے ہیں تاہم طلبا اور اساتذہ کے طور طریق اور جوش و ولولے کی قوت کا فرق واضح ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ علم بھی حاصل کرتے ہیں۔ اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ علم اور تخیل کی حدود کو وسیع کریں۔ آج کل بعض مضامین کے پوسٹ گریجویٹوں کی تعداد گذشتہ ۲ سال کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ ہے۔ لیکن اس تناسب کے مطابق عملے کی تعداد میں کوئی اضافا نہیں ہوا۔ جس سے یہی نتیجا نکالا جا سکتا ہے کہ جواں عمر طلبا کے ساتھ ذہنی ربط ناممکن سا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ جگہ کی بھی قلت ہے۔ جو کمرے چالیس طلبا کے لیے مخصوص ہیں اس میں ایک سو طلبا کو ٹھونس دیا جاتا ہے۔ کلب اور ایسوسی ایشن تعلیمی درس گاہوں کی جگہ نہیں لے سکتے۔ اساتذہ لگاتار تین گھنٹے کام کر کے تھک جاتے ہیں اور ایسا محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتے اور طلبا کورے کے کورے رہ گئے ہیں۔

یونیورسٹیوں کی حالت واقعی تسلی بخش ہے۔ عوام یونیورسٹیوں میں کام کرنے والے اساتذہ کی حالت سے ناواقف ہیں۔ وہ طلبا کی زندگیوں کو صحیح ڈھانچے میں ڈھالنے میں کام رہتے ہیں۔ اس کمی کو صرف تعلیم کی توسیع سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہندستان میں حالات کچھ ناموزوں ہیں مگر ایسی سرگرمیاں جاری کی جا سکتی ہیں جن سے طلبا میں زندگی کی پھونکی جا سکے۔ طلبا نزدیکی دیہات میں جا کر کام کر سکتے ہیں اور قدرت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس طرح طلبا اور دیہاتوں میں بیگانگی دور ہو جائے گی۔

یونیورسٹیوں کو مالی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے اور متعلقہ ریاستوں کو چاہیے کہ وہ انہیں ضروری مالی امداد دینے سے گریز نہ کریں۔ گو امدادی رقوم دینے کے لیے کمیٹیاں مقرر ہیں لیکن ان سے جیسے کہ چاہیے نتیجے نہیں نکلے۔ اس لیے گرانٹ کمیٹیوں کی اصلاح ضروری ہے۔

پانچسالہ پلان میں اس اہم فرض کی طرف توجہ تو دی گئی ہے لیکن وہ واضح اور ٹھوس نہیں۔ اصل میں یونیورسٹیاں اقتصادی۔ سیاسی اور ذہنی آزادی سے محروم ہیں اس کا علاج

(دوسری قسط)

عبداللہ ابن المقفع

تمکین کاظمی

ابن المقفع کا مقام انشا و بلاغت میں

ابن المقفع چونکہ زبان پہلوی کے ادیب اور انشا پرداز تھے اور یہ جانتے تھے کہ پہلوی زبان ختم ہو رہی ہے اور اب عربی کا دور دورہ ہے اس لیے زبان عربی میں اس ذخیرے کو منتقل کرنا چاہیے جو پہلوی زبان کے لیے مایہ ناز رہا ہے اور جس کے وسیلے سے ایرانی روایات برقرار رہ سکتی ہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے ادب و انشا عربی پر عبور حاصل کیا۔ اور بجائے عربی زبان میں کوئی مستقل تصنیف پیش کرنے کے تراجم اور تالیف کا کام شروع کیا۔

ابن المقفع کو پہلوی اور عربی زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ اور وہ کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ پہلوی ان کی مادری زبان تھی اور عربی کو انہوں نے اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ اور اتنی ہی مہارت پیدا کر لی تھی جتنی مادری زبان میں تھی۔ اور لغت اور ادب پر اس قدر عبور حاصل کر لیا تھا کہ ان کے تراجم جن میں سب سے زیادہ کلیلہ دمنہ مشہور ہوئی۔ عربی ادب میں شاہکار تصور کیے جاتے ہیں۔ عرب کے بڑے بڑے انشا پردازوں نے ان کی طرز انشا کا تتبع کیا اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ مگر وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ (۱) سچ ہے:

دین اللہ کی ہے، رنگ ہے اپنا اپنا

ابن المقفع سے پہلے کسی شخص نے کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی تھی۔ یعنی کسی کا کوئی کارنامہ ایسا نہ تھا جو شروع سے آخر تک ایک ہی شخص کی انشا پردازی کا نتیجہ اور ایک ہی نہج کی انشا پردازی کا نمونہ ہو۔ اکثر بزرگوں نے ادب، فتوحات، مغازی، سیر اور احادیث اور تراجم احوال میں ان سے پہلے کتابیں لکھیں۔ مگر ان تمام کتابوں میں مولف کو زیادہ تر اقتباسات اور روایات وغیرہ جمع کرنی پڑتی تھیں جس سے جو کچھ ملا نقل کر لیا۔ اور جس راوی نے جو کچھ بیان کیا لکھ لیا۔ خود مولف کو بہت کم اپنی انشا پردازی اور قلم کاری کے جوہر دکھانے پڑتے تھے۔ مگر ابن المقفع کو ایسی سہولت نہ تھی۔ ان کی کتابوں کے خیالات تو دوسری زبان کے تھے۔ مگر جس زبان میں وہ پیش کرتے تھے وہ الف سے یا تک ان کی اپنی زبان ہوتی تھی جس میں کوئی اقتباس تھا نہ روایت۔ ابن المقفع کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ انشا مرسل یعنی غیر مسجع عبارت لکھتے تھے، جو دوسری صدی ہجری تک بہت کم لکھی گئی تھی۔ یہ مخصوص طرز انشا ابن المقفع کی تھی جس کی پیروی اور تقلید بعد کے مصنفین اور مولفین نے کی ہے۔

ابن المقفع کی کلیلہ دمنہ پہلی کتاب ہے جو اس خصوصیت کی وجہ سے ممتاز ہے اور دوسروں نے اس کی پیروی اور تقلید کی ہے آج تک کلیلہ دمنہ نصاب درس میں داخل ہے اور اس میں وہی لوچ اور دلکشی ہے جو آج کل کے ادب عالیہ میں پایا جاتا ہے۔ کہنگی اور فرسودگی نام کو بھی نہیں، جس طرح فارسی طالب علم گلستان اور اسے اپنے ہی زمانے کی چیز سمجھتا ہے۔

ابن المقفع کا طرز بیان اور اسلوب تحریر اس لیے بہترین اور قابل تقلید ہے کہ ان کی زبان میں بلاغت و روانی کے علاوہ اعرابیوں اور خصوصاً اہل علم اور فاضل عربوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے رہنے سہنے سے ایک خاص لوچ اور شگفتگی پیدا ہو گئی تھی۔ جو اہل عجم میں ابن المقفع کا ہی حصا تھی۔ ورنہ غیر عرب مصنفین میں ایسے بہت ہی کم ملیں گے۔

(۱) طبقات الاطباء ص ۳۰۱، ج ۱

ابن المقفع نے ابوالجاموش ثور بن یزید جیسے علما اور ادب پردازوں میں عمر بسر کی تھی جس کی وجہ سے ان کو عربی زبان پر حاوی ہونے کا موقع ملا۔

قدیم ایرانیوں کی بلاغت عرب میں مشہور تھی چنانچہ کہا جاتا تھا کہ "اگر فن بلاغت میں مہارت حاصل کرنے اور کلام غریب کو پہچاننے کا کوئی خواہش مند ہو تو اسے چاہیے کہ لغت میں تبحر حاصل کرے اور "کاروند" پڑھے۔ اگر کوئی معقولات اور ادب اور مراتب علم و حکم امثال و معانی سے واقف ہونا چاہے تو کتاب "سیرت الملوک" پڑھے (۱)

کاروند ان کتابوں میں سے ہے جو پہلوی سے عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ مگر یہ اچھی طرح معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس موضوع پر تھی اور اس کا مترجم کون تھا۔ سیرت الملوک کے متعلق یہی احتمالات ہیں۔ جاحظ کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب وہی خدائی نامہ پہلوی ہے جو ایران کے حالات اور تاریخ میں تھی اور ابن المقفع نے عربی میں اس کا ترجمہ کیا تھا یا وہ کوئی ایسی ہی کتاب ہونی چاہیے جو فارسی سے عربی میں ترجمہ کی گئی ہو۔

جاحظ کی کتاب سے خود بھی بڑے بلیغ اور انشا پرداز تھے ظاہر ہوتا ہے کہ طالبین بلاغت اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے ایرانیوں کے آثار بلاغت کا مطالعہ کرنے پر مجبور تھے۔ اور یہ مانتے تھے کہ وہی شخص کسی زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں عمدگی سے کر سکتا ہے جو اس زبان پر حاوی ہو۔ اور کامل عبور رکھتا ہو۔ چنانچہ ابو ہلال عسکری اپنی کتاب "الصناعتین" (۲) میں لکھتے ہیں "جو شخص کسی زبان پر کامل عبور رکھتا ہو اگر اس زبان کے سرمایے کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا چاہے تو لازمی ہے کہ اس بیان پر بھی جس میں وہ ترجمہ کر رہا ہے اسے مساوی قدرت حاصل ہو چنانچہ

(۱) کتاب البیان والتبیین صفحہ ۵ جلد ۳
(۲) کتاب البیان والتبیین صفحہ ۵۱

عبدالحمید کاتب کے نمونہ امثال و کنایت آیندہ نسلوں کے لیے یادگار ہیں جو زبان فارسی سے عربی میں منتقل کیے گئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ابن المقفع کا شمار درجہ اول کے ادیبوں اور بلیغوں میں ہوتا تھا اور بزرگان ادب عربی ان کو ان دس ادیبوں میں کرتے تھے جو چوٹی کے بلیغ مانے جاتے تھے۔ (۱) ابن الفقیہ لکھتے ہیں۔

"اہل ایران ایام گذشتہ زمانے میں وسعت مملکت کثرت اموال اور شان و شوکت کے لحاظ سے دوسری قوموں پر برتری رکھتے تھے جنہیں عربوں نے احرار کا لقب دیا تھا کیونکہ وہ دوسروں کی اسیری اور استخدام میں پیش پیش رہتے تھے اور دوسرے ان کی اسیری اور استخدام پر قادر نہ تھے جب پروردگار عالم نے اسلام بھیجا اور عجمیوں کی شوکت مٹی اور ان کے کاموں میں پراگندگی پیدا ہو گئی تو ان لوگوں میں عہد اسلام میں کوئی ایسا شخص نہیں رہا جو بزرگ کہلا سکے۔ سوا ابن المقفع اور فضل بن سہل (۲) کے (۳)"

جعفر بن محمد بن حذار وزیر دولت طولونیہ مصر (متوفی ۲۶۷ھ) نے اپنے ایک معارف پرور ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے یہ شعر کہا ہے۔

یا کسرویاً فی القدیم و ہاشمیاً فی الولاء
یا ابن المقفع فی البیان و یا ایاساً فی الذکاء

یحیی بن خالد برمکی وزیر شاہان عباسیہ جو خود بھی بڑا ادیب تھا کہتا ہے:

"یہ چار آدمی ایسے ہیں جو اپنے فن میں جواب نہیں رکھتے ۱۔ خلیل بن احمد، ۲۔ ابن المقفع، ۳۔ ابو حنیفہ، ۴۔ الفرازی (۴)"

(۱) الفہرست صفحہ ۱۲۶،
(۲) فضل بن سہل ذوالریاستین وزیر خلیفہ مامون الرشید۔
(۳) معجم البلدان، صفحہ ۳۱۷
(۴) معجم الادبا، صفحہ ۲۴۴، جلد ۶۔

جلال الدین سیوطی ابوطیب عبدالواحد لغوی سے روایت کرتے ہیں کہ محمد بن سلام الجمعی کا بیان ہے کہ "میں نے اپنے شیوخ سے سنا وہ کہتے تھے کہ عرب میں صحابہ کے بعد خلیل بن احمد اور عجم میں ابن المقفع سے جامع تر کوئی شخص پیدا نہیں ہوا" (۵)

جعفر بن یحیٰی برمکی وزیر ہارون رشید جو بہت نکتہ سنج اور نقاد تھا کہتا ہے:—

"عبدالحمید سنج ہے اور سہل بن ہارون ٹہنی، ابن المقفع میوہ اور احمد بن یوسف پھول" (۱)

ابن المقفع کے تراجم

ابن المقفع نے بہت سی پہلوی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا ہے۔ اور بعض یونانی کتابوں کا ترجمہ بھی عربی میں کیا ہے مگر ان کی یونانی زبان کے جاننے کا کوئی ثبوت ہم کو نہ مل سکا۔ ہم صرف اس قدر جانتے ہیں کہ ابن المقفع فارسی اور عربی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ یوں تو انہوں نے بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ مگر چند ہی کتابوں کے نام ہمیں ملتے ہیں۔ صاحب الفہرست محمد بن اسحاق بغدادی معروف بہ ابن الندیم وراق نے ۳۷۷ھ میں اپنی اہم ترین کتاب مرتب کرتے ہوئے ابن المقفع کی حسب ذیل کتابیں گنائی ہیں۔

۱۔ خدائی نامہ ۲۔ آئین نامہ، ۳۔ کلیلہ دمنہ، ۴۔ کتاب مزدک، ۵۔ کتاب تاج در سیرت انوشیروان ۶۔ الآداب الکبیر، ۷ کتاب الادب الصغیر ۸ کتاب الیتیمہ در رسائل (۲)

ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء فی طبقات الاطباء (۳) میں کلیلہ دمنہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ابن المقفع نے ارسطا طالیس اور فاطی غوریس کی کتابوں "مقالات عشرہ" وغیرہ اور باریمیناس کی عبارت اور ساناطولیقا کی تحلیل" کا ترجمہ بھی کیا ہے اور کتاب المدخل الی الکتب المنطق معروف بایساغوجی" تالیف فرفوریوس کا ترجمہ بھی کیا ہے"۔

طبقات الامم (۴) میں قاضی صاعد اندلسی اور الفہرست (۵) میں ابن الندیم نے لکھا ہے کہ "قاطی غوریاس اور باری ارمی نیاس کی کتابوں کی ابن المقفع نے تلخیص کی ہے"

ہمارے پاس ابن المقفع کی یونانی زبان سے واقفیت کا کوئی ثبوت نہیں ہے اس لیے ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو بھی پہلوی (فارسی) ہی سے عربی میں منتقل کیا ہوگا۔ اور ہمارے اس خیال کی تصدیق ابن الندیم کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے "ابن المقفع نے منطق اور طب کی بہت سی کتابوں کا فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا ہے جو دوسری زبانوں سے فارسی میں منتقل ہوئی تھیں" (۱)

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں ابن المقفع پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے منطق کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا مگر اس کی تائید صاحب طبقات الامم (۲) نہیں کرتے بلکہ ان کا بیان ہے کہ:—

"یونانی کتابوں میں قاطی غوریاس کی کتاب کا ترجمہ ابن المقفع سے پہلے عربی میں ہو چکا تھا"۔ اگر طبقات الامم کا بیان غلط سمجھا جائے تو اس سے صاحب الفہرست کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ:—

"ابن المقفع نے ان کتابوں کی تلخیص کی ہے ترجمہ نہیں کیا ہے"

ایرانیوں نے انوشیروان کے عہد میں علم و حکمت فلسفہ و منطق وغیرہ کی بہترین کتابیں یونانی اور سریانی سے ترجمہ کیں۔

(۵) کتاب المزہر صفحہ ۲۴۹، جلد (۲)
(۱) ابن المقفع صفحہ ۱۹۴
(۲) الفہرست صفحہ ۱۱۸
(۳) ص ۳۰۸، ج ۱

(۴) ص ۴۹،
(۵) ص ۲۴۸-۲۴۹
(۱) الفہرست ص ۲۴۲،
(۲) ص ۴۹

چنانچہ افلاطون اور ارسطو کی کتابیں فارسی میں منتقل ہو چکی تھیں۔ اور انوشیروان ان دونوں فلسفیوں سے واقف تھا اور حکمائے یونان سے مناظرہ و مباحثہ کیا کرتا تھا۔ چونکہ ابن المقفع کو حکمت اور فلسفہ سے شغف تھا اس لیے قرین قیاس ہے کہ انھوں نے منطق وغیرہ کی کتابوں کا فارسی سے ترجمہ کیا ہو اور پہلی مرتبہ مسلمانوں کو حکمت و منطق سے روشناس کیا ہو۔ یہ ابن المقفع کا احسان ادب عربی پر ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا۔

ترجمہ نامہ تنسر خدائی نامہ اور کلیلہ دمنہ جیسی جلیل القدر کتابوں کے علاوہ ایک اور عظیم الشان کتاب نامہ تنسر کا ترجمہ بھی ابن المقفع نے پہلوی سے عربی میں کیا ہے اور اس عربی ترجمہ کو بہاء الدین محمد بن حسن بن اسفندیار کاتب مولف تاریخ طبرستان نے سنہ ۶۰۶ھ اور سنہ ۶۱۳ھ کے درمیان فارسی میں منتقل کیا ہے اب نہ تو پہلوی کتاب ہی کہیں ملتی ہے اور نہ ابن المقفع کا عربی ترجمہ ملتا ہے۔ البتہ فارسی ترجمہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے باقی رہ گیا ہے۔ تنسر (۱) جیسا کہ حاشیہ سے معلوم ہوگا موبد اردشیر بابکان (۲۲۶-۲۴۱م) موسس سلسلہ ساسانی تھا جس نے اردشیر کا پروپگنڈا کرنے کے علاوہ کتاب اوستا اور قدیم مذہبی اوراق ایرانیان کو بڑی محنت سے جمع کیا اور ہیربدان ہیربد (بزرگ آتش کدہ و رئیس روحانیین) کا رتبہ حاصل کیا۔

ابن المقفع نے نامہ تنسر کو عربی میں منتقل کرنے کے بعد جو مقدمہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردشیر نے طوائف الملوک کا اور جس نف شاہ بادشاہ طبرستان اور فرشواذ گر (یہ سلسلہ البرز کے قدیم بادشاہوں کا نام ہے) کو مطیع کرنے کی کوشش کی جس نف شاہ چونکہ اردشیر کے مقابلے کی تاب نہ لا سکتا تھا اس لیے اپنے آپ کو مجبور پاکر ایک خط اردشیر کے موبد تنسر کو لکھا جس میں اردشیر کے اعمال اور اقدام پر نکتہ چینی کی تھی۔ یہ نامہ تنسر اسی جس نف شاہ کے خط کا جواب ہے۔ موبد نے اس رسالے میں ان تمام اعتراضات کا جواب دینے اور انھیں مبنی بر عقل و انصاف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو جس نف شاہ نے اردشیر پر کیے تھے۔

نامہ تنسر جو اس وقت ہمارے سامنے ہے وہ علاوہ متن کے ایک مقدمہ اور ایک حکایت، بادشاہ (۲) بوزینگان پر مشتمل ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ابن المقفع کا اضافہ ہے جس میں آیات و اشعار کا اضافہ مترجم فارسی نے کیا ہے۔ اس حکایت کے دیکھنے کے بعد یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ابن المقفع کے سامنے نامہ تنسر کا اصلی نسخہ نہیں رہا ہے بلکہ انھوں نے پہلوی نسخے سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ جس میں یہ حکایت موجود تھی۔ اصل نامہ تنسر عہد انوشیروان (۵۳۱-۵۷۹م) میں مرتب ہوا ہے مگر پروفیسر کرسٹن اس کو سنہ (۵۵۷ و ۵۷۰م)

(۱) تنسر یا توسر ہیربد ہیربدان (ہیربد یعنی بزرگ آتش کدہ) اردشیر بابکان تھا جس نے کتاب دینکرت کے منتشر اوراق سے آئین زردشتی جمع کیا اور اس طرح اوستا کے پراگندہ اوراق کی ترتیب دی۔ مسعودی، ابو علی مسکویہ، ابو ریحان بیرونی، رشید الدین فضل اللہ نے اس کے حالات لکھے ہیں۔ مسعودی کا بیان ہے کہ علاوہ اس کی اور تالیفات بھی ہیں۔ اور وہ بڑا زاہد اور حکما مذہب افلاطونی میں سے تھا۔ (التنبیہ والاشراف ص ۹۹ و ۱۰۰) وتحقیق ما للہند ابو ریحان ص ۵۳، تجارب الامم ابن مسکویہ ص ۹۸، ج ۱ جامع التواریخ رشیدی، مضمون جمال زادہ مطبوعہ روزنامہ کاوہ دور جدید سال اول ص ۴-۶)

A.R CHRISTENES L'DES SASSAN PP. 110-111
DARMESTETER LA LATTRE DE TANSAR PP. 14.

(۲) حکایت بادشاہ و بوزینگان دراصل پنچ تنتر کا خلاصہ ہے جسے سندباد نامہ کے نام سے ظہیری کاتب سمرقندی نے فارسی میں مرتب کیا ہے۔ چونکہ یہ قصہ قدیم سریانی کلیلہ دمنہ اور ابن المقفع کے عربی ترجمے میں نہیں ہے اس لیے بعد کو پاکر ابن المقفع نے نامہ تنسر کے ساتھ شریک کر لیا ہے یہ قصہ جو نامہ تنسر فارسی کے صفحہ ۴۶ سے صفحہ ۵۳ تک چھپا ہے۔ حقیقتاً پنچ تنتر ہی کا قصہ ہے۔

کی مرتبہ خیال کرتے ہیں۔ (۱)

نامہ تنسر قدیم ایران کی تاریخ کی اہم اسنادی کتاب ہے جس سے عہد ساسانی کی مذہبی اور معاشی حالت پر روشنی پڑتی ہے اور اس زمانے کی ملکی اور عصری تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے۔ گو ابن المقفع کا ترجمہ اصل نامہ تنسر نہیں ہے مگر یہ ضرور ہے کہ وہ بلکل ابن المقفع ہی کی تخلیق بھی نہیں ہے۔ اس میں اصلیت کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ابن المقفع نے ایسی کتاب کا ترجمہ کیوں کیا۔ جو مسلمانوں کے کسی کام کی نہیں شاید آثار قدیمہ کے تحفظ کے شوق نے اس کتاب کے ترجمہ کی تحریک کی ہے۔ جیسا کہ انہوں نے خدای نامہ اور کلیلہ دمنہ کا ترجمہ کیا ہے۔ (۲)

نامہ تنسر کے فارسی ترجمے کو جو تاریخ طبرستان میں نقل ہوا ہے مشہور فرانسیسی ادیب اور مستشرق ڈارمیسٹٹر نے مجلہ ایشیائی فرانسیسی بابتہ ۱۸۹۴ء میں پہلے شایع کیا اور پھر ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ فرانسیسی میں ترجمہ کرکے مع متن علحدہ بھی شایع کیا ہے مگر افسوس ہے کہ تاریخ طبرستان کے غلط سلط نسخے کو پیش نظر رکھنے کی وجہ سے متن فارسی بھی بے انتہا غلط سلط ہے۔

قلمی رسالہ عباس اقبال کو ان کے کسی ایرانی دوست سے ایک قلمی مجموعہ ملا ہے جس میں کلیلہ دمنہ اور مرزبان نامہ وغیرہ ایک ہی جلد میں ہیں اس مجموعے کے حاشیہ پر ایک رسالہ ابن المقفع کا ہے جس کا نام کاتب نے رسالہ قلمیہ لکھا ہے۔ اس کے دیباچے میں مترجم نے لکھا ہے

"جب بھی ناصر الدین عبد الرحیم بن ابی منصور کی مجلس عالی میں آداب نفس اور مکارم اخلاق کا ذکر ہوتا تو جو بھی وہاں حاضر رہتا اسے اشارہ ہوتا۔ اور وہ کوئی نہ کوئی علمی بحث چھیڑ دیتا۔ ایک روز چند رسایل عبد اللہ بن المقفع رحمتہ اللہ علیہ کے جو آداب و مواعظ اخلاق و نصایح پر مشتمل تھے مجلس میں پیش ہوئے اور اس دعا گو کو ان رسایل کا ترجمہ عربی سے فارسی میں کرنے کا حکم ہوا۔ چنانچہ دعا گو نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس مجلد کا پہلا رسالہ وہ ہے جسے ابن المقفع نے اپنے بیٹے کی تادیب اور تعلیم کے لیے لکھا ہے۔ جس کا نام "الادب الوجیز للولد الصغیر" رکھا گیا ہے یہ پہلا رسالہ اگر پسند کیا گیا تو دوسرے رسایل کا ترجمہ بھی کیا جائے گا۔"

اس رسالے کے مترجم نے جس ناصر الدین کا ذکر کیا ہے وہ غالباً ناصر الدین ابو الفتح عبد الرحیم ابی منصور ہے جس کی خدمت میں قہستان میں خواجہ نصیر الدین طوسی رہے۔ اور کتاب "اخلاق ناصری" اسی کے نام پر لکھی۔ یہ شخص حکام اسماعیلیہ سے تھا۔ اور عربی کی اچھی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرانے کا شایق تھا۔ چنانچہ مشہور حکیم ابو علی مسکویہ کی کتاب الطہارت کا ترجمہ خواجہ نصیر نے اسی کی فرمایش پر اخلاق ناصری کے نام سے کیا اور عین القضات ہمدانی کی کتاب کا ترجمہ بھی عربی سے فارسی میں کیا۔ اور مشکل مقامات کی شرح بھی لکھی۔ (۱)

اس رسالے کے مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ مگر اس کی عبارت خواجہ نصیر الدین کے ترجمہ سے بہت ملتی ہے اور یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ خواجہ کے ترجمے کا عکس ہے۔ مگر اس کا یقین نہیں کیا جا سکتا اگرچہ مقدمہ میں اس رسالے کا نام الادب الوجیز للولد الصغیر لکھا ہے۔ مگر عنوان رسالہ قلمیہ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ رسالہ مطبوعہ رسالہ الادب الصغیر سے بلکل الگ ہے۔

جہاں تک تحقیق ہو سکا کلیلہ دمنہ، نامہ تنسر اور یہ قلمی رسالہ تین ہی کتابیں ابن المقفع کی ایسی نظر آتی ہیں جن کا ترجمہ فارسی میں ہوا ہے۔ ان کے علاوہ ابن المقفع کی کسی اور کتاب کا فارسی ترجمہ نہیں ملتا۔ اس رسالے کی عبارت رواں اور بلیغ

DARMESTETER LETTRE TANSAR. P. 6 (1)

A. R. CHRISTEN, l'EEMPIRE DES SASSAN P. 112 (2)

(۱) مجالس المومنین قاضی نور اللہ شوستری مجلس ششم

ہے۔ طرزِ انشا میں متانت اور سنجیدگی ہے تا ہم نثر او رکلیلہ دمنہ بہرام شاہی کی طرح عربی فارسی اشعار و امثال کا اضافہ کیا گیا ہے نمونتاً کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"اے پسر! در اکتساب و اطلاب سعادت دنیا وی جد و جہد نمائے و بیقین شناس کہ اگر رزق از دنیا اندکست کسے زیادت نتواں کند و اگر بسیار است خلق را نقصان آں نتوانند دہد بیت:۔

بدست ما چو ازیں حل و عقد چیزے نیست
بعیش ناخوش و خوش گر رضا دہیم رواست
کہ زیر گنبد خضرا چناں تواں بودن
کہ اقتضائے قضا ہائے گنبد خضرا است (۱)

و ہرچہ از آں تو خواہد رسید غیرے را منع و دفع و تبدیل و تحویل آں ممکن نہ باشد، و با اگر چیزے از آں از تو فائت گشت رد و صرف آں ممتنع و نا مستطاع تواند بود و الفائت لا یستدرک"

غزل

جسے کہتے ہیں آزادی ملی ہے وہ کہاں ہم کو
بنانے ہی نہیں دیتا کوئی بھی آشیاں ہم کو
پسند آئے تو کیا آئے گلستانِ جہاں ہم کو
بہار اس کی جو دیکھی تو نظر آئی خزاں ہم کو
اجازت دے بھی تو پہلے خوشی سے باغباں ہم کو
کہ ہم دیکھیں چمن میں آشیاں کو آشیاں ہم کو
محبت تو نظر آتی ہے نیرنگِ جہاں ہم کو
ہنساتی ہے وہاں ان کو رلاتی ہے یہاں ہم کو
جنوں کے جوش میں دیکھو تو کیا انقلاب آیا
نظر آتا ہے پردے میں زمیں کے آسماں ہم کو
ذرا چھیڑی جو دل کی بات تو انکی نظر بدلی
وہ ہوں گے بدگماں ہم سے نہ تھا ایسا گماں ہم کو
یہ بات اک راز کی ہے جو کسی سے کہہ نہیں سکتے
ملے تھے ہم کہاں اس سے ملا تھا وہ کہاں ہم کو
محبت کو کہیں کیا یہ بنائے دشمنی نکلی
نہ تھا ایسا گماں ان کو نہ تھا ایسا گماں ہم کو
اٹھائیگا بٹھائے گا ہنسائے گا، رلائے گا
شرر رہنے نہ دیگا چین سے دردِ نہاں ہم کو

عبدالغفور شرر ندوی

غزل — نازشا جہاں پوری

ہمت ضبط ستم، تاب جفا رکھتی ہوں میں
یعنی پہلو میں دل صبر آزما رکھتی ہوں میں
اپنے پہلو میں" دل بے مدعا رکھتی ہوں میں
اللہ اللہ کیا متاع بے بہا رکھتی ہوں میں
گو حد آخر یہ ہیں مجبوریاں میری مگر
اے نگاہ ناز تیرا آسرا رکھتی ہوں میں
ہے جگر معمور زخموں سے تو دل لبریز درد
سب تمہاری بخششیں ہیں ورنہ کیا رکھتی ہوں میں
اے نگاہ لطف پرور! مرحبا صد مرحبا!
از سر نو قصر الفت کی بنا رکھتی ہوں میں
میری کشتی کو نہیں موج حوادث کا خطر
ناخدا اسے کوئی یہ کہدے خدا رکھتی ہوں میں
کیا کہوں اے نازؔ وجہ خود نمائی کیا کہوں
سامنے اپنے انہیں جلوہ نما رکھتی ہوں میں

سری نگر موسم بہار میں

ا۔ ا

بہار کی آمد آمد ہے۔ وادی کشمیر موسم سرما کی میٹھی نیند سے بیدار ہونے پر مسرت پھولی نہیں سماتی۔ نہ صرف نو شگفتہ پھول اور درختوں کی نئی کونپلیں بلکہ اس خطہ زمین کا ایک ایک ذرہ ایک نئی زندگی کی دھڑکن سے مچل رہا ہے۔ بہار کی دلکش سرمستی اور انبساط اور شادمانی فضا میں ہر سو بکھری ہوئی ہے۔ ایک چمکدار دھند نے ساری وادی کو اپنی گود میں لے رکھا ہے سماں گویا پھولوں کے موسم کی آمد کی منادی کر رہا ہے۔ شاہ داتا اور بادام کے درخت گلابی اور سفید پھولوں کے تازہ شگوفوں سے لدے مسکرا رہے ہیں۔ گھمکار کی جانب صبح کی سیر بہت سہانی اور موہنی ہوتی ہے۔ پھولوں کی پتیوں کا ایک نہایت نفیس غالیچہ ہر جگہ بچھا ہوا ہے۔ رستے میں ڈھلانوں اور سڑک کے کنارے سب جگہ پھول ہی پھول نظر آتے ہیں۔ مادر قدرت رحمت برساتی نظر آتی ہے۔ اور موسم بہار نئی زندگی بخش رہا ہے۔

کہرا یا منظر

صبح سویرے جھیل اور پہاڑیوں کے ارد گرد ایک کہرایا منظر آہستہ آہستہ ختم ہوتا ہوا اس طرح دکھائی دیتا ہے گویا شیشے پر برف پڑنے سے نقش و نگار بن رہے ہوں۔ تھوڑی دیر بعد سورج کی چند ایک شرمیلی کرنیں دھندلی شکلوں کو دھو کر صاف کر دیتی ہیں۔ اور آگے پیچھے کا سارا منظر نکھر کر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔

مکانوں کی ڈھلوان چھتیں اور ان کے لہریے خد و خال گمنامی سے نکل کر پہچان میں آنے لگے۔ انسانی صورتیں جو نور کے تڑکے سے پہلے اپنے بے ترتیب لمبے چوڑے چغوں میں ملبوس اور اور منہ ڈھکے ہوئے ... بے قد بھوت یا نے کے جیسے پہنے اور سر منہ ڈھکے راہبوں کی طرح چلتی پھرتی دکھائی دیتی تھیں۔ اب زیادہ واضح طور پر معمولی لباس پہنے افراد کی طرح نظر آنے لگے۔ چند لمحوں کے اندر ہی اندر بید مجنوں کے جھنڈوں میں سے جھانک تانک کرتا ہوا سورج ابھر آیا۔ اور سارا خطہ زمین بقعہ نور بن کر ہر طرف نقش و نگار سے بھرپور ہو گیا۔

نشاط اور شالی مار کے مشہور مغل باغات میں ایک نئی سرسبزی اور شادابی نظر آتی ہے۔ گاندربل اور اچھابل جیسے نشیبی مقامات پر موسم گرم اور خوشگوار ہے۔ جو لوگ سردی برداشت کر سکتے ہوں وہ اب سونا مرگ اور گلمرگ جا سکتے ہیں۔ وہاں بے شمار خود رو شگفتہ پھولوں کا دلکش منظر ان کا استقبال کرے گا۔

نئی خوشی

میدانی علاقوں کے برعکس کشمیر میں موسم بہار ایک بلکل نیا تجربہ ہے۔ یہاں کیفیت مزاج اور فضا میں ایک نیا نکھار محسوس ہوتا ہے۔ میدانوں میں موسم بہار ایک حد تک نظر فریب نقاب اوڑھے نظر آتا ہے۔ اس کی شکل و صورت کسی قدر خزاں سے ملتی جلتی ہے۔ کہیں کہیں چند ایک درخت اپنے پتے جھاڑ ڈالتے ہیں۔ تاکہ وہ سبز پتوں کا ایک نیا جامہ اوڑھ لیں۔ لیکن باقی سب درخت اور پودے غرور و تکبر سے بھرے سرکش بنے رہتے ہیں اس جزوی پت جھڑ اور نئے شگوفے پھوٹنے کے عمل سے کشمیر کی مانند نہ تو موسم خزاں کی سی ویرانی اور نہ موسم بہار جیسی زندگی کی دھڑکن کی تیزی پیدا ہوتی ہے۔ وادی کشمیر میں بہار کی آمد یقینی طور پر سنجیدا ہوتی ہے۔

یہ کھیتوں، جھیلوں اور پہاڑوں کو دھوپ اور زندگی کا سحر انگیز احساس دلا کر بیدار کر دیتی ہے۔

نئی شادمانی

جب مارچ کی بارشیں ختم ہو جاتی ہیں کیچڑ خشک ہو جاتا ہے اور گرد و نواح کی پہاڑیوں پر برف کے تودے پگھل جاتے ہیں، تب بہار ایک نئی مسرت ساتھ لیے وادی میں قدم رکھتی ہے۔ ہواؤں میں خوشبو بسی ہوئی ہے اور دھوپ سے چمکتی ہوئی فضائیں اور پہاڑیوں پر جہاں بے شمار رنگوں کے خودرو پھولوں نے حیرت انگیز تیزی سے اپنا رنگا رنگی جامہ بدل ڈالا ہے۔ سب جگہ ایک ہی خوشی اور شادمانی سرایت کر جاتی ہے۔

دیہاتی لوگ کھیتوں میں پہنچ گئے ہیں۔ کوئی برف کے نیچے سے نکلی ہوئی زمین کا جائزہ لے رہا ہے تو کوئی زمین میں ہل چلانے میں مصروف ہے۔ کسی نے سردی سے اکڑی ہوئی سخت زمین کو نرم کرنے کے لیے اپنے جفاکش دیہاتی بیل پھر سے جوت لیے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں اور پیروں سے ہر ایک ڈھیلے کو توڑتا ہے اور زمین کو دھان یا اس کی اپنی بولی میں شالی بونے کے لیے تیار کرتا ہے۔

چاروں طرف برف ڈھل جانے سے خالی پڑے کھیتوں میں پھر سے ایک نئی زندگی عود کر رہی ہے۔ پانی کے جوہڑوں کے آس پاس اور کھیتوں کے کنارے نئی گھاس اگ رہی ہے۔ نواحی پہاڑوں کے دروں میں دھنسی ہوئی برف کی نقرئی دھاریاں بڑی تیزی سے غائب ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

دھان کی کاشتکاری

سرسبز دھان کے چھوٹے بڑے کھیت دور تک پھیلی ہوئی لمبی وادی میں سرسرا رہے ہیں۔ چاروں طرف دھان کی کاشت جاری ہے۔ پانی سے لبالب بھرے ہوئے کھیتوں کے پہلو میں اچھلتے کودتے اور گڑگڑاتے ہوئے نالے ایک کھیت کی منڈیروں سے دوسرے کھیت میں دوڑتے جا رہے ہیں۔ ہر دوسرے کھیت کے کونے پر دھان کی پنیری لہلہا رہی ہے اس کے قریب ہی پودے لگائے جا رہے ہیں۔ کشمیری عورتیں رنگے ہوئے کپڑے چاندی کی بالیاں پہنے نیچے جھک کر اپنے ننگے ہاتھوں سے ایک ایک پودے کو مادری شفقت کے ساتھ گاڑ رہی ہیں۔ نیچے وادی کی تہ میں جھیل کے پانی میں گہرے سایوں کا عکس پڑ رہا ہے۔ چشموں کا پانی زیادہ تیزی سے اچھل رہا ہے۔ نالے اور ندیاں بھرپور بہہ رہے ہیں۔ ساکن پانی کے جوہڑوں میں کنول کے پھول مسکرا رہے ہیں۔

ہر جگہ سبزہ زار نظر آ رہا ہے اور دیوہیکل درخت اب پتوں سے بھرے دکھائی دیتے ہیں۔ دور فاصلے پر ریشمی زمینوں میں مویشی اور بکریاں ادھر ادھر دھوپ میں لاپروائی سے پھر رہی ہیں۔ اب وہ گھروں کے اندر ہی تک کے خشک چارا اور بید کے پتوں پر گذر کرنے کی محتاج نہیں رہیں۔ بلکہ وہ بے فکری سے لگاتار نئی اگی ہوئی گھاس پر چکتی ہیں۔

گانے والے پرندے

کشمیر کی صبح گانے والے پرندوں کی چہک سے بیدار ہوتی ہے۔ سفید رخساروں والی بلبل اپنی سیاہ کلغی اور زرد دم کو تمکنت سے اکڑاتے آپ کے دسترخوان سے بچے کھچے ٹکڑے چننے کے لیے پھر سے آ گئی ہے۔ رام چڑیا بھی پھر نظر آنے لگی ہے۔ عام چڑیا اور پہاڑی کھٹ بڑھئی بھی اچانک ہی پھر سے نمودار ہو گئے ہیں۔

موسمی سبزیاں اور پھل

سبزی کی دکانوں پر اب پھر وہ موسمی سبزیاں مل سکتی ہیں جن کا بڑی دیر سے انتظار تھا۔ تارا یا لک کے پتے ولایتی ہول اور نرگس کی نازک جڑوں کے گچھے پھلوں میں سے شہتوت اور شاہ دانا بڑی افراط سے فروخت کے لیے موجود ہیں۔

نچی چھتوں والے گھروں میں ایک عرصے سے دبکے بڑے کشمیری دستکار اپنی تیار کی ہوئی رگشیدہ کاری لکڑی ۹ و ر ہیں ماشی کی چیزیں بیچنے کے لیے دکانوں پر لا رہے ہیں۔ یہ موسم ان کے لیے بڑی توقعات لیے آیا ہے۔ دن تو بہت مستعدی دکھائی دیتی۔ تاکہ وہ سیر و سیاحت کے آیندہ موسم میں سردیوں میں کی

جین ایڈمز

یو۔ یس

جین ایڈمز ۱۸۶۰ء میں سیڈر وِلے الی نوئس میں پیدا ہوئی۔ بچپن ہی میں وہ ہونہار خیالات میں گم اور مشاہدہ نفس کرنے والی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ وہ شروع ہی سے زبردست خیالات اور احساسات رکھتی تھی۔ لیکن وہ اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کی شروع شروع میں قدرت نہ رکھتی تھی۔ اور اپنی آواز بلند کرنے سے کچھ ڈرتی اور جھجکتی بھی تھی۔

رک فورڈ کالج سے گریجویٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ یورپ گئی اور وہاں اقتصادیات اور معاشرت کا مطالعہ کرتی رہی۔ لندن کے ٹائینبی ہال سے متاثر ہو کر اس نے شکاگو امریکا میں ایک ویسا ہی ادارہ قائم کیا۔ چنانچہ آج یہ ادارہ دنیا بھر میں "ہل ہاؤس" کے نام سے مشہور ہے۔

جب ستمبر ۱۸۸۹ء میں "ہل ہاؤس" کے دروازے عوام کے لیے کھولے گئے تو شکاگو کے شہری بہت حیران رہ گئے۔ بعض تو اس کی کامیابی کے متعلق شبہے کا اظہار کرنے لگے مگر بعضوں نے اس سے اپنی گہری دلچسپی دکھائی۔ ۱۸۸۹ء کے اس زمانے سوشل ورکر تو کوئی رکھتے نہیں اور جین ایڈمز تن تنہا اور واحد رہنما تھی جس نے امریکا میں سماج سدھار کا بیڑا اٹھایا۔

"خاندانی" اور "معزز" لوگ مس ایڈمز کو ترچھی ترچھی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جب وہ نئے پیدا ہونے والے بچوں کو اپنے ہاتھوں نہلاتی اور بیماری میں خدا ان کی دیکھ بھال کرتی یا اگر کوئی موت واقع ہو جاتی تو تجہیز و تکفین کا انتظام کرتی۔ ایک دفعہ ایک عورت کے ناجائز حمل تھا تو اس نے ایک اپنی دوست کی مدد سے دایاگری کا کام کیا ڈاکٹر وقت پر نہیں پہنچا۔ جو پڑوس اور آس پاس رہنے والی دایاگری کی ماہر عورتیں اور میٹرنیں تھیں، انہوں نے اس فحاشی کی عورت کے ناجائز بچہ جنانے میں دایاگری کرنے سے انکار کر دیا۔

"ہل ہاؤس" میں زندگی اکثر و بیشتر بہت سخت تھی۔ شراب کے نشے میں بدمست عورتیں اور احمق بچوں کا سنبھالنا اور ان کی اصلاح کرنا ویسے بھی بڑا کٹھن کام ہے۔ چوروں رہزنوں قاتلوں بیویوں کو زد و کوب کرنے والوں اور بدچلن عورتوں کی اصلاح اور تربیت اور سدھار کے کام میں بھی بڑی ہی مشکل تھی۔ پھر بھی "ہل ہاؤس" کی ان اندرونی مشکلات کا حل کرنا اتنا کٹھن نہ تھا، جتنا کہ باہر کے لوگوں کا مس ایڈمز کے فلسفے اور اس کے کام کی اہمیت اور نوعیت کو نہ سمجھنے کے باعث دشواریاں پیدا ہوتی تھیں۔

مس ایڈمز اور اس کے ساتھ کام کرنے والی عورتوں کو "ہل ہاؤس" کو چلانے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کرنا پڑتا تھا۔

پہلے سال میں پچاس ہزار اشخاص نے اس ہاؤس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا۔ دوسرے برس ہر ہفتہ ۲ ہزار تک تعداد بڑھ گئی۔

جین ایڈمز ہل ہاؤس کا نہ صرف اندرونی کام ہی کرتی تھی۔ بلکہ سینکڑوں لوگوں کے گھروں کو جاتی اور انہیں ہل ہاؤس کے کام میں دلچسپی لینے کی ترغیب بھی دیتی تھی۔ چندہ حاصل کرنے کا انتظام کرتی تاکہ ہاؤس کے اخراجات پورے نہ ہو سکیں۔ اور پھر بچوں کے ساتھ بھی کانفرنسیں کرتی تھی۔ اور اس کے علاوہ جہاں کہیں موقع ملتا تقریریں بھی کرتی تھی۔

ہل ہاوس کے ۱۸۹۰ء کے ریکارڈ سے پتا چلتا ہے کہ ہر ہفتہ ۳ ہزار اشخاص وہاں جماعتوں میں شامل ہونے کلبوں اور ناٹکوں میں حصہ لینے اور مشورہ اور امداد حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔

اسی زمانے کے مقابلے میں اب "ہل ہاوس" ایک عظیم ادارہ بن چکا ہے۔ اس کی کامیابی کا سہرا مس ایڈمز کے سر ہے۔ جس کی انتظامی قابلیت مانی ہوئی تھی۔ تنسکاگو میں یہ ادارہ بھاری اہمیت رکھتا ہے۔

چالیس برس تک مس ایڈمز دن رات انتھک طور پر کام کرتی رہی۔ اور اس کٹھن اور مشکل کام میں اپنی کمزور دل ساتھی کارکنوں کی حوصلا افزائی اور رہنمائی کرتی تھی۔

جین ایڈمز کمیونٹی کی زندگی کے دوسرے شعبوں میں کام کرتی تھی۔ جس کا ثبوت اس بات سے چلتا ہے کہ اس نے وہاں کی میونسپل گورنمنٹ کے انسپکٹر آف سٹریٹس اینڈ ایلیز کے عہدے طور پر کام کرنا منظور کیا۔

ایک لیکچرار۔ سوشل ورکر اور سماج کا سدھار کرنے والی رہنما کی حیثیت سے اس کی بڑی شہرت ہوئی۔ ہزاروں پلیٹ فارموں سے اس نے تقریریں کیں۔ اور اور لوگ اس کی کتابیں دلچسپی سے پڑھتے تھے۔

مس ایڈمز نے معاشرت کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں ان میں "ڈیموکریسی اینڈ سوشل اتھکس" (۱۹۰۲ء) "نیو ور آئیڈیلز آف پیس" (۱۹۰۷) "سپرٹ آف یوتھ اینڈ سٹی اسٹریٹس" (۱۹۱۰ء) شامل ہیں۔

ان سرگرمیوں کے علاوا جین ایڈمز عورتوں کو ووٹ کا حق اور مساوات کی جدوجہد کی لیڈر بھی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں عورتوں کی بین قومی کانگریس کا اجلاس ہیگ میں ہوا۔ اس کی چیرمین یہی تھیں۔ اندنوں امن اور آزادی کے متعلق عورتوں کی بین قومی تنظیم مستقل طور پر قایم ہوئی جس کا نام "ویمنز انٹرنیشنل لیگ فار پیس اینڈ فریڈم" رکھا گیا اور اس کی صدر مس ایڈمز بنائی گئیں۔

اس کے بعد کے برسوں میں جین ایڈمز کو اس صدی کی اور ملک کی عظیم ترین عورت قرار دیا گیا۔ اور رسالوں اخباروں نے اس کا نام سرفہرست رکھا۔

مس ایڈمز پہلی خاتون تھیں جنہیں بہت سی یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریاں بھی دیں۔ یہاں تک کہ اہل کی رجعت پسند یونیورسٹی نے بھی اسے اعزازی ڈگری دی۔

۱۹۳۱ء میں جین ایڈمز کو امن کی کوششوں اور عوام کی خدمت بجا لانے کے صلے میں "نوبل پرائیز" جیسا گرانقدر انعام ملا۔

غزل

مادھو پرشاد سکسینہ آزاد (لکھنوی)

گیا ہے چھوڑ کر آخر کہاں پر کارواں ہم کو
کہ ڈھونڈے سے بھی تو ملتا نہیں اس کا نشاں ہم کو
نظر آنے لگیں پھر وہ چمکتی بجلیاں ہم کو
قفس میں کاش اب آئے نہ یاد آشیاں ہم کو
حقیقت بیں نظر سے جب زمانے کی طرف دیکھا
ہر اک جانب نظر آیا انہیں کا آستاں ہم کو
نہ جانے کتنے دھوکے کھائے ہم نے دوربینی میں
مگر پھر بھی پسند آیا تماشائے جہاں ہم کو
چمن اجڑا، خزاں آئی رہا صیاد کا قبضہ
قفس کی زندگی میں کیوں ہو فکر آشیاں ہم کو
اجاڑا باغباں نے اور جلایا برق نے گر کر
نہ آیا راس گلشن میں بنانا آشیاں ہم کو
کبھی ایسا بھی تھا جب بیڑیوں کو ہم سنبھالے تھے
مگر اب تو سنبھالے ہیں ہماری بیڑیاں ہم کو
مسیح و خضر ہیں ہم زندگی کی بھیک کیوں مانگیں
قضا اک روز خود دے گی حیات جاوداں ہم کو
فصاحت کا۔ بلاغت کا سلاست کا یہ مخزن ہے
اسی سے ہے پسند آنا دیبہ اردو زباں ہم کو

ٹامل ڈرامے کی روایات

ا - ا

ٹامل کی پرانی کتابوں میں "چپ سوانگ" یا تماشا اور ادبی ناٹکوں کا ذکر پایا جاتا ہے لیکن ایک بھی پرانا ڈراما زمانے کے دست برد سے بچ کر ہم تک نہیں پہنچا۔ غالباً تفریحات کے ان دونوں ڈھانچوں پر بھارت نیتم اور کتھا کلاک شیوکم چھا گئے۔ بھارت نیتم خالص ناچ ہوتا تھا جس میں ابتدائی ایکٹنگ کے امکانات کا امتزاج بھی پایا جاتا۔ کتھا کلاک شیوکم قصہ گوئی کو کہتے تھے۔ جس کے ساتھ سنگیت اور ایکٹنگ کی چاشنی بھی ہوتی تھی۔

ساتویں صدی عیسوی میں ایک شہزادہ مصنف راجا مہندر ورمن جو سنت اپار کا چیلا تھا اس نے ایک دلچسپ ڈراما لکھا یہ بالکل جدید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں شراب نوشی اور مذہبی تعصب کے خلاف طنز کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں لیکن یہ ڈراما جس کا عنوان ہے "بھگت ولاس" پروا سم سنسکرت اور پراکرت کی ایک ملی جلی زبان میں لکھا گیا ہے گیارویں صدی میں "راجا راجا چولا" جس نے تنجور کا مشہور مندر تعمیر کیا اس نے اسی مندر میں ناٹک کی سالانہ تقریب کا افتتاح کیا لیکن یہ سالانہ تقریب اس کے موجد کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔ پھر یہ صحیح معنی میں ڈراما بھی نہیں تھا۔ جس چیز کو ہم ڈرامے کا روپ کہہ سکتے ہیں وہ سڑکوں کے جلوس نما رقص میں پایا جاتا تھا۔ اس ہنگاموں کے عام دستکار (خصوصاً دھوبی جن کے پاس ہر قسم کے کپڑے ہوتے تھے) عموماً پورانوں کے ناٹک کھیلتے تھے۔ کبھی کبھی "نلاتھمگال" جیسے بڑے بڑے ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے ان کے پاس اسٹیج کی کچھ ملکیت بھی ہوتی تھی۔ اور ان ناٹکوں میں زیادہ تر مقبول عام اقتباسات اور پرانے گیت ہوتے تھے۔ اس کا نام دیہی تیرو کوتو تھا۔ یہ چیز اب بھی بعض مقامات پر پائی جاتی ہے۔

جب تنجور کے مرہٹا راجوں خصوصاً سیرا بوجی مہاراجا کے عہد حکومت میں تامل ادب اور ثقافت تخلیقی عروج کی طرف مائل پرواز تھے، اس وقت ڈرامے کی ایک نئی قسم "کوراونجی" (خانہ بدوشوں کے ناٹک) نے رواج پایا۔ اس ناٹک کی نمایاں خصوصیات لوک گیت اور رعنائیت (بھاگوتان دی چندوا اور پھلانا) ہیں۔ اس ناٹک کی ایک قسم "کنزلا کوراونجی" بہت مشہور رہے۔ "کوراونجی" میں فن رقص کی کھپت بھی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اس ناٹک کے موضوع تو دیوتا ہوا کرتے تھے۔ لیکن پھر بھی اس میں انسانی جذبات کے سلسلے میں موسیقی اور تماشا گری کے معاملات خصوصاً محبت ہجر اور وصال کی کیفیتوں کا اظہار ہوتا تھا۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں عوامی ناٹک کی تجدید ہوئی۔ سنہ ۱۸۴۴ء میں پانڈیچری کے مقام پر "سارنگ" کو اسٹیج کیا گیا۔ یہ ڈراما ہندستانی کے پورن بھگت ناٹک سے مشابہت رکھتا تھا اور اس کی کہانی بھی بالکل وہی تھی جو بنگالی ڈرامانویس گریش چندر کے ناٹک "پورن چندر" کی ہے۔ اس طرح سنہ ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ خصوصاً ضلع تنجور میں عوامی اسٹیج مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گیا۔

چھکے ناٹک کھیلنے والوں کے گروہ گاؤں گاؤں گھومتے اور معمولی تھیٹروں میں ڈراما کیا کرتے "ولی"، "کویلن" اور "ہریش چندر" کا شمار مقبول عام ڈراموں میں ہوتا تھا۔ ان میں اور دوسرے ناٹکوں میں زیادہ تر صوفی موسیقی پر زور دیا جاتا جس کا اکثر ڈرامے سے کم ہی تعلق رہتا۔ پھر مغرب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ سندرم پلے کا

ڈراما "مانون مینم" نظم میں لکھا گیا ہے اور ناٹک کے درمیانی وقفے میں پر مذاق نقل بھی ہے۔ اور یہ چیز ایک جوگی کے کیریکٹر کی شکل پیش کی گئی ہے۔ لکشمن پلے کا ناٹک "سینۃ ولی" شیکسپیر کے ڈراما "سمبیلائن" کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس دور کے دوسرے ڈرامے وی جی سوریا نارائن شاستری کے ناٹک "روپاوتی" اور "کلاوتی" ہیں۔

شہر مدراس کے ارباب ذوق نے اس صدی کے ابتدائی سالوں میں "سگن ولاس سبھا" قائم کی جو تامل ناڈ میں جدید تھیٹر کے آغاز کی نشاندہی کرتی ہے۔ سبھا کے ایک کرتا دھرتا شری پی سمبندا مدالیار نے جو اب مدراس ہی میں بود و باش رکھتے ہیں، متعدد ایسے ڈرامے لکھے جن کے بیشتر پلاٹ جدید یورپ کے طرز کے ہیں۔ انہوں نے اور ان کے دوستوں نے اسٹیج میں کئی اصلاحات بھی کیں۔ ان کی کامیابیوں کی بدولت ڈرامے کے پیشے کو نئے سرے سے احترام کی جگہ نصیب ہوئی۔ اس کے بعد متعدد اداروں نے ان کی تقلید کی جن میں مدراس سکریٹریٹ ایسوسی ایشن (ڈرامیٹک کلب) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ کونیتا اور کمپنی نے اسٹیج کے فن کو جلا دیا۔ اس طرح عوامی روایات میں نئی جان آگئی۔ آج اس سلسلے میں ٹی اے راجا منکم کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ان کے ناٹکوں میں جا بجا گیت ہوتے ہیں لیکن ان کے اسٹیج کا فن عالی ترین ہوتا ہے۔ مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان ڈراموں کو دیکھنے کے لیے لوگ ہزاری تعداد میں کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ حالیہ ادبی ڈراموں میں "سیوکامی کا سپتھم" جیسے ناٹک ہیں۔ یہ ناٹک نیشنل ڈراما فیسٹیول میں بھی تامل روایات کی نمائندگی کرے گا۔ یہ ڈراما پلاوا اور چالوکیوں کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ عصر جدید کی زندگی اور مسائل سے بحث کرنے والے سماجی ڈرامے بھی لکھے جا رہے ہیں۔ اس کی ایک حالیہ مثال "رتھ پاسم" ہے۔ تامل اسٹیج نے ٹی کے ایس برادرس جیسے ذہین ایکٹروں کو بھی جنم دیا ہے جو اس کا معیار بلند کرنے کی انتھک کوشش کر رہے ہیں۔

غزل

چمن کے راز سے غافل نہ سمجھے باغباں ہم کو
گلوں نے کر دیا ہے رفتہ رفتہ رازداں ہم کو

ستائے جس قدر چاہے ستائے آسماں ہم کو
مگر مل جائے تھوڑی فرصت آہ و فغاں ہم کو

کمال جستجو ہے یہ کہ اپنی کم نگاہی سے
کہ گرد راہ پر ہوتا ہے منزل کا گماں ہم کو

بنایا بار ہا ہم نے جلایا برق نے پیہم
نہ دے اب دعوت تعمیر شاخ آشیاں ہم کو

فلک کی گردشیں بدلیں زمانہ بھی بدل جائے
مگر تبدیل کر سکتا نہیں دور جہاں ہم کو

کچھ ایسی یادگاریں آج بھی باقی ہیں گلشن میں
بتاتی ہیں چمن میں جو نشان آشیاں ہم کو

ہمارے ہی تو سجدوں میں کشش تھی یہ جبیں کی
کہ اکثر ڈھونڈتا رہتا ہے سنگ آستاں ہم کو

وطن اپنا چمن اپنا چمن کی دل کشی اپنی
تو پھر آنکھیں دکھاتا رہتا ہے کیوں باغباں ہم کو

حرم کو دیر کو کعبہ کو بتخانہ کو اے یوسف
جسے دیکھا نظر آیا انہیں کا آستاں ہم کو

حکیم یوسف اعظمی

امام اکبرآبادی

انسانیت کا جوہر

(امام اکبرآبادی نے انسانی بھائی چارے کے نیک جذبے کو اپنے جس معصومانہ انداز میں پیش کیا ہے اسی نقطۂ نظر سے اس مضمون کو جانچا جائے۔ ایڈیٹر)

انسانیت کے بھیس میں رہزن کا نشیمن

اسلم جو ایک نوجوان بی۔ اے تھا۔ اشتراکی کامجسمہ تھا اس کو سیاست سے گہری دلچسپی تھی لیکن افلاس و ناداری کی وجہ سے یہ میدان سیاست میں عملاً کچھ کر نہ سکا۔ بجز اس کے صرف ایک بار جیل میں رہا تھا۔ چند مہینے بیکار رہنے کے بعد ایک مل میں بمشکل اس کو جگہ ملی۔ اور یہ بھی صرف پچاس روپے کی۔

آج چھٹی کا دن تھا اور یہ اپنی کھولی میں پڑا ہوا بیڑی پی رہا تھا۔ ایک طرف ایک بوسیدا قسم کی ایک کرسی پڑی تھی۔ یہ بیڑی پیتے پیتے کسی خیال میں ڈوب گیا اور دل ہی دل میں کہنے لگا۔

بمبئی جیسے شہر میں اور پچاس روپے ؟ کیا کھاؤں؟ اور کیا گھر بھیجوں؟ آج سے چند دن پہلے اناج کا کیا بھاؤ تھا؟ اور آج کیا ہے؟ ہمارے بزرگ ہم سے ٹھیک کہا کرتے تھے کہ بیٹا تم نے جتنا پانی پیا ہوگا اتنا ہم دودھ گھی پی چکے ہیں۔

دفعتہً ایک پرانا کھونسٹ فقیر ہات میں ایک بوسیدا ڈنڈا اور بغل میں جھولا ڈالے ہوئے آتا ہے اور کہتا ہے "ہے کچھ اللہ تام پر"۔ اس کے ہات کانپ رہے ہیں۔ ٹانگیں کپکپا رہی ہیں۔ اسلم اپنے بستر پر بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ گردن موڑ کر دیکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ انسانیت کا نپ رہی ہے کائنات کانپ رہی ہے بوڑھے فقیر کی اس حالت سے متاثر

رہبر کی ہر اک بات میں رہزن کا اشارہ

ہوکر بولا۔ میاں صاحب اس کرسی پر ذرا دم لے لو۔ کچھ مل ہی جائے گا۔ بوڑھا فقیر کچھ مل جانے کی امید پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور اسلم اس سے پوچھتا ہے۔

اسلم۔ بابا تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور دن میں یہ لال ٹین کیوں جلا رکھی ہے۔

بوڑھا۔ بیٹا میں ہوں تو فرخ آباد کا۔ مگر اب تو خانہ بدوش ہوں

اسلم۔ یہاں بمبئی میں کیسے آنا ہوا؟

بوڑھا۔ بھیک مانگنے کو۔

اسلم۔ مگر تم تو مانگنے والوں میں سے نہیں معلوم ہوتے یہ پیشہ کب سے اختیار کیا۔

بوڑھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے۔

اسلم۔ اس کے پہلے کیا کرتے تھے؟

بوڑھا۔ میں ایک متوسط درجے کا زمین دار تھا۔ جب بیوی بچے قتل کر دیے گئے اور زمین چھن گئی۔ دولت لٹ گئی تو گاؤں سے بھاگنا پڑا اور فاقوں تک نوبت پہنچی تو بھیک مانگنے پر مجبور ہو گیا۔

دفعتہً اسلم کا دوست روپ سنگھ آجاتا ہے۔ یہ دراز قد کشادہ چشم اور سر کے بال اسلم کے بالوں سے کچھ بڑھے ہوئے ہیں۔ ہیئت سے آدمی سنجیدہ اور متین معلوم ہوتا ہے۔

روپ سنگھ۔ (اسلم سے)، کہو بھائی نوکری تو مل گئی۔

اسلم۔ ہاں مل تو گئی۔ مگر صرف پچاس روپے کی۔

روپ سنگھ۔ بھئی منیجر تمہارا بھائی ذہنیت کا ہے۔ پہلے اس نے

انکار ہی کر دیا تھا۔ لیکن جب میں نے مل مالک پر زور دیا تو منیجر کو مجبوراً جگہ دینی پڑی۔

بوڑھا فقیر ایک سرد آہ کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنی جلتی ہوئی لالٹین سے دونوں کے چہروں کو دیکھ کر چل دینے کا ارادہ کرتا ہے۔ اسلم اس کو روک کر کہتا ہے۔

اسلم۔ میاں صاحب یہ لو اور ذرا ٹھہرو۔ بوڑھا ہاتھ میں روپیا دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے کتنے دن بعد اس کم بخت روپیے کی شکل دیکھی ہے یہ کہہ کر پھر بیٹھ جاتا ہے۔

روپ سنگھ۔ بابا تمہاری کتنی عمر ہو گی؟ اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ دن میں یہ لالٹین کیوں جلا رکھی ہے؟

بوڑھا۔ بیٹا میری عمر ۱۱۵ برس کی ہے لیکن لالٹین جلانے کا سبب نہ پوچھو۔ یہ سن کر اسلم و روپ سنگھ اور زیادہ مصر ہوتے ہیں۔ بوڑھا سبب بتانے پر مجبور ہوتا اور کہتا ہے۔

بوڑھا۔ میں اس لالٹین کے ذریعے انسانیت کی تلاش کرتا پھرتا ہوں۔ لوگ مجھے پاگل کہتے ہیں بچے میرے پیچھے تالیاں پیٹتے اور خاک اڑاتے پھرتے ہیں۔ مگر میں اپنی دھن کا پکا ہوں۔ اور اس روشنی کے ذریعے لوگوں کے چہرے پڑھتا پھرتا ہوں۔ مگر کسی کے چہرے پر اب تک انسانیت کا نقش نہیں دیکھا۔ اگر تم مجھے روپیا نہ دیتے تو میں کہتا کہ آج اور اس وقت کچھ دھندلا سا نقش دکھائی دیتا ہے یہ لالٹین نفسیات کے تحت جلائی ہے۔

روپ سنگھ۔ سائیں بابا۔ بات تو تجربے کی ہے۔ آپ تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہیں۔

اسلم۔ میاں صاحب! آپ نے تو زمانے کے اتار چڑھاؤ خوب دیکھے ہوں گے۔ پھر ذرا بتایئے کہ ۵۷ء میں کیا دیکھا تھا!

بوڑھا۔ کچھ نہیں۔

اسلم۔ کچھ نہیں بابا یہ کیا کہہ رہے ہو؟

بوڑھا۔ بیٹا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں کہ ۴۷ء کے مقابلے میں ۵۷ء میں کچھ بھی نہ تھا۔ روپ سنگھ اسلم کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔ بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔

روپ سنگھ۔ سائیں صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت اناج، گھی، دودھ اور تیل کا کیا بھاؤ تھا۔

بوڑھا۔ (ایک سرد آہ کے ساتھ) ارے بیٹا پچھلی بات پوچھ کر میرے زخم کیوں ہرے کرتے ہو؟

روپ سنگھ۔ پھر بھی ذرا بتایئے تو۔ آپ تو پڑھے لکھے اور دور اندیش معلوم ہوتے ہیں۔

بوڑھا۔ بیٹا اس غلط تعلیم ہی نے تو ہم کو اور ہمارے بیڑے کو ڈبویا ہے کل اگر ہم کو انگریز کی غلط اور زہر آلود تاریخ نہ پڑھائی جاتی تو آج ہمارا پڑھا لکھا گروہ ہم کو بندر کا ناچ نہ نچواتا۔ ۴۷ء میں جو ناچ ہم نے ناچا تھا وہ ناچ اسی پڑھے لکھے گروہ کے اشارے پر تھا۔ اسی نے تو ہم سے آگ اور خون کا کھیل کھلوایا تھا۔

روپ سنگھ۔ اسلم کی طرف دیکھتا ہے۔ اسلم گردن ہلا دیتا ہے۔ بوڑھا پھر رخصت چاہتا ہے لیکن روپ سنگھ روک کر کہتا ہے۔

روپ سنگھ۔ ذرا اناج وغیرہ کا بھاؤ تو بتاتے جایئے۔

بوڑھا۔ میرے بچو! سنو۔ آج سے ۹۰ برس پہلے گیہوں کا بھاؤ روپیے کا دو من تھا۔ اور موٹے اناج کا ڈھائی من۔ گھی روپیے کا پانچ سیر۔ دودھ ایک روپیے کا ۳۲ سیر اور تیل آٹھ دس سیر کا تھا۔ یہ سنی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ آنکھوں دیکھی بات ہے۔ بیٹا تم کیا کھا پی سکتے ہو؟ (جوش میں آ کر بوڑھا آگے ہاتھ بڑھاتا ہے اور کہتا ہے لو تو ذرا میری اس کلائی کو تو موڑ کر دیکھو۔ روپ سنگھ اور اسلم مسکرا دیتے ہیں۔ بوڑھا پھر اصرار کرتا ہے

اب دونوں پارٹی پارٹی سے زور آزمائی کرتے ہیں لیکن کلائی کو ٹس سے مس نہیں کر سکتے۔ اور ندامت سے سر جھکا لیتے ہیں۔

بوڑھا پھر رخصت چاہتا ہے۔ مگر اسلم پھر روک کر کہتا ہے کہ بابا ذرا اپنے زمانے کا کچھ حال سناتے جایئے۔

بوڑھا۔ (کھانس کر) میرے بچو! کیا حال سناؤں۔ پہلے دونوں قوموں کا یہ حال تھا کہ ایک دوسرے کی شادی و غمی میں شرکت لازمی تھی۔ باہم لوگوں کا دستور تھا۔ ایک دوسرے کو چچا، بھتیجی اور بیٹا، بیٹی کہہ کر پکارتا تھا گاؤں کی بیٹی کو سارا گاؤں اپنی بیٹی تصور کرتا تھا۔ اور تمام بچے اپنے بچے سمجھے جاتے تھے۔ دونوں قوموں کے لوگ عید تہوار پر ایک دوسرے کے گھروں پر جاتے اور مبارکباد اور دھنیہ واد کہتے۔ بغل گیر ہوتے اور آؤ بھگت کرتے۔

میرے بچو! میں تم کو ایک آنکھوں دیکھی بات بتاتا ہوں۔ اس سے اندازہ کرنا کہ دونوں قوموں کے بھائی چارے کا کیا حال تھا۔ اور اب کیا ہے۔

سنو! ایک مسلمان نوجوان لڑکی بیمار پڑتی ہے جب اسکو آرام نہیں ہوتا اور سوکھ کر کانٹا ہو جاتی ہے۔ بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تو اس کو اسپتال میں داخل کرا دیا جاتا ہے ڈاکٹر اس کو دیکھ کر کہتا ہے کہ لڑکی کے جسم میں ایک جوان خون کے پہنچانے کی ضرورت ہے یہ سن کر مریضا کے عزیز اقارب ایک دوسرے کا موہنہ تکنے لگتے ہیں۔ دفعتاً ایک نوجوان رام سنگھ جو مریضا کے بھائی کا ملنے والا تھا آگے بڑھ کر کہتا ہے ——

رام سنگھ۔ ڈاکٹر صاحب آپ میرا خون دیکھ لیجے۔ اگر موافق ہو تو لے لیجے۔

ڈاکٹر خون دیکھتا ہے اور موافق پا کر لے لیتا ہے پھر یہ خون مریضا کے جسم میں پہنچا دیتا ہے۔ اب مریضا روبہ صحت ہونے لگتی ہے۔ میرے بچو اگلے زمانے کا یہ ایک ادنا سا واقعہ تھا۔ اس سے بھی زیادہ ہمدردی کا ثبوت دیا جاتا تھا۔ مگر آج دونوں کے درمیان کیا ہو رہا ہے؟

اب بوڑھا جوش میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے گلے کی رگیں پھول جاتی ہیں۔ آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ موہنہ میں کف بھر آتا ہے اور اس کا سارا بدن کانپنے لگتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ——

بچو! سانپوں اور اژدہوں سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ بھیڑیوں اور کتوں کو گلے لگا سکتا ہوں۔ پر میں آجکے نام نہاد انسان کی صورت تک نہیں دیکھنا چاہتا۔ انسان نما شیطان کی پرچھائیں سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ کاش کہ آج میں اس درندہ نما انسان سے بدلا لے سکتا۔

یہ کہتا ہوا بوڑھا چل دیتا ہے۔ اسلم ور وپ سنگھ پر خاموشی طاری ہو جاتی ہے دونوں اس طرح ساکت ہو جاتے ہیں جیسے پتھر کے بت یا جیسے بے روح مجسمے۔ دفعتاً اشرف و موہن آجاتے ہیں۔ اور ان دونوں کو اس حال میں دیکھ کر ایک ہلکا سا قہقہا لگاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔

ابھی سے نیند کا غلبا! یہ نیند ہے یا افیون کھائی ہے؟

اب ان دونوں کا سکوت ٹوٹتا ہے۔ اور اسلم کہتا ہے۔

اسلم۔ ارے بھئی نہ نیند ہے نہ افیم۔ ۱۱۵ برس کا ایک بوڑھا فقیر ہم دونوں کو خاموش اور بے معلوم آگ میں ڈال گیا ہے۔

موہن (حیرت سے) ۱۱۵ برس کا بوڑھا؟ تعجب ہے۔

اشرف۔ وہ کیسی آگ تھی؟

اسلم۔ بوڑھے فقیر کی ساری داستان سنا دیتا ہے۔ اس پر چاروں

دوست رائے زنی کرتے ہیں۔ آخر میں روپ سنگھ کہتا ہے
روپ سنگھ۔ میری تو مدت سے یہ رائے ہے کہ انگریز کی زہریلی
تاریخ کو سپرد خاک کرکے از سر نو تاریخ کو صحیح طور پر مدون
کیا جائے۔ اگرچہ اس سے موجودہ زہریلے دماغ
تو صاف نہیں ہو سکتے مگر آیندہ نسل استفادہ کرسکے گی۔
شام کا وقت ہے ہر چیز پر اداسی چھائی ہوئی ہے
موسم خوشگوار ہے۔ شفق خون سے رنگین محسوس ہوتی
ہے۔ گلگشت کرنے والے باہر آ جا رہے ہیں۔ کچھ دفعہ
کی خاموشی کے بعد اشرف کہتا ہے۔

اشرف۔ بیتا دیا آج چھٹی کا دن تو بیتائی میں گذار دیا۔ اب
فل مون ہے شہر سے دور نکل کر کچھ چاندنی کی تو
داد دے لو۔

اسلم۔ جیب میں پیسے بھی ہیں؟ ہمارے پاس تو صرف ایک
روپیہ تھا وہ بوڑھے فقیر کو دیدیا۔ اب تو کھانے
کو بھی کچھ نہیں ہے۔

اشرف۔ پیسوں کی فکر نہ کرو پیسے ہو جائیں گے۔ اب
سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ایک کشتی میں سوار
ہو کر ایلفنٹا کیوز پہنچ جاتے ہیں۔

ایلفنٹا کیوز ساحل بمبئی سے چند میل کے فاصلے پر
ایک پہاڑی پر ہیں۔ اس پر فضا مقام پر پہاڑی پر
چند ایک چھوٹے بڑے غار ہیں۔ ان غاروں میں پتھر
پر نقش کھدے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ نقش کوروں
پانڈووں کے عہد کے ہیں۔ اور دور دور سے لوگ
ان کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ باہر سطح زمین پر ایک
چھوٹی سی بغیچی ہے۔ جس میں چند بنچیں پڑی ہوئی
ہیں۔ ایک بنچ پر یہ چاروں دوست بیٹھے ہوئے
چاندنی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ آج چاندنی
بھی کچھ غیر معمولی طور پر اس طرح چٹکی ہوئی ہے گویا
دودھ کی بارش ہو رہی ہو۔

اب یہ چاروں اٹھ کر غاروں سے دور سیر کے لیے
چل دیتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر ان کو ایک ڈھیر سا نظر آتا ہے
اور اس ڈھیر میں ایک جنبش سی محسوس ہوتی ہے۔ قریب
میں لالٹین جل رہی ہے۔ پھر اس ڈھیر میں سے ایک
آواز سنائی دے رہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔
دھوکا، دھوکا، دھوکا چند سال گذر جانے کے
بعد بھی تیرا پتا نہیں ——!
اگر تو ویسا ہوتا جیسا عوام سمجھے ہوئے ہیں
تو تو مجھے ضرور ملتا۔ اور جب ملتا تو میں تجھ سے
پوچھتا کہ لوگ انسان کا لہو کیوں پیتے ہیں؟
شراب کیوں نہیں پیتے! انسان کا گوشت کھایا
جاتا ہے، انگارے کیوں نہیں کھائے جاتے؟
ہڈیاں چبائی جاتی ہیں۔ سنگ خشت کیوں نہیں
چبائے۔
مجھے اب تیری تلاش نہیں۔ میں انسانیت کا جویا
ہوں۔ انسانیت کہاں ملے گی ——؟
ایک دوسری آواز۔ عمل کے نشیمن میں۔

غزل

شارب (لکھنوی)

یہ اطمینان ہے دیر و حرم کے درمیاں ہم کو
کشش ہوگی تو خود کھینچے گا ان کا آستاں ہم کو
ہمیں دنیا کے ہر طوفان میں ساحل بنانا ہے
ذرا آہستہ لے چل کشتیِ عمر رواں ہم کو
وہ راہیں جو بظاہر موت کا پیغام دیتی ہیں
انہیں راہوں میں ملتی ہے حیات جاوداں ہم کو
غبار کارواں میں چھپ گئے ہیں کارواں کتنے
یہ وہ سن لیں جو سمجھے ہیں غبار کارواں ہم کو

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ملتان (پنجاب)

بھائی صاحب تسلیم!

——تمکین کاظمی صاحب کا مضمون "عبداللہ ابن المقفع" بہت ہی قابل قدر ہے موصوف سے مزید اسی نوع کے مضامین لکھوایے۔ میں بھی انہیں عنقریب خط ارسال کروں گا۔ میں نے مرزا یگانہ کی اصلاحیں جوش ملیح آبادی پر حاصل کی ہیں کیا میں آپ کے لیے حاصل کر کے ارسال کروں؟" فضا

——مثل مشہور ہے کہ "گھر کی مرغی دال برابر"۔ "ہندستانی ادب" جیسے پرلطف علمی ادبی سیوک کو نظر انداز کرتے ہوئے تمکین صاحب نے یہ مضمون ایک ایسے گم نام رسالے میں چھپنے کے لیے بھیجا جس سے ہندستان کی جنتا تو رہی ایک طرف خود پاکستانی تک اس کے نام سے واقف نہیں۔ مضمون چھپ تو گیا لیکن رسالے کی گم نامی کا لحاظ کرتے تمکین صاحب کی نظر میں اس مضمون کا چھپنا نہ چھپنا برابر تھا۔ "ہندستانی ادب" کی طرف نظر کرم ہوئی۔ ہم نے مضمون کو دیکھا۔ اور ایک ہی نظر میں اس کی اہمیت کو بھانپ لیا۔ چپکے سے "بلا شکریا" حاصل کر لیا، اس لیے کہ چیز تھی "سکنڈ ہینڈ" اب چپکے اس کی تعریف کے گیت گائے جا رہے ہیں جناب تمکین کا اخلاقی فرض ہے کہ ایک کھلے خط کی شکل میں "ہندستانی ادب" کا شکریا ادا کریں۔

آپ مرزا یگانہ کا مضمون بلا تکلف اور بلا تامل بھجوا سکتے ہیں۔ "ہندستانی ادب" صحیح تنقیدی مضامین چھاپتے چوکتا ہے نہ اور نہ چوکے گا۔ ہمیں کسی کی ذات اور شخصیت سے کبھی بھی کوئی بحث نہیں رہی۔ اور نہ ہم کسی کی بڑی چڑی حیثیت سے آج تک بھی مرعوب ہوئے ہیں۔ ہم بے لاگ تنقید کے ہر وقت قایل رہے ہیں اور آیندہ بھی اسی پر عمل کرتے رہیں گے۔ "ہندستانی ادب" میں کتابوں اور رسالوں وغیرہ پر تبصرے آپ کی نظر سے ضرور گذرتے ہوں گے۔ اور آپ نے ہر وقت ہی محسوس کیا ہوگا کہ ہمارے مبصر کا ادا رہ ہمیشہ غیر جانبدارانہ رہا کرتی ہے۔ ہمارا مبصر نہ کسی کی جھوٹی تعریف کرتا ہے اور نہ بلا وجہ بھی کسی کو گرانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی نظر ہر وقت کھرے اور کھوٹ پر رہتی ہے۔ بالکل ہی منصفانہ طریقے پر اس میں فرق پیدا کر کے آپ کے سامنے واجبی واجبی مواد پیش کرنا ہمارے مبصر کا کام ہے۔ — ایڈیٹر

لکھنو

محترم تسلیم نیاز!

"تمکین کاظمی صاحب کا مضمون بڑا محققانہ اور قابل رشک ہے۔ ممکن ہو سکے تو تمکین صاحب کا پتا مجھے روانہ کر دیجیے۔ بڑا کرم ہوگا۔

——جواب کا اور تمکین کاظمی صاحب کے پتے کا سخت انتظار رہے گا۔" معراج لکھنوی

مضمون کے بارے میں آپ کی راے صحیح ہے۔ مضمون واقعی تحقیقی اور بڑی ہی چھان بین سے لکھا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ ایک ایسا محققانہ مضمون گوشہ گمنامی اور تاریکی میں جا پڑا تھا۔ مگر "ہندستانی ادب" میں چھپنے کے باعث اب کہیں اس کے جوہر نمایاں ہو رہے ہیں۔ ہمیں آشا ہے کہ تمکین کاظمی صاحب آیندہ بھی ایسے ہی تحقیقی مضامین سے "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کو مستفید فرماتے رہیں گے۔

کسی کا پتا بلا اجازت معلوم کرا دینا صحافتی جرم ہے۔ اسی لیے ہم نے جناب تمکین کاظمی صاحب سلطان شاہی حیدرآباد دکن ۲ کے نام خط لکھا ہے۔ جواب آنے پر آپ کو ضرور بہ ضرور اطلاع دی جائے گی۔ [illegible] ایڈیٹر

تبصرے

اساس عربی

یہ کتاب عربی داں طبقے کے لیے نئی نہیں ہے۔ عربی زبان سیکھنے والوں کی سہولت کی غرض سے الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر عربی محمد نعیم الرحمان ام۔ اے نے قواعد کی یہ کتاب آج سے کچھ عرصہ پہلے لکھی تھی۔ عربی زبان کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہے۔ اس زبان میں بھی وہ تمام خوبیاں اور خصوصیات موجود ہیں جو ایک بڑی اور مسلمہ زبان میں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ دوسری بڑی زبانوں کی طرح عربی زبان کی قواعد بھی نہایت منضبط شکل میں ہے۔ بہ قول مولف "ان قواعد کی تدوین کی ابتدا بہت چھوٹے پیمانے پر ہوئی۔ ہوتے ہوتے یہ ایک مستقل فن بن گیا۔ اور اتنا پھیلا کہ لاکھوں صفحات کا میدان بھی اس کے لیے تنگ ہوگیا"۔ لیکن ایک مبتدی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ قواعد کا اتنا وسیع اور تفصیلی مطالعہ کر سکے اور مولف کتاب کے الفاظ میں "موجودہ زمانے کی حالت یہ ہے کہ عربی کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ شوق بہت کم اور فرصت بالکل مفقود۔ ایسی صورت میں وہ کتابیں زمانہ حال کے لیے موزوں نہیں۔ اور ان مابعد موجودہ زمانے کی ضرورت کے موافق ہیں۔ اور ان میں وہ تمام مسائل آگئے ہیں اس لیے یہ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب موجودہ طالب علم کی ضروریات کے لیے کافی ہوگی"۔

"اس کتاب میں صرف و نحو کے مسائل کی بحث اور ان کی ترتیب زیادہ تر عربی زبان کے انگریزی نحوی بھیچ کی انگریزی گرامر پر مبنی ہے"۔ لیکن مولف کا ساتھ ہی یہ بھی کہنا ہے کہ "اس میں ہر جگہ اس کی پیروی نہیں کی گئی ہے بلکہ اکثر و بیشتر اس سے قطع نظر کی گئی ہے، اور ائمہ فن مثلاً سیبویہ، ابن مالک، زمخشری وغیرہم کی تصانیف سے استمداد کر کے مطالب کو زیادہ واضح اور صحیح بنانے کی کوشش کی گئی ہے"۔

مختصر یہ کہ "جو صاحب اس فن میں کمال حاصل کرنا چاہیں ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان اوراق کو انتہا بلندی پر پہنچنے کا پہلا زینہ بنائیں"۔ اس لحاظ سے "یہ کتاب جیسی کچھ مفید ثابت ہو سکتی ہے" ظاہر ہے۔

یوں تو اصح المطابع صحت کتابت اور پاکیزہ لکھائی چھپائی کے لیے عام طور پر مشہور ہے لیکن اس کتاب میں نفاست طباعت اور صحت کتابت کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کتاب کے آخر میں صرفی و نحوی اصطلاحات کے انگریزی مترادفات کا ایک ضمیمہ بھی دیا گیا ہے۔ چکنا اچھی قسم کا کاغذ استعمال کیا ہے۔ ۳۰۳ صفحے پر مشتمل بڑے سائز کی غیر مجلد یہ کتاب نور محمد کارخانہ آرام باغ۔ فریر روڈ۔ کراچی (پاکستان) سے پانچ روپے میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہندستان میں ترسیل زر کا پتا۔ اشتیاق بکڈپو۔ دیوبند (سہارنپور) "ا"

دل آسوا

اختر انصاری کی نظموں کا مجموعہ کاؤن سائز (۲۰×۱۲) صفحات لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ نفیس مجلد قیمت (عـ۱) ملنے کا پتا مرکز ادب مشن روڈ کراچی۔

اختر انصاری اکبرآبادی چند سال سے بہت لکھ رہے ہیں۔ اور اچھا لکھتے ہیں۔ یہ ان کے کلام کا مجموعہ ہے سرورق کے پیچھے ہی ان کی مختصر سی تصویر ہے۔ جس کے ساتھ جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی رائیں بھی ہیں۔ فراق گورکھپوری اور سید احتشام حسین، حسن عسکری ڈاکٹر اعجاز حسین کی رائیں بھی ہیں۔ اور ظ۔ انصاری کا مختصر دیباچہ بھی۔

ظاہر ہے کہ ان "سات" مشاہیر کے سراہنے کے بعد پڑھنے والا مرعوب ہی ہو کر مجموعے کا مطالعہ کرے گا۔ جوش اور فراق جیسے بلند نظر و بلند فکر شاعر احتشام اور اعجاز جیسے نقاد اختر حسین، حسن عسکری اور ظ۔ انصاری جیسے ادیب جسے سراہیں وہ اچھا ہی ہوگا۔ مگر ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ان حضرات نے نہ تو دل افزائی کی ہے اور نہ بے جا مدح سرائی بلکہ بالکل ایمانداری کے ساتھ داد دی ہے۔ حقیقتاً اختر انصاری بڑا اچھا کہنے لگے ہیں۔ ان کے کلام میں کافی روانی اور شگفتگی نظر آتی ہے۔ اختر غزل اور نظم دونوں یکساں روانی کے ساتھ کہتے ہیں۔ اختر کے کلام میں خاصی گرمی ہے اور زندگی بھرپور موجود ہے۔ اگر انداز فکر یہی رہا تو وہ دن دور نہیں کہ اختر دنیائے شعر میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کرلیں گے۔ "ت۔ ک"

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

جلد (۱۵) نمبر (۹)

ایڈیٹر
جی۔ام۔خان ام۔اے (عثمانیا)

امرداد ۱۳۶۴ ف جون ۱۹۵۵ء

چندا سالانا آٹھ روپے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
حقایق و معارف	افقر موہانی وارثی	۳
ترانہ دل	اعتبارالملک نسل شاہجہاں پوری	۴
غزل	سراج (لکھنوی)	۵
حیدرآباد	سلام سندیلوی ام۔اے ال ال۔بی ریسرچ اسکالر	۶
چوماسہ برسات	سالک کرسنی (اوناو)	۷
تعریف غزل	شبنم رومانی (بی۔کام)	۸
پنڈت رتن ناتھ سرشار	ظ۔انصاری	۹
غزل	زبیدہ خاتون نشاط (لکھنوی)	۱۲
بنگالی ادب	ڈاکٹر سری کمار بنرجی	۱۳
غزل	(ابوالبیان) محضر سندیلوی	۱۵
غزل	معراج (لکھنوی)	۱۵
عبد اللہ ابن المقفع	تمکین کاظمی	۱۶
شاید کہ عید آے	صبا نقوی	۲۳
غزل	صفی احمد بہاری	۲۶
استالن آباد	اعظم ظفر	۲۸
غزل	(سروار) بلونت سنگھ فیض ام۔اے ادیب فاضل	۲۹
ترنمات حبیب	حبیب ویزوارثی (لکھنوی)	۲۹
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے	ایڈیٹر	۳۰
تبصرے	"ا" اور "ت۔ک"	۳۱
رباعی	عظیم الدین محبت ام۔اے (عثمانیا)	۳۲

ہمارے خیالات

یہ کیا مذاق ہے ——

مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہندستان ——؟

اخباری اطلاع ہے کہ ——

شرم دان مہم کے سلسلے میں بہار علاقے کے طالب علم دریائے کوسی کے کناروں پر کام کر رہے ہیں۔ ان طلبا کو کام کے سلسلے میں نمبر دیے جائیں گے اور یہ نمبر ان کی سالانہ درجا واری ترقی کے سلسلے میں کام آئیں گے۔ شرط یہ رکھی گئی ہے کہ اگر کسی طالب علم نے کوئی ایک میقاتی (ٹرمنل) امتحان کامیاب کر لیا ہو تو اس کے ان حاصل کیے ہوئے نمبرات میں "مٹی ڈھونے" کے نمبر بھی شامل کر دیے جائیں گے۔ اور اس طرح پر سالانہ امتحان پاس کیے بغیر اوپر کے درجے میں ترقی دیدی جائے گی"۔

ہم شرم دان کے مخالف نہیں ہیں ہم جیون دان اور بھودان وغیرہ کے بھی مخالف نہیں۔ ہم ایسے ہر ایک دان کا من مندر کی گہرائیوں سے سواگت کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان دانوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے اور ہمارے دیس کا بول بالا ہو۔ ہم اس کے بھی مخالف نہیں کہ ایسے کاموں میں طالب علم حصہ نہ لیں۔ اوروں کی طرح وہ بھی حصہ لیں اور ضرور حصہ لیں لیکن پڑھائی کے اوقات کے علاوہ چاہے وہ صبح کا وقت ہو یا شام کا۔ شام میں کھیل کود کی بجائے طالب علم یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ ایسے کام کرنے سے ان میں دیس کی سیوا کا جذبہ بڑھے گا۔ اور یہ کہ محنت مشقت کرنے سے ان کی صحت بھی ٹھیک رہے گی۔ ایسے کام کرنے کے لیے کسی کو مجبور اور پابند نہیں کیا جاتا۔ یہ کام جنتا کی سیوا اور خدمت کے جذبے کے تحت کیے جاتے ہیں۔ اس لیے کام کرنے والوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ چاہے تو وہ خوشی سے کام کرے۔ اور نہ چاہے تو اس پر کوئی پابندی بھی نہیں ہوتی! ایسے کام کرنے والے سیوکوں کو ان کی خدمات کا کوئی معاوضہ بھی نہیں دیا جاتا ——

مگر یہ کیا غضب ہے کہ بہار کی تعلیماتی منسٹری نے طلبا کی سیوا کے سلسلے میں ایک بیجا نامعقول اور غیر مستحسن معاوضہ مقرر کیا ہے جس پر ہر سنجیدہ اور سمجھدار آدمی لعنت بھیجے بغیر نہ رہے گا —— اول تو یہ نامعقولیت کہ اوقات درس و تعلیم میں طلبا سے مٹی ڈھونے کا کام لیا جائے اور دوسری بڑی بیوقوفی یہ کہ اس کام کے نمبر دے کر انہیں سالانہ امتحان دیے بغیر کامیابی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس مہمل سی تجویز کو کوئی بھی معقول پسند آدمی گوارا نہ کرے گا۔ نہ معلوم حکام بہار کی بدھی چر کھانے گئی ہے یا دریائے کوسی کی طغیانیوں میں بہہ گئی ہے؟

پچھلے ہی نمبر میں ہم نے تعلیم کے گرے ہوئے معیار کا دکھڑا رویا ہی تھا کہ یہ ایک نیا گل کھلا —— میقاتی امتحان کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ صرف سالانہ امتحان ہی پر زور دیا جاتا ہے اور طالب علم اس امتحان کے لیے خاص محنت اور خاص تیاری کرتا ہے۔ امتحان کی خاطر زیادہ مطالعہ کرنے سے طالب علم کی علمی اور درسی معلومات میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی خصوصی محنت کا پھل اس کو درجے کی ترقی کی شکل میں ملتا ہے اور جب طالب علم کو یہ معلوم ہو جائے کہ سالانہ امتحان نہیں ہو گا صرف میقاتی امتحان کی کامیابی اور "مٹی کے ٹوکرے ڈھونے" سے درجا بدرجا ترقی مل سکتی ہے تو طالب علم پڑھنے سے جی چرائے گا۔ پڑھنے لکھنے میں نکمے سے نکما تر بنتا جائے گا۔ اس کی معلومات میں بھی کوئی خاص اضافہ نہ ہو سکے گا —— اور اس طرح پر اس کا تعلیمی معیار بلکل ہی پست اور گرا ہوا سا ہو گا —— ہم حیران ہیں کہ ایسی ناقص پیداوار ملک اور دیس کی منسٹری کو چلانے کے کیوں کر قابل بن سکے گی —— یہ ایک نہایت ہی مضحکہ اور فضول سی تحریک ہے اس لیے ہم وزیر تعلیم حکومت ہندستان

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

مرا دل منزل حسن نہاں ہوتا ہی رہتا ہے
یہ کعبہ کافروں کا آستاں ہوتا ہی رہتا ہے

شب غم دل مرا محو فغاں ہوتا ہی رہتا ہے
تنزل میں نظام دو جہاں ہوتا ہی رہتا ہے

خزاں کی قید ہے کچھ۔ اور نہ شرط موسم گل ہے
چمن والوں پہ جور باغباں ہوتا ہی رہتا ہے

وہی ہے امتحاں جو عشق کی منزل میں ہو اے دل
اور ایسے تو جہاں میں امتحاں ہوتا ہی رہتا ہے

وہ کعبہ ہو کہ بتخانہ کلیسا ہو کہ میخانہ
مرا سجدہ برائے آستاں ہوتا ہی رہتا ہے

تصور لاکھ کم کر دے مری بیتابی دل کو
مگر دل میں سے درد نہاں ہوتا ہی رہتا ہے

خیال اسکا نہ کر صیاد اسیروں کی یہ فطرت ہے
قفس میں رہ کے ذکر آشیاں ہوتا ہی رہتا ہے

عروج زیست تمہید زوال زندگانی ہے
یہ دور گردش عمر رواں ہوتا ہی رہتا ہے

شب فرقت مری ویرانی دل پر تعجب کیا
کہ پژمردہ خزاں میں گلستاں ہوتا ہی رہتا ہے

یہ دنیا ہے یہاں کے رنج و راحت کی شکایت کیا
ہمیشہ منقلب دور جہاں ہوتا ہی رہتا ہے

کبھی کاوش نشیمن کی کبھی غم میرے رہنے کا
غرض برہم مزاج باغباں ہوتا ہی رہتا ہے

نہ پابند تعین ہو نہ ہو شرط مکاں جس میں
وہ سجدہ بے نیاز آستاں ہوتا ہی رہتا ہے

یہ کہہ کر یاد کر لیتے ہیں ہم اپنی جوانی کو
کہ بعد فصل گل دور خزاں ہوتا ہی رہتا ہے

خرد کا آسرا جوش جنوں میں مل نہیں سکتا
کہ طوفاں میں تو ساحل بے نشاں ہوتا ہی رہتا ہے

میں سوئے میکدہ جاتا ہوں زاہد جانب مسجد
غرض یوں سامنا وقت اذاں ہوتا ہی رہتا ہے

قفس میں کہہ کے یہ صیاد تسکیں مجھکو دیتا ہے
چمن والا خراب آشیاں ہوتا ہی رہتا ہے

تعجب کیا۔ جو مجھکو یاد کر کے اب وہ روتے ہیں
کہ مرنے والے کا غم بعد ازاں ہوتا ہی رہتا ہے

صدا دی بتکدہ میں اور کعبہ میں نظر آئے
یوں ہی تبدیل ان کا آستاں ہوتا ہی رہتا ہے

ہوئی ہے ترک مے نوشی کو اک مدت مگر افقر
شریک حلقہ پیر مغاں ہوتا ہی رہتا ہے

ترانۂ دل

اعتبار الملک دل شاہجہاں پوری

شکیب و ضبط بھی اے پیک یار لیتا جا
پلٹ چلا ہے تو دل کا قرار لیتا جا

لکھا ہے خون کے قطروں سے حالِ رنجِ فراق
مرقع خلش و اضطرار لیتا جا

بجائے مہر ہوئی ثبت چشمِ پرحسرت
یہ نقش ہے ہمہ تن انتظار لیتا جا

بندھے ہیں لختِ جگر اشک نابہ رنگیں ہیں
یہ دل پسند یہ خوش رنگ ہار لیتا جا

کسی کے زیرِ قدم آج ہی بچھا دینا
سکونِ جانِ محبت شعار لیتا جا

تجھے ہے عذرِ ادا داستانِ عشق طویل
مری زبان بھی اے غمگسار لیتا جا

وفورِ شوق جو سرمایۂ محبت ہے
بصد نیاز پئے نذرِ یار لیتا جا

یہ چیز وہ ہے جو فائق ہے لاکھ چیزوں سے
خلوصِ عشق کا تو اعتبار لیتا جا

رہا سہا ہے جو تسکینِ دل کا سرمایہ
مرے رفیق مرے راز دار لیتا جا

انیس حضرتِ دل آہ جو تمنا تھی
ملی ہے خاک میں اس کا غبار لیتا جا

غزل

سراج (لکھنوی)

اک برق اضطراب ہے ہم جہاں رہے
پھولوں کے آشیاں میں بھی آتش بجاں رہے

لب پر جنوں پسند ہنسی یا فغاں رہے
جو شورش حیات ہو کچھ دن جواں رہے

جنبش ہوئی پروں میں تنکے چنے گئے
برسوں قفس سے چھوٹ کے بے آشیاں رہے

ظالم مرے ملائے تو ملتا نہیں یہ ساز
کیوں کر ہنسی کے ساتھ لبوں پر فغاں رہے

دل چاک چاک سا ہے نظر تنگ تنگ سی
انصاف بھی تو شرط ہے جلوہ کہاں رہے

ہمدم اسی کا نام ہے ہنگامہ حیات
اک بار نہ بجلیوں کی سر آشیاں رہے

فی الحال تو وطن میں بھی غربت نصیب ہوں
اب اس کے بعد جو روش آسماں رہے

گھبرا نہ جاؤ اس ستم روز روز سے
اب ایک دن کوئی کرم ناگہاں رہے

دامن پہ اپنے چھٹکی ہوئی چاندنی تو دیکھ
سب پارہ پارے بن گئے آنسو کہاں رہے

صبح وطن تو شکل بھی پہچانتی نہیں
اب نامراد شام غریباں کہاں رہے

چاہے جو ہر ڈھکیل دے دنیا کی مصلحت
اب ہر قفس کی چوٹ پر اک آشیاں رہے

چادر ہلا کے مانگ رہا ہے کوئی پناہ
ہم مرٹوں کی خاک سراج اب کہاں رہے

حیدرآباد

سلام سندیلوی
ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی ریسرچ اسکالر

سلام سندیلوی ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی ریسرچ اسکالر لکھنؤ یونیورسٹی "ہندستانی ادب" کے مستقل لکھنے والوں میں ہیں۔ ان کا شمار بلا شبہ صف اول کے شاعروں میں ہے۔ سلام غزل اور نظم دونوں بھی خوب کہتے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ اصل میں نظم گو شاعر ہیں۔ ان کی ہر نظم میں فن کاری کے جوہر نمایاں رہتے ہیں۔ سلام کو واقعہ نگاری سے ایک خاص لگاؤ ہے چنانچہ ان کی تمام نظموں میں اس فن کا کمال اجاگر رہتا ہے۔

نظم "حیدرآباد" میں تو سلام نے واقعی کمال کر دکھایا ہے۔ صرف چند مصرعوں میں ایک طویل فسانۂ عشق اور اس کے متعلقہ واقعات کو بیان کر دینا "دریا کو کوزے میں بند کرنے" کے برابر ہے۔ سلام کی شاعری کی ایک اور خاص خوبی یہ بھی ہے کہ ان کا کلام سہل اور آسان ہوا کرتا ہے۔ سیدھی سادی زبان میں وہ اہم سے اہم واقعات بھی بیان کیے دیتے ہیں۔ ان کی نظم کے ہر شعر سے لطافت، ہر مصرع سے شیرینی اور ہر بول سے سریلا پن ٹپکتا ہے۔ چنانچہ نظم "حیدرآباد" ہمارے اس دعوے کی شاہد ہے۔ اس نظم میں تو شاعر کی حسن کارانہ صلاحیتوں کا کمال اپنے عروج پر چمکتا دکھائی دے رہا ہے۔ امید ہے کہ سلام آئندہ بھی اسی قسم کی نظموں سے "ہندستانی ادب" کے صفحوں کو زینت بخشتے رہیں گے۔ ایڈیٹر

حیدرآباد، قطب شاہ کی الفت کا نشاں
ایک عاشق کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز
ایک شاعر کے خیالات کی رنگیں پرواز
حیدرآباد، فسوں کاری چشم جاناں

ایک رقاصہ ناہید رخ و زہرہ جبیں
عشق نے "بھاگ متی" کہہ کے پکارا تھا جسے
حسن کے مرمریں ہاتھوں نے سنوارا تھا جسے
ایک محبوبہ گل رنگ و سمن پوش و حسیں

تھا قطب شاہ اسی بھاگ متی کا مفتوں
جس کی ہر ایک ادا اس کے لیے ناگن تھی
جس کی زلفوں کی گھٹا اس کے لیے ساون تھی
رشک فردوس تھا جس حور کا روئے گلگوں

رود موسیٰ کے تلاطم سے جو ٹکرایا تھا
اپنی رقاصہ ہم رنگ قمر کی خاطر
اپنی محبوبہ منظور نظر کی خاطر
اپنی گل رو کو تھپیڑوں سے چھڑا لایا تھا

بس گئی تھی نگہ شاہ میں وہ متوالی
عشق کی راہ میں اک شمع جلانے کے لیے
حسن کے نام کو تابندہ بنانے کے لیے
اس نے بنیاد حسیں "بھاگ نگر" کی ڈالی

طے یوں ہی ہوتا رہا عشق و جنوں کا رستہ
کیف و مستی میں گذرتے گئے رنگیں ایام
بعد میں ہو گیا "حیدر محل" اس حور کا نام
حیدرآباد اسی نام سے ہے وابستہ

شہر تو بن گیا گہوارہ عیش و عشرت
چھیڑتی تھی وہ بصد ناز و ادا بربط و چنگ
دست سیمیں سے پلاتی تھی شراب گل رنگ
محفل رقص سے شرمندہ تھی بزم جنت

گردش چرخ نے بکھرا دیا وہ خواب حسیں
ہے مگر عشق کی وہ زندہ کہانی اب تک
حیدرآباد ہے دونوں کی نشانی اب تک
سو رہے ہیں اسی گلزار میں وہ زیر زمیں

چوماسہ برسات

سالک گرستی (اوناو) ——— (موسمی تحفہ)

بارش میں کہا تھا آنے کو، برسات ہے آئی آجاو
گر پاس ہے اپنے وعدے کا تو دل میں دیپ جلا جاو
جب لو کے تھپیڑوں نے جل کر سنسار میں آگ لگائی تھی
جب کال نہ پڑ جاتا کل عالم خورشید نے آنکھ دکھائی تھی
جب پیاس سے بیدم تھی دنیا۔ اور جان لبوں پر آئی تھی
جب دن میں تارے نکلے تھے اور رات بہت گھبرائی تھی
وہ جیٹھ کا منظر یاد کرو اور دل کی آگ بجھا جاو
بارش میں کہا تھا آنے کو برسات ہے آئی آجاو
مرطوب ہوا کے کاندھے پر بادل گنگا جل لائے ہیں
اشنان کو دھرتی ماتا کے کیا بھر کے چھاگل لائے ہیں
ہریالے جوڑے بدلیں گے تھالوں میں کوپل لائے ہیں
دل کھول کے چاندی برسیں گے جو بھورے بادل لائے ہیں
آساڑھ کی اب رت آئی ہے تم بادل بن کر چھا جاو
بارش میں کہا تھا آنے کو برسات ہے آئی آجاو
دھرتی کی کایا جاگ پڑی۔ بن مور پپیہے بولے ہیں
سب جل تھل ندی نالوں میں آکاش نے گیسو کھولے ہیں
پڑھتے ہیں پینگ پریم کے اب جھولے ہیں اور ہنڈولے ہیں
بھونروں نے پھول کٹوروں میں اب پریم سمیت رس گھولے ہیں
اب سندر ساون آیا ہے ملہار کا راگ سنا جاو
بارش میں کہا تھا آنے کو برسات ہے آئی آجاو
گھنگھور گھٹائیں مڈی ہیں۔ پرخوف اندھیری راتیں ہیں
سب جل دھارے مدھ ماتے ہیں بہکی بہکی باتیں ہیں
بجلی کے خزانے لٹتے ہیں، کیا جوش بھری برساتیں ہیں
آکاش کی جانب سے گویا دھرتی کے لیے سوغاتیں ہیں
بھادوں کی سہانی راتیں ہیں اب پریم کی جوت جگا جاو
بارش میں کہا تھا آنے کو برسات ہے آئی آجاو
پنچھی پردیسی لوٹ پڑے موسم بدلا برسات گئی
اب سیلے گیلے دن ہیں کہاں وہ بھیگی بھیگی رات گئی
دنیا دھانی کھیت کا پانی سلونو بھادوں کی بات گئی
سب دل کی امنگیں بیٹھ گئیں سالک ملنے کی گھات گئی
اب کنوار آیا برسات گئی اب تو وہ روپ دکھا جاو
بارش میں کہا تھا آنے کو برسات ہے آئی آجاو

تعریف غزل

شبنم رومانی بی کام

نظر آتی ہے موثر، مری آشفتہ سری
خبر عالم امکاں ہے تری بے خبری

رنگ بھر دیتی ہے جذبات میں کیسے کیسے
اے مری جان تمنا! تری سادہ نظری

نکل آیا ہوں تری زلف سے کوسوں آگے
میں نہ کہتا تھا کہ مشکل ہے مری ہم سفری

مرے حالات کی پرسش، مری نظروں سے گریز
ہائے یہ تیرا خلوص خبر و بے خبری

نفس پاک و معطر، دل بے داغ و جواں
ترا آغوش ہے، آغوش نسیم سحری

مجھے گمراہ نہ کر دے کوئی غارت گر ہوش
یہ مری عمر جواں، یہ مری تنہا سفری

یہ ترا نام ہے یا شب کا سلام رخصت؟
یہ مرے دل کی صدا ہے کہ اذان سحری؟

میں بتاؤں تجھے تعریف غزل اے شبنم
"مرے جذبات کی رانی مرے خوابوں کی پری"

پنڈت رتن ناتھ سرشار

ظ۔ انصاری

پنڈت رتن ناتھ سرشار نے جس لکھنؤ میں آنکھیں کھولی تھیں وہ ناسخ آتش اور انیس اور دبیر کی آوازوں سے گونج رہا تھا اور الگ الگ طرزوں کی پسند ناپسند میں بٹا ہوا تھا۔ سرشار کو عربی فارسی اور بنیادی سنسکرت کی تعلیم تو کچھ گھر پر اور کچھ ماحول سے ملی۔ اور اس کے بعد انھوں نے زمانے کی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے انگریزی بھی سیکھ لی۔ ادبی شعور بڑھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب بھی جیسا کچھ انہیں اس وقت میسر آسکتا تھا مطالعے میں آیا۔ اس طرح وہ مشرقی تمدن کی کسمساتی ہوئی زندگی سے اور اس کے نئے پرانے ادبی ذخیرے سے بھرپور واقفیت حاصل کر چکنے کے بعد اس قابل بھی ہوگئے کہ جدید مغربی تمدن کی روح کو پاسکیں اور اس کے جگمگاتے ہوئے ادب کی گہرائی اور وسعت کے بہترین عناصر سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اس وقت کے تعلیم یافتہ ہندستانی ذہن میں تین رجحان رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے کٹتے اور الگ ہوتے جا رہے تھے۔ ایک ذہن بلکل مڈل کلاس کا تھا۔ جسے لارڈ میکالے کے ضابطہ تعلیم اور تعلیمی پالیسی کی پیداوار بھی کہا جا سکتا ہے یعنی انگریزی آداب سیکھو اور نئے با اقتدار حلقے سے واسطہ بڑھاؤ۔ اس کے رنگ میں رنگ جاؤ تو وہیں سے ترقی کا زینا شروع ہوتا ہے دوسرا ذہن مشرق کے ان عاشقوں کا تھا جو مغرب کے اچھے اور برے عناصر میں امتیاز کرنے کو تیار نہ تھے جو ہر اس چیز سے نفرت کرتے تھے جس پر ذرا بھی انگریزی تعلیم انگریزی تہذیب یا نئے صنعتی یورپ کی پرچھائیں پڑی ہوں۔ اس رجحان میں یا دا تر زمین داریوں سے وابستہ اور پرانی تہذیب اور دربار کے دلدادہ لوگ تھے۔ جو ابھی تک اپنے برے بھلے دن گذار رہے تھے۔ اپنی روز بروز بڑھتی ہوئی پسماندگی اور بے بسی کا احساس رکھتے تھے۔ لیکن اسے دیانت داری کے ساتھ ایک امتحانی اور آزمایشی دور سمجھ کر راضی برضا ہو چکے تھے۔

تیسرا ذہن ان دونوں کے بین بین تھا۔ یہ مشرق و مغرب کے اعداد و خصایل طور و اطوار اور تعلیم و تہذیب کا قریب سے مطالعہ کرتے تھے۔ دونوں کو برابر رکھ کر دیکھتے تھے۔ اور مشرق کے خلوص، ایثار، شرافت، محبت ترقی کو مغرب کے نئے زاویوں سے ہم آہنگ کرتے جاتے تھے لوگ اپنے ہاں کے قدیم تمدن اور تہذیب زبان و ادب رسم و رواج، مذہب و اعتقاد غرض زندگی کے ہر ہر شعبے میں نئی تراش خراش اور نئے زمانے کے مطابق تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے۔ اور کر رہے تھے۔

سرشار کو ہم ذہنی اعتبار سے ہندستانی نثر میں اسی رجحان کا نمایندہ سمجھتے ہیں۔

راجا رام موہن رائے اور سوامی دیانند سرسوتی نے جو کام مذہب و اعتقاد اور رسم و رواج کے دایرے میں کیا کچھ اس سے ملتا جلتا مشن سرسید اور ان کے دوستوں نے تعلیم و تمدن کے شعبوں میں انجام دیا۔ حالی نے ہندستانی شاعری میں بعد کو اسی کا بیڑا اٹھایا۔ اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سرشار نے ہندستانی ناول کے بلکل ابتدائی دور میں اس کے لیے ذہنی فضا تیار کی۔

یہاں پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا سرشار ہندستانی ادب میں کسی اصلاحی تحریک کے رہنما تھے؟ تو میرا جواب نفی میں ہوگا۔

وہ تحریک چلانے والوں کی نفسیات اور تحریک چلانے کی ذمے داریاں اٹھانے والے آدمی تھے ہی نہیں لیکن چونکہ وہ بنگال پنجاب اور مہاراشٹر میں ابھرنے والی اصلاحی تحریکوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ اور مغرب کے علم و تہذیب کی آمد سے باخبر تھے اس لیے خود ان کے دل و دماغ میں ہلچل ضرور تھی۔ یہ ذہنی ہلچل سرشار کے مخصوص مزاج اور حالات کو دیکھتے ہوئے نہ تو کوئی ادبی یا تہذیبی تحریک کا رخ بنا سکتی تھی اور نہ خود کو کسی منظم تحریک کے سپرد کر سکتی تھی۔ لیکن یہ ذہنی ہلچل ان کے قصوں کہانیوں میں مضامین میں خصوصاً "فسانۂ آزاد" میں وہ روشنی ضرور دکھا رہی تھی جو سماجی کرداروں کے روپ میں دیسی کالج کے مجہول ناکارا، فرسودا اور بے مصرف عناصر کا مضحکا اڑاتی، اور نئے تندرست جاندار بے تعصب متحرک کرداروں کو ان کے مقابلے میں کامیاب دکھاتی۔ جو پرانے علوم کو بے وقت کی راگنی مشرقی تعصب کی نادانی مغرب سے اور مغربی اثرات سے بچ کر رہنے کو تنگ نظری، پرانے امیروں اور زمینداروں کی عشرت پرستی کو زوال کی آخری منزل قرار دیتی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں فرانس اور انگلستان کے جدید فلسفے اور سائنس کو نئی روشنی اور انگریزی تہذیب کی بعض برکتوں کو قابل قبول قرار دیتی تھی۔

میرے خیال میں یہ انداز نظر ہی سب سے اہم صیقل ہے جس نے سرشار کے انداز بیان پر دھار رکھی اور اسے تیز تیز تیکھے جملوں اور کٹیلے لفظوں کا ایک ہتیار عطا کیا۔

برنارڈ شا سے کسی نے اسٹائل (STYLE) کے بارے میں پوچھا تھا تو انہوں نے جواب دیا اسٹائل اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہوتا جب تک کہ آپ کسی خاص نکتے پر اپنے کسی خاص زاویے پر یا کسی مخصوص پہلو پر زور نہ دینا چاہتے ہوں۔

انہوں نے یہاں EMPHASIZE کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور جب ایک نقطۂ نظر پر یا کسی خاص زاویے سے افراد اور چیزوں کو پیش کرنے کا EMPHASIS پڑ جاتا ہے تو وہ اس حال میں کچھ زمانا گذر جانے کے بعد ایک عادت بن جاتا ہے اور یہی عادت مخصوص طرز بیان یا انداز بیان کہلاتی ہے۔ پھر اگر زور نہ بھی دینا ہو اور اس کا خیال نہ رکھا جائے تب بھی یہ عادت کارفرما رہتی ہے اور اس سے ہم پہچانتے ہیں کہ فلاں مصنف کا یہ طرز بیان ہے اور وہ صاحب طرز ہے۔

سرشار ہنسی دل لگی اور خوش وقتی کے آدمی تھے۔ لیکن ان کا ذہن جس سانچے میں ڈھلا ان کی فکر نے جس روشنی کو پایا ان کو قصے کہانی کے روپ میں پیش کرتے وقت وہ جانب دار ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی فکر اور اپنے قبول کیے ہوئے فکری زاویوں کو ظرافت اور ہنسی دل لگی کی زبان میں اس طرح سمویا کہ ان کی ظرافت بیک وقت ایک بامقصد باشعور آدمی کی طنز یا مسکراہٹ اور ایک ٹھٹول کا قہقہا بن گئی۔ یہ ایک ایسا زبردست وصف ہے جو سرشار کے زمانے تک ہمیں کسی نثر نگار کسی انشا پرداز کے ہاں نہیں ملتا۔ "فسانۂ آزاد" ان کی زندۂ جاوید تصنیف جسے ہم موڈرن ہندستان کا پہلا ہندستانی ناول کہہ سکتے ہیں۔

ایک ایسے کردار کی لاابالی اور بے لگام زندگی سے وابستہ ہے جو خود تو سوٹ پہنتا ہے مگر شیروانی یا دھوتی پہننے والوں کو حقارت سے نہیں دیکھتا۔ جو نئے فلسفے اور سائنس سے آشنا ہے، اور اس سے نفرت کرنے والوں کا مضحکا اڑاتا ہے۔ جو فلسفے اور تمدن پر علمائے مغرب کے لیکچر بھی سننے جاتا ہے اور ناچ رنگ کی محفلوں میں بھی دم خم دکھاتا ہے جو نام کا ہی نہیں بلکے مشرب کا بھی آزاد ہی ہے۔

"فسانۂ آزاد" میں بہت سے مکالمے ایسے ملتے ہیں جہاں نہ صرف یہ کہ اس میں جو ایک طرف مشرقی تعصب وہم پرستی قدامت پرستی اور دوسری طرف مغربی آزادہ روی روشن خیالی اور علمی تلاش کے درمیان کشمکش سرشار دوسرے فریق کی کھلم کھلا حمایت کرتے ہیں اور اپنے عہد کی ترقی پسند قدروں کا اعلان کرتے ہیں بلکہ سرشار کے طرز بیان کو طنز اور ظرافت کے وہ بہترین عناصر بھی اس کی بدولت عطا ہو گئے ہیں۔ جو زندہ اور وسیع ادب کی بنیادی ضرورت سمجھے جاتے ہیں۔

ایک بار مہدی نے (جو درمیان میں خد کو مہدی افادی الاقتصادی بھی لکھنے لگے تھے) اپنے دور کے بہترین انشا پردازوں کا چند جملوں میں مقابلہ اور موازنہ کیا تھا انہوں نے شبلی پر یہ فتویٰ دیا کہ وہ تاریخ پر تنقید کے میدان میں اپنا ایک بے مثال طرز رکھتے ہیں۔ نذیر احمد مذہبیات کے بغیر لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ لیکن محمد حسین آزاد ایک ایسے صاحب طرز انشا پرداز ہیں۔ جنہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں ان کی انشا پردازی میں وہ زور ہے کہ چاہے کوئی موضوع سخن ہو وہیں اپنی جولانی دکھا دیتا ہے۔ بعینہٖ یہی بات سید سلیمان ندوی نے خد مہدی افادی کے بارے میں لکھی ہے کہ مہدی صاحبِ طرز تھے ان کا طرز سب سے نرالا تھا خطوط سے لے کر مضامین تک ہر جگہ یہ طرز نظر آتا ہے۔

یہ بات مہدی افادی اور محمد حسین آزاد سے پہلے کے دور میں خد سرشار کے لیے کہی جا سکتی ہے۔ ۱۸۷۷ء سے ۱۹۰۰ء تک جب وہ اودھ پنچ میں اور اودھ اخبار میں لکھتے تھے لوگوں پر ان کا رواں دواں طرز بیان ایسا جادو کرنے لگا تھا کہ کئی حضرات مختلف ناموں سے اسی طرز میں لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور پورے اخبار پر یہ طرز حاوی ہونے لگا تھا۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ کسی ایک موضوع ادب کے کسی خاص شعبہ میں اپنا طرز استوار کر لینا آسان بات ہے۔ لیکن ہر صنف اور ہر موضوع میں اپنا طرز بیان باقی رکھنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے صرف ریاضت محنت مشق اور زبان و بیان پر قابو ہی ضروری نہیں بلکہ یہ بھی لازمی ہے کہ سماج میں بسے ہوئے مختلف حلقوں مختلف طبقوں مختلف کرداروں کی زندگی کا ظاہری اور باطنی علم بھی ہو ممکن ہے کچھ ہیئت پرستوں اور لفظی داؤ پیچ کی زلفوں میں گرفتار لوگوں کو صاحب طرز ہونے اور سماجی زندگی کا ظاہری اور باطنی علم رکھنے کے تعلق پر اعتراض ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب تک مصنف کو یہ خبر نہ ہو کہ زندگی کے مختلف کرداروں، مختلف فکروں نظریوں اور معاشروں میں کسی طرح کی اندرونی کشمکش جاری و ساری ہے۔ کیا کیا نفسیات ہیں۔ اور ان کے علل و عوامل کیا ہیں۔ اور وہ کس طرح خد کو باہر کی روز کی زندگی میں ظاہر کرتی ہیں۔

اس وقت تک وہ زبان، الفاظ محاورات اور جملوں کی ساخت میں فرق و امتیاز رد و قبول کا عمل نہ کر سکے گا۔ طرز کسی مردہ حقیقت سے پیدا نہیں ہوتا اور نہ خد کوئی مردہ اور جامد شے ہے۔ مختلف کرداروں کا جس طرح ماحول حالات اور نفسیات الگ الگ ہوتی ہیں اسی طرح ان کی زبان ان کے محاورے ان کے استعمال کرنے کی چیزیں اور اظہار کے پہلو بھی علحدہ علحدہ ہوتے ہیں۔ اور ان سب مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے جدا گانہ تصویروں کو جب ایک مصنف اپنا مخصوص طرز ادا باقی رکھ کر بیان کرنا چاہے گا۔ تو یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ مختلف کرداروں اور ان کے مختلف ماحول ظاہری اور باطنی علم رکھتا ہو۔ اور تب ہی وہ نمایندہ کردار تراشنے کی سکت پیدا کر سکتا ہے اس کو غالب نے ؎

در دل سنگ بنگر رقص بتان آذری

کہا ہے۔ پتھر کو تو سب دیکھتے ہیں۔ لیکن پتھر کے سینے میں ہزارہا صنم لو کے قلب کی دھڑکن جس نے پالی اور اس دھڑکن کو اظہار و بیان کا جامہ پہنا لیا وہ خالق ہے وہ زبردست فن کار ہے اور اس کا ایک جداگانہ طرز بن سکتا ہے۔

گوئٹے نے کسی موقع پر کہا تھا کہ جیسے کیرکٹر زندگی میں دیکھے ہیں ویسے ہی اٹھا کر ادب میں رکھ دے تو یہ کیا فن کاری ہوئی یہ تو نقالی ہے۔ لیکن اگر فن کار نمایندہ اور TYPICAL CHARACTERS ڈھالنے اور پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ صحیح معنوں میں فن کار رہے اور خالق کہے جانے کا مستحق۔ سرشار کا کمال یہی ہے کہ انہوں نے جن کرداروں سے ہمیں اپنے فسانۂ آزاد میں ملایا ہے وہ اس گذرے ہوئے عہد کے جیتے جاگتے مجسمے ہی نہیں تھے بلکہ وہ نمایندہ کیرکٹر تھے۔ جن کی ذات میں ہم اس عہد کی معاشرت کو اور اس گذرے ہوئے دور کی مختلف زندگیوں کو ہمیشہ پا سکتے ہیں۔ قریب سے مل سکتے ہیں اور ان کی ذہنی تہوں سے آشنا ہو سکتے ہیں۔

خوجی آزاد، حسن آرا، مولانا مقدس، نازک بدن بھٹیارن معلانی اکٹر فون یو ازعفران میان جواد سب نمایندہ کردار ہیں جن کی زبان خیالات اور آداب معاشرت کو دیکھ کر ہم نئے اور پرانے زمانے کے اس سنگین دور کو بالکل اپنی اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں اور سرشار کا طرز بیان ہے جو ان لوگوں کے وجود میں زندگی اور دلچسپی کی روح پھونکتا چلا جاتا ہے ان کے یہاں اب سے سو برس پہلے کی قافیہ پیمائی کی لذت اور مقفیٰ و مسجع عبارتوں کی رنگینی بھی گھلی ہوئی ہے۔ یعنی روایت کا بھی احترام ہے اور نثر کی سلاست روانی اور تیز تیز قدم اٹھانے اور بے ضرورت لفاظی سے دامن بچائے رہنے کی احتیاط بھی موجود ہے یعنی روایت سے بغاوت کرنے اور اپنی انفرادیت یا اپنا جداگانہ طرز بیان پیدا کرنے کا ولولہ بھی طرزادا میں روایت اور بغاوت کا یہ پیوند اور تقلید و آزادی کی یہ ہم آہنگی۔ میں پھر کہوں گا کہ خدا ان کے خیالات اور گہرے فن کارانہ مشاہدے کا نتیجہ تھی جس نے انہیں جاگیرداری عہد کی سسکتی ہوئی بدبودار قدروں سے نفرت سکھائی تھی اور نئے صحت مند مستقبل کی قدروں سے محبت اس لیے روح اور مجہول ماضی کے نمایندہ کردار خوجی نواب صاحب اور شعرائے غزل گو غلامی، فہامی، جامی، وقار اور جواد ہیں اور تندرست روشن خیال مستقبل کے نمایندے کردار میاں آزاد اور حسن آرا ہیں۔ جن کی محبت بھی بے لوث ہے بے لگام نہیں۔ جرات طلب ہے عیش پرست نہیں جن کے دماغوں میں نئے عہد کی روشنی ہے زبانوں پر مغربی ادب کی چاشنی ہے اور دلوں میں نئی فتوحات کی لگن خوجی پر ہم تحقیر سے قہقہا لگاتے ہیں۔ غزل پرست میاں جواد کی جب بھٹیارن درگت بناتی ہے تو ہم دور ہی سے مسکرا دیتے ہیں۔ اور میاں آزاد جب اپنی نیچریہ شاعری اور مسلسل غزل یا نظم پڑھتے ہیں اور جابجا میدان کارزار میں فتوحات دکھاتے ہیں تو ہم خدا ان کی ہم نوائی کی امنگ پاتے ہیں

غزل

زبیدہ خاتون نشاط (لکھنوی)

نہیں جب ڈھونڈھنے سے بھی ترا ملتا نشاں ہم کو
تو پھر پیدا کیا کیوں تو نے خلاق جہاں ہم کو

رہے حمد و ثنا میں جو تری مصروف ہر لحظہ
جو دینا ہے تجھے یارب تو دے ایسی زباں ہم کو

محمد مصطفےٰ صلی علیٰ وہ نام نامی ہے
ملی صدقہ میں جن کے دولت کون و مکاں ہم کو

مزہ آجائے گا روز قیامت جب سنائیں گے
ہم اپنی داستاں ان کو وہ اپنی داستاں ہم کو

نشاط آئے گا محشر میں ہمیں جب ڈھونڈھنے کوئی
تو دامن میں چھپا لیں گے شفیع عاصیاں ہم کو

بنگالی ادب (دور قدیم)

ڈاکٹر سری کمار بینرجی

اگرچہ بنگالی زبان نے طویل اور مختلف تبدیلیوں اور مرحلوں سے گذر کر ہی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ لیکن بنگالی ادب ایک ہی زقند میں بلوغ کو پہنچ گیا تھا "چریاپد" غالباً دسویں صدی میں لکھا گیا اور اگرچہ وہ ہندو اور بدھ تخیلات کا مرکب تھا لیکن خیالات اور صحیح طرز تحریر کے لحاظ سے وہ حیرت انگیز طور پر پختہ اور جامع تھا اس میں روحانیت کو ایک بلند مقام دیا گیا ہے اور اس جہان فانی کی ناپائیداری کو دردمندانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ نجات کے لیے عبادت کے متعلق رسوم اور مقدس کتابوں کو عبث و بے سود قرار دیا گیا ہے۔ طرز تحریر تشبیہ اور پرواز تخیل کے اعتبار سے یہ نظمیں مکمل اور بلند پایا ہیں۔ ان میں عمیق مذہبی محسوسات پیش کیے گئے ہیں۔

وشنو ادب

اگرچہ بنگالی ادب کی ابتدا شاندار طریقے سے ہوئی لیکن اس کے بعد تقریباً تین صدیوں تک وہ کلی طور پر ایک ویران صحرا کا منظر پیش کرتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم فتوحات کے بعد بنگال میں عوام کی تخلیقی قوت ماند پڑ گئی۔ اور خیالات کے اظہار کے لیے انہیں کوئی رستا نہیں ملتا۔ ادب کے لحاظ سے یہ زمانا بنجر تھا۔ البتہ بارویں صدی کی جے دیو کی تصنیف "گیتا گوبند" سریلے گیتوں سے بھرپور ہے۔ جس کا کوئی دوسری کتاب مقابلا نہیں کر سکتی۔ اس سے ایک بات صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں عوام کے مذہبی جذبات میں تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ اور وہ کرشن اور رادھا کی پرستش میں مگن تھے۔

تین صدیوں کی خاموشی کے بعد جب بنگالی ادب پھر سے منظر عام پر آنے لگا تو وہ تین صورتوں میں ظہور میں آیا۔ اول سری چے تنیہ کے جذبات کی موجوں سے وشنو روایت کو تقویت حاصل ہوئی۔ اور دوسرے رامائن اور مہابھارت کی عظیم رزمیہ نظموں کا ترجمہ کیا گیا۔ تیسری "منگل کاویہ" جس میں نئے دیوتاؤں کا پرجوش سواگت کیا گیا۔ اس کے بعد درباری شاعر ودیاپتی نے نقد و نظر اور روحانیت سے ملے جلے جذبات کو ایک نئے روپ میں پیش کیا اور نامکمل نظم سری کرشن کیرتن کا مصنف بارو چاندی داس سوز و گداز اور شعریت کے لحاظ سے ایک بلند پایا شاعر تصور کیا جاتا تھا۔ البتہ اس کے مذاق میں اوچھاپن ضرور تھا۔

سری چے تنیہ

قرون وسطیٰ کے ادب اور زندگی کے لحاظ سے ۱۴۸۶ء میں سری چے تنیہ کا قیام ایک اہم حیثیت رکھتا ہے کیونکہ بنگال میں کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں ملتا جو عوام کی زندگی اور جذبات پر سری چے تنیہ کے برابر اثر انداز ہوا ہو۔ انہوں نے بنگالیوں کے دلوں میں جذبات کے تار کو چھیڑا۔ اور انہیں آسمان کی بلندیوں پر لے گئے۔ اس کے بعد بنگالی ادب کا سلسلا برابر جاری رہا۔ اور اس میں متواتر جذبات کا رنگ بھرا جاتا رہا جو "پداولی" سے صاف ظاہر ہے اس کے علاوہ چے تنیہ اور ان کے ساتھیوں کی سوانح عمریاں بھی کوئی کم اہمیت کی حامل نہیں۔ ان تاریخی رجحانات سے لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ اور وہ ذہنی توسیع میں ممد و معاون ثابت ہوئے کرشن داس کویراج کی تصنیف "چے تنیہ چرت امرت" وشنو دھرم کے متعلق معلومات اور تصورات کے اعتبار سے "ان سائیکلوپیڈیا" قرار دی جا سکتی ہے۔ حقیقت میں یہ فلسفہ عبادت اور نظم کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہے اس میں وفا اور ایثار کی جھلک پائی جاتی ہے اور روحانی خیالات کو ایسے دلکش پیرائے میں پیش کیا گیا ہے جس سے

انسان وجد میں آجاتا ہے۔ بہرحال اس سے چیتنیہ کی زندگی کے سچے حالات کا پتا چلتا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ چیتنیہ محبت کا سرچشمہ تھے اور انسانوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی تک مقدس کتابوں اور رزمیہ نظموں کے بے شمار ترجمے کیے گئے، لیکن ان میں سے کرتی باس کی "رامائن" اور کاسی رام داس کی "مہابھارت" لاثانی شہرت رکھتی ہیں۔ ان میں دھارمک کتابوں کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ ان میں عوام کی طرز زندگی اور شعار کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اور خیالات کو ایسے دردمندانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ بدترین مجرم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان میں سری چیتنیہ کی محبت اور خلوص کی جھلک عیاں ہے۔

منگل کا دیا "منگل کا دیا" میں بنگال کی زندگی کے ایک خاص پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بنگالی قوم مختلف فرقوں اور عناصر کا مجموعہ ہے۔ ان میں بعض تو آرین زمانے سے پہلے کے بھی قبائل شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنی رسومات کو برابر قایم و برقرار رکھا اگرچہ بعد میں ان میں آرین رنگ بھر آگیا۔

"منگل کا دیا" "دھرم منگل" "منسا منگل" اور "چاندی منگل" کے تین حصوں پر مشتمل ہے۔ جن میں ترتیب وار ہندو، بدھ مذہبوں کا ملاپ۔ ناگ دیوی کی پرستش اور قدیم قبایلی کی طرف سے چاندی کی پرستش کا اظہار کیا گیا ہے ان میں سے ایک بات مشترکہ ہے یعنی ان سب میں قدیم زمانے کی گھریلو زندگی کی جھلک پائی جاتی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ غلیظ اور گندے رہتے تھے ایک مرد کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں۔ اور خانگی جھگڑے زندگی کا معمول تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عورت کی غیر متزلزل وفاداری شجاعت وغیرہ کا بھی پتا ملتا ہے۔

قرون وسطا کے عظیم ترین شاعر مکند رام کا طنز حقیقت پسندی اور ظرافت کے اعتبار سے چاسر کے شاہکار سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے ان صاف اور واضح رجحانات کے علاوہ دوسرے مذہبی اور روایتی نظموں میں مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا۔ ان میں سے "گوپی چند اور مینا وتی" کے گیت قابل ذکر ہیں۔ جن میں یوگ اور نجات کے طریقوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان میں بعض جگہوں پر مافوق فطرت کارناموں۔ دنیا سے تیاگ اور دنیا کی ناپائیداری کو بے ڈھنگے سے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً "سواتا" میں شوجی کو ایک مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور انہیں ازدواجی جھگڑوں کا دائمی شکار بتایا گیا ہے۔ "میمن سنلا" میں عوامی گیت شامل ہیں جن میں عشق کی داستانیں اور فرقوں کے سماجی رسم و رواج درج ہیں ان میں تشبیہ اور تصورات کا یہ عالم ہے کہ جذبات کی رو دل سے بہتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں دھارمک اور غیر دھارمک دونوں قسم کے گیتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور ان میں زیادہ تر دیہاتی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ان میں خشک مزاجی کا عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ "باؤل" گیت ہندوؤں اور مسلموں کی مشترکہ پیداوار ہیں جن میں مذہبی کتابوں کی رسمی پابندی سے ہٹ کر دلی جذبات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ "سکتا پدولی" سے تغزل کا رنگ ظاہر ہوتا ہے جس میں ماتا کی پرستش کو مقدس درجہ دیا گیا ہے۔ اور اس کے برعکس اگرچہ دوسری جگہ کالی ماتا کو ایک خوفناک صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس سختی کے پیچھے محبت اور نرمی کارفرما

بھارت چندر قرون وسطا کے بنگالی ادب کا سلسلہ بھارت چندر کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ جو

چنڈی منگل کا پرستار تھا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ موجود زمانے کا پیشرو تھا۔ اس کی تصنیف "آنند منگل" میں دلی پرستش کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ اور شاعر طنز پر اتر آتا ہے۔ اور سماج پر بڑی نکتہ چینی کرتا۔ شاعر موصوف کی طرز تحریر ڈرائیڈن اور پوپ سے ملتی ہے۔ اس کے الفاظ چیدہ اور مہذب ہیں۔ وہ حقیقت میں دانشمندی کا مرقع ہے۔ اس میں کالی ماتا سے اخلاقی اور سماجی قوانین کی خلاف ورزی کے سلسلے میں پناہ کی درخاست کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں رنگا رنگ کی زندگی کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ حقیقت میں اس کی تصنیف قدیم اور جدید زبانوں کے سنگم کی مظہر ہے۔ جس میں مستقبل کی پیشین گوئی پائی جاتی ہے۔

غزل

(ابوالبیان) محضر سندیلوی

مٹا کر مثل نقش پا بنا کر بے نشاں ہم کو
گلے مل مل کے روتے ہیں زمین و آسماں ہم کو
چمن والے قفس والوں سے آخر تنگ آ کر بیٹھے
نہیں ملتی زمانے میں کہیں جائے اماں ہم کو
قیامت تک رہے برق و فلک دھوکے ہی میں کھوئیں
کوئی لے آشیاں سمجھا کوئی بے خانماں ہم کو
جہاں سے روشنی پائی تھی شمع زندگانی نے
وہیں پر کھینچ کر لائی ہے مرگ ناگہاں ہم کو
ہماری بادہ نوشی سے ابھی واقف نہیں ساقی
اسے بھی ہوش آ جائے گا غش آیا جہاں ہم کو
مخالف تم اہل بدظن زمیں تنگ و فلک دشمن
غرض اب آپ ہی مرنا پڑے گا مہرباں ہم کو
زبان اشک کچھ کہنے نہیں دیتی ہے اے محضر
مگر دل میں سمجھتے سب ہیں نباض زماں ہم کو

غزل

معراج (لکھنوی)

تسکین کو شب غم میں کلیجے سے لیے ہیں
جو زخم تری چشم عنایت نے دیے ہیں
کچھ دن تو غم و یاس کے برتے پہ جیے ہیں
اکثر تری نظروں نے سہارے بھی دیے ہیں
اب جن کا تصور بھی طبیعت پہ گراں ہے
ایسے بھی کئی زہر بھرے جام پیے ہیں
اترے ہوئے چہروں پہ تبسم نہیں اچھا
یہ وہ ہیں جو بار غم کونین لیے ہیں
چاک دل ہر گل پہ زمانے کی نظر ہے
ہائے وہ گریباں جو دامن میں سیے ہیں
انداز جنوں تب کہیں آیا ہے سمجھ میں
رشوت میں بہاروں کو گریباں دیے ہیں
فردوس محبت ہے ترے غم کی نوازش
زندہ ہیں وہی لوگ جو مر مر کے جیے ہیں
اک کیف جہاں تاب ہے اک نعمت نایاب
معراج وہی درد جو سینے سے لیے ہیں

(تیسری قسط)

عبد اللہ ابن المقفع

تمکین کاظمی

کلیلہ دمنہ ابن المقفع کی کلیلہ دمنہ سے متعلق کچھ پڑھنے سے پہلے آپ کے لیے یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کلیلہ دمنہ کیا ہے؟ پٹنے یا پاٹلی پتر یا جنوبی ہند کا کوئی راجا تھا، جہیلا نامی جس کے تین لڑکے تھے مگر یہ تینوں نہایت غبی کند ذہن اور نکمے تھے راجا نے ان کی تعلیم و تربیت کی بہت کوشش کی مگر یہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر میں تنگ آکر راجا نے اپنی حکومت بھر کے پانچ سو عقلمند امیروں، وزیروں، عالموں، فاضلوں کو دربار میں بلاکر اپنے ان لڑکوں کا قصہ بیان کیا کہ "ایسی اولاد کس کام کی جو علم اور عقل حاصل نہ کرے۔ اور ایسی گائے سے کیا فائدہ جو دودھ نہ دیتی ہو۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میرے اولاد ہی نہ ہوتی۔ اب آپ لوگ غور فرمائیں اور کوئی ترکیب ان لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی بتائیں۔" ایک پنڈت جی نے کہا کہ ان لڑکوں کو بارہ سال تک قواعد زبان پڑھایئے۔ پھر منو کا دھرم شاستر اور چانکیا کے ارتھ شاستر اور واتسیاینہ کے کام شاستر کا مطالعہ کرایئے۔ دوسرے نے کہا زندگی مختصر اور فانی ہے۔ علوم و فنون حاصل کرنے کے لیے بڑی مدت درکار ہے اس لیے کوئی ایسا طریقہ ہو جو مختصر اور مفید ہو۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ دودھ بلوئیں اور مکھن یا بالائی راجکماروں کو دیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہنس دودھ میں سے پانی الگ کرکے دودھ پی جاتا ہے اور پانی چھوڑ دیتا ہے۔ خوش نصیبی سے ہم میں وشنو شرما جیسا شخص موجود ہے۔ جس نے تمام علوم و فنون میں نہ صرف کمال حاصل کیا ہے بلکہ اپنے طالب علموں کے ذہن میں ہر بات بہ آسانی بٹھانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے وہ بہت ہی کم مدت میں شہزادوں کو تعلیم دے سکے گا۔

راجا نے اسی وقت وشنو شرما کو بلایا اور کہا محترم استاد! میرے بچے آپ کی توجہ کے محتاج ہیں۔ مجھ پر مہربانی فرمایئے اور انہیں تعلیم و تربیت دیجیے۔ میں ہمیشا کے لیے آپ کے نام ایک سو گاؤں بطور جاگیر اس محنت کے صلے میں مقرر کرتا ہوں۔ وشنو شرما نے جواب دیا "میں وہ شخص نہیں ہوں جو اپنا علم اس طرح بیچتا پھروں۔ آپ کے سو گاؤں کی میرے پاس کوئی قیمت نہیں ہے۔ میں ایک استاد ہوں اور طالب علم کو سکھانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ چھ مہینے میں یہ راجکمار سیاست مدن اور علوم دنیوی میں ماہر ہو جائیں گے۔ راجا نے ان لڑکوں کو وشنو شرما کے حوالے کرکے اطمینان کا سانس لیا۔ وشنو شرما نے ان لڑکوں کو گھر لاکر تعلیم دینی شروع کی۔ اور اپنی تعلیم کو پانچ تنتروں تک محدود کر دیا۔ ان پانچوں ابواب یا تنتروں میں علوم و فنون سیاست اور مذہب کو قصوں کے پیرائے میں بیان کیا گیا تھا جن کی تقسیم یوں تھی۔

۱۔ متر بھید۔ یعنی دوستوں کو کیسے ایک دوسرے سے جدا کیا جائے۔

۲۔ متر سمپراپتی۔ یعنی دوستوں کو کیسے حاصل کیا جائے

۳۔ کاکولوکیم۔ یعنی کوؤں اور الووں کی جنگ۔

۴۔ لبدھ پرناشنم۔ یعنی اپنی کمائی کا نقصان۔

۵۔ اپریکشت کارکم۔ یعنی جلدی میں جو کام کیے جاتے ہیں ان کے کیا نتیجے ہوتے ہیں۔

ان قصوں کے کردار لومڑی۔ شیر، ریچھ، بیل، کچھوے

کوے، الو، چوہے، بندر، مگرمچھ، مرد عورتیں اور دیوتا تھے۔ اور ان قصوں کو اس عمدگی سے بیان کیا گیا تھا کہ یہ غبی شہزادے ان واقعات کو جو افسانوی حیثیت رکھتے تھے حقیقت پر محمول کر کے دل چسپی لینے لگے۔ اور پانچ ہی مہینوں میں ان کو یہ پانچوں تنتر حفظ ہو گئے، جن کی وجہ سے یہ لڑکے نہ صرف امور سلطنت اور امور دنیوی میں ماہر ہو گئے، بلکہ نظم و نثر بھی لکھنے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان قصوں کا طرز بیان نہایت ہی دل کش تھا۔ اس طرح یہ قصے عام ہو گئے۔

ان قصوں کی ترتیب یا تالیف دوسری صدی قبل مسیح میں ہوئی۔ اور یہ قصے پلپے کی کہانیوں کے نام سے مغرب میں مشہور ہوئے۔ وشنو شرما کا لقب اپادھی تھا جسے پلپے بنا دیا گیا ہے۔ یہ پانچوں قصے "پنچ تنتر" کے نام سے مشہور ہوئے۔

پنچ تنتر کی تاریخ تصنیف و تالیف کے متعلق ہم کوئی تحقیق نہ کر سکے۔ گریٹ شارٹ اسٹوریز آف انڈیا کا ایک سلسلہ تارا پوری پبلشرز بمبئی نے شروع کیا تھا جس کے ضمن میں پنچ تنتر اینڈ ہتوپدیش کے نام سے ایک کتاب اے۔ ایس۔ پی، ایئر، ایم، اے (آکسن) آئی۔ سی۔ ایس کی بھی شایع ہوئی ہے۔ ایئر صاحب نے بڑی تحقیق کی ہے اور پنچ تنتر کا سنہ تصنیف دوسری صدی قبل مسیح ظاہر کیا ہے۔ مگر مستشرق المانوی ہرٹل (HERTEL) نے اس کا سنہ تالیف یا تصنیف ۳۰۰ع بتایا ہے (۱) جب اس نایاب کتاب کی شہرت ہوئی اور ایران تک پہنچی تو انوشیروان (۵۷۹-۵۳۱م) سن گرویدہ ہو گیا۔ اور اس نے بڑی کوشش سے کتاب منگوائی اور سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ کرایا۔ چونکہ اس قصے کے دو کردار دو لومڑیاں ہیں جن کا سنسکرت نام کرٹکا اور دمنکا ہے۔ اس لیے پہلوی ترجمہ "کلیلگ و دمنگ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اور ابن المقفع نے اس کو کلیلہ دمنہ بنا لیا۔

کلیلہ دمنہ آج جس صورت میں ہمارے سامنے ہے وہ تین طریقوں سے مرتب ہوئی ہے اور وہ قصے جو ہندی یا سنسکرت ہیں اور اصل کتاب یعنی پنچ تنتر میں ہیں۔ دوم وہ داستانیں جو ایرانیوں نے ترجمہ کرنے کے بعد اضافہ کیں۔ سوم وہ ابواب جو زبان عربی میں ترجمہ کرتے وقت بڑھائے گئے۔ مگر اصل حصہ وہ پانچ کہانیاں ہیں جو عربی زبان میں ترجمہ ہو کر پانچ ابواب پر اس طرح تقسیم ہوئیں۔

۱۔ باب الاسد والثور ۲۔ باب الناسک المطوق،
۳۔ باب البوم والغربان ۴۔ باب القرد والسلحفاۃ،
۵۔ باب الناسک ابن عرس۔

جیسا کہ مشہور ہے پنچ تنتر کا ایک نسخہ انوشیروان کے عہد میں ایرانیوں کے ہات آیا اور انہوں نے ان میں کے بعض قصوں کا ترجمہ سنسکرت سے پہلوی میں کیا اور اس کا نام کلیلگ دمنگ رکھا۔ ان پانچ قصوں پر تین ابواب کا اور اضافہ کیا گیا۔ میں ان تین ابواب کے اضافے کے علاوہ بعض عربی نسخوں میں دو باب اور بھی نظر آتے ہیں۔ (باب ملک الجرذان وزرائہ، باب الحمامۃ والثعلب والمالک الحزین) اس طرح عربی کلیلہ دمنہ نو ابواب یا داستانوں پر مشتمل ہے اور سابق الذکر دس ابواب کو ملا کر انیس ابواب پر حاوی ہو جاتی ہے۔ (کلیلہ فارسی یعنی ترجمہ ابو المعالی میں بعثت برزویہ اور عرض الکتاب کو مقدمہ میں مختصر کر کے شریک کر دیا ہے۔ اور بقیہ ابواب کا جن میں باب ملک الجرذان ودونسائہ و باب الحمامۃ والثعلب و مالک الحزین شریک نہیں ہیں خفیف سی تبدیلی کے ساتھ ترجمہ کیا گیا ہے۔ صاحب الفہرست (۱) کا بیان ہے کہ "کلیلہ دمنہ کے سترہ باب ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ اٹھارہ باب ہیں۔ اور میں نے ایک نسخہ ایسا بھی دیکھا ہے جس میں دو باب اور بھی ہیں۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ تالیف الفہرست یعنی ۳۷۷ھ میں جو ابن المقفع کے دو ہی صدی بعد کا زمانہ ہے کلیلہ کے

ابواب میں اختلاف موجود تھا۔

کلیلہ کی دوسری نو داستانوں میں سے تین داستانیں (۱) باب السنور والجرذ (۲) باب الملک والطیر (۳) باب الاسد ابن آدی مہابھارت کے بارویں باب سے لے کر کلیلہ میں شریک کیے گئے ہیں اور یہ چھ باب معلوم نہیں کہاں سے لیے گئے۔ (۲) الفحص عن امر دمنہ ۲ الرانی واللبوۃ، ۳ الناسک والضیف ۴ البلار والبراہمہ ۵ السایح والصائغ ۶۔ الملک واصحابہ یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ کلیلہ کے پہلے پانچ ابواب پنچ تنتر کے اور تین مہابھارت سے مقتبس ہیں کیونکہ یہ بلکل ہندی الاصل ہیں اور بقیہ داستانیں یعنی گیارھواں باب اور دوسرے چھوں باب پہلی دفعہ عربی ترجموں کی مختلف کتابوں میں دیکھے گئے۔ یہ ابواب اس سریانی ترجمے میں موجود نہیں ہیں جو ایک ایرانی عالم "بود" نامی نے کیا تھا۔ اور جو ۵۷۰ء میں مکمل ہوا ہے۔ اور پہلوی نسخے کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ یہ چھ ابواب عبارت ہیں بعثت برزویہ، عرض الکتاب، باب برزویہ طبیب، الفحص عن امر دمنہ الناسک والضیف الحمامۃ والثعلب و مالک الحزین سے یہ ابواب صاف طور پر الحاقی معلوم ہو رہے ہیں۔ ابتدائی تین ابواب کے متعلق تو کوئی شک ہی نہیں۔ کیونکہ یہ تینوں ابن المقفع ہی کے اضافہ کردہ ہیں۔

باب برزویہ جیسا کہ ابن المقفع نے اپنے (کلیلہ دمنہ کے) مقدمے میں اور فردوسی نے شاہنامے (در ذکر سلطنت انوشیروان) میں اور ثعالبی نے اپنی کتاب غرر اخبار ملوک الفرس میں بیان کیا ہے۔ کتاب کلیلہ و دمنہ کو ہندی (سنسکرت) سے فارسی (پہلوی) میں جس نے ترجمہ کیا وہ ایک طبیب تھا۔ انوشیروان کے خاص طبیبوں میں سے جس کا نام برزویہ تھا۔ کیونکہ انوشیروان کو پنچ تنتر کا حال سنکر نادیدہ عشق ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے اس کتاب کے حصول کے لیے طبیب کو ہندروانا کیا۔ اور طبیب نے بڑی محنت اور کوشش کے بعد اس کتاب کو بعض اور کتابوں کے ساتھ حاصل کیا۔ اور ایران لاکر ترجمہ کیا۔

ابن المقفع نے باب بعثت برزویہ میں پوری تفصیل ہندستان جانے اور کتاب حاصل کرنے اور ایران کی واپسی پر اس کے پرشکوہ استقبال کی لکھی ہے۔ جو انوشیروان کی طرف سے کیا گیا تھا۔ ابن المقفع نے لکھا ہے کہ اس خدمت کے صلے میں جو طبیب نے انجام دی۔ انوشیروان نے یہ اجازت دی کہ وہ کوئی چیز مانگے۔ اس پر طبیب نے بادشاہ سے یہ خواہش کی بزرجمہر کو حکم دیا جائے کہ وہ ایک باب اس کے (برزویہ طبیب کے) نام سے لکھے۔ جس میں اس کی محنت کی تفصیل ہو جو اس نے اس کتاب کے حصول میں اٹھائی۔ تاکہ اس کا نام بھی کتاب کے نام کے ساتھ قایم رہے۔ چنانچے انوشیروان کے حکم پر بزرجمہر نے باب برزویہ کا نام نظر آتا ہے اور نہ اس کے حالات ہی ملتے ہیں۔ اس لیے بعض محققین نے برزویہ کے وجود میں شک کا اظہار کیا ہے اور برزویہ کے وجود کو جھٹلاتے ہوئے سرے سے کلیلہ دمنہ کے پہلوی ترجمے ہی سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکے انہیں اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ (۱)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن المقفع سے پہلے پنچ تنتر کا ترجمہ ہندی (سنسکرت) سے پہلوی میں ہو چکا تھا گو کوئی معتبر شہادت اس کے متعلق نہیں ملتی۔ مگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس نے سنسکرت قصوں کو پہلوی میں منتقل کیا یا جس نے پنچ تنتر یا اس کے کسی حصے کا ترجمہ کیا اس کا نام برزویہ تھا مگر اس سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکالا سکتے کہ ابن المقفع نے باب برزویہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہے۔ کیونکہ یہ باب جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں خود ابن المقفع ہی کی انشا پردازی کا نتیجہ ہے اور اصل پہلوی نسخے میں اس کا وجود ہی نہیں ہے۔

(۱) الفہرست ص ۳۰۴-۳۰۵

(1) EDFNISON, ROSS FOREWORD TOTHE OCEAN OF STORY

پنچ تنتر کے پہلوی میں ترجمہ ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک ایرانی عیسائی پادری "بود" کے توسط سے ۵۷۰ء (نوشیروان کی وفات سے قبل) میں پہلوی سے سریانی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس ترجمے کی خبر مدت تک کسی کو نہیں ہوئی۔ ۱۲۸۷ھ میں شہر ماردین (ایشیائے کوچک) کے ایک معبد (کلیسا) سے یہ نسخہ نکلا اور بیکل (BICKELL) جرمنی مستشرق نے جرمنی زبان میں ترجمے کے ساتھ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں لپزگ میں چھپوایا۔ اور ایک دوسرے مستشرق بنفی (BENFY) نے بیکل کے نسخے پر ایک عالمانہ مقدمہ لکھا جس میں عربی ترجمے قدیم ترجمہ سریانی اور ان آثار کے متعلق جو پہلوی سے ترجمہ ہونے کی وجہ سے سریانی نسخے میں باقی رہ گئے ہیں تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور ایک مستشرق کیتھ فالکنر (۱) نے جو کلیلہ دمنہ انگریزی کے مترجم ہیں اپنے انگریزی ترجمے میں بنفی کی تحقیقات کو مختصراً بیان کرکے خود بھی تحقیق کی ہے۔ کلیلہ دمنہ کا پہلوی نسخہ یعنی برزویہ سے منسوب شدہ ترجمہ دوسری صدی ہجری کے وسط تک باقی تھا۔ اور جو لوگ پہلوی جانتے تھے اس سے بہرہ اندوز ہوتے تھے ابن المقفع نے اسی نسخے کا عربی میں ترجمہ کرکے فصاحت و بلاغت کا وہ شاہکار پیش کیا جو عربی ادب میں غیر فانی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد کلیلہ دمنہ کا پہلوی نسخہ بالکل ہی بھلا دیا گیا۔ اور دوسرے نفائس آثار عجم کی طرح یہ بھی مفقود ہوگیا۔ اس لیے کلیلہ دمنہ کے جتنے بھی ترجمے بعد کو دوسری زبانوں میں کیے گئے، وہ انہیں دونوں عربی اور سریانی ترجموں سے کیے گئے۔

اس سریانی ترجمے میں صرف دس باب ہیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ باب الاسد و الثور ۲۔ باب الحمامۃ و المطوقۃ ۳۔ باب القرد و السلحفاۃ ۴۔ باب الناسک و ابن عرس ۵۔ باب السنور و الجرذ ۶۔ باب البوم و الغربان ۷۔ باب الملک والطیر ۸۔ باب الاسد و ابن آوی ۹۔ باب البلار ۱۰۔ باب الملک ایجرداد و وزرائہ۔

آخری باب بعض عربی نسخوں میں ہے۔ بعض میں نہیں۔ بیشتر عربی ترجمے اور کلیلہ بہرام شاہی مترجمہ ابوالمعالی اس سے خالی ہیں۔ چونکہ یہ حکایت قدیم سریانی اور بعض عربی نسخوں میں موجود ہے۔ جو یورپ کے کتب خانوں میں ہیں۔ اس لیے مشہور مستشرق نولدیکے (۲) نے اس حکایت کی بعض نسخوں سے تصحیح کی ہے۔ اور اسے جرمن ترجمے کے ساتھ ۱۸۷۹ء میں چھاپا ہے۔ اور بعض اشارات کی بنا پر جو اس نسخے میں پائے جاتے ہیں ثابت کیا ہے کہ یہ باب ان ابواب میں سے ہے جنہیں ایرانیوں نے تالیف کرکے ساسانیوں کے عہد میں ہندی قصوں پر اضافہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان ابواب کی ترتیب بھی ابن المقفع کے ترجمے کی ترتیب سے مختلف ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ ابواب کی ترتیب اس لیے درست نہ رہ سکی کہ جیسے جیسے یہ ملتے گئے ان کا ترجمہ ہوتا گیا۔ اور غالباً یہی وجہ عربی نسخے میں ان ابواب کے موجود نہ ہونے کی ہے۔

اس کے علاوہ ابن المقفع کے تین باب یعنی بعثت برزویہ عرض الکتاب اور باب برزویہ طبیب کھلے طور پر ابن المقفع ہی کے تصنیف کردہ ہیں۔ مگر نیو کلمن کا عقیدہ یہ ہے کہ اور دو باب باب الفحص عن امر دمنہ اور باب الناسک و الضیف بھی ابن المقفع ہی کے ریختۂ قلم ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ:—

"ابن المقفع نے خصوصیت سے باب الفحص عن امر دمنہ کو تحریر کیا ہے تاکہ یہ ثابت ہوسکے کہ چغل خوروں کی کوشش بالآخر عدالت تک پہنچتی اور حق عدالت سیاست کو پہنچتا ہے اور بے گناہوں کا خون خالی نہیں جاتا اس طرح وہ چاہتا تھا کہ اس غیر اخلاقی اثر کو جو باب الاسد

دانشور کے نتیجے کے طور پر مترتب ہوتا ہے۔ زایل کرے (۱) ایروکلمن نے آگے چل کر یہ بھی احتمال ظاہر کیا ہے کہ ابن المقفع نے وہ فقرات جو اختلاف اصحاب مذاہب سے متعلق ہیں۔ اپنی طرف سے بڑھائے ہیں (۲)

اس خیال کی تائید ابوریحان بیرونی نے بھی کی ہے جو خود ہندستان میں عرصے تک رہ چکے ہیں اور سنسکرت سے بھی واقفیت رکھتے تھے ان کی عبارت یہ ہے۔

"اہل ہند نے علوم و فنون میں بہت بڑا ذخیرہ فراہم کیا ہے جو بے حد و شمار ہے۔ افسوس ہے کہ میں ان تمام سے واقف نہ ہو سکا۔ کاش مجھ سے یہ ممکن ہو سکتا کہ کتاب پنچ تنتر کا جو اس وقت میرے سامنے کلیلہ دمنہ کے نام سے موجود ہے، ترجمہ کر سکتا کیونکہ یہ کتاب ہندی (سنسکرت سے فارسی (پہلوی) میں اور پھر فارسی (پہلوی) سے عربی میں ترجمہ کی گئی ہے۔ اس طرح ایک زبان سے دوسری اور دوسری سے تیسری زبان میں منتقل ہونے کی وجہ سے اس میں خاصہ تغیر ہو گیا ہے — ابن المقفع نے اس کتاب پر باب برزویہ کا اضافہ اس غرض سے کیا ہے کہ سست عقیدہ لوگ امور دینی میں مشکوک ہو جائیں اور ان کو دین مانویہ کی طرف رغبت ہو۔ جب ابن المقفع کو اس باب کے اضافے پر متہم کیا جا سکتا ہے تو یہ بھی باور کیا جا سکتا ہے کہ ترجمہ میں بھی تصرف کیا گیا ہوگا۔" (۱)

اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ باب برزویہ ابن المقفع تالیف کردہ ہے اور اس سے غرض تھی مذہب مانویہ کی اشاعت و تبلیغ۔ مگر سر ڈینی سن راس (۲) کا خیال ہے کہ کلیلہ دمنہ کے پہلوی کے ترجمے کا قصہ خود گڑھا ہوا ہے۔ کبھی اس کتاب کا کوئی نسخہ پہلوی میں نہیں رہا۔ وہ اپنی رائے کی تائید میں یہ شواہد پیش کرتے ہیں۔

۱ - ابن المقفع کے عربی ترجمے میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ انہوں نے اس کتاب کا ترجمہ کس زبان سے کیا ہے۔

۲ - سریانی قدیم نسخے یعنی بود کے ترجمے میں باب برزویہ موجود نہیں ہے۔

۳ عبدیشوع اسقف نصیبین نے جن کا زمانہ قرن ہفتم ہجری کا ہے۔ ایک فہرست میں جو انہوں نے سریانی نسخوں کی مرتب کی ہے لکھا ہے کہ کتاب کلیلگ و دمنگ کا ہندی سے سریانی زبان میں جو ترجمہ کیا گیا وہ بود نے کیا تھا۔

مستشرق موصوف ان شواہد کو بیان کر کے کہتے ہیں کہ "اگر بولدکی اور بنفی کی بزرگی اس سے متاثر نہ ہو تو میں یہ کہنے کی جرات کرتا ہوں کہ ابن المقفع کو کلیلہ دمنہ کا کوئی پہلوی نسخہ نہیں ملا بلکہ ان کے ترجمے کی اساس وہی سریانی نسخہ تھا۔ جسے بود نے ترجمہ کیا تھا۔ اور اسی کو انہوں نے عربی میں منتقل کیا اور چند ابواب کا اضافہ بھی کر دیا۔

سر ڈینی سن راس کی رائے سے ہمیں ان وجوہ کی بنا پر اختلاف ہے۔

۱ - کسی جگہ اس تذکرہ کا نہ پایا جانا کہ ابن المقفع نے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ کس زبان سے عربی میں کیا ہے۔ کسی طرح بھی اس کی دلیل نہیں ہے کہ اس کا ترجمہ پہلوی سے نہیں کیا گیا۔ کیونکہ باب برزویہ میں (جو ابن المقفع کا لکھا ہوا ہے)

---

(1) ENCY. DE ISLAM -II-7-38. D

(۲) کلیلہ دمنہ عربی طبع لوئیس ص ۳۳ و ۴۱ و کلیلہ دمنہ بہرام شاہی ص ۲۲۵

(۱) کتاب تحقیق ما للہند من مقولۃ فی العقل او مرذولۃ ص ۷۶

(۲) SIR. DENISON ROSS. FOREWORD, THE OCEAN OF STORY. P. XI.

اس کتاب کو ہندستان سے ایران لانے اور اس کا ترجمہ پہلوی زبان میں کرنے کا سارا واقعہ موجود ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو نسخہ ابن المقفع نے ترجمے کے وقت سامنے رکھا وہ پہلوی ہی تھا۔ علاوہ ازیں مختلف شہادتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ابن المقفع نہ صرف پہلوی سے واقف تھے بلکہ وہ ان کی مادری زبان تھی۔" ابو المعالی مترجم کلیلہ دمنہ بہرام شاہی نے ابن المقفع کا قول نقل کیا ہے "جب میں نے دیکھا کہ اہل فارس نے اس کتاب کا ترجمہ ہندوی سے پہلوی میں کیا ہے تو میں نے چاہا کہ اہل عراق و شام کو بھی اس سے محروم نہ رکھوں۔ اس لیے لغت تازی میں جو ان لوگوں کی زبان ہے یہ ترجمہ کیا گیا۔ (۱)"

۲۔ ابن المقفع قدیم ترین ایران کے بزرگ ترین ماخذ اور واقف ترین شخص تھے۔ آج تک کوئی شخص ان معلومات میں ان کے برابر نہیں پایا گیا۔ اس لیے مستشرق موصوف کا یہ کہنا کہ "ابن المقفع نے داستان برزویہ اس خیال سے لکھی ہے کہ اپنے اہل وطن کا پایہ بلند کرے اور کلیلہ دمنہ کے ترجمے میں اولیت کا سہرا ایران کے سر باندھے" میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اگر ابن المقفع نے باب برزویہ کو جیسا کہ ابوریحان کا خیال ہے "تعلیم و اشاعت مذہب مانویہ کے لیے لکھا ہے" تو انہوں نے بڑی غلطی کی ہے کیونکہ ابن المقفع نے یہی کام نامۂ تنسر میں بڑی عمدگی سے انجام دیا ہے۔ پھر انہیں اس طرح تاریخ سازی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس لیے مستشرق سر ڈینی سن راس اور مستغرب ابو ریحان البیرونی دونوں کا خیال بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

۳۔ عہد نوشیروان کا سات سو سال کے بعد بود کی کلیلہ دمنہ کا دریافت کرنا ہندی سے ترجمہ کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ ابن المقفع نے پہلوی سے ترجمہ نہیں کیا۔ یا بقول سر ڈینی سن راس بود کے ترجمے سے ترجمہ کیا۔ در آں حالیکہ خود بود نے سریانی نسخے میں اس کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا کہ اس نے ہندی یا سنسکرت سے ترجمہ کیا ہے یا پہلوی سے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ سر ڈینی سن کا منشا یہ ہے کہ بود نے اپنا ترجمہ ہندی کتاب کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔

۴۔ ابوریحان کے علاوہ ابو حنیفہ دینوری (متوفی ۲۸۲) نے اپنی کتاب میں کلیلہ دمنہ کی موجودگی ابن المقفع سے پہلے ظاہر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہرام چوبین اس کا ایک نسخہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور جس منزل پر پہنچتا یہ منگوا کر مطالعہ کرتا تھا (۲)

۵۔ سب سے بڑی دلیل کلیلہ دمنہ کے زبان فارسی (پہلوی) میں موجود ہونے کی یہ ہے کہ بود کے سریانی ترجمے میں پہلوی کے بہت سے الفاظ موجود ہیں ان کی طرف نیقی نے سب سے پہلے توجہ کی ہے اور اپنے مقدمہ طبع اول میں اس پر بحث کی ہے۔

سریانی ترجمے میں باب البوم والغربان میں ایک چشمہ ذکر ہے جس کو پنچ تنتر میں "چندر آسرا" نام دیا گیا ہے۔ جس کے معنی چشمہ ماہ کے ہیں۔ سریانی نسخے میں اس چشمے کا نام ماہ خانی رکھا گیا ہے۔ جو ماہ اور خانی سے بنا ہے۔ ماہ بمعنی چاند، خانی بمعنی چشمہ حوض وغیرہ جیسا کہ نظامی گنجوی کہتے ہیں۔

زشرم آب آں رخشندہ خانی
شدہ در ظلمت آب زندگانی

شہر اصفہان کے جنوب مشرق میں ایک ایک شہر گاوخانی مشہور ہے۔ (۱) یہ دونوں لفظ پہلوی ہیں اور پہلوی طریقے ہی پر بنائے گئے ہیں۔ ابن المقفع نے اس کا ترجمہ عین القمر کیا ہے۔ اور ابو المعالی نے چشمہ قمر لکھا ہے۔

---

(۱) کلیلہ دمنہ بہرام شاہی صفحہ ۴۹
(۲) الاخبار الطوال صفحہ ۷۸۹
(۱) فرہنگ جہانگیری در ذیل لغت "خانی"

باب الاسد والثور میں سی مرغ کی حکایت ہے جس کا نام پنج تنتر میں گروڈا ہے اور سریانی ترجمے میں سیمر' جو فارسی سی مرغ سے لیا گیا ہے۔ ابن المقفع نے اس کا ترجمہ عنقا کیا ہے۔ (۲)

اگر بود نے سنسکرت سے سریانی میں ترجمہ کیا ہے تو پھر پہلوی لغت کا استعمال کس طرح ہوا؟ اس بنا پر یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ بود نے پہلوی سے سریانی میں ترجمہ اور ابن المقفع نے بھی پہلوی ہی سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

دوسرا ثبوت بود کے پہلوی سے سریانی میں ترجمہ کرنے کا یہ ہے کہ جن لومڑیوں کے نام بود نے کلیلگ و دمنگ لکھے ہیں وہ بھی پہلوی ہی ہیں کیونکہ پہلوی میں ہ ہمیشہ گ سے بدل جاتی ہے چنانچہ نامہ سے نامگ ور فیروزہ پیروزگ جامہ سے جامگ بنایا گیا۔ اور یہ طریقہ فارسی میں بھی لے لیا گیا ہے جو اب تک جاری ہے۔

بود اپنی کتاب کا نام بھی بدل نہ سکا۔ بلکہ وہی نام رکھا جو پہلوی میں تھا۔ مگر ابن المقفع نے ان دونوں آخر کے گ کو ہ سے بدل دیا۔ چنانچہ زبان تازی سے جو الفاظ عربی میں لیے گئے ہیں وہ اسی طرح بدلے گئے ہیں۔ بقول نولدکی ان الفاظ سے ثابت ہے کہ بود نے ترجمے کے وقت پہلوی نسخے ہی کو پیش نظر رکھا ہے۔

۶ - ابن المقفع کا سریانی زبان سے واقف ہونا غیر ثابت ہے کیونکہ کسی مورخ نے بھی یہ نہیں لکھا کہ ابن المقفع پہلوی اور عربی کے علاوہ کوئی اور زبان سریانی وغیرہ سے واقف تھے۔ یہ کھلا ثبوت اس بات کا ہے کہ ابن المقفع نے سریانی نسخے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اگر ابن المقفع سریانی زبان سے واقفیت رکھتے بھی تھے تو وہ پہلوی نسخے کی موجودگی میں سریانی نسخے سے ہرگز ترجمہ نہ کرتے کیونکہ ان کے لیے پہلوی سے ترجمہ کرنا زیادہ آسان اور اطمینان بخش تھا۔ بہ نسبت سریانی کے جو ان کے لیے غیر زبان تھی۔

لیکن باب برزویہ طبیب بہ لحاظ حکمت و اخلاق ابن المقفع کی فکر لطیف کا نقش جمیل اور شاہکار ہے۔ اس فاضل حکیم نے برزویہ کی زبانی تمام اطبا' حکما اور علمائے ادیان کے آرا پر بحث و انتقاد کیا ہے اور ان پر اصولی بحث کر کے اپنے طور پر اصول کا استنباط کیا ہے کہ قابل پیروی کو نسا مذہب ہے۔ خصوصاً ہر بے اساس دین کے پیچھے نہ پڑنا اور اعمال خیر کی مواظبت و ملازمت جو تمام دینوں کا نچوڑ ہے اور جو کچھ کہ عقل کی صحیح رہنمائی سے ہو اس پر ابن المقفع نے اصرار کیا ہے۔ محقق فاضل نولدکی نے اس باب کا ترجمہ اور تشریح جرمنی زبان میں کر کے ۱۹۱۲ء میں استراسبرگ میں چھپوایا ہے (۱)

کلیلہ دمنہ پہلوی سے ابن المقفع کے قلم سے عربی میں ترجمہ ہو کر اپنی تازگی موضوع حکم و مواعظ اور اخلاق و مدنی دستور وغیرہ کے لحاظ سے خاص چیز بن گئی ہے۔ بیشتر حکما اور علما نے اس سے انتخاب اور اختصار کیا ہے۔ چنانچہ مشہور ادیب اور شاعر آبان بن عبد الحمید اللاحق (۱) اور علی بن داود (۲) اور بشیر بن المعتمر نے اس کو عربی میں نظم کیا ہے اور سہل بن ہارون صاحب (۳) کتاب خانہ بیت الحکمت والبربد الاسود وغیرہ نے ایک کتاب موسوم بہ ثعلہ وعفرا در معارضہ کلیلہ و دمنہ لکھی۔

تبصرے
کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے
آنے ضروری ہیں۔ ورنا تبصرا
نہیں کیا جائے گا۔

KEITH FALCONER OP-CIT-LLIII.(2)
NOLDEKE, BURZOE EINLEITUNG ZU DEM(1)
BUCHE KALILAH WA DIMNA.

شاید کہ عید آئے

صبا نقوی

سنا ہے عید پھر آگئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ دن خوشیوں کی نوید لایا کرتا ہے — سنا ہے اس دن برسوں کے بچھڑے ہوؤں کا ملاپ ہو جاتا ہے — روٹھے ہوئے دوست من جاتے ہیں — جانی دشمن تک گلے مل لیتے ہیں۔ بہتوں کی مرادیں آج کے دن بر آتی ہیں — کہا جاتا ہے اس دن ہنسی ہونٹوں سے پھوٹ پڑتی ہے۔ چہروں پر بشاشت آسمان سے برستی ہے — تمام دنیا پر ایک دن کے لیے مسرتوں کا راج ہو جاتا ہے۔ رنج و غم کی عملداری اس دن معطل رہتی ہے اور جانے کیا کیا کچھ سنا جاتا ہے اس دن کے متعلق —

لیکن آج میں کیوں خوش نہیں۔ میرے دل کی دنیا پر غم کے بادل کیوں چھائے ہوتے ہیں۔ یہاں رنگینیاں کیوں نہیں رنگتیں میری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں — لبوں پر مسکراہٹ کیوں نہیں۔ میرا سینہ کیوں گھٹا جا رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پھٹ کر رہے گا — کیا غم و اندوہ حد سے زیادہ بخش دیا گیا ہے مجھے — یا تمام دنیا کا رنج میرے غم خانۂ دل میں پناہ لینے آگیا ہے۔ جبکہ ہر ایک نے مسرت کی آغوش میں پہنچ کر اسے دھتکار دیا ہے — آخر کیا ہو گیا ہے مجھے آج کسی دوسرے کو ہنستے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے مذاق کیا جا رہا ہے — میری ہنسی اڑائی جا رہی ہے۔

ہاں۔ ہاں۔ یہ دنیا ہے۔ اس دنیا والے جس طرح کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتے — جل بھن جاتے ہیں — اس کی مسرت بھری دنیا کو تباہ کرنے۔ اس کی خوشیاں چھیننے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اس دنیا میں غم نصیبوں کا بھی ٹھکانا نہیں — ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ طنز کے نشتر چبھوئے جاتے ہیں — زہر میں بجھی ہنسی کے تیر پھینکے جاتے ہیں۔ آوازوں کے کانٹوں سے رستا چلنا دشوار کر دیا جاتا ہے۔ جینا محال کر دیتے ہیں۔ بیچارے کا۔ آخر یہاں کوئی رہے تو کیوں کر — جیئے تو کیسے جیئے —؟

آج عید ہے — اور میں اس دنیا سے — ریاکار دنیا والوں سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لیے آج کا دن گذارنے یہاں چلا آیا ہوں۔ اس سنسان اور اجڑے گاؤں میں — لوگ آج کے دن عید کی رونق سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے شہر جاتے ہیں۔ اور میں شہر سے بھاگ آیا ہوں۔ شہر کے ہنگاموں سے دور — دوستوں سے دور — صرف آج کا دن گذارنے — تاکہ آج کا دن سکون سے گذر جائے — لیکن یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کسی چیز سے مفر یہاں بھی نہیں۔ وہ دن گئے جب شہر اور گاؤں کی دنیا الگ الگ ہوتی تھی آج تو دونوں جگہ ایک ہی جیسے انسان رہتے ہیں۔ شیطان صفت درندے۔ یہاں بھی ہر وہ شے موجود ہے جس کے لیے شہر والے مورد الزام ہیں۔ لیکن میں گاؤں کو بھی چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں۔ کتنی اچھی پناہ گاہ مل گئی ہے سبز سبز کھیت ہیں۔ گھنے پیپل کی گہری چھاؤں میں۔ ٹھنڈے شفاف پانی کی نہر کے کنارے۔ فطرت کی اس آغوش میں نیم دراز سوچ رہا ہوں۔ شاید دنیا کا کوئی فریب ابھی تک رسائی حاصل نہیں کر سکے گا۔ اب میں اس دغا باز دنیا کی دسترس سے بالکل باہر ہوں۔

یقین جانیے میں اس دور افتادہ گوشے میں بالکل غیر ارادی طور پر پہنچا ہوں۔ کل شام عید کا چاند دیکھتے ہی مجھے نہ جانے کیوں وحشت سی ہونے لگی تھی — گھر کے تمام افراد عید کی تیاریوں میں ساری رات نہیں سوئے۔ اور مجھے اس وحشت

نے آنکھ نہ جھپکنے دی۔ اب صبح ہونے سے پہلے میں بلا سوچے بغیر کسی کو اطلاع دیے اسٹیشن پر موجود تھا۔ اور پھر میں یہاں پہنچ گیا۔ نہ جانے کیوں۔ شہر میں اس وقت رنگ و بو کا طوفان بپا ہوگا۔ گھر والے خوشی سے جھوم رہے ہونگے عورت۔ مرد۔ بچے سے بوڑھے تک زیادہ سے زیادہ قہقہے لگانے کے لیے کوشاں ہونگے شاید میں اس طوفان سے گریز کی کوشش میں ہی یہاں آگیا ہوں۔ شاید یہ سوچکر کہ مسرت کے اس موقع پر یادوں کے چرکے میرے زخموں کو ناسور نہ بنادیں — لیکن یہاں آنے کے بعد کیا ایسا نہیں ہوگا — کیا تنہائی تمام ماضی کے حسن کو واپس نہ سمیٹ لائے گی — کیا دکھ نہ ہوگا۔ ان زخموں کو ہرا کرکے۔

شہر میں بھی عید کے کیا ٹھاٹ ہوتے ہیں۔ شہر سے عیدگاہ تک دورویہ طرح طرح کی رنگ برنگی جگمگ کرتی دکانیں۔ کچھ دور ایک میدان میں ہنڈولا اور جھولوں پر بچوں کا ہجوم مجمع لگانے والوں کی چاندی۔ شعبدہ بازوں کے گرد مجمع اور نماز کے بعد رنگ و نور کا سیلاب پھوٹ پڑتا ہے — چھ کیلے اور شوخ لباسوں کی سرسراہٹ۔ عطروں کی لہریں — کئی طرح کی خوشبوؤں سے لدی ہوئی ہوا کی موجیں — لال۔ گلابی۔ فیروزی۔ اور خصوصاً سیاہ ریشمی چکدار برقعوں کی شعاعیں حسین رخساروں کی تجلیاں — اور لمحہ بہ لمحہ گھنگروؤں کی آواز کی طرح بکھرتے والے سریلے قہقہے اور اس گہما گہمی میں کیا کچھ نہیں ہو جایا کرتا ! دیدار کے تمنائی نگاہ کی جھولیاں بھر لیتے ہیں — روٹھنے والوں کو منانے کا موقع ہات لگ جاتا ہے —

اور اس دن کی مرادیں جاننے والے دل کی گرہیں کھول لیتے ہیں۔ اور کون ہے جس کی تمنا بر نہیں آتی —

دوپہر کے بعد شام کو رونق کا یہ طوفان پھر ابھر آتا ہے۔ اور اس وقت اس کا مرکز باغ ہوتے ہیں۔ تمہیں نسیم باغ تو نہ بھولا ہوگا۔ جو شہر کے باغوں کی دلہن ہے اور جس کا سینا عید کی رونق کے نچوڑ کا امانت دار ہے — عید کی شام کو وہاں بلا شرکت غیرے راج ہوتا ہے اور کسی تختے پر تو بس آنکھیں چندھیا کر رہ جاتی ہیں — وہاں بھی خوب شغل ہوتے ہیں — کہیں تاش کی بازی لگی ہے — کہیں کیرم کا مقابلا عروج پر ہے — کسی طرف مٹھائیوں کے دونے خالی ہوکر جمع ہوئے جارہے ہیں — کہیں پھلوں کے چھلکے اور گٹھلیاں ڈھیر کی صورت اختیار کر رہی ہیں کئی جوڑے تالاب کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں — کچھ ٹولیاں خوش فعلیوں اور گپوں میں مصروف ہیں۔ فضا قہقہوں سے گونج رہی ہے — جو ان قہقہوں کی کھنک ہر دل کی امنگوں کو یکایک جوان کرتی محسوس ہوتی ہیں — اور یہ لے نکری۔ جوانی اور مسرت کی اس شام کے قریب تو غم کے فرشتے بھی پر نہیں مار سکتے —

یہ باغ بھی کتنی حسین یادوں کی جمع پونجی ہے۔ میری اور تمہاری پہلی ملاقات کا امانت دار بھی تو یہی باغ ہے اور آج کا دن اس ملاقات کی سالگرہ۔ میں اپنے دوستوں کی پارٹی کی تلاش میں تھا۔ اور تمہیں شاید کسی سہیلی کی جستجو تھی۔ دوپہر کی بارش نے پھسلن پیدا کردی تھی۔ کہیں کہیں کیچڑ بھی تھا۔ تمہارے جوتے کی ایڑی نے دغا کی۔ اور اگر میں قریب سے ہی فوراً سنبھال نہ لیتا تو تمہارے سر سے پاؤں تک کیچڑ کا پلستر ہو جانا ضروری تھا۔ تم اس اچانک حادثے سے اس قدر حواس باختہ ہوگئیں کہ غیر ارادی طور پر اپنی باہیں میری گردن کے گرد حمایل کرکے خود کو بالکل مجھ پر چھوڑ دیا۔ اور چند ہی لمحے بعد جب سنبھلیں تو بجلی کی سی چمک کے ساتھ دور جا کھڑی ہوئیں۔ تمہارا سانس بے قابو ہوا جارہا تھا — تمہاری نظریں شکست خوردہ ہرنی کی مانند نیچے تکے جارہی تھیں۔ تم سمجھ نہیں پارہی تھیں۔ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس کی تلافی کیوں کر ہو۔ تم نے بولنے کی لاکھ کوشش کی لیکن زبان نے یارا نہ کیا۔

اور تمہیں یاد ہوگا۔ کہ اس صورت حال کے خاتمے کی خاطر میں نے اپنا تعارف کرایا۔ اور تمہارے حواس درست کرنے کی خاطر تمہیں باہر اور باغ کے ایک گوشے میں ٹہلنے پر راضی کر ہی لیا ——— اور کچھ دیر بعد نہ تمہیں وحشت تھی نہ پریشانی۔ مجھے تشنگی تھی نہ اپنے دوستوں کے ملنے کی تمنا ہم نے ایک دوسرے سے مکمل واقفیت حاصل کی۔ موسم سے لے کر سیاست تک کے مسائل پر تبادلہ خیال کیا اور کتنی مسرت تھی ہم دونوں کو۔ جب ہم نے ایک دوسرے کو بڑی حد تک اپنا ہم خیال پایا۔ پھر یہ حسین ——— رنگین ——— انوکھی اور سہانی شام ——— ایک رنگین جادو ——— ایک ایک پیاری ملاقات اور بہت سی پیاری پیاری ——— متاع زندگی باتوں کی یاد اپنے سینے میں چھپائے رات کی تاریکی میں جا سوتی۔

اور اس کے بعد کی کسی عید کی یاد ذہن سے محو ہو سکتی ہے۔ جنہیں تمہارے وجود نے غیر فانی بنا دیا۔ اور وہ عید تو تمہارے دل میں بھی اب تک چٹکیاں لیتی ہو گی۔ جو تم نے ہمارے ہاں گذاری تھی۔ دو انسانوں کی زیرِ دستی کی ملاقات نے دو خاندانوں کو کس قدر قریب کر دیا تھا۔

اس عید کو تم ایک روز پہلے ہماری پہنچ گئی تھیں۔ تم نے اپنی تمام تر توجہ میرے کپڑوں اور دیگر ضروری چیزوں کی درستی پر مرکوز کیے رکھی۔ اور مجھے کس قدر تعجب ——— پشیمانی اور مسرت ہوئی تھی جب دیکھا کہ تم میرے جوتوں کو تک پالش کر چکی ہو۔ یاد ہے اس بات پر ہماری لڑائی ہوئی تھی اور پھر میں نے تمہیں منانے کی خاطر تمہارے چہرے کو دیکھ کر کہا تھا ———

"لو! میری تو عید ہو گئی ———"

"حیا اور مسکراہٹ کی سرخی تمہارے چہرے کو واقعی عید کے چاند سے بھی زیادہ حسین بنا رہی تھی۔ اور تمہارے ہوتے تو میری ہر رات بھی عید کی رات تھی اور دن بھی عید کا دن۔ تمہارے سوا کس چیز کی ضرورت تھی مجھے ———؟

ہم نے ——— رات کو جیسے تہیا کر لیا تھا کہ سوئیں گے نہیں۔ کُل کس قدر پروگرام بنائے تھے عید کے دن کے لیے۔ اور دیر سے سونے کی وجہ سے صبح جب میں جلد نہ اٹھا اور تم نے آ کر جگایا ——— تو عید کے دن آنکھ کھولتے ہی تمہارا تابناک۔ عید کے چاند سے بھی زیادہ پیارا چہرہ میرے سامنے تھا۔ تم صرف مجھے جگانے آئی تھیں واپس ہونے لگیں تو میں نے ہات پکڑ کر اپنے قریب پلنگ پر بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر بعد تمہارا چہرہ اوپر کرتے ہوئے پھر وہی فقرہ دہرا دیا۔

"لو! میری عید تو ہو گئی۔"

تمہاری بوجھل پلکوں نے نشیلی آنکھوں سے ذرا سا پردہ ہٹایا۔ اور پھر تمہارے لبوں سے بھی مسکراہٹ کی کرن پھوٹ کر کانوں کی لووں تک پھیلتی چلی گئی۔ مجھے اس وقت تم اتنی پیاری معلوم ہوتیں کہ ضبط کا یارا نہ رہا۔ تمہارے لیے اپنا سینا وا کر دیا اور تم بالکل ہرنی کی طرح اچھل کر اس طرف ہو رہیں۔ مگر تمہاری گرم گرم سانسیں میری رگوں میں ایک ابدی زندگی کا احساس پیدا کرتی رہیں۔ اور تمہارے دل کی دھڑکن میرے دل کی دھڑکنوں کے ہم آہنگ پاک محبت کا وہ نغمہ الاپتی رہی جس کے بول کبھی فنا ہونے والے نہیں۔ کتنے مسحور کن تھے وہ لمحات۔ کاش! طویل تر ہو جاتے۔ اس قدر طویل۔ کہ ہم اس دنیا سے کبھی واپس نہ آتے ———

ایک روز جبکہ میں نہا کر اپنے کمرے میں آیا۔ اور کپڑے تبدیل کر رہا تھا کہ تم دھڑ سے کواڑ کھول آ موجود ہوئیں ———

"اوہ ——— ٹھیک ہے کپڑے پہنا کیجئے تو پہلے کسی سے" تم نے مجھے سر سے پاؤں تک بغور دیکھتے ہوئے موہنہ بنا کر کہا۔ اور جب میں گھبرا کر آگے پیچھے سے اپنے کپڑوں کو دیکھنے لگا تو تم نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور میں جھینپ کر رہ گیا۔

"تو آپ پہنا دیجے ماسٹر جی!" میں نے خفت مٹانا چاہی۔ تم تو جیسے اسی انتظار میں تھیں۔ بلکل ماسٹروں کی طرح جھ کر پل پڑیں۔ اور میں نہایت فرمانبرداروں کی طرح تمہارے ہاتوں کے اشاروں پر چڑھ گیا۔ اس دن جیسا بنا و سنگار شاید ہی میرا کبھی کا ہے کو ہوا ہوگا۔ گویا اس میک اپ کے بعد مجھے فوراً اسٹیج پر جاکر بہت اہم رول ادا کرنا تھا۔

"کوئی روز لپ اسٹک وغیرہ؟" تم نے ڈریسنگ ٹیبل کی ہر چیز پر مشق کرنے کے بعد میری جانب استفہامیا نظروں سے دیکھا۔

"بس اب تو چھٹکارا ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔"

"لو! میری بھی عید ہو گئی!"

تم نے بلکل میری کاپی کرکے بدلا اتار لیا۔ میں نے تمہاری اس ادا پر آگے بڑھ کر تمہیں بازوؤں کی گرفت میں لینا چاہا لیکن تم سانپ کی طرح پھسل کر ایک جھپاکے ساتھ کمرے سے نکل گئیں۔

نماز پڑھ کر واپس ہوتے تو تم میرے کمرے کے دروازے پر میری منتظر تھیں۔ تمہاری کھلتی ہوئی بے پناہ میٹھی مسکراہٹ نے مجھے دور سے ہی عید مبارک کہا — میں تمہاری طرف بڑھا — مبارکباد دینے میں تم مجھ پر سبقت لے گئیں۔ اور میں نے ادھر ادھر دیکھ کر محبت سے تمہارے شکریں ہونٹوں کی تھوڑی سی شیرینی چرانی چاہی — تم شرما کر سمٹیں اور وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اس کے بعد تمام دن کا رنگا رنگ پروگرام کتنا حسین اور کتنا پر لطف تھا — کتنی رنگینیاں تھیں — کتنا تنوع تھا۔ کتنا میٹھا پن تھا — وہ عید تھی — دفعتاً عید۔

آج بھی عید ہے شاید —

کاش! میری دنیا میں ایک بار عید پھر سے آئے۔

غزل

فکرِ معاش بھی ہے تری جستجو بھی ہے
اک زندگی کے واسطے وہ بھی ہے تو بھی ہے

کتنا عجیب ہے یہ ترے میکدے کا نظم
یاں تشنہ کام دل بھی ہے جام و سبو بھی ہے

اے انقلاب تجکو الٹ پھیر کی قسم
اتنا بتا دے تجھمیں نیاز نگ و بو بھی ہے

اے تشنگیِ شوق مبارک کہ آج پھر
ساقی نازنیں بھی ہے، جام و سبو بھی ہے

وا ہو اگر جو دیدۂ عبرت تو تیرے پاس
چاکِ جگر کے واسطے تارِ رفو بھی ہے

آزادیِ حیات ہے جس زندگی کا نام
وہ زندگی کے واسطے طوقِ گلو بھی ہے

پل بھر میں صاف کر دے جو دل کی کدورتیں
یہ بادہ حرام وہ آبِ وضو بھی ہے

کیوں کر نہ بزم اس کے اشاروں پہ جھوم اٹھے
وہ مطربا حسین بھی ہے، خوش گلو بھی ہے

جس سے رگِ حیات میں ہے تازگی صفیؔ
میری غزل کے ساز میں وہ آبجو بھی ہے

صفی احمد (بہاری)

استالن آباد

اعظم ظفر

تاریخ کے چند اوراق

چالیس سال پہلے پہاڑی دریا دیوشامبہ کے کنارے ایک چھوٹا سا تاجک کشلاک (وسط ایشیا کا گاؤں) آباد تھا جہاں صرف چند درجن کچے جھونپڑے تھے اس کا نام دریا کے نام پر دیوشامبے تھا۔

اس گاؤں میں رہنے والے دستکار اور کسان ایسی کچی جھونپڑیوں میں رہتے تھے جن میں چولے تک نہ ہوتے گاؤں میں نہ پانی کا نل تھا اور نہ گلیوں سڑکوں پر روشنی تھی۔ پانی مشک میں بھر کر بہشتی لاتے تھے۔

اکتوبر انقلاب کے بعد اس پچھڑے ہوئے گاؤں میں بڑے پیمانے پر تعمیری کام شروع ہوا۔ دیوشامبے میں نئے مکانات بن گئے اور سڑکوں کے کنارے کنارے درخت لگا دیے گئے۔ جو تاجک عوام کی ترقی کے آئینہ دار تھے۔ وہ عوام جو اب آزاد تھے اور جنہوں نے اپنی ریاست قایم کر لی تھی۔

اونٹوں کے کارواں کھاری دلدل کے وسیع و عریض علاقوں کو عبور کرتے ہوئے دور دراز ترمیز اسٹیشن سے تعمیرات کے کام آنے والی چیزیں مختلف قسم کا اور ساز وسامان صنعتی اور کھانے پینے کی چیزیں لے آتے۔ سوویت یونین کے ہر کونے سے معمار انجنیر ڈاکٹر تہذیبی کارکن اور ماہرین زراعت وہاں پہنچے۔

سوویتوں کی تیسری غیر معمولی کل تاجک کانگریس نے جس کا افتتاح ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں ہوا۔ پورے جوش وخروش سے تاجک سوویت اشتراکی جمہوریہ کے قیام سے متعلق ایک اعلان نامہ منظور کیا۔ کانگریس نے ایک تجویز منظور کی کہ دیوشامبے کا نام بدل کر استالن آباد رکھ دیا جائے، جو سوویت ایشیا کی سب سے نوعمر جمہوریہ کی راجدھانی بن گیا۔ شہر میں تعمیر کا کام اس قدر تیزی سے کیا گیا کہ بہت کم عرصے میں استالن آباد کو ایک بڑے صنعتی اور تہذیبی مرکز میں بدل دینا اور اسے ملک کے بہترین شہروں کا ہم پلا بنا دینا ممکن ہو گیا۔

اچھی سڑکوں کی کمی نے استالن آباد کو باہر کی دنیا سے الگ کر دیا تھا۔ صرف تنگ پہاڑی رستے اور چند سڑکیں اسے صرف قریب ترین ضلعوں سے ملاتی تھیں۔ اس کے باوجود شہر نے حیران کن حد تک تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ پچھلی جھونپڑیوں اور اجاڑ میدانوں کی جگہ اب پختہ مکانات، سڑکوں اور فٹ پاتھ نے لے لی ہے۔ اس زمانے میں وہاں ایک بہت بڑا میدان تھا جہاں اب استالن آباد کی بہترین عمارتوں (ہوٹل گورکی سنیما اور قانہ ماہرین) کا اجتماع ہے۔ اور جو فن تعمیر کے خوبصورت نمونے ہیں۔ جہاں آج ٹکسٹائل مل قایم ہے۔ اور جو سوویت یونین کے سب سے طاقتور صنعتی اداروں میں سے ایک ہے وہاں پہلے استالن آباد کے باشندے گھنی جھاڑیوں میں جنگلی سور اور جنگلی مرغابیوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ یکم ستمبر ۱۹۲۹ء کو ترمیز استالن آباد ریل کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ اس لائن پر چلنے والی پہلی گاڑی اسی دن استالن آباد پہنچ گئی۔

آج کا استالن آباد

کہتے ہیں کہ کسی ریاست کی راجدھانی اس کا آئینہ ہوتی ہے اور کسی شہر کی ترقی عام طور پر اس کی آبادی کی ترقی سے پرکھی جاتی ہے۔

۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۴ء تک استالن آباد کی آبادی تیس گنی سے زیادہ بڑھ گئی۔ ہر سال نت نئے ادارے قایم ہوئے۔ جن میں سوتی مل اینٹوں کی بھٹیاں ریشم مل

اور چمڑے اور روئی کے کارخانے اور بجلی گھر بھی شامل ہیں۔

استالن آباد میں بڑے پیمانے پر صنعتی تعمیر خاص طور پر جنگ سے پہلے کے پنج سالہ منصوبوں کے دوران عمل میں آئی۔ اس دور میں کھانے پینے کی چیزوں کو ڈبوں میں بند کرنے والا ایک کارخانہ، تیل نکالنے کا ساز و سامان بنانے والا کارخانہ اور جوتوں کا کارخانہ قایم ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں تاجکستان کے سب سے بڑے اداروں میں سے ایک مل یعنی سوتی کپڑے کے کارخانے میں کام شروع ہوا۔ جنگ سے پہلے کے پنج سالہ منصوبوں کے دوران شہر کے صنعتی اداروں کی تعداد بڑھ کر ۱۱ سے ۱۵۵ ہو گئی۔

جہاں صنعت کو ترقی دی جا رہی تھی وہاں ساتھ ساتھ رفاہ عام کے کاموں کی منصوبہ بندی اور تنظیم کا کام بھی ہو رہا تھا۔ سب سے پہلا پانی کا نل ۱۹۳۱ء میں لگا۔ اب پائپ لائن کی لمبائی ۹۶ کلو میٹر ہو چکی ہے۔

شہر کی خاص خاص سڑکیں اور چوک پختہ کر دیے گئے ہیں۔ خوب صورت فوارے تعمیر ہو گئے ہیں۔ درخت اگائے گئے ہیں۔ اور پھولوں کے باغ لگا دیے گئے ہیں۔ استالن آباد کو بجا طور پر باغوں کا شہر کہا جا سکتا ہے۔ شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلی ہوئی سایہ دار گلیاں اور پارک شہریوں کو موسم گرما کی شدید گرمی سے بچاتی ہیں۔

شہر کا بجٹ جس کا دو تہائی حصہ سماجی اور تہذیبی کاموں میں خرچ ہوتا ہے سال بہ سال بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۵۳ء تک شہر کا رقبہ ۱۵ گنا بڑھ گیا۔ اور مکانات کی تعمیر کا خرچ ۹۰۰ گنا سے زیادہ ہو گیا۔ استالن آباد میں کئی منزلہ عمارتیں ہیں جن کی تعمیر میں پرانی تہذیب کے ورثے یعنی قومی امتیازی خصوصیات اور جدید طرز تعمیر کو یکجا کیا گیا ہے۔

تعلیمی و تہذیبی اداروں کا شہر

آج استالن آباد میں پانچ اعلا تعلیمی ادارے قایم ہیں — تاجک ریاستی یونیورسٹی، ایک زراعتی اور ایک طبی ادارہ اور دو تعلیمی ادارے۔ اس کے علاوہ شہر میں بہت سے ثانوی اسکول اور ۱۳ مخصوص قسم کی تعلیم کے ثانوی ادارے کھولے گئے ہیں۔

۱۹۴۲ء میں سوویت یونین کی سائنس اکادمی کی تاجک شاخ استالن آباد ہی میں قایم ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں یہ تاجک سوویت اشتراکی جمہوریہ کی سائنس اکادمی میں بدل دی گئی۔ ۱۹۴۹ء ہی میں استالن آباد میں عام ثانوی اسکول کی تعلیم کو لازمی قرار دے دیا گیا تھا۔

۱۹۵۴ء میں تعلیم عام کے لیے دو کروڑ پچاس لاکھ روبل منظور کیے گئے۔ فن اور تہذیب کو ترقی دینے کے لیے بڑی بڑی رقمیں خرچ کی گئی ہیں۔ تاجک اوپیرا اور بیلے تھیٹر جن کو لینن کا اعزازی تمغا مل چکا ہے۔ تاجک اور روسی تھیٹر اوپیرا، ادارہ موسیقی، ۸ سینما گھر، ۳۹ سے زاید کتاب گھر اور دار المطالعہ، ۳ عجائب گھر، ۴ پارک اور دو اسٹیڈیم اسی شہر میں قایم ہیں۔ تاجک، ازبک اور روسی زبانوں میں ۷ اخبار اور دس رسالے استالن آباد سے شایع ہوتے ہیں۔

وہ بڑی عمارت جس میں ریاستی عوامی لائبریری قایم ہے ۱۹۵۴ء میں مکمل ہوئی۔ یہاں دس لاکھ جلدوں سے زاید کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ بہت سے قدیم اور قیمتی مشرقی قلمی نسخے اور مسودے یہاں محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ ضلع کی لائبریریوں کے علاوہ یہاں کلب گھروں اور صنعتی اداروں میں بھی لائبریریاں قایم ہیں۔ اس شہر میں ایک مرکزی بچوں کی لائبریری اور ایک شہر کی عوامی لائبریری بھی موجود ہے۔

صحت عامہ کی دیکھ بھال اور خبر گیری

صحت عامہ کی خدمات کے سلسلے میں بنیادی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں۔ انقلاب سے پہلے استالن آباد میں کوئی ہسپتال نہ تھا

اور یہاں کے باشندوں کو کوئی طبی امداد نہ ملتی تھی۔
اب یہاں سات بڑے طبی ادارے، ۲ زچہ خانے ۳۰ سے زیادہ شفاخانے اور کلنک بہت سے پولی کلنک اور بچوں کے طبی ادارے شہر میں قایم ہیں۔
استالن آباد کے گرد و نواح میں آرام گاہیں اور سینی ٹوریم تعمیر کیے گئے ہیں۔ اور علاج معالجے میں کام آنے والے معدنی اجزا والے چشمے بھی تعمیر ہوئے ہیں۔
استالن آباد وسط ایشیا میں اسب سے بڑے سائنسی صنعتی اور تہذیبی مرکزوں میں سے ایک بڑے مرکز کی حیثیت سے مستقل ابھر رہا ہے اور ترقی کر رہا ہے۔

غزل

(سردار) بلونت سنگھ فیض
ام۔ اے منشی فاضل

نئے سر سے جو رکھنا ہے بنائے آشیاں ہم کو
تو پھر خائف کریں گی کیا کڑکتی بجلیاں ہم کو

قفس میں لاکھ تکلیفیں سہی پھر بھی یہ راحت ہے
نہ ہے صیاد کا کھٹکا نہ خوف باغباں ہم کو

کبھی روتی ہوئی شبنم کبھی گرتی ہوئی بجلی
بہاروں میں نہ راس آئی ہوائے گلستاں ہم کو

قفس والوں کی فطرت کو چمن والوں سے کیا نسبت
مسرت ہے بہاروں کی نہ کچھ رنج خزاں ہم کو

نگاہوں میں ہماری ہیچ ہے دنیا کی رنگینی
زمانے بھر سے پیارا ہے ہمارا آشیاں ہم کو

جبیں محشر سے پہلے تیرے در سے اٹھ نہیں سکتی
بڑی مشکل سے ہاتھ آیا ہے تیرا آستاں ہم کو

بنائے آشیاں اے فیض پھر اک بار ہم رکھیں
اگر دو چار مل جائیں قفس میں تیلیاں ہم کو

ترنمات

حبیب

ترے حسن رنگیں کا دلکش نظارا
بنا ہے مری زندگی کا سہارا
وہ دزدیدہ نظریں وہ ان کا اشارا
کیا مار کر مجھکو زندہ دوبارا
نشیلی وہ آنکھیں وہ ڈورے گلابی
کسی جام رنگیں کا جیسے کنارا
سلامت رہو تم۔ بس اتنا بتا دو
مرے قتل پر تم کو کس نے ابھارا
تمہیں دل چرانے کی حاجت ہی کیا ہے
یہ دل بھی تمہارا ہے۔ میں بھی تمہارا
مرے ہوتے غیروں پہ مشق ستم ہے
تمہیں کس طرح سے ہوا یہ گوارا
سمجھتا ہے قاتل تمہیں جب زمانہ
کرو قتل عالم کو پھر آشکارا
مجھے داد مل جائے اپنے جنوں کی
جو تم کہہ دو دیوانہ ہے یہ ہمارا
نگاہوں سے بچ کر گزرنے جانے والے
تجھے بھی خبر ہے یہ کس نے پکارا
دم نزع اور روٹھ کر جانے والے
مجھے چاہیے زندگی کا سہارا
یہ کیا کہہ گئی تیری چشم فسوں گر
کہ اب پھر گیا ہم سے سارا زمانا
نہ تم کو پکاروں تو کس کو پکاروں
رہے ضبط غم کا نہ جب دل کو یارا
لب دم آیا مجھ اب میرا تڑپنا
کیا زندہ قاتل نے مجھکو دوبارا
حبیب اس ستمگر سے کوئی یہ پوچھے
کریں تیرے عاشق کہاں اب گذارا

حبیب ویرواڑی
(لکھنوی)

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

کراچی
مکرمی تسلیم!

آپ کا رسالہ "ہندستانی ادب" سات سال کے بعد نظر سے گذرا۔ پرچہ دیکھتے ہی بہت سی یادیں یاد آگئیں۔ مجھے حیرت ہے کہ اس قدر نامساعد حالات کے باوجود آپ کس طرح پرچے کو زندہ رکھ سکے! مضامین کا تنوع، نظموں کا معیار بہت ہی اچھا ہے اور معاونین بھی آپ کے ساتھ ساتھ ہیں۔

خانصاحب! کیا بات ہے کہ آپ کے پرچے میں ایک بھی اشتہار نہیں ہے۔ رسالے کے لیے اشتہار اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جسم انسانی کے لیے خون۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ذاتی کمزوری کو اس میں بڑا دخل ہے۔

اب تو اپنی پالیسی نرم کیجیے اور اشتہارات جس قیمت پر بھی ہوں حاصل کر لیجیے۔۔۔۔

عظیم الدین محسنت ایم۔ اے (عثمانیہ)

محبت کی باتوں سے عارضی طور پر دکھے دل کو تسلی تو ہو جاتی ہے مگر۔۔۔۔ یہ سچ ہے حالات انتہائی ناموافق ہیں لیکن علمی ادبی سیوا کا سر پر بھوت جو سوار رہے، قد کو زندہ درگور کیے پرچے کو پندرہ سال سے زندہ رکھا ہے نہ معلوم اس کی شمع حیات کی لو کب تک ہماری آنکھوں کو نور بخشتی رہے؟

اچھے لکھنے والوں کا تعاون ہمیشہ ہی حاصل رہے تو کسی رسالے کا معیار کیسے گر سکتا ہے۔! یہ سچ ہے کہ مبتدی لکھنے والوں کا دماغی معیار بھی بڑا ہوتا ہے۔ اس لیے ان کا منانا سمجھانا کوئی آسان کام نہیں! بہرحال ہم کسی نہ کسی طرح اس کٹھنائی پر بھی قابو پا لیتے ہیں۔ آپ بھی تو کچھ بات بنایے نا—!

اشتہار کے بارے میں پالیسی والیسی کچھ بھی نہیں! بات اصل یہ ہے کہ اشتہار دینے والے علمی ادبی رسالوں کو خاطر میں نہیں لاتے— اگر آپ کو ہمارے بیان میں شبہ ہو تو مذہبی اشتہارات فراہم کرکے بھجوا کر دیکھیے۔
ایڈیٹر

خانیوال (پاکستان)

جی۔ ام۔ خانصاحب۔ تسلیم!

۔۔۔۔ غم روزگار اور غم صحت مجھے تو کھائے جاتا ہے۔ لیکن جیے جاتا ہوں ؎

بری اور بھلی سب گذر جائے گی
یہ کشتی یوں ہی پار اتر جائے گی

آپ کی عمر اور صحت میں برکت ہو آپ پندرہ سال سے مخلصانہ طور سے ادبی خدمت کر رہے ہیں۔ ایسے ناگوار حالات میں اس مشکل کام کا انجام دینا آپ ہی کا حق ہے۔

آپ کا مخلص۔ دل محمد فضا جالندھری

"غم روزگار اور غم صحت" یہی دو بری بلائیں ہمیں بھی گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ آپ کا ہمارا معاملہ ایک سا ہے اور آپ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ دیکھیں یہ کشتی کب پار لگے! جب صحت ہی کا ناس ہو گیا ہو تو ایسی عمر میں برکت ہونے سے کیا حاصل— بحیثیت علمی ادبی خدمت انجام دینا لوہے کے چنے چبانے سے کم نہیں۔ کام کٹھن ضرور ہے مگر بفضلہ اتنا سے "مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں"۔ اب تو صرف علمی ادبی خدمت کے ایک خاص جذبے کے تحت اندھا دھند کام کیے جا رہے ہیں۔ جب ہماری بے لوث خدمات کا سب ہی کو اعتراف ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ رسالے کی توسیع اشاعت میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹایا جاتا۔ زبانی تعریفوں سے کون کام بن سکتا ہے۔ کچھ عملی اقدام بھی تو کر دکھائیں "ہمارے مہرباں"!
ایڈیٹر

تبصرے

تازیانے کتابی سائز۔ مجلد آرٹ پیپر کے دو رنگی گرد پوش کے ساتھ۔ کاغذ میکانیکل۔ لکھائی چھپائی نفیس حجم ۲۸۰ صفحے۔ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتا:۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ فریر روڈ۔ کراچی (پاکستان) ہندستان میں ترسیل زر کا پتا: اشتیاق بک ڈپو دیوبند (ضلع سہارنپور۔)

عربی کی مشہور کتاب "المنبہات" (علی الاستعداد لیوم المعاد) کا ترجما ہے۔ بہ قول مترجم اس کے مولف زین القضاۃ احمد بن محمد الحجی ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اصل مولف کے نام میں آج تک بھی اختلاف باقی ہے۔ یہ کتاب کافی مشہور اور مقبول ہے عربی ممالک اور ہندستان میں بھی کئی بار چھپ چکی ہے۔ حافظ محب اللہ پانی پتی نے ۱۲۸۳ھ میں تیسری بار اس کا ترجما شائع کیا تھا۔ اس کے بعد کانپور اور لکھنو وغیرہ سے اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں

اس کتاب کی حیثیت عربی زبان کی ادبی ریڈر کی سی ہے جس میں زبان و ادب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ عمدہ نصیحتیں بہترین مثالیں اور عبرت آمیز حکایتیں بھری ہوئی ہیں۔ جن سے یہ نتیجا نکالا جا سکتا ہے کہ مرغوب اور مطلوب امور کی انجام دہی پر فطرت انسانی کو ابھارا گیا ہے اور یہ تمام باتیں دین کے رموز و نکات اور شریعت کے اسرار و احکام کی شکل میں بیان کی گئی ہیں۔ مولف کتاب نے اپنے طور پر بہت ہی کم باتیں بیان کی ہیں۔ دراصل اس کتاب میں زیادہ تر قرآن کی آیتوں، حدیثوں اذکار صحابہ کرام اور بزرگان سلف کے ارشادات کو جمع کر دیا گیا ہے

مختصر یہ کہ زیر تبصرہ کتاب "پند و موعظت اور حکمت و نصیحت کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے۔ جس کو ایک خدا رسیدہ بزرگ نے عامۂ مسلمین کی نصیحت کی خاطر نہایت ہی دل نشین اور مرغوب انداز میں جمع کر دیا ہے۔ نصیحتیں کے چند بول عبارت مختصر۔ دل نشیں جملے زبان سلیس اور شگفتا پھر ترتیب انوکھی ہے۔"

ترجمے کے ساتھ عربی متن بھی دیا گیا ہے۔ ترجمے میں لفظی معانی کی پابندی کم کی گئی ہے۔ بہ قول مترجم یہ ترجما نہیں بلکے ترجمانی ہے۔ اسی لیے ترجمے میں سلاست و روانی پیدا ہو گئی ہے کتاب ہر نقطہ نظر سے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ شائقین اوپر کے پتے سے طلب فرما سکتے ہیں۔ "ا"

برگ سبز مجموعہ کلام ابومسلم صحافی۔ کراؤن سائز (۱۰۴) صفحات کاغذ نفیس لکھائی چھپائی عمدا مجلد قیمت عہ ملنے کا پتا مرکز ادب مشن روڈ کراچی۔

سرورق کے پیچھے ابو مسلم کی مختصر تصویر کونے پر چھپی ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین اور شاہد احمد دہلوی کی مختصر رائیں بھی اسی صفحے پر موجود ہیں۔ خلیق ابراہیم نے چند صفحات کا مقدما بھی لکھا ہے۔

ابو مسلم صحافی گذشتا چار پانچ سال سے لکھ رہے ہیں۔ اور خوب لکھ رہے ہیں۔ طبیعت میں غور و فکر سنجیدگی اور متانت ہے۔ جس کی وجہ سے اور لوگوں کی طرح "کانا اور لے دوڑی" کے اصول پر کام نہیں کرتے بلکے کہنے کے بعد غور کر لیتے اور پھر سمجھ سوچ کر چھپواتے ہیں۔ جس کا نتیجا یہ ہے کہ کلام میں پختگی پیدا ہو چلی ہے اور یقین ہے کہ یہی روش اگر رہے تو ابو مسلم ایک دن "مسلم شاعر" بن جائیں گے۔ زیر تبصرا مجموعے میں غزلیں، نظمیں رباعیاں، قطعات غرض سبھی موجود ہیں۔

نظموں میں بڑی روانی ہے مگر ترقی پسندی اور کمیونزم چھپا ہوا سا نظر آتا ہے۔ چنانچہ "تلاش سکون" نظم ہمارے اس دعوے کی غماز ہے اور "اقدار نو" بھی اس کی شاہد ہے۔ ایک آدھ گیت بھی نظموں کے ساتھ لکھا ہے

جس نے اس مجموعے کو گنگا جمنی بنا دیا ہے۔

قطعات بھی بڑے اچھے کہے ہیں مثلاً

میں مسرت سے بھول جاتا ہوں۔ تا بہ دور قبول جاتا ہوں
یاد آتا ہے جب کرم تیرا۔ ظلم دوراں کو بھول جاتا ہوں

(۴۶) غزلیں اس مجموعے میں موجود ہیں جن میں سے بیشتر اپنی یعنی خود ساختہ زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ غزلوں میں خاصی جان ہے۔ بقول ڈاکٹر اعجاز "بے اعتدالی یا بے راہ روی" مطلق نہیں اور بقول شاہد احمد "کلام میں خاصی روانی ہے۔ البتہ شاہد نے جو پختہ مشقی محسوس کی ہے وہ فی الحال پائی نہیں جاتی مگر یقین ہے کہ ابومسلم کا آئندہ چھپنے والا مجموعہ پختہ مشقی کا نمونہ ہوگا۔

آج کل غزل کہنے کا جو ڈھنگ اختیار کیا گیا ہے ابومسلم بھی اس کے مقلد نظر آتے ہیں، اور اس تقلید میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

بہرحال ابومسلم اچھا کہہ لیتے ہیں اور ان کا مستقبل نہایت ہی تابناک اور روشن نظر آ رہا ہے۔ "ت۔ک"

قصر بلند امام اکبر آبادی نہ صرف ایک کہنہ مشق مضمون نگار ہیں بلکہ صاحب تصانیف بھی ہیں زیر تبصرہ کتاب میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لوگ عام طور پر قرآن کا مطالعہ تو کرتے ہیں لیکن اس کے حقیقی مطلب اور مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے حافظ جی نے نفس مضمون کو سمجھنے کے بعد ہی یہ کتاب لکھی ہے چنانچہ خود ان کا یہ کہنا ہے کہ "میں نے اس کتاب میں انہیں آیات کو درج کیا ہے جنہیں بسیار غور و فکر کے بعد جن کے نفس مطلب کو میں سمجھ سکا ہوں"۔ ان کے اس خیال کی تائید پنڈت سندر لال نے اس طرح پر کی ہے "اس میں شک نہیں کہ جناب نے کلام مجید کا بہت غور سے مطالعہ کیا ہے اور خوب کیا ہے آپ کے خیالات میں تازگی ہے نیاپن ہے جان ہے اور آزاد خیالی ہے۔ مسلمان عام طور پر اسے پڑھ لیں تو ان کی آنکھیں کھلینگی اور سوچنے کی عادت پڑے گی"۔ تائید مزید جوش ملیح آبادی نے ان الفاظ میں کی ہے "یہ کتاب بڑے پایے اور بڑے کام کی ہے حافظ جی نے قرآن کی صحیح اسپرٹ اور صاحب قرآن کی تعلیم کے مغز کو سمجھنے کی طرح سمجھا۔ پھر کہنے کی طرح یہ کہا ہے اور مسلمانوں کو وہ صحیح راہ دکھائی ہے جو انہیں فلاح بہبود کی طرف بآسانی لے جا سکتی ہے۔ حافظ صاحب نے بے روح وظائف اور صوم و صلوٰۃ کے رسوم و قیود میں گھرے ہوئے مسلمانوں کو قوائے فطرت کی تسخیر اور ارض و سما کی سلطانی کی طرف آواز دی ہے اور یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ جو قوم دنیا میں نامراد رہی ہے وہ عقبیٰ میں بھی ناکام رہے گی"۔

"کاش اوہام گزیدہ مسلمان ان حقائق کی طرف متوجہ ہوں اور "قصر بلند" کے مطالعے سے ان کے ذہنوں میں وہ روشنی اور ان کے قوائے عمل میں وہ حرارت پیدا ہو جس کی صاحب "قصر بلند" کے دل میں آرزو ہے"۔

قیمت درج نہیں ہے اس لحاظ سے ۱۶۸ صفحے کی یہ کتاب۔ ایچ۔ ایچ امام اکبر آبادی آبکاری روڈ آگرہ سے مفت طلب کی جا سکتی ہے۔ "(ا)"

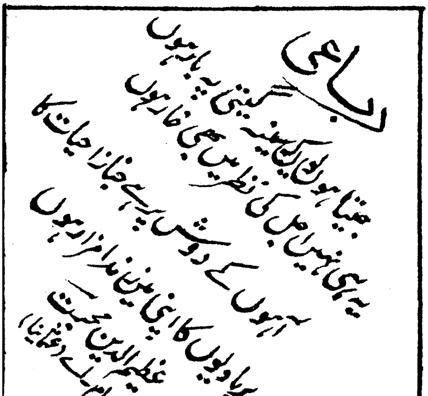

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی-ام-خان-ام-اے (عثمانیہ)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

جلد (۱۵) نمبر (۱۰)

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

شہریور ۱۳۶۴ ف جولائی ۱۹۵۵ء

چندہ سالانا آٹھ روپے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲	غزل	عزیز سیلانی	۱۳
حقایق و معارف	اقفر موہانی	۳	عبداللہ ابن المقفع	تمکین کاظمی	۱۴
ترانۂ دل	اعتبار الملک دل (شاہجہانپوری)	۴	غزل	صابر حسین صبا (لکھنوی)	۲۱
غزل	سراج (لکھنوی)	۵	چینی زبان کو صوتی یا آوازی اصول پر ڈھالنے کی تجویز	جو ہے چین کی تحریری زبان سدھار کمیٹی کے انتظامی ممبر	۲۲
مصور	سلام سندیلوی ام۔اے۔ ال۔ال۔بی ریسرچ اسکالر	۶	غزل	دلاور (لکھنوی)	۲۵
غزل	رؤف عباسی مدیر روزنامہ "حق" لکھنو	۷	سر انتھنی ایڈن سے ملیے	ولسن ہیرس	۲۶
تضاد	شبنم رومانی (بی کام)		ازبکستان کی عورتیں	عبدالحق	۲۷
ہندستان میں اعلیٰ تعلیم کی کہانی	ا۔ ا	۹	ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!	ایڈیٹر	۲۹
محمد حسین آزاد	عرش ملسیانی	۱۰	تبصرے	"ا" "ت۔ ک"	۳۱

ہمارے خیالات

چینی زبان اور آوازی (صوتی) اصول

چینی بھاشا یا زبان دنیا کی قدیم زبانوں میں ہے اس بھاشا کی لکھاوٹ خیالی علامتیں ہیں یعنی جس چیز کا تصور پیدا ہوا، علامتوں کے ذریعے تصویری حروف بنا دیے گئے چونکہ اس زبان کو وجود میں آئے ہزاروں سال ہوئے اس لیے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت تہذیب یا کلچر اس معیار پر نہ تھا کہ زبان کے لیے خاص خاص اور معین حرف ڈھالے جائیں۔ زمانا گذرتا گیا، زبان ترقی کرتی گئی یہاں تک کہ اس کے حرفوں کی تعداد ۲۰۰۰۰ تک پہنچ گئی یہ تعداد اس حد تک خطرناک ہے کہ اس کے بارے میں سنتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ایک ایسی کٹھن بھاشا کا سیکھنا آسان کام نہیں۔

موجودہ ترقی یافتہ دور میں چینی بھاشا کی مشکل پسندی خود چینیوں کے لیے وبال جان بن گئی ہے انہوں نے اس کو آسان بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے اسی سلسلے کا ایک مضمون آپ اس نمبر میں پائیں گے اس مضمون کے لکھنے والے ۷۹ چوبیہ چینی زبان کے ماہر اور عالم ہیں۔ یہ اس کمیٹی کے ایک ممبر بھی ہیں۔ جو چینی زبان کو آسان بنانے پر غور کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "چین کی تحریری زبان سیکھنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ کسی آوازی (صوتی) زبان کا سیکھنا" یہ ایک بالکل حقیقت ہے کہ آوازی یا صوتی زبان آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے چوبیہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ "قومی آزادی چینی عوام کے لیے تہذیبی ترقی کی خاطر سازگار حالات کا پیام لائی ہے لیکن چین کی تحریری زبان تعلیم اور کلچر کی توسیع اور فروغ علم و آگہی کی نشر و اشاعت اور نئے خیالات اور ہنر کو جذب کرنے میں ابھی تک ایک دشوار ذریعہ ہے۔ بعض اوقات جدید سماج کی زندگی کی ضرورتوں کے برابر اسے ڈھالنا مشکل ہوتا ہے

یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی تحریری زبان کو سدھارنے اور دھیرے دھیرے آوازی طریقے کو اختیار کرنے کی تجویز تیار کر رہے ہیں مختصر یہ کہ چینی بھاشا کو آوازی (صوتی) اصولوں پر ڈھالنے کی کوشش کی جا رہی ہے ـــــ کیوں؟ اس لیے کہ یہ بھاشا نہایت ہی کٹھن اور مشکل ہے صرف بھاشا کی مشکل پسندی کے سبب جیسا کہ وے چوبیہ نے کہا ہے۔ کئی ایک ترقیوں میں رکاوٹیں حائل ہیں۔ جب چینی بھاشا آوازی سانچوں میں ڈھلے گی تو آسان بن جائے گی۔ صرف ایک زبان کے آسان بن جانے سے کئی ایک دشواریوں کا حل نکل آئے گا ـــــ ہمارا کیا کہنا ہے ہم بھی تو یہی کہتے ہیں ہماری بھاشا میں بھی تو چند ایک کٹھنائیاں موجود ہیں اس کے سبب زبان جیسا کہ چاہیے ترقی نہیں کر رہی ہے۔ ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں کہ ہماری بھاشا بھی آوازی یا صوتی سانچوں میں ڈھلے۔ آسان سے آسان تر بنے۔ اس کو جنتا آسانی سے اپنا سکے۔ یہ پروان چڑھے ترقی کی منزلیں طے کرے اور کونے کونے میں اس کا بول بالا ہو۔ ہم اپنی بھاشا کو زیادہ سے زیادہ پھلتی پھولتی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے اس کو آسان بنانے کی ٹھانی اور آوازی یا صوتی اصول کی تحریک شروع کی۔ ہماری کوششیں آج تک بھی برابر جاری ہیں لیکن یہ کہتے ہمیں دکھ اور افسوس ہوتا ہے کہ دیس کے سنجیدہ سمجھدار اور عالم فاضل لوگوں نے تک اس معقول اور سائنٹفک تحریک پر "لبیک" نہ کہا۔ مگر ہم مایوس نہیں ہیں۔ ہمیں آشا ہے کہ ایک نہ ایک روز ہماری اس مفید اور کارآمد تحریک کی طرف لوگوں کا دھیان پڑے گا۔

بعض خاص مصلحتوں اور اسباب کی بنا پر ہم نے محض عارضی طور پر صرف نظم کی حد تک اپنی آوازی (صوتی) یا لپی کو بنا دیا ہے اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ ہم نے بار بار [illegible] کی ہے۔ بعض لوگوں کو اس قسم کی غلط فہمی ہوگئی۔ چنانچہ اس خصوص میں خطوط کے ذریعے ہماری لے دے کی گئی ہے۔ ہمیں اس کا مطلقہ تردد نہیں۔ ہمارے سامنے جو ہماری مقصد ہے اس کی اہمیت کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لیے ایسی واہی تباہی باتوں یا حمل [illegible]

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

مرنا پڑا کسی کے لیے جب خوشی کے ساتھ
ایسا بھی ایک دن تھا مری زندگی کے ساتھ

رہنا عبث ہے دہر میں اس زندگی کے ساتھ
انسانیت ہی جب نہ رہی آدمی کے ساتھ

ساقی پلائے جا، مجھے ساقی پلائے جا
آئے جو مجھکو ہوش بھی تو بیخودی کے ساتھ

اب دید کا سوال ہی باقی نہیں رہا
خود بن گئی ہے جلوہ نظر روشنی کے ساتھ

کم ظرفیٔ حیات بھی ساحل کی تشنگی
طوفاں میں ڈوبتا ہوں میں آسودگی کے ساتھ

ہولی کی عظمتوں کو وہی جانتے ہیں خوب
ملنے لگے ہیں جو کہ خلوص دلی کے ساتھ

سوز غم فراق ذرا اور اضطراب
ہے درد دل ضرور مگر کچھ کمی کے ساتھ

آغاز کا پتہ ہے نہ انجام کی خبر
دیوانے کی ہے بات بھی دیوانگی کے ساتھ

سنا ہے کتنی گور غریباں کی رات ہے
جلتا یہاں چراغ بھی ہے خامشی کے ساتھ

دھوکا نہ دے سکی مجھے عمر گریز پا
ہیں کب رہا یہاں ہوس دائمی کے ساتھ

ہر جام اک پیام نئی زندگی کا ہے
ہوتی ہے روح تازہ مری میکشی کے ساتھ

تیرا ہی گو خیال ہے تیرے سوا تو ہے
یہ بھی ہے کفر مجھکو جو سمجھیں کسی کے ساتھ

وہ جو نگاہ شوق میں لرزش بھی وقت دید
سمجھا میں جلوہ اس کو بھی جلوہ گری کے ساتھ

بیخود بنا سکیں گے نہ ہوش و خرد مجھے
جینا مجھے قبول ہے دیوانگی کے ساتھ

ہنس ہنس کے مجھکو دیکھنے والے خبر بھی ہے
سو بجلیاں گریں مرے دل پر ہنسی کے ساتھ

جلووں میں گم نظر ہے تو جلوے نظر میں گم
نظارہ و نظر ہیں ملے خیرگی کے ساتھ

منزل خودی کے بعد ملی مجھکو وہ جہاں
احساس بیخودی بھی نہیں بیخودی کے ساتھ

آزادی چمن ہے یہی، تو قفس ہے کیا
ہم بات بھی تو کر نہیں سکتے کسی کے ساتھ

اب کیا اٹھیگی سنگ در یار سے جبیں
سر ہی زمیں کا ہو گیا جب بندگی کے ساتھ

محشر پکارتا ہے کہ دنیا نہیں ہوں میں
یہ دن وہ ہے کہ کوئی نہیں ہے کسی کے ساتھ

افقر خلش ہی دل کی تو اصل حیات ہے
وہ دوستی کے ساتھ ہو یا دشمنی کے ساتھ

ترانۂ دل

اعتبارالملک دل شاہجہاں پوری

غم فراق کا ظاہر اثر نہیں نہ سہی — جگر تو خون ہوا آنکھ تر نہیں نہ سہی

مری نگاہ تو مایوس التفات نہیں — تری نظر میں مروت اگر نہیں نہ سہی

رہیں گے مست ہمیشہ شراب ہو کہ نہ ہو — ملے تو ہمت ساقی اگر نہیں نہ سہی

خیال عارض روشن تو وجہ تسکیں ہے — دل حزیں شب غم کی سحر نہیں نہ سہی

یہی ہیں سوز دل عندلیب کے معنی — قفس تو پھونک دے یا چند پر نہیں نہ سہی

نگاہ مست سے اوڑ کے دیکھنے والے — تجھے تو ہے مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی

یہ سوچتا ہوں کہ خود جا کے عرض حال کروں — ہوائے شوق تو ہے نامہ بر نہیں نہ سہی

حیا تو حضرت دلؔ اور دل لبھاتی ہے
کسی کی آنکھ میں شوخی اگر نہیں نہ سہی

غزل

سراج (لکھنوی)

ملنے کی طرح ہم سے وہ قاتل نہیں ملتا　　سو بار نظر ملتی ہے اور دل نہیں ملتا
اک لَو ہے چراغ سر محفل نہیں ملتا　　درد اپنی چمک دیتا ہے اور دل نہیں ملتا
ہر اشک میں آباد ہے دنیا مرے غم کی　　موجیں بھی ہیں گرداب بھی ساحل نہیں ملتا
مایوس محبت ہوں نہ کہنا مجھے کافر　　ڈھونڈے سے خدا ملتا ہے اور دل نہیں ملتا
ہر ذرہ ہے اک آئینہ شوق کا عالم　　اب میرے سوا کچھ سر منزل نہیں ملتا
اس شان سے مایوس کیا اہل کرم نے　　اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں تو سائل نہیں ملتا
تھی تشنگی اشک تو پایاب تھا دریا　　اب رونا جو سیکھا ہے تو ساحل نہیں ملتا
پھرتا ہوں ترے درد کو سینے سے لگائے　　اے دوست دہائی ہے تری دل نہیں ملتا
آ تو بھی ذرا میری پریشاں نظری دیکھ　　ساحل پہ ہوں اور کہتا ہوں ساحل نہیں ملتا
اک پردہ جو اٹھا بھی تو اک پردہ گرا بھی　　جب آپ نہیں ملتے تھے اب دل نہیں ملتا
ہم کیا کریں مجبور ہیں اے مرگ محبت　　جوش آتا ہے اور وقت پہ قاتل نہیں ملتا

کب ہوگی سراج آہ محبت کی ہم سر
ہم آپ میں ہوتے ہیں تو قاتل نہیں ہوتا

مصور

سلام سندیلوی، ام۔ اے۔ ال ال۔ بی
(ریسرچ اسکالر)

داسونت ایک ہنرمند مصور جس کو ۔۔۔ اکبری دور کا تابندہ ستارا کہیے
جس کے فن میں تھی نہاں مانی و بہزاد کی روح ۔۔۔ جس کی تصویر کو فطرت کا اشارا کہیے

جنبش موئے قلم کی شفق آمیزی سے ۔۔۔ نقش ہائے رخ فطرت کو ابھارا اس نے
لالہ و گل کی جھلکتی ہوئی سرخی لے کر ۔۔۔ حسن کے عارض رنگیں کو سنوارا اس نے

شاخ صندل کی لچک ساعد سیمیں کو دی ۔۔۔ چشم فتان کو غزالوں کی شرارت بخشی
لب رنگیں کو کیا رشک عقیق یمنی ۔۔۔ گیسوؤں کو شب دیجور کی ظلمت بخشی

کبھی پھولوں کے تبسم کی اتاری تصویر ۔۔۔ کبھی گلشن میں بہاروں کا حسیں عکس لیا
کبھی مہتاب کو موجوں پہ کیا سایہ فگن ۔۔۔ کبھی دریا میں ستاروں کا حسیں عکس لیا

دل کے جذبات کو چہرے پہ نمودار کیا ۔۔۔ پہونچی باریک نظر روح کی گہرائی تک
فکر و تخییل نے کی جذب و جنوں میں پرواز ۔۔۔ ناتراشیدہ صنم خانوں کی رعنائی تک

بام معراج پہ جب ذوق مصور پہونچا ۔۔۔ یک بیک عقل و خرد کھو کے وہ دیوانہ ہوا
خودکشی کر کے کیا تکملۂ فن لطیف ۔۔۔ شمع کے عشق میں برباد وہ پروانہ ہوا

کس لیے رنگ بن آمیزش خوں کی اس نے ۔۔۔ فن کی تکمیل کا یہ راز خدا ہی جانے
کس لیے توڑ دیے تار رباب ہستی ۔۔۔ کیوں شکستہ کیا یہ ساز، خدا ہی جانے

غزل

رؤف عباسی مدیر روزنامہ "حق" لکھنؤ

بٹھا لو خانۂ دل میں بلا کر مہماں ہم کو
کسی پہلو سے راس آ جائے دورِ آسماں ہم کو

نشانِ منزل کا دیتا ہے وہ بے نام و نشاں ہم کو
پتہ محمل کا دیتا ہے، غبارِ کارواں ہم کو

کلیجہ منہ کو آتا ہے کھٹک کچھ دل میں ہوتی ہے
مزہ دیتی ہی رہتی ہے ہماری داستاں ہم کو

یہ گلشن کیوں کھلایا تھا تماشہ گاہ عالم میں
اگر کرنا ہی تھا دم بھر میں پامال خزاں ہم کو

پریشاں مثل بوئے گل ہیں صحنِ باغِ عالم میں
بنایا ہے کسی نے جب سے اپنا راز داں ہم کو

غبارِ کارواں بن کر اڑیں گے کوئے جاناں میں
نشانِ منزل بہ منزل دیں گے خود ہی بے نشاں ہم کو

نگاہ پڑتی ہے جس شے پر اسی کو سجدہ کرتے ہیں
نظر آتا ہے ہر ذرہ تیرا ن کا آستاں ہم کو

کوئی رقصاں کوئی لرزاں کوئی خنداں کوئی گریاں
زمانہ تم سے کرتا جا رہا ہے بدگماں ہم کو

کسے معلوم تھا الفت میں یوں مر مر کے جینا ہے
رلائے گی ہلو اک دن یہ سعیِ رائیگاں ہم کو

رؤف چاک دامن ہیں کے یہ اک اک سے کتنے ہیں
فقط اک آہ پر بخشے گئے ہر دو جہاں ہم کو

تضاد

تری آغوش مرے واسطے جب تنگ نہ تھی
زندگی گردشِ دوراں سے ہم آہنگ نہ تھی

جن لبوں کے لیے وا تھا ترے ہونٹوں کا خلوص
ان لبوں کو ہوسِ بادۂ گلرنگ نہ تھی

رقص کرتی تھی تری شوخیٔ آواز کے ساتھ
وہ سماعت، جو ہم آغوشِ دف و چنگ نہ تھی

بات ہے مختصر، اِک چشمکِ پنہاں کی کچھ اور
ورنہ ظاہر میں تری مجھ سے کوئی جنگ نہ تھی

دل شکن کیوں ہے کہ اب تک تری معصوم نظر
آئینہ دارِ نوازش تھی کبھی سنگ نہ تھی

آہ کیوں ذکرِ وفا سے ہے گریزاں بدمست
یہ قبا تیرے حسین جسم پہ کل تنگ نہ تھی

پردۂ شوق اٹھایا تو یہ معلوم ہوا
تری فطرت مری فطرت سے ہم آہنگ تھی

شبنم رومانی بی۔کام

ہندستان میں عالا تعلیم کی کہانی

(۱-۱)

۱۸۵۴ء سے ہندستان کی عالا تعلیم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ لارڈ ڈلہوزی نے ۳۰ دسمبر ۱۸۵۴ء کے نوٹ میں یونیورسٹیوں کے قیام کی اسکیم مرتب کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی کے تقرر کی سفارش کی۔

نومبر ۱۸۵۶ء میں کمیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت کے سامنے پیش کر دی۔ اور کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیوں کے قیام کے لیے ایک بل تیار کیا گیا۔ اسی مہینے لارڈ کیننگ نے اس بل کو منظوری دیدی۔ چنانچہ جنوری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں تین یونیورسٹیاں قایم کر دی گئیں۔ اور اس طرح ہندستان میں عالا تعلیم کو مستقل بنیادوں پر جاری کیا گیا۔

برطانوی وزیر ہندستان کے مراسلے اپریل ۱۸۵۹ء کے ذریعے کیننگ کالج۔ لکھنؤ (۱۸۶۴ء) سینٹ زیویرس کالج بمبئی (۱۸۶۹ء) اورینٹل کالج لاہور ۱۸۷۰ء میور کالج الہ آباد (۱۸۷۲ء) میٹروپولیس انسٹی ٹیوشن کلکتہ (۱۸۷۳ء) اور اینگلو محمڈن کالج علی گڑھ (۱۸۷۹ء) کے قیام کی صورت پیدا ہوئی۔ پنجاب یونیورسٹی ۱۸۸۲ء میں قایم ہوئی تھی۔

الہ آباد یونیورسٹی کا قیام ۱۸۸۷ء میں عمل میں آیا۔ لارڈ کرزن کی بھی یہ خواہش تھی کہ عالا تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ چنانچہ اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یونیورسٹی کمیشن (۱۹۰۲ء) مقرر کیا گیا۔ جس نے یونیورسٹیوں کے دستور پر نظر ثانی کی۔ ۱۹۱۶ء میں بنارس یونیورسٹی اور ۱۹۱۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی قایم ہوئی۔

کلکتہ یونیورسٹی کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے ۱۹۱۷ء میں سیڈلر کمیشن مقرر کیا گیا تھا۔ جس نے مارچ ۱۹۱۹ء میں اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی سفارش کی گئی تھی کہ کلکتہ یونیورسٹی کی نگرانی کے اختیارات مرکزی حکومت کی بجائے بنگالی سرکار کو منتقل کر دیے جائیں۔ اور اس کو درسی یونیورسٹی کی شکل دی جائے جس کا چانسلر تنخواہ یاب ہو اور اس یونیورسٹی کا بار کم کرنے کے لیے ڈھاکا میں ایک یونیورسٹی قایم کی جائے۔ اسی سال مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی رو سے عالا تعلیم کا کام صوبائی حکومتوں کے سپرد کر دیا گیا۔

نیشنل آرکیوز آف انڈیا نے پمفلٹوں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کا عنوان ہے "تاریخی مواد" اس سلسلے کا پمفلٹ نمبر ۴ حال ہی میں شایع کیا گیا ہے جس میں ہندستان میں عالا تعلیم کی رفتار ترقی کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ تاریخی مسودات کا یہ دفتر اس قسم کے پمفلٹوں کے سلسلے شایع کرتا ہے جس سے ان ریکارڈوں کی تاریخی قدر و قیمت نمایاں ہو جاتی ہے۔ ہر پمفلٹ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی خاص موضوع سے متعلق خاص خاص مسودے روشنی میں لائے جائیں اور تاریخ کے طلبا اور عوام دونوں کو متعلقہ موضوع پر تاریخی مواد سے واقف کرایا جائے۔

اوپر کا پمفلٹ اس خیال سے مرتب کیا گیا ہے کہ انگریزی دور میں ہندستان میں عالا تعلیم کی تاریخ معلوم کی جائے۔ پمفلٹ میں ان مسودوں کی تفصیلی فہرست بھی دی گئی ہے جو اس مقصد کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ تاکہ ہندستان میں عالا تعلیم کی تاریخ کے ہر اہم منزل میں کا پتا چل سکے اور اس ادارے کے سلسلے میں یہ فہرست ممد و معاون بھی ثابت ہو سکے۔ اس کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ علما۔ فضلا اور عوام دونوں ہندستانی تاریخ کے ان وسیلوں سے مستفید ہو سکیں جو مسودوں وغیرہ کی شکل میں اس دفتر میں موجود ہیں۔

محمد حسین آزاد

عرش ملسیانی

مغلیہ خاندان کی آخری شمع ۱۸۵۷ء میں گل ہو گئی علم و ادب کی سرپرستی کس مپرسی میں تبدیل ہو گئی لیکن اردو ادب خوش نصیب ہے کہ اس دور میں کچھ ایسے انشاپرداز اس کو ملے کہ اردو کو بقائے دوام عطا کر گئے۔ آزاد، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، رتن ناتھ سرشار اور ماسٹر پیارے لال وغیرہ اس زمانے کے وہ چمکتے ہوئے ستارے ہیں جن سے آسمان ادب کو تابانیاں ملتی رہیں۔ یوں تو "ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است" لیکن مولانا محمد حسین آزاد چند ایسی خصوصیات کے مالک تھے جو اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ مولانا نے اردو زبان کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ نثر میں ایک ایسی طرز کے موجد ہوئے جو انہیں پر ختم ہو گئی۔ یوں تو آبا کی زبان فارسی تھی لیکن دلی کی بود و باش کی وجہ سے اردو اختیاری زبان سے مادری زبان کا درجہ پا چکی تھی۔ آب حیات کے مقدمے میں سب سے پہلا فقرا اس کو ظاہر کرتا ہے۔

"آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔ مگر تخمیناً سو برس سے کل خاندان کی زبان اردو ہے۔" اس ایک فقرے سے انداز لگایئے کہ مولانا نثر میں کیسی اچھی شاعری فرماتے تھے "آزاد ہندی نہاد" میں صوفی حسن بھر دیا ہے "فارسی کو تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔" الفاظ نگینے کی طرح جڑ دیے ہیں۔ زبان کی تیغ سے تشبیہ، تیغ کے لیے جوہر کی ضرورت ہے۔ وہ فارسی ہٹری اس رعایت سے آزاد کو ہندی نہاد کہا۔ یہ خوبی مولانا کی نثر میں جگہ جگہ ملے گی۔ اور یہ انداز خاص خدا نہیں پر ختم ہو گیا۔ اردو زبان کے متعلق اس مقدمہ میں چند ابتدائی فقرے ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ لگایئے کہ

بے جان لفظوں میں روح بھر کر مولانا نے کیا شان دکھائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"تعجب ہے کہ بچا شاہجہاں بازار میں پھرتا ملے۔ شعرا اسے اٹھا لیں اور ملک سخن میں پال کر پرورش کریں انجام کو یہاں تک نوبت پہنچے کہ وہی ملک کی تصنیف و تالیف پر قابض ہو جائے۔ اس حالت میں اس کے عہد کی تبدیلیاں اور ہر عہد میں اس کے باکمالوں کی حالتیں نظر آئیں۔ جن کی وقت بوقت کی تربیت اور اصلاح نے اس بچے کو انگلی پکڑ کے قدم قدم آگے بڑھایا اور رفتہ رفتہ اس درجے تک پہنچایا کہ جو آج حاصل ہے"

چنانچہ اس لحاظ سے پانچ جلسے سامنے آئے کہ مسلسل اور متواتر قائم ہوئے اور برخاست ہوئے ایک نے دوسرے کو رخصت کیا اور اپنا رنگ جمایا۔

مولانا آزاد فارسی کے عالم متبحر اور عربی کے اچھے عالم تھے۔ ہندی کی خوبیوں سے آگاہ اور انگریزی علم و ادب کی خصوصیات سے واقف تھے۔ اردو پر جو احسانات آپ نے کیے ہیں وہ کسی ایک شخص کے حصے میں نہیں آئے۔ آپ نے پنجاب کو اردو سکھانے کے لیے جو تصنیفات کی ہیں اس کا بہت کم لوگوں کو علم ہو گا۔ پرانی اردو کی پہلی دوسری اور تیسری کتابیں اردو قاعدہ قصص ہند کا دوسرا حصہ جامع القواعد آپ ہی نے تصنیف فرمائیں آپ نے اہل پنجاب کو زندہ فارسی سکھائی ایران کے روزمرہ کی تعلیم دی دوسری مرتبہ جب مولانا آزاد ایران کے سفر سے واپس آئے تو ایک لپٹا ہوا نوٹوں۔ سوالوں، یادداشت اور تحقیقات کا اپنے ساتھ لائے۔

مولانا شاعری کو قدامت کی قید سے آزاد دیکھنا چاہتے تھے آپ نے انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں جو ۱۸۶۷ء کو منعقد ہوا تھا ایک بسیط مضمون "نظم اور کلام موزوں" کے باب میں خیالات کے عنوان سے پڑھا اس کا کچھ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"شاعر اگر چاہے تو امور عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ سحر کو گویا کر دے۔ درختان درگل کو رواں کر دے، ماضی کو حال، حال کو استقبال کر دے دور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان، خاک طلا۔ اندھیرے کو اجالا کر دے روشن دلان اہل نظر کے نزدیک طلوع و غروب آفتاب اور انقلاب صبح و شام، ہزاروں باغ نو بہار قدرت الٰہی کے شگفتا کرتا ہے اور تیرہ دلان بے خبر کے نزدیک کارگاہ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ دن پھر چکر میں چلا جاتا ہے اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العلوم فن شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے"۔

اس طرح شاعروں کی بددیانتی و بد خیالی سے شعر بھی بحیثیت کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہیے کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروش خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اسے قوت قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے خیالات پاک جوں جوں بلند جاتے ہیں مرتبہ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں۔ ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے معتبر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی۔ اور ان تصنیفات میں اور حالی کی تصانیف میں فرق زمین و آسمان کا ہے

نظم کے متعلق مولانا کے خیالات کیا تھے اور وہ پرانی روش کو ترک کرنے پر کس قدر مصر تھے۔ اس کا اندازہ ان کی اس زمانے کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ تعجب کا مقام ہے کہ وہ شخص جس نے اپنی تعلیم کا زمانہ کلاسیکل فضائیں گذارا ہو۔ اور جس کا خمیر خالص کلاسیکی عناصر سے بنا ہو۔ وہ ادب کے باب میں پہلا مجاہد ثابت ہو۔ افادیت کا پہلا علم بردار ہو۔ اہل ملک کو آزاد کرے کہ بیہودہ ترکیبوں اور الفاظ کے جال میں پھنس کر شاعری اور ادب اپنا وقار کھو دیتے ہیں۔ آج کے زمانے کو دیکھیں تو مولانا ہمیں ایک قدامت پسند سے زیادہ نظر نہیں آئیں گے لیکن اس زمانے کو دیکھیے آج سے تین چوتھائی صدی پہلے کے ماحول کو دیکھیے۔ پرانی ڈگر سے ہٹ کر چلنا قدما کے رستے کو چھوڑنے کی تلقین کرنا کفر میں داخل تھا۔ چنانچہ آزاد اور حالی اپنے زمانے میں معتوب عوام بھی ہوئے یورپ کے ادب کی انہوں نے محض ایک جھلک سی دیکھی اور وہ بھی ہم نشینوں سے سن کر، یا تراجم کے ذریعے سے لیکن ان پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھے۔

"بیشک مبالغہ کا زور تشبیہ اور استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب ہو۔ استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جن میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے اور ہار ہاتھوں میں لئے اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب بھی وہ منتظر ہے کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے"۔

چنانچہ علامہ کیفی بھی لکھتے ہیں کہ یہ صاحب ہمت وہ خود تھے اگرچہ ان کی مراد اپنی ذات سے نہیں تھی اس سے آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں۔

"اے میرے اہل وطن مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش و خروش اور

لطائف و صنائع کے سامان تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئی ہے وہ کیا۔ مضامین عاشقانہ ہیں۔ جن میں کچھ وصل کا لطف بہت سے حسرت و ارمان اس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب ساقی بہار خزاں فلک کی شکایت اور اقبال مندوں کی خوشامد ہے یہ مطالب بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے دور دور کے اشاروں میں ادا ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔"

لیکن مولانا کو اپنے بزرگوں کا اس قدر احترام تھا کہ قدیم طرز سخن سے کنارہ کش ہونے اور دوسروں کو اس کی تلقین کرنے کے باوجود وہ انہیں ہمیشہ عزت سے یاد کرتے ہیں۔ آب حیات کے خاتمے پر فرماتے ہیں۔

"اے باقبال گداؤ! اے شاہ نشان خاکسارو! تمہاری نیک نیتی! اچھے وقت لائی مگر افسوس تمہاری شاعری نے بہت کم عمر پائی۔ قسمت نے تمہیں اچھے سامان اور اچھے قدردان دیے جن کی بدولت جوہر طبعی اور جوش اصلی کو اپنے شوق کو پورا کرنے کا سامان ملے اب نہ وہ سامان ہوں گے نہ ویسے قدردان ہوں گے نہ کوئی اس شاخ کو ہرا رکھ سکے گا۔ نہ تم سے بڑھ کر اس میں پھول پھل لگا سکے گا ہاں تمہاری بیٹوں کے لئے تبرک تمہارے ہجر و وصل اور خط و خال کے مضمون لیں گے۔ ان ہی لفظوں کو الٹیں یا پلٹیں گے اور تمہارے چبائے ہوئے نوالوں کو منھ میں پھراتے رہیں گے۔"

شاہ عالم کے زمانے میں جب دلی وہ دلی نہ رہی۔ اور اہل علم و اہل فن کی یہاں قدر نہ ہوئی تو صاحب کمال اور ماہران فن اس زمین کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ چنانچہ اس زمانے میں لکھنؤ مرجع اہل کمال رہا۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء کی گیر و دار کے بعد مولانا اور ان کے دوسرے علمی رفیق پنجاب پہنچے۔ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال

منشی درگا پرشاد مولوی سید احمد مولف "فرہنگ آصفیہ" مولوی کریم الدین۔ پنڈت من پھول شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی وغیرہ سب لاہور میں جمع ہوئے۔ یہاں مولانا آزاد نے نثر و نظم میں گلکاریاں کیں، نثر میں آب حیات نیرنگ خیال، دربار اکبری، سخندان فارس، قند فارس نصیحت کا کرن پھول اور اس کے علاوہ بے شمار درسی کتابیں جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے آپ نے تصنیف فرمائیں علامہ کیفی نیرنگ خیال کے متعلق فرماتے ہیں "میرامن دہلوی کی باغ و بہار اور آرائش محفل آج کل کی زبان میں نہیں۔"

سرور لکھنوی کے فسانۂ عجائب کی طرز بھی مقبول و مروج نہیں ہو سکتی۔ خواجہ امان دہلوی نے صرف قالب لکھے فارسی ترجمے کیے آزاد کا نیرنگ خیال فی الواقع اسم بامسمیٰ ہے یہ نثر ہزار نظم کی اصلاح کا ایک بہترین دستور العمل ہے۔ پند و نصائح کا ایک دفتر ہے استعارے اور تمثیل میں وہ مطلب کی باتیں بتائے گئے ہیں کہ پڑھنے والا خیالات سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس کتاب نے اردو نثر کی نئی طرز قائم کی۔ اور تمام پہلے کی نثر کی کتابوں کے آگے خط و صدائی کھینچ دیا۔ رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب کے ساتھ آپ اخبار اتالیق پنجاب کی ادارت کا بار بھی اٹھاتے رہے۔ مولانا آزاد گلستان ادب کے سرو آزاد تھے ان کی شہرت کسی سوسائٹی یا قومی ادارے کے پلیٹ فارم سے نہیں ہوئی وہ کسی دربار کے مداح خواں نہیں تھے دلی اور لکھنؤ کے فرسودہ جھگڑوں سے انہیں کوئی کام نہیں تھا۔ استاد سے والہانہ عقیدت رکھتے ہوئے ان کی غزلیات و قصائد کے پراگندہ اوراق سر پر اٹھائے ہوئے تھے کئی سال دیدہ ریزی کر کے اسے مرتب کیا۔ بہ قول کہ قلم ان کی چوب تھی اور کاغذ ان کا نقارا اور انہیں نے اپنی شہرت کا آوازہ سارے ہندستان میں پھیلا دیا۔ واقعی تو ان کی قسمت ہے۔

مولانا کا قد میانہ گندمی رنگ چھریرے بدن کے آدمی تھے۔ مزاج اور وضع دونوں میں سادگی تھی۔ لباس میں بھی سادگی تھی اکثر چغا پہنتے اور ہندستانی فیشن کا عمامہ باندھا کرتے تھے چہرے سے ذہانت و فطانت ٹپکتی تھی ہنس مکھ ملنسار اور ہمدرد و رحمدل معلوم ہوتے تھے زبان میں جادو اور خیالات میں یہ اثر تھا کہ جو ایک گھنٹہ پاس بیٹھ گیا ان کا کلمہ پڑھنے لگا۔ بذلہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ موتھ سے پھول جھڑتے تھے۔

صاحبزادی کے انتقال کا صدمہ ایران کے سفر کی صعوبتیں اور دماغی مصروفیت کی انتہائی کثرت نے ان کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا سنہ ۱۱۸۹ء سے جنون کے آثار پیدا ہوے۔ اسی عالم میں ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو نظم و سخن کا یہ بادشاہ ہم سے رخصت ہو گیا۔ مولانا نے ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ اردو ادب میں ہمیں اپنے ملک کے کلچر اور اس کی طبعی کیفیتوں کا ذکر کرنا چاہیے اور اسی جذبے کے تحت انہوں نے خود خالص ہندستانی انداز اپنی نثر میں پیدا کیا۔ فارسی پر اردو اثرات کا ذکر کرتے ہیں لو کہتے رہیں۔

"حسن و جمال کے شبستان میں لیلیٰ و شیریں آ گئیں اور جب وہ آئیں تو راجھے کی جگہ مجنوں و فرہاد کیوں کر نہ آتے۔ مجنوں و فرہاد کی آنکھوں سے گنگا و جمنا تو بہ نہیں سکیں۔ محبوب چمن نسیم و ن پہننے لگے ہمالیہ کی جگہ کوہ بیستون اور کوہ الوند آ گئے مگر جب کوئی خوش طبع چاہتا ہے تو یہیں کے پھولوں سے بھی یہاں کے مکان سجا دیتا ہے اور وہ عجب بہار دیتے ہیں" اس آخری فقرے پر غور کیجیے اور مولانا آزاد کے خالص ہندستانی مزاج کی داد دیجیے۔

ہندستانی ادب کی توسیع اشاعت میں ہاتھ بٹانا ہر ہندستانی پر فرض ہے

غزل

عزیز جیلانی

خزاں بن کر نظر آئی بہار بوستاں ہم کو
خدا جانے دکھائے اور کیا کیا آسماں ہم کو

پھرایا عمر بھر دیر و حرم کے درمیاں ہم کو
نہ ملنا تھا نہ آخر تم نہ ملے اے مہرباں ہم کو

حقیقت کون سمجھے کون سمجھائے زمانے کو
کوئی ہنستا ہے ہنس لے دیکھ کر گریہ کناں ہم کو

چمک کر برق نے بھولی کہانی پھر سے دہرائی
قفس میں آ رہی ہے آج یاد آشیاں ہم کو

زباں رکھتے ہیں ہم بھی منھ میں لیکن کہہ نہیں سکتے
غم پنہاں نے بخشی ہے زبان بے زباں ہم کو

الجھتی جا رہی ہے روز مرہ عمر کی گتھی
نہ غم کو ہم ہی چھوڑیں گے نہ غم دیگا اماں ہم کو

کبھی تو طالب و مطلوب آ جائیں گے مرکز پر
تلاش رہروان اسکو تلاش کارواں ہم کو

اسی کو کعبۂ مقصود سمجھیں گے عزیز اپنا
پئے سجدہ جبین شوق لے جائے جہاں ہم کو

عبد اللہ ابن المقفع

(چوتھی اور آخری قسط)

تمکین کاظمی

خدائی نامہ ایک اہم ترین کتاب جسے ابن المقفع نے زبان پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا اور جس کے ذریعے سے ایران قدیم اور پہلوانان داستانی و ادوار باستانی عجم اور ان کے حالات مسلمانوں تک پہنچے تاریخ پادشاہان ایران ہے جس کا پہلوی نام خدائی نامگ تھا اور عربی میں ترجمہ ہو کر سیر الملوک ہوا۔ اصل خدائی نامہ بڑی داستان تھی۔ وقائع تاریخ ایران قدیم اور روایات محلی و افسانہ ہائے ملی پر مشتمل جس میں اوستا کی مذہبی تعلیمیں اور قدیم آریائی روایات اور کہانیاں تھیں جو ان سریانی اور یونانی صنمیات سے ماخوذ تھیں جنہیں ساسانی خاندان کے آخری بادشاہ یزدگرد سوم (۱۰ - ۲۱) کے عہد میں جمع کیا گیا تھا یہ پوری تاریخ افسانہ قدیم ایران عہد کیومرث سے خسرو پرویز تک کے زمانہ پر حاوی تھی۔

ابن المقفع نے اس جلیل القدر کتاب کا ترجمہ پہلوی سے عربی میں کیا مگر بدنصیبی سے بہت ہی جلد یہ ترجمہ ضائع ہو گیا چنانچہ نولدکی کا بیان ہے کہ:-

"ابن المقفع نے اس ترجمے پر محنت کی تھی اور بڑی دقت سے اصلی متن کو معاصرین کے ذوق کے مطابق ڈھالنے میں کامیابی حاصل کی تھی چونکہ مذہب اسلام ان کے پیش نظر تھا اسی لیے دوسرے مولفین کی طرح انہوں نے بھی حذف و تغیر سے کام لیا تھا مگر بظاہر ترجمے میں یاوہ تصرف نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اسی قبیل کی دوسری کتابوں مثلاً شاہنامہ فردوسی وغیرہ سے اس کا مقابلہ کیا گیا تو جزوی اختلاف پایا گیا"

پوری کتاب تو نہیں ملتی۔ مگر بعض کتابوں میں اس کے اقتباسات جو ہم تک پہنچے ہیں ابن المقفع کے ترجمے کے بیشتر حصے پر مشتمل ہیں منجملہ ان کے عیون الاخبار ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) میں چند طویل اقتباس ملتے ہیں جن میں ایک "فیروز کے کام کا خاتمہ" بھی ہے۔ (۱)

یہی حصہ کچھ اختصار سے سعید بن البطریق خلیفہ نصاریٰ کی کتاب میں بھی موجود ہے اس کے علاوہ ایران کی ایک اور تاریخ بھی جو اوطوفیوس (EUTYCHIUS) (۲۶۳ - ۳۲۸) نے اسکندریا میں لکھی، ابن المقفع ہی کے ترجمے سے ماخوذ ہے طبری کے ماخذ میں بھی سیر الملوک رہی ہے۔ (۲)

ہم اس جگہ اصلی خدائی نامہ سے جو سیر الملوک عربی اور شاہنامہ فردوسی کا ماخذ ہے بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے مگر اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ فاضل نولدکی کی کتاب "تاریخ ایرانیاں و عرب بزمانہ ساسانیان" (۳) کے مقدمہ میں جو طبری کی تاریخ کے دور ساسانیان کا ترجمہ ہے اور عالمانہ حواشی کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ اس خصوص میں بڑی بحث کی ہے اور حماسہ ملی (۴) ایران میں بھی فاضل مذکور نے خدائی نامہ سے بیشتر مسائل حل کیے ہیں۔ روسی مستشرق بارون روزن نے بھی اس معاملہ میں بڑی تحقیق کی ہے اور ان

---

(۱) عیون الاخبار ص ۱۱۷ - ۱۲۱، ج ۱ (۲) مجلد کاوہ شمارہ ۱۲، ص ۸، ترجمہ جرمنی تاریخ طبری پر نولدکی کے لکھے ہوئے مقدمے کا ترجمہ (۳) GESCHICHTE DER PERSORDM DARABER ZURZEIT SASSANIDEN (۴) DAS LRANISCHE NATIONAL EPOS

مستشرق کی محنت کی تکمیل زوٹن برگ (ZOTEN BERG) نے کی ہے اور اسی روشنی میں ثعالبی کی کتاب غرر اخبار ملوک الفرس وغیراہم کو فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے چھپوایا ہے واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں بڑی تحقیق سے کام لیا گیا ہے اس کا ترجمہ روزنامہ کاوہ میں آقا تقی زادہ نے مسلسل شایع کیا ہے (۱) جس پر اپنی معلومات کا اضافہ بھی بصورت حواشی کیا ہے۔

کتاب خدائی نامہ جیسے ہی ابن المقفع نے عربی میں ترجمہ کر کے شایع کی۔ لوگوں نے اس کی تہذیب و تلخیص و اصلاح اور اختصار کی طرف توجہ کی۔ چونکہ اس کا موضوع تاریخی تھا۔ اور قصص و حکایات اور دل کش داستانیں تھیں اس لیے عرب و عجم دونوں نے اسے پسند کیا اور کلیلہ دمنہ کی طرح یہ کتاب بھی بہت جلد مسلمانوں میں شایع اور مشہور ہو گئی۔ اس کی مقبولیت دیکھ کر بعض مترجمین، مثلاً زادویہ بن شاہویہ اور محمد بن الجہم برمکی وغیرا نے دوسری کتابیں مرتب کیں چنانچہ ان میں سے بعضوں کے نام حمزہ بن حسن اصفہانی اور ابوریحان بیرونی اور ابن العدیم کی کتابوں اور بلعمی کے ترجمہ تاریخ طبری فارسی و مقدمہ قدیم شاہنامہ و مجمل التواریخ میں درج ہیں۔

جتنی کتابیں بھی خدائی نامہ کے عربی ترجمہ ابن المقفع کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئیں، وہ سب سیر الملوک کے نام سے مشہور اور موسوم ہوئیں۔ چنانچہ بعض مولفین نے انہیں کو سامنے رکھ کر کئی شاہ نامے تالیف کر ڈالے جن میں سے شاہنامہ ابو المؤید بلخی و شاہنامہ ابو علی محمد بن احمد بلخی و شاہنامہ ابو منصور محمد بن عبد الرزاق طوسی وغیرا بہت مشہور رہے۔ یہی شاہنامے دقیقی کے سامنے رہے ہیں جنہیں دیکھ کر اس نے شاہنامہ کی نظم کا ڈول ڈالا۔ مگر افسوس ہے کہ اسے ختم نہ کر سکا اور کیوں کر کرتا کہ

(۱) روزنامہ کاوہ شمارہ ۱۱ سال اور دور جدید جمادی الآخر ۱۳۳۳ تا ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۴

یہ سعادت فردوسی کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!

فردوسی نے اسی دقیقی کے لگائے ہوئے پودے کو اپنے خون دل سے سینچ کر باغ و بہار بنا دیا اور پہلے کے تمام شاہنامے اس کے سامنے ہیچ ہو گئے۔

غور کیجیے تو شاہنامہ فردوسی کی بنیاد ابن المقفع ہی کی رکھی ہوئی ہے کیونکہ خدائی نامہ کو اگر ابن المقفع ترجمہ نہ کرتے اور سیر الملوک الفرس عربی پھر ایرانیوں کے ہاتوں شاہنامہ مجموعہ بن کر نہ جاتی تو فردوسی کون سے واقعات نظم کرتا؟ اس طرح شاہنامہ فردوسی کی بنیاد بالواسطہ ابن المقفع ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔

دوسری تالیفات علاوہ ان ترجموں کے جو ابن المقفع نے عربی میں کیے ہیں۔ بعض مولفین نے ان کی بعض تالیفات کا ذکر بھی کیا ہے جو اخلاق و آداب و سیر ایرانیان عہد ساسانی سے متعلق ہیں۔

مشہور کتاب جسے ابن المقفع سے منسوب کیا جاتا ہے وہ "کتاب الیتیمہ" ہے جو چند رسالوں کا مجموعہ ہے۔ صاحب کتاب الفہرست (۱) نے اس کو ابن المقفع کی تالیفات میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ دوسرے مولفین و مصنفین نے اس کو نہ صرف ابن المقفع کی تالیف قرار دیا ہے بلکہ ان کی بہترین کتاب بھی مانا ہے۔ ابن خلکان (۲) اور کشف الظنون (۳) دونوں بیک لفظ قائل ہیں کہ اس فن پر اس سے اچھی کتاب کوئی آج تک نہیں لکھی گئی۔ بلاغت حسن عبارت اور تسلسل کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ ابو الفضل احمد بن ابی طاہر طیفور (۴) کہتے ہیں کہ "ابن المقفع نے ایک رسالہ بنام الیتیمہ لکھا ہے ایسا رسالہ آج تک کوئی نہ لکھ سکا یہ بلاغت کا بہترین نمونہ اور تمام لکھنے کے لیے عالی ترین انشا ہے"

(۱) الفہرست ص ۱۱۸ (۲) ص ۱۶۴، ج ۱، (۳) ص ۲۰۴-۲۸۰، (۴) رسائل البلغاء ص ۱۱۵،

مشہور عرب شاعر ابو تمام طائی کہتا ہے۔

و لقد شہدتک و الکلام لآلی
صرف فبکر فی الکلام و ثیب
فکأن قساً فی عکاظ یخطب
و کأن لیلی الاخیلیة تندب
و کثیر عزة یوم بین ینسب
و ابن المقفع فی الیتیمہ یسہب (۵)

صاحب کتاب الفہرست دو اور کتابیں ابن المقفع کے نام سے منسوب کرتے ہیں ایک الآداب الکبیر اور دوسری الآداب الصغیر۔ یہ دونوں رسالے ان ہی ناموں سے شام اور مصر وغیرہ میں کئی مرتبہ چھپ چکے ہیں۔ چنانچہ سب سے بہترین نسخے وہ ہیں جنہیں احمد ذکی پاشا نے قاہرہ میں ۱۳۳۲ھ میں بڑے اہتمام سے بہت ہی نفیس چھپوایا ہے۔

بعض مصنفین کا خیال ہے کہ کتاب الیتیمہ اور الآداب الکبیر دونوں ایک ہی کتاب کے نام ہیں۔ معلوم نہیں ان لوگوں نے یہ رائے کیسے قائم کی ہے کیونکہ صاحب الفہرست اور ابن قتیبہ نے صاف طور پر دونوں کا ذکر علحدہ علحدہ کیا ہے۔ اور بعد کے مصنفین نے بھی ان دونوں کو الگ الگ شمار کیا ہے۔

جن لوگوں نے ان دونوں کتابوں کو ایک تصور کیا ہے بڑی غلطی کی ہے کیونکہ جو کچھ ابن قتیبہ نے عیون الاخبار (۱) میں، ثعالبی نے ثمار القلوب (۲) میں سید مرتضی نے تاج العروس (۳) میں اور احمد بن ابی طیفور نے کتاب المنظوم والمنثور (۴) میں کتاب الیتیمہ سے نقل کیا ہے الآداب الکبیر میں موجود نہیں ہے۔ مگر الآداب الکبیر ابن المقفع کے نام سے ابن قتیبہ نے جو کچھ نقل کیا ہے (۵) وہ مطبوعہ نسخہ الآداب الکبیر مطبوعہ ذکی پاشا (۶) میں موجود ہے۔

اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ابن المقفع نے الیتیمہ کے نام سے لکھا ہے وہ آج ہماری دسترس سے باہر ہے اور یہ خزانہ بھی من جملہ اور نفائس کے ضائع ہو گیا اسی طرح ابن المقفع کی اور کتابوں یا کتاب التاج، آئین نامہ، مزدک نامہ کا آج کہیں بھی پتہ نہیں ہے۔ صرف اول الذکر دو کتابوں کے اقتباسات کہیں کہیں نظر آتے ہیں چنانچہ عیون الاخبار میں کتاب التاج اور آئین نامہ کی عبارت نقل ہوئی ہے اور مسعودی و ثعالبی نے آئین نامہ کا اقتباس دیا ہے۔

مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف (۷) میں لکھا ہے۔ "ایرانی ایک کتاب رکھتے ہیں جسے گہنامہ (گاہ نامہ سالنامہ) کہتے ہیں۔ اس میں مراتب مملکت ایران درج ہیں۔ جو مرتبہ کتاب کی ترتیب کے مطابق چھ سو ہیں اور یہ کتاب، کتاب آئین نامہ کا ایک جزو ہے (۸) جس کے معنی کتاب رسوم کے ہیں جو اتنی بڑی ہے کہ اس کے ہزارہا ورق ہیں اور جو سوا موبدوں اور صاحبان ریاست کے دوسروں کی دسترس سے باہر ہے"۔

اس کی تفصیل مسعودی نے مروج الذہب (۱) میں "رسوم دربار ایران و تقسیم طبقات الناس بتوسط موبدان سلسلہ ساسانی" کے عنوان سے نقل کی ہے جو آئین نامہ سے ماخوذ ہے۔ (۲)

آئین نامہ بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ کیونکہ آئین تقریباً وہی معنی رکھتا ہے جو عرب آداب کے لیتے ہیں۔ عہد ساسانی میں متعدد آئین نامہ موجود تھے جو علاوہ دوسرے مطالب کے، گفتگو، نصائح بادشاہان قدیم اور ان کے دستوران کی فوج کشی ان کے کھیل مثلاً تیر اندازی چوگان بازی

(۱) ص ۳-۵، ج۔ ۱ (۲) ۱۵۸ - (۳) مادہ ق۔ ت ع، (۴) یہ حصہ رسائل البلغاء ص ۱۱۶ - ۱۱۸ میں طبع ہوا ہے (۵) ص ۲۰، ۲۱، ۲۲، ج ۱ (۶) ص ۲۱، ۴۱، ۵۷ (۷) ص ۱۰۶ (۸) الفہرست ص ۱۱۸، ۳۰۵، وغرر اخبار ملوک الفرس ثعالبی ص ۱۴ (۱) ص ۱۵۲، ج ۲ (۲) ZOTENDERG HIST DES.

وغیرہ کی تفصیلات پر مشتمل تھے یارون روزن نے ایک بڑا نفیس مقالہ آئین نامہ پر لکھا ہے جو رائل اکاڈمی پیٹرزبرگ کے مجلہ میں چھپا ہے۔ (۳)

مسعودی نے مروج الذہب (۴) میں دو اور کتابوں کے ترجمے بھی تاریخ ایران سے متعلق ابن المقفع کے نام سے منسوب کیے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا صحیح نام بھی معلوم نہ ہو سکا۔ ایک کا نام الیکنش اور دوسرے کا السکیکین لکھا ہے غالباً دونوں نام ایک ہی کتاب کے ہیں۔ بلوخت (BLOCHET) کا خیال ہے کہ یہ دونوں نام کتاب البندھش کے ہیں یہ خیال اس لیے صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی نے ان کتابوں کی جو تعریف کی ہے وہ بالکل نسخہ پہلوی بندھش کے مطابق ہے علاوہ ازیں تاریخ فارسی سیستان میں (جس کی تالیف سال ۳۴۳ و ۴۰۰ کے درمیان باور کی جاتی ہے) بن دھشن کتاب کا ذکر موجود ہے، اور مولف نے اس کتاب کے اقتباس بھی دیے ہیں۔ اور اس کتاب کے مولف کا نام ابن دھشتی گبرگان لکھا ہے غالباً "بن دھش گرگان" نام ہوگا جسے عربوں نے اپنے تلفظ کے لحاظ سے کچھ اور بنا دیا۔ مولف تاریخ سیستان نے یا تو کسی عربی ترجمے سے استفادہ کیا ہوگا یا کسی عربی کتاب میں یہ نام پڑھ لیا ہوگا۔

ابن المقفع پر ان کی زندگی میں جو مظالم توڑے گئے اور جس اذیت سے انہیں قتل کیا گیا آپ نے دیکھ لیا مگر یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ موے پر سو درے کے مصداق غریب کو مرنے کے بعد بھی چین نہیں دیا گیا اور مختلف قسم کے الزام، اتہام، بہتان ان پر لگائے گئے اور ان کو فرش سے گھسیٹ کر فرش پر لانے کی کوشش کی جاتی رہی۔ لوئیس شیخو نامی ایک عیسائی نے کلیلہ دمنہ ابن المقفع کا ایک مخطوطہ کہیں پا لیا جس پر تاریخ کتابت ۶ رجب ۷۳۹ھ لکھی ہوئی تھی۔ یہ نسخہ نہایت ہی غلط سلط تھا بجائے اس کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے شیخو بابا نے نہایت اہم سمجھ کر غلطیوں کی بھی اہمیت بڑھا دی اور اسے شائع کرتے ہوئے ایک مقدمہ بھی لکھ مارا۔ جس میں ابن المقفع کی ساری کیفیت کرکری کر دی چنانچہ لکھا ہے کہ:-

"اس نسخے کی غلطیاں اس کی قدامت کی دلیل ہیں۔ چونکہ ابن المقفع عرب نہیں تھے اس لیے ان کا ترجمہ لازمی طور پر عجمی ہوگا اور ان کی عجمیت کو نمایاں کرے گا۔ علاوہ ازیں وہ ایک نہایت مشکل کتاب سے دست و گریبان تھے جس میں فکر و حکمت کی باتیں تھیں اور عربوں کا ذوق ان سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ معلوم نہیں مترجم (ابن المقفع) نے اصلی نسخے کو سمجھا بھی ہے یا نہیں اور یہی نکتہ دو پہلوی نسخوں پر حاوی ہو سکتا ہے" (۱)

آپ نے دیکھ لیا لوئیس شیخو کتنے بدھو ہیں۔ ان کو نہ تو ابن المقفع کی عظمت کا پتہ ہے اور نہ ان کے مقام سے واقف ہیں۔ ابن المقفع زندہ ہوتے تو سر پیٹ لیتے اور کہتے کہ کس جاہل سے سابقہ پڑا ہے۔ اس لیے اس شیخو بابا کے جاہلانہ بیان کو اہمیت دینا فضول ہے۔ غور فرمائیے ابن المقفع انشا و بلاغت کے فن میں ضرب المثل تھے چنانچہ سارے عرب ادبا و شعرا و فضلا مثلاً ابو تمام، یحییٰ بن خالد، جعفر بن یحییٰ ابن الندیم، ابو الفضل احمد بن ابی طاہر، جاحظ، سلام بن محمد، ابن خلکان اور

(۳) XXIII, THA'ALIBI, ROIS DES PERSES DEAI جلد ہشتم ص ۲۲۶ - ۲۲۲

(۴) ص ۴۴ ، ۸ ، ۱۱ ، ۴۴ ، ۴۴ ج ۲ -

(1) PREFACE, P.L. CHEIKHO, AU TEXTE ARABE DE KALILAH. P. 25.

اور ابن خلدون ان کو بلاغت کا استاد مانتے تھے۔ اور فضلائے عرب ان کا شمار عرب کے ان دس بلیغوں میں کرتے تھے جو انگلیوں پہ گنے جاتے تھے۔ محض ایک قلمی نسخے کی اہمیت ظاہر کرنے اور اس کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرنے کی خاطر ایسے امام فن پر اس قسم کا الزام تراشنا صریحاً بے انصافی اور دیانت کے خلاف ہے۔

ابن المقفع جیسے عجمی نژاد کے لیے یہی افتخار بس ہے کہ انہوں نے ایک غیر زبان یعنی عربی پر وہ عبور حاصل کیا اور اس مقام پر پہنچ گئے، جہاں ان کے ہم وطن نہ پہنچ سکے تھے جن کی عربی دانی ابو تمام جیسے لغز سوا میدان فصاحت و بلاغت نے مان لی اور ابن خلدون نے جن نے رسایل کا مطالعہ عربی کے ادیبوں کے لیے لازمی قرار دیا۔ اور سہل بن ہارون، ثعالبی اور ابن الزیات نے زبان عربی کی تکمیل کے لیے ان کی انشا کا مطالعہ ضروری خیال کیا۔ (۱)

اصمعی لغت کے بڑے عالم اور متعصب قسم کے عرب تھے جن کے دل میں ایرانیوں کی طرف سے سخت کینہ تھا انہوں نے ابن المقفع کی کتابوں کا مطالعہ اس نیت سے کیا کہ ان کی غلطیاں نکالیں مگر با وجود کوشش کے کوئی غلطی نہ نکال سکے۔ بالآخر لحن سے متعلق ایک بے تکا اعتراض کر بیٹھے جو اس جملے پر تھا۔

العلم اکثر من ان یحاط بالکل فاحفظوا البعض

کہ اس جملے میں کیوں ابن المقفع نے دو کلموں کے اوپر یعنی کل اور بعض پر ال لگایا۔ (۲) لطف خاص یہ ہے کہ اس جملے کا ال صرف اصمعی ہی کی آنکھوں میں شہتیر بن کر کھٹکا ورنہ کسی اور نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔ نحوییں اور علما لغت کی بڑی جماعت مثلاً اخفش سیبویہ وازہری (لسان العرب مادہ ب ع ض) نے ان دونوں کلموں پر الف اور لام کو جایز قرار دیا ہے۔ اصمعی نے بھی بقاعدہ نحو اعتراض نہیں کیا تھا صرف لحن کی غلطی ظاہر کی ہے جو کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ بیچاروں نے ہزاروں صفحات ابن المقفع کے پڑھ ڈالے۔ آخر اتنا بھی اعتراض نہ کرتے تو کیا کرتے؟

شیخو نے کلیلہ شایع کرتے ہوئے اپنے مقدمہ (۳) میں ابن المقفع کو بخل سے بھی متہم کیا ہے اور اس اتہام کے ثبوت میں ابن عبدربہ (صاحب عقد الفرید) کا بیان پیش کیا ہے اس سے شیخو کی جہالت کا پول کھل جاتا ہے، کیونکہ ابن عبدربہ (۴) کی عبارت کو جاحظ نے کتاب البخلا (۵) میں مفصل اور کتاب البیان والتبین (۶) میں مختصراً نقل کیا ہے جو اس بوڑھے کے بخل کا قصہ ہے جس نے ابن المقفع کی دعوت کی تھی۔ اور جس کا نام بہ قول جاحظ ابن جزام الیسی تھا۔ ایسے شیخو یا بانے الٹا سمجھا کیونکہ شروع سے ہر چیز کو وہ الٹا ہی سمجھتا آیا ہے چنانچہ اسی مقدمہ (۷) میں کتاب یتیمۃ الدھر کو الیتیمہ سمجھ کر ابن المقفع کی تالیفات میں شمار کیا ہے۔ غالب نے ایک دفعہ بگڑ کر کسی کو لکھا تھا "اگر شناساے حقیقت نہ کتاب چراغی نگاری، بوریا بیافت، ریسمان نتابی، گلخن بافروخت ہیزم بفروش" اگر ابن المقفع بھی شیخو کا مقدمہ دیکھ لیتے تو شاید یہی کہتے۔

برلن کی شاہی لائبریری میں ایک بڑا مجموعہ ۱۹ عربی قلمی رسایل کا تھا۔ جو (امام) قاسم بن ابراہیم کے لکھے ہوئے تھے۔ اس مجموعہ کا چوتھا رسالہ "کتاب الرد علی الزندیق اللعین ابن المقفع" (۱) ہے۔

عباس اقبال کے ایک ایرانی دوست نے اس رسالے کی نقل انہیں بھجوائی تھی۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ رسالہ امام قاسم بن ابراہیم نے رد عقاید مانی و مانویہ

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۷۴ (۲) المزہر ص ۱۰۵-۱۰۶، ج ۲ (۳) المزہر ص ۲۶، ج ۲ (۴) عقد الفرید ص ۲۲۱، ج ۴ (۵) عقد الفرید ص ۱۳۰-۱۳۱ (۶) عقد الفرید ص ۱۰۳-۱۰۴، ج ۲ (۷) عقد الفرید ص ۴۴، ج ۲ - (۱) GLASER [O] شاہی لائبریری برلین۔

و ابن المقفع میں تحریر کیا ہے کیونکہ عام طور پر ان دنوں (وسط قرن سوم ہجری) ابن المقفع مانی کے خلیفہ اور رواۃ عقاید و افکار کے نام سے مشہور کیے گئے تھے جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔

اس مجموعہ کے مولف (امام) قاسم بن ابراہیم طباطبائی بن اسمٰعیل الدیباج بن ابراہیم الغمر بن الحسن المثنیٰ ابن الحسن بن علی بن ابی طالب ہیں۔ جو ابو محمد کی دشمنی کی وجہ سے جبال الرس یمن میں رہتے تھے اور اسی مناسبت سے قاسمی الرسی مشہور تھے (۲) بقول اہل وارث ۲۴۶ھ میں وفات پائی۔ یہ ائمہ زیدیہ میں سے تھے (۳) یہ مجموعہ رسایل رسم خط کے لحاظ سے مخصوص یمنی ہے اور اس کی کتابت ماہ شعبان ۵۴۴ھ میں ہوئی ہے۔ (۴)

قابل غور بات یہ ہے کہ ابن المقفع نے تشریح عقاید مانویہ میں کون سا رسالہ لکھا تھا جس کا (امام) قاسم نے رد لکھا ہے؟ ہم نے جہاں تک ابن المقفع کا مطالعہ کیا ہے انہیں جدل و مناظرہ و مباحثہ مذہبی اور اس قسم کے مباحث سے جو خشک متعصب و ہنگامہ پسند کوتاہ نظر لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔ بہت دور پایا۔ بلکہ باب برزویہ سے جو ان کا تخلیقی یا اپنی شاہکار ہے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان فضولیات سے کوسوں دور تھے۔

(امام) قاسم جو متدین واعلیٰ اور ائمہ زیدیہ سے تھے اور مرکز تمدن اسلام (ایران، عراق، شام) سے دور مقیم تھے، یقین ہے کہ کسی مانوی رسالہ کو دیکھ کر جو اس زمانہ میں کثرت شایع ہو رہے تھے اور بیشتر رسالے مسلمانوں اور خلفا عہد کے خوف سے بغیر نام ہی کے شایع کیے جاتے تھے اس لیے یا ر لوگوں سے یقین ہے کہ ایسے رسایل کو ابن المقفع ہی کے نام سے شہرت دی ہوگی اور (امام) قاسم نے اپنی دانست میں اس رسالے کو ابن المقفع ہی کا رسالہ سمجھ کر رد لکھ دیا ہوگا۔ مصنفین اور مولفین میں سے کسی نے بھی ابن المقفع کے کسی ایسے رسالے کا ذکر نہیں کیا ہے جو اس قسم کا ہو۔ ظاہر ہے کہ ابن المقفع بنی عباس کے دربار سے متوسل ہو کر اس قسم کی جرات کیسے کر سکتے تھے اور اگر کرتے بھی تو ان کے نگہبان دشمنوں اور حاسدوں سے جو ہر وقت ان کے خلاف زہر اگلتے رہتے اور ان کی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتے تھے۔ کس طرح چھپا سکتے تھے؟

(امام) قاسم نے بزعم خود ابن المقفع کے جس رسالے کا رد لکھا ہے اس میں صرف زور قلم اور عبارت آرائی کی گئی ہے۔ نہ تو منطقی استدلال ہیں اور نہ ہی عقلی دلایل اور نہ متکلمانہ بحث اور نہ اس میں کوئی علمی ادبی یا تاریخی خوبی ہی ہے چونکہ اس کے مولف قدما سے ہیں۔ اور زمانہ تصنیف قدیم (قبل ۲۴۶ھ) ہے اس لیے اس کے مطالعہ سے زیادہ تر (مانویہ) کے عقاید پر روشنی پڑتی ہے اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عقاید اسلام سے کس قدر ہٹے ہوئے ہیں۔

کلیلہ دمنہ دنیا کی ان کتابوں میں سے ہے جس کے ترجمے بہت زیادہ اور دنیا کی تقریباً کل زبانوں میں کیے گئے ہیں۔ انجیل مقدس کے بعد قرآن شریف اور اس کے بعد کلیلہ دمنہ ہی ہے جس کی ساری دنیا زبانوں میں ترجمے کیے گئے اور یہ عجیب بات ہے کہ کلیلہ دمنہ کے جتنے بھی ترجمے دنیا کی زبانوں انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، عبرانی، یونانی، لاطینی اور فارسی وغیرہ زبانوں میں کیے گئے وہ سب ابن المقفع کی عربی کلیلہ دمنہ سے کیے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔ اس کا ابن المقفع کا چشمہ رواں رہے گا۔

افسوس ہے کہ ہندستانی میں کوئی اچھا ترجمہ کلیلہ دمنہ

(۲) عمدۃ الطالب فی انساب آل ابی طالب، BIB.NAT.AR 2021.F104.A,

(۳/۴) ——— AHLWARDT-ARAB HAND KONIG BIBIV. 281.331.B.

کا نہ ہوسکا۔ (۱)

کورس میں جو حصہ کلیلہ دمنہ کا رہا ہے اس کے ترجمے اکثر لوگوں نے شایع کیے ہیں جو اب بھی کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ مگر وہ نہ تو پوری کتاب کے ترجمے ہیں اور نہ ان میں کوئی خصوصیت ہی ہے۔ کلیلہ دمنہ کو سامنے رکھ کر جن بزرگوں نے فارسی میں طبع آزمائی فرمائی ہے ان کے ہندستانی ترجمے بھی ہو گئے ہیں۔ مگر کلیلہ دمنہ عربی سے انہیں دور کا واسطہ بھی نہیں ہے کاش انجمن ترقی اردو اس طرف متوجہ ہوا ور جس طرح الف لیلیٰ کا ترجمہ شایع کیا گیا اسی طرح کسی قابل شخص سے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ کرا کے شایع کرے (۱)

اس مقالے کے ملاحظے کے بعد آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ انگریزی، جرمن، روسی، اور فرانسیسی عالموں نے ابن المقفع اور کلیلہ دمنہ سے کتنی دل چسپی لی ہے اور کتنی تحقیق و تدقیق کی ہے مگر افسوس ہے کہ نہ تو مصر نے اس طرف توجہ کی نہ ایران نے!

مجلہ فارسی ایران شہر کے مدیر نے جرمنی کے قیام کے دوران میں البتہ کوشش کی اور آقا عباس اقبال سے ایک مختصر سا مقالا لکھوا کر شایع کیا جو ابن المقفع پر اولین مقالا ہے۔

مدت ہوئی (تقریباً چالیس سال) کہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مترجم تمدن عرب و تمدن ہند نے ایک مختصر سا مضمون ہندستانی میں کلیلہ دمنہ پر لکھا تھا اس کے بعد سے کوئی مضمون بھی اس موضوع پر نظر نہیں آیا۔ راقم الحروف کا ایک نہایت مختصر مضمون "پنچ تنتر" کے عنوان سے مجلہ نیا ہند الہ آباد میں اپریل ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا ہے جو کلیلہ دمنہ ہی سے متعلق ہے۔ مگر [illegible] مختصر اور غیر مفید ہے اور ایک مضمون راقم الحروف کا "پنچ تنتر یا کلیلہ دمنہ" کے عنوان سے ماہنامہ ماہ نو کراچی بابتہ ستمبر ۱۹۵۱ء میں چھپا ہے مگر چھ صفحات کے مضمون میں کیا ہو سکتا تھا؟

اس کے بعد یہی مقالا ہے۔ جو آپ کے پیش نظر ہے اور یہ پہلا تفصیلی مقالا ہے جو ابن المقفع سے متعلق پیش ہو رہا ہے ورنا اس سے پہلے کوئی مقالا ہندستانی یا فارسی میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس موضوع پر پہلی کوشش عباس اقبال کی اور دوسری راقم الحروف کی ہے۔ خدا کرے ہم دونوں کے بعد کوئی ——

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند!

کے مصداق جن چیزوں تک ہم دونوں نہ پہنچ سکے پہنچ جائے۔

میں چاہتا تھا کہ پنچ تنتر اور کلیلہ دمنہ کا تقابلی مطالعہ کروں۔ یہ بڑی دل چسپ چیز ہوتی۔ مگر آپ یہ معلوم کر کے متحیر ہوں گے کہ پنچ تنتر کہیں نہیں ہے۔ بدنصیبی سے میں سنسکرت سے بے بہرہ ہوں۔ مگر پھر بھی میں نے کوشش کی کہ کہیں سے پنچ تنتر ملے تو کسی سنسکرت کے ودوان سے کام لوں۔ مگر ہو تو ملے۔ پنچ تنتر کا نام ہی رہ گیا ہے۔ ہتوا پدیش مہابھارت وغیرہ کو ملا کر بعض کتابیں لکھی گئی ہیں اور نام وہی رکھا گیا ہے۔ چنانچہ مرہٹی اور ہندی میں بھی یہی ہوا اور ان دونوں زبانوں کے بیشتر ترجمے میں نے دیکھ ڈالے۔ انگریزی میں جو ترجمے ہوے ہیں وہ بھی میں نے ڈھونڈے مگر ناکامی ہوئی۔ البتہ مسٹر آئیر کا ترجمہ جس کا حوالا اس سے پہلے دے چکا ہوں۔ مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اس میں خود آئیر صاحب نے لکھا ہے کہ "ان قصوں میں اور قصے بھی شامل کر دیے گئے۔ نارائن کا قصہ ہتوا پدیش بھی جو اس قصے کے مماثل

(۱) بیس چالیس سال پہلے ایک ترجمہ کلکتہ سے ٹائپ میں شایع ہوا تھا۔ جس کا ایک نسخہ والد مرحوم حضرت تجلی کے کتب خانہ میں تھا۔ مگر ہم لوگوں کی اضلاع نوردی کے زمانے میں کتب خانہ کی بیشتر کتابیں دیمک کی غذا بن گئیں جن میں یہ ترجمہ بھی تھا۔ اس ترجمے سے متعلق میں نہیں لکھ سکتا کہ کیسا تھا کیونکہ میرے بچپن (ہی) میں [illegible] تلف ہو گیا۔ (۱) پنچ تنتر کے اردو تراجم پر ڈاکٹر گیان چند کے مقالات جو رسالہ اردو میں چھپے ہیں ملاحظہ طلب ہیں۔

تھا اسی میں شریک کر دیا گیا اس طرح پنچ تنترا ور ہتوا پدیش مل کر سترہ قصے ہوگئے۔ اور کمنڈ کا کے نیتی شاستر سے اچھی اچھی نظمیں لے کر بھی اس میں داخل کر دی گئیں۔" آپ کے اس ترجمے میں ۴۴ قصے پنچ تنتر کے ہیں اور ۴ قصے ہتوا پدیش کے۔ اس طرح (۴۸) قصے اس میں ہیں۔ مگر مقدمہ میں آپ صاحب نے سترہ قصے گنائے ہیں۔ البتہ مقدمہ بڑا اچھا لکھا ہے اور ان قصص پر بڑی بے لاگ تنقید کی ہے مختلف نسخوں کے اختلافات اور چکو نگیاں بڑی تفصیل سے بیان کی ہیں۔

پنچ تنترا ور کلیلہ دمنہ کے ترجموں پر ڈاکٹر گیان چند ام۔ اے ڈی فل نے اپنے مضمون "اردو کے سنسکرت الاصل قصے" مطبوعہ اردو (کراچی) بابتہ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء میں بھی بحث کی ہے اور ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی ام اے پی۔ ایچ ڈی نے اپنے مضمون پنچ تنتر کے گجراتی ترجمے مطبوعہ اردو کراچی بابتہ اپریل سنہ ۱۹۵۱ء میں گجراتی ترجموں کو پیش تو کیا ہے مگر ابتدا ہی میں یہ لکھنا پڑا کہ:—

"تعجب تو اس بات کا ہے کہ یہ کتاب (پنچ تنتر) دنیا کے ہر ملک میں ترجمہ ہوئی اور خوب پھولی پھلی لیکن خود اس کے وطن ہندستان میں عرصہ دراز تک شاہی خزانوں کی زینت بننے کے بعد حوادث زمانہ کی بھینٹ چڑھ گئی۔"

تا وقتیکہ کوئی پنچ تنتر کا قدیم نسخہ نہ ملے یہ بتانا ناممکن ہے کہ وہ کیسی کتاب تھی۔ البتہ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ عربی کلیلہ دمنہ کا مقابلہ سنسکرت کی قدیم پنچ تنتر سے کیا جائے اور کلیلہ دمنہ سے مطابقت رکھنے والی حکایتیں چن کر مفروضہ پنچ تنتر مرتب کی جائے۔ یہ کوشش میں نے کی مگر مرہٹی میں جو چند کتابیں پنچ تنتر کے نام سے ملتی ہیں کلیلہ دمنہ سے بے حد مختلف نظر آئیں۔ اس لیے میں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ کوئی ایسے بزرگ جو سنسکرت اور عربی پر عبور رکھتے ہوں اس کام کو کریں تو مناسب ہوگا۔ جیسا کہ میں نے اس سے پہلے عرض کیا ہے ا...

عباس اقبال کے فارسی مقالے سے میرا یہ مقالہ بنا ہوا ہے۔ اس کو میری تالیف قطعاً خیال نہ فرمائیے۔ ترجمہ اور اس پر اضافہ ہے۔ اور بس میرا اپنا مواد اس ترجمے میں جگہ جگہ میں نے کھپا دیا ہے اس طرح زیادہ محنت عباس اقبال کی اور کم محنت میری ہے۔ اور یہ مقالہ آپ کے سامنے ہے۔ میں خوش ہوں کہ ایک اضافہ ہندستانی ادب میں ضرور ہوا۔ یہ ہندستانی کی کامیابی ہے جس کا سہرا محترم مولانا عبدالحق سلمہ اللہ تعالیٰ کے سر ہے خداوند عالم ہندستانی کی خدمت کے لیے محترم مولانا کو تا دیر سلامت رکھے

غزل

صابر حسین صابر (لکھنوی)

نہ بھولے گی کبھی اصلاح نہ تا عمر رواں ہم کو
ہماری داستاں تم کو تمہاری داستاں ہم کو

ابھی سے کترنا ہے لیے بال و پر کیوں باغباں ہم کو
قفس کا ہے ترے لینا ابھی تو امتحاں ہم کو

بہار آنے کا حاصل ہم فقط اتنا سمجھتے ہیں
کہ بابے قفس دینا پڑا ہے آشیاں ہم کو

پہنچ جاتے ہیں جب نزدیک بڑھ جاتا ہے وہ آگے
غرض اب مل نہیں سکتا ہمارا کارواں ہم کو

ہوا کے دوش پر اڑ اڑ کے تنکے آئے گلشن سے
قفس تک ڈھونڈنے آیا ہمارا آشیاں ہم کو

نہ جانے کتنے طوفان و حوادث ہم نے دیکھے ہیں
ہوئے ہیں سیر جب ہم ملیں آسانیاں ہم کو

صدا ہر رند کے منہ سے یہ میخانے میں آتی ہے
ادب پیر مغاں ہم کو ارے پیر مغاں ہم کو

کھلی کس وقت صابر آنکھ اپنی واہ ری قسمت
جگا کر چل دیے جس دم سب اہل کارواں ہم کو

چینی زبان کو صوتی یا آوازی اصول پر ڈھالنے کی تجویز

وے چو یہہ — چین کی تحریری زبان سدھار کمیٹی کے انتظامی ممبر

چین کی تحریری زبان صوتی یا آوازی زبانوں سے کس طرح الگ ہے

چینی زبان جو ہان جنتا کی زبان ہے ایک تصوری رسم خط والی زبان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ایسے تصویری حروف میں لکھا جاتا ہے جو خیال کی علامت ہوتے ہیں۔ ہر تصویری حرف یا تصوری رسم خط قلم کے ایسے خطوں سے پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں ایک خاص ڈھنگ سے ترتیب دی جاتی ہے۔

چینی زبان کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ شبدوں کو اکثر ان کی شکل سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یا جزوی طور سے تمام ہم آواز شبدوں کی (ایسے شبد جو معنی کے اعتبار سے مختلف مگر آواز کے لحاظ سے ایک سے ہوں) ان کے تصویری حروف کی شکل کی بدولت ایک دوسرے سے شناخت کی جاسکتی ہے مثال کے طور پر یہ تصویری حروف [illegible]، [illegible]، [illegible] جن کا مطلب ترتیب وارثیا، کارنامہ اور صوبہ ہے سب کا تلفظ یہ ہے لیکن ان کی شکل ایک کو دوسرے سے الگ کرتی ہے۔

چینی تصویری حرف چونکہ آوازی ڈھنگ سے نہیں لکھا جاتا ہے اس لیے اس کو مختلف بولیوں یہاں تک کہ بدیسی تحریری زبانوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چین میں ایک یا دوسری بولی میں کسی تصویری حرف کا مختلف انداز میں تلفظ ادا کیا جا سکتا ہے مگر اس کا مطلب پھر بھی اپنی شکل کی وجہ سے واضح رہتا ہے۔ جاپانی زبان چینی زبان سے بالکل مختلف ہے لیکن اس نے بہت سے چینی تصویری حروف اپنائے ہیں۔ چینی تصویری حروف کو کبھی کوریائی اور ویٹ نامی لوگ بھی استعمال کیا کرتے تھے۔

آوازی زبان میں ہر لفظ آواز یا آوازوں کی ترجمانی کرتا ہے جس کے ہجے حروف ابجد میں کیے جاتے ہیں۔ لفظ یا جملے کا مطلب اس کے تلفظ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لیے آوازی زبانیں ایک ایسے طریقہ سے تعلق رکھتی ہیں جو چینی زبان سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

حقیقتاً ہم اسے ایک خوبی کہہ سکتے ہیں کہ چینی زبان مطالب کو تصویری حروف کے ذریعے ادا کر سکتی ہے۔ اور تلفظ کے مقامی اختلافات کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن دوسری طرف آوازی زبانوں کو تحریری نیز اور بول چال میں اس کی آواز کے درمیان گہرے رشتے کی وجہ سے اہمیت دی جانی چاہیے۔

چینی حروف اپنی تصویری شکل یعنی خط لگانے کی بدلتی ہوئی ترتیبوں اور لکھنے کے مختلف اسالیب کی وجہ سے خوش نویسی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو آوازی زبانوں کے حروف ابجد سے زیادہ جمالیاتی قدر رکھتے ہیں لیکن چینی شبد قلم کے خطوں سے، چونکہ نہایت پیچیدہ جوڑ توڑ سے بنتے ہیں اس لیے آوازی زبانوں کے حروف ابجد اس سے زیادہ سادہ ہوتے ہیں اس لیے آوازی زبانوں کے حروف ابجد روا روی کے ساتھ اور قلم برداشتہ لکھے جا سکتے ہیں۔

چین کی تحریری زبان سیکھنا اتنا آسان نہیں جتنا کہ کسی آوازی زبان کا سیکھنا اور چینی زبان عملی طور پر بھی اتنی آسان نہیں ہے اس کا سبب ڈھونڈنا مشکل نہیں چینی حروف میں قلم کے خطوں کی ترتیب لامحدود طور پر متنوع ہے اور ان کے تصوری ڈھانچے پیچیدہ ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ چینی زبان سیکھنے اور اسے استعمال کرنے میں زیادہ وقت لگتا ہے اور زیادہ کوشش کرنی پڑتی ہے چینی زبان کو عمل میں لانے کے معنی یہ ہوئے کہ ۱۵۰۰ سے ۲۰۰۰ تک انتہائی مختلف تصویری حروف یعنی ان کی شکل ان کے معنی اور تلفظ پر عبور حاصل کیا جائے۔ یہ ایک دشوار اور محنت طلب کام ہے آوازی زبانوں کی بات ہی بلکل الگ ہے۔ ابجد کے بیس یا تیس حروف کو صرف پہچاننا اور انہیں لکھنا سیکھنا پڑتا ہے اور پھر ان حروف کی بدولت ہر شخص شبدوں کے ہجے کر سکتا اور پڑھ سکتا ہے۔

چینی حروف کی پیچیدگی کی وجہ سے چینی زبان کو ٹائپ رائیٹر ٹائپ کی چھپائی اور ٹیلیگرافی کے جدید ذریعوں کے اظہار میں استعمال کرنا دشوار رہا ہے۔

قومی آزادی چینی عوام کے لیے تہذیبی ترقی کی خاطر سازگار حالات کا پیام لائی ہے لیکن چین کی تحریری زبان تعلیم اور کلچر کی توسیع اور فروغ علم و آگہی کی نشر و اشاعت اور نئے خیالات اور ہنر کو جذب کرنے میں ابھی تک ایک دشوار ذریعہ ہے بعض اوقات جدید سماج کی زندگی کی ضرورتوں کے برابر اسے ڈھالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی تحریری زبان کو سدھارنے اور دھیرے دھیرے آوازی طریقے کو اختیار کرنے کی تجویز تیار کر رہے ہیں۔

آیا چینی زبان کا آوازی زبان بنایا جانا ممکن بھی ہے

چین کی آبادی کثرت سے ہے اور اس کا علاقہ بھی بہت بڑا ہے چین کی تحریری زبان ہزاروں سال سے استعمال ہو رہی ہے۔ اس کو آوازی زبان میں بدلنا آسان کام نہیں۔ اور چند مسئلے ایسے بھی ہیں جن کا حل کیا جانا ضروری ہے

اب میں اخبار "عوامی چین" کے پڑھنے والوں کی طرف سے کیے گئے تین سوالوں کا مختصر سا جواب دینے کی کوشش کروں گا اور وہ سوالات یہ ہیں۔ ہم ہجہ الفاظ بولیاں اور ہمارا اتفاقی ورثا ــــــ

ہم ہجا الفاظ (وہ شبد جن کے ہجے ایک سے ہوتے ہیں مگر ان کا مطلب الگ ہوتا ہے جیسے انگریزی کا لفظ DOCK اس کا مطلب سرکنڈا ہے۔ قطع کلامی ہے پولیس تھانے کا ایک حصہ ہے یا جہاز کی گودی ہے۔) اور تلفظ الفاظ (یعنی وہ شبد جن کے ہجے مختلف ہوتے ہیں مگر جن کا تلفظ ایک سا ہوتا ہے جیسے HOUR اور OUR) ہر زبان میں مختلف درجوں میں آتے ہیں چینی زبان میں بھی بہت سے ہم آواز مگر مختلف معنی شبد ہیں مگر موجودا رجحان یہ ہے کہ ایسے شبدوں کو بڑھایا جائے جن میں دو یا دو سے زیادہ تصویری حروف ہوں یہ طریق کار ان ہم آواز الفاظ کی گنتی کو بڑی حد تک کم کر دیتا ہے جن کے بارے میں الجھاو پیدا ہو سکتا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ عام استعمال میں آنے والے لگ بھگ ۳۰ ہزار چینی شبدوں میں سے صرف ۲۴۶ واقعی ہم آواز شبد ہیں۔ مثال کے طور پر چین کے ان تصویری حروف کو 葉 葉 اور 頁 جن کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے عملی طور پر ہمیشہ دوسرے تصویری حروف کے ساتھ ملایا جاتا ہے تاکہ دو سے ارکان والے شبد بنا سکیں جیسے 樹葉 سوہیا (پتے) 葉 نیہ بہہ (کارنامہ) اور 頁 یہ (صفحوں کے نمبر) چند واقعی ہم آواز الفاظ کا مطلب جو چینی زبان کے آوازی زبان بن جانے کے بعد بھی باقی رہے گا۔ قریب قریب عبارت سے ہمیشہ واضح رہے گا۔ ایسے معاملوں میں جہاں الجھاو پیدا ہو سکتا ہے مختلف ہجے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

زیادہ تر زبانوں میں بولیاں پائی جاتی ہیں چین میں اگرچہ بہت سی بولیاں ہیں لیکن ایک ملی جلی قومی

زبان (ماندرن) جس کی بنیاد پیکنگ تلفظ ہے پہلے ہی صورت پذیر ہو چکی ہے (اتفاق کی بات ہے کہ قومی اقلیتیں اکثر اپنی زبان رکھتی ہیں) نئے چین میں آنے جانے کی سہولتوں اور اس کی معاشی اور تہذیبی ترقی کی بدولت مشترکہ زبان باقاعدگی کے ساتھ اپنے پاؤں جماتی چلی جا رہی ہے اس کے علاوہ مختلف علاقوں کی جنتا کے لیے جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے مشترکہ زبان سیکھنا مشکل نہیں کیونکہ جو بولیاں انہوں نے اب تک استعمال کی ہیں وہ مجموعی طور پر ایک دوسرے سے صرف تلفظ کے اعتبار سے مختلف ہیں مگر بنیادی ذخیرہ الفاظ یا گرامر کے اصل ڈھانچے کے لحاظ سے مختلف نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تلفظ کا اختلاف بھی محدود ہے اور اس پر عبور حاصل کیا جا سکتا ہے اس لیے ان سب باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ بات ممکن ہے کہ ملی جلی زبان کو بنیاد بنایا جائے اور وقت اور کوشش صرف کرنے کے بعد اس سے پورے ملک کی جنتا کے لیے ایک آوازی زبان بنائی جائے۔

سچ پوچھیے تو اپنے ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے کا سوال تحریری زبان کو سدھارنے کا سوال ہی نہیں بلکہ قدیم کتابوں کے طالب علموں کے لیے اس سوال کو نمٹانے کا بھی معاملہ ہے۔ یہ مسئلہ بڑی حد تک پیچیدہ ہے کہ چینی زبان کو آوازی زبان بنایا جا سکتا ہے کہ نہیں۔ بہت سی قدیم چینی کتابیں وین این یعنی قدیم ادبی اسلوب میں لکھی گئی ہیں جو پائی ہوا یعنی جدید ادبی اسلوب سے بالکل مختلف ہے۔ دونوں اسالیب نے بیان میں ایک ہی سے چینی تصویری حروف استعمال کیے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ ایک دوسرے کو سمجھنے سے مجبور رہیں۔ آج کل بعض لوگ جو مڈل اسکول یہاں تک کہ کالج کی تعلیم کے برابر علم رکھتے ہیں اکثر چوانگ زے کی تحریروں کو سمجھنے کے ناقابل ہوتے ہیں۔ اس لیے تصویری حروف کو محفوظ رکھنا چین کے تہذیبی ورثے کو محفوظ رکھنے کے برابر ہے اور ان کا آوازی زبان کے حروف میں بدلے جانے کا مطلب لازمی طور پر تصویری حروف اور قدیم چینی ادب کا مکمل طور پر نقصان ہے ماہرین لسانیات بھی ان کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتے رہیں گے اور جدید چینی زبان میں ترجمہ کرتے رہیں گے۔ اور اس طرح انہیں آسانی کے ساتھ عام پبلک کے لیے مہیا کرتے رہیں گے۔

چینی زبان کے سدھار کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

جیسا کہ میں اپنے ایک پچھلے مضمون میں کہہ چکا ہوں چین تحریری زبان کے سدھار کو دو مرحلوں میں عملی جامہ پہنایا جائے گا پہلا مرحلہ حروف کو سادا بنانے کا ہے اور دوسرا مرحلہ باقاعدگی کے ساتھ آوازی رسم خط کو رائج کرنا ہے۔

چینی زبان کے تصویری حروف ہزاروں سال سے استعمال میں ہیں اس لیے ان کو تیزی کے ساتھ آوازی زبان کے نظم میں تبدیل کرنا احمق پن ہوگا۔ آوازی زبان کو جب واقعی اختیار کر لیا جائے گا تو اس کے بعد بھی ایسا عبوری دور رہے گا جس کے دوران چینی زبان کے تصویری حروف اور نئے حروف ابجد ساتھ ساتھ استعمال کیے جاتے رہیں گے۔

اس لیے اس سے پہلے کہ سب آوازی رسم خط کو اپنائیں یہ ضروری ہے کہ تصویری حروف کو سادا بنایا جائے یہ بات تصویری حروف کے پڑھانے پڑھنے اور لکھنے کے کام کو اور ان کے عملی اقدام کو کم دشوار اور کم تکلیف دہ بنا دے گی۔

تصویری حروف کو سادا بنانے کی تجویز کا مسودہ پہلے ہی قلم بند کیا جا چکا ہے۔ اسے تجرباتی استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ اور پبلک کی رائیں جمع کی جا رہی ہیں۔ یہ تجویز ۷۹۸ تصویری حروف اور ۴۰۰ ایسے متروک حروف پر مشتمل ہے۔ جو مختلف انداز میں لکھے تو جاتے ہیں مگر تلفظ اور معنی کے اعتبار سے ایک ہیں۔ اس تجویز میں

ہات سے روانی کے ساتھ لکھے جانے والے بنیادی الفاظ کی فہرست بھی شامل ہے جو مختلف درجوں تک بیشتر چینی تصویری حروف کی لکھائی کو سادہ بناتے ہیں آخری نظرثانی اور حکام کی منظوری کے بعد اس تجویز کو پورے ملک کے عوام اپنا لیں گے۔

چینی زبان کے آوازی رسم خط کی تجویز مرتب کرنے کی تیاری کے سلسلے میں سرگرم تحقیق جاری ہے اس کام میں رہبری کرنے والا اصول یہ ہے کہ مشترکہ زبان کو جسے عام طور پر ماندرن کہا جاتا ہے پیکنگ لفظ کے برابر استعمال کیا جائے اور چینی زبان کی تمام خصوصیات کو دھیان میں رکھا جائے۔ بہت سے ماہرین لسانیات محسوس کرتے ہیں کہ چینی زبان کے نوعی "لب و لہجے" کو ظاہر کرنے کا کوئی طریقہ وضع کیا جانا چاہیے۔ مگر کیا ہر لفظ اس قسم کا اظہار رکھے گا۔ یا ہر لفظ حروف کی صورت یا علامتوں کی شکل اختیار کرے گا؟ اس کا مطالعہ کیا جانا ابھی باقی ہے حروف کا بھی ابھی فیصلہ نہیں کیا گیا ہے۔

اگر ایک مرتبہ آوازی زبان بنانے کی تجویز کا مسودہ مکمل ہو گیا اور اس کا اعلان کر دیا گیا تو پھر چین کی ساری جنتا کے سامنے اسے پیش کیا جائے گا۔ کہ وہ اس پر نکتہ چینی کرے اور مشورہ بھی دے اس کے بعد اس پر نظرثانی کی جائے گی اور اسے مناسب حکام کے سامنے منظوری کے لیے پیش کیا جائے گا۔ اور پھر دھیرے دھیرے استعمال میں لایا جائے گا۔ نئی آوازی زبان کا اختیار کیا جانا چینی جنتا کے لیے ایک بڑا کارنامہ ہوگا۔ اس زبان کو قایم کرنے میں کتنی مدت درکار ہوگی یہ وقت ہی بتا سکتا ہے۔

مگر یہ بات مانی ہوئی ہے کہ ایک یا دوسری صورت میں موجودہ تصویری حروف کچھ مدت تک استعمال کیے جائیں گے۔ اسکول کے لڑکے اور لڑکیاں اور ہماری نسل کے بوڑھے لوگ ابھی تک چینی تصویری حروف کا استعمال سیکھ رہے ہیں۔ وہ غیر ملکی جو موجودہ چینی زبان سیکھ رہے ہیں وہ بھی اس کو مفید پائیں گے ابھی تک انہوں نے جو کام کیا ہے وہ انہیں چینی زبان پڑھنے میں مدد دے گا اور جب مستقبل کی صوتی چینی زبان سیکھنے کا موقع آئے گا تو یہ ان کے بڑے کام آئے گا۔

غزل

دلاور (لکھنوی)

نہیں درکار ہے عیش و نشاط جاوداں ہم کو
خداوندا اگر دینا تو درد دو جہاں ہم کو

گذر جانا دیار عشق سے آسان سمجھے تھے
مگر دینا پڑا ہر گام پر اک امتحاں ہم کو

تمنائے سجود شوق نے پھر لی ہے انگڑائی
خدا جانے نظر آیا ہے کس کا آستاں ہم کو

جلا کر آشیاں اے برق اب ہے جستجو کس کی
تو کیا کرنا پڑے گی پھر یہ سعی رایگاں ہم کو

چلو ہم، دل کے بہلانے کو یہ بھی مان لیتے ہیں
کیا ہے یاد تم نے آ رہی ہیں ہچکیاں ہم کو

نہیں لے کی تھی سر تا پا نیا اے آشیاں رکھ کر
نظر انداز کیوں کرتی نگاہ باغباں ہم کو

نثار اس آستاں کے اے دلاور اپنی پیشانی
جہاں کرتی ہے خود سجدے جبین آسماں ہم کو

سر اینتھنی ایڈن سے ملیے

ولسن ہیرس

برطانوی وزیر خارجہ سر اینتھنی ایڈن چالیس سال سے اپنی قوم کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ۱۷ سال کی عمر میں وہ پہلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہو گئے تھے فوج میں غیر معمولی بہادری دکھانے کے صلے میں انہیں ملٹری کراس ملا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر انہوں نے اپنی تعلیم پھر سے شروع کر دی۔ اور کرائسٹ کالج آکسفورڈ سے مشرقی زبانوں کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ سیاست اور خاص کر بین قومی امور سے وہ ہمیشہ دلچسپی لیتے رہے ہیں ۲۶ سال کی عمر میں وہ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہو گئے تھے۔

ایوان عام میں انہوں نے جلد ہی نام پیدا کر لیا۔ ان کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے سر آسٹن چیمبرلین نے جو اس وقت برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے انہیں اپنا پارلیمنٹری پرائیویٹ سکریٹری بنا لیا۔ اس طرح دفتر خارجہ کے ساتھ پہلی بار ان کے تعلقات قائم ہوئے وہ ترقی کے منازل بڑی تیزی سے طے کرتے گئے۔

نیول چیمبرلین کی وزارت میں وہ برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مصالحت اور منھ بھرائی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے مسولینی کی دھمکیوں کے سامنے جھکنے اور اس کو مزید مراعات دینے کی پالیسی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور نیول چیمبرلین کی حکومت سے مستعفی ہو گئے۔ ان کے لیے یہ ایک اصول کا سوال تھا اپنے اقدام کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے اپنے حلقے کے ووٹروں کو بتایا تھا کہ "ہمیں بطور ایک قوم کے اپنی جگہ پر جم کر کھڑا ہو جانا چاہیے۔ نہیں تو ہم اپنی اور اوروں کی عزت کھو بیٹھیں گے۔"

جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی اور سر ونسٹن چرچل نے اپنی وزارت بنائی تو انہوں نے ایڈن کو اپنی وزارت میں لے لیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہ سر ونسٹن چرچل کے دست راست بنے ہوئے ہیں۔ سر ونسٹن چرچل کی کتاب "دوسری جنگ عظیم" میں آپ کو ایڈن کا بار بار ذکر ملے گا۔ ان بحرانی سالوں میں سر ونسٹن چرچل سب سے پہلے ایڈن سے ہی صلاح مشورہ کیا کرتے تھے اب تقریباً ہر کسی کو یہ یقین ہے کہ سر ونسٹن چرچل کی گدی ایڈن ہی سنبھالیں گے۔

جنگ کے آخری سالوں میں اور برطانیہ میں قدامت پسند پارٹی کی شکست سے پہلے سر اینتھنی ایڈن برطانوی وفد کے قائد بن کر اقوام متحدہ کی تشکیل کے سلسلے میں سان فرانسسکو گئے تھے ۱۹۵۱ء میں جب ان کی پارٹی برسر اقتدار آئی تو وہ پھر برطانیہ کے وزیر خارجہ بنے وزیر خارجہ بننے کے چند روز بعد ہی وہ اقوام متحدہ کی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے پیرس گئے۔

اس سے پہلے انہوں نے اقوام متحدہ کو جس کے قیام میں ان کا بھی ہاتھ تھا کام کرتے نہیں دیکھا تھا وہاں ایم وائشنسکی کی تقریر سن کر ان کو بہت دکھ ہوا۔ تقریر سننے کے بعد انہوں نے کہا تھا "سان فرانسسکو میں ہم نے جو کام کیا تھا اس کا مقصد یہ تو نہیں تھا۔ یہ ایک ٹریجڈی ہے" اسی رات انہوں نے اپنی ایک تقریر بنیاد رکی جس میں انہوں نے ان اصولوں اور امیدوں کی یاد دلائی جن پر اقوام متحدہ کی عمارت کھڑی کی گئی تھی انہوں نے اپیل کی کہ بین قوامی تعلقات کی نئے سرے سے ابتدا کی جائے۔ انہوں نے خدا قوام کے درمیان دوستانا اور

ازبکستان کی عورتیں

عبدالحقی

عورتوں کی آزادی اشتراکی سماج کے تاریخی کارناموں میں سے ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ خاص طور پر سابق روسی سلطنت کے مشرقی علاقوں میں اس کی بڑی اہمیت تھی۔

انقلاب سے پہلے ازبک عورت کو سیاسی۔ سماجی کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے اور اس لیے وہ سماج کی زندگی میں کوئی حصہ ادا نہیں کرتی تھی وہ اپنے شوہر کی کنیز تھی وہ اپنے گھر کے زنانے حصے (جس کو ازبک زبان میں ایچکری کہتے ہیں۔) میں قید، تعلیم سے بیگانہ اور جاہل تھی۔

تاشقند میں بہت سے لوگ، سادہ طبیعت اور ملنسار خاتون شریفا عبداللہ ایوا کو اچھی طرح جانتے ہیں جو علم لسانیات کی امیدوار ہیں اور جو نظامی ادارہ تعلیمات میں پڑھاتی ہیں۔ شریفا عبداللہ ایوا کی زندگی اس بات کی ایک مثال ہے کہ سوویت یونین میں ازبک عورتوں کی طرف کتنی توجہ دی جاتی ہے۔

شریفا نے ۱۹۱۴ء میں ایک غریب اور جاہل کسان کے گھر جنم لیا۔ ابھی وہ چھوٹی ہی تھیں کہ ماں باپ کا سایا سر سے اٹھ گیا لیکن نئے سوویت نظام نے انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع عطا کیا۔ آج وہ اسی ادارے میں تعلیم دیتی ہیں۔ جہاں سے کئی سال قبل انہوں نے اپنی سند حاصل کی تھی۔ وہ ان پہلی ازبک عورتوں میں سے ہیں جنہوں نے ایک کالج کی سند حاصل کی تھی تاشقند کے عوام نے کئی بار ان کو ضلع اور شہر کی سوویتوں کا ممبر منتخب کیا۔

اس ادارے میں جہاں ان دنوں وہ ازبک زبان و ادب کے شعبے کی صدر ہیں ان کو بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ نوجوان مرد و عورت جن کو شریفا نے تعلیم دی ہے۔ اب سارے ازبیکستان کے شہروں میں اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بہتیروں نے سائنس کے امیدوار کی سند حاصل کر لی ہے۔ ان میں سے دو جنہوں نے اپنی سندیں ماسکو اور لینن گراڈ میں حاصل کی ہیں۔ شریفا کے ساتھ اسی ادارے میں تعلیم اور تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ شریفا عبداللہ ایوا کو تعلیم کے میدان میں نتیجہ خیز کارنامے نمایاں انجام دینے کے لیے حکومت کی طرف سے کئی اعزاز عطا ہوئے ہیں۔

شریفا عبداللہ ایوا کے تین بچے ہیں۔ ان کی دو لڑکیاں کالج میں تعلیم پاتی ہیں۔ ایک ماسکو میں اور دوسری تاشقند میں ان کا لڑکا تاشقند کے ایک ثانوی ایک ثانوی اسکول میں پڑھتا ہے۔ خود انہوں نے ہمیشہ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ پچھلے سال ازبک سائنس اکاڈمی کے ادارہ زبان و ادب کی سائنٹفک کونسل نے ان کو بالاتفاق رائے ان کے مقالے "عورت سے متعلق علی شیر نوائی کے انسانیت دوست خیالات" پر علم لسانیات کے امیدوار کی سند عطا کی ہے۔

آج ازبیکستان کی عورتیں جمہوریا کی قومی معیشت کی تمام شاخوں میں مساوی بنیاد پر مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔

سوویت یونین میں روئی کاشت کا سب سے بڑا علاقہ ازبیکستان ہے۔ اسے سفید سونے کا دیس کہتے ہیں۔ یہاں عورتوں نے ایک بڑا حصہ ادا کیا ہے ان میں سے بہتوں کو روئی کی پیداوار میں اضافہ کرنے والی محنت و مشقت کے تمغے اشتراکی محنت کے

ہیرو کا خطاب دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک توتی خان کولبیکوا ہیں جنہوں نے ایک جتھے کی تعداد کی حیثیت سے ۱۹۴۹ء میں فی ہیکٹر (۱ ہیکٹر = ۲½ ایکڑ) روئی کی فصل میں ستر سینٹنر (۱ سینٹنر = [illegible] من) کا اضافہ کیا تھا۔ ایک غریب کسان کی لڑکی، توتی خان ۱۹۲۱ء میں فرغانہ علاقے میں التیاریک ضلع کے ایک یوریا نامی گاؤں میں پیدا ہوئی تھیں۔ ۱۹۳۸ء میں وہ ایک پنچایتی فارم میں کام کرنے کے لیے چلی گئیں۔ نمایاں کارگزاریوں کی بدولت، انہیں ۱۹۴۹ء میں تمغا افتخار عطا کیا گیا۔ توتی خان کولبیکوا کا جتھا جتنی روئی پیدا کرتا ہے۔ وہ مصر کی روئی کی پیداوار کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ ہے۔ ازبک عورتوں نے ریشم سازی کی صنعت میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔

اشتراکی محنت کی ہیرو عالیہ خان سلطانووا کو ریشم کے کیڑوں کی زیادہ پیداوار کرنے کے نئے طریقے کے لیے اسٹالن انعام دیا گیا ہے۔ وہ فرغانہ علاقے میں لووایدی ضلع کے کیروف پنچایتی فارم کے ریشم کے کیڑے کی پرورش کرنے والے جتھے کی لیڈر ہیں۔ ازبکستان میں چھبیس عورتیں اشتراکی محنت کے ہیرو کا سنہرا ستارہ اپنے سینے پر لگاتی ہیں۔ انہیں یہ اعزاز ریشم کے کیڑوں کی پرورش، چقندر اور سن وغیرہ کی فصلوں کی پیداوار میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے عطا ہوئے ہیں۔

کھیتوں میں کام کرنے کے علاوہ ازبک عورتیں زراعت کے میدان میں اعلیٰ عہدوں پر مامور ہیں اور وہاں اپنی غیر معمولی تنظیمی قابلیتوں کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ تین سو سے زاید عورتیں پنچایتی فارم جتھوں کی لیڈر ہیں۔ ۹۶ عورتیں چھوٹے چھوٹے فارموں کو ملا کر بنائے جانے والے بڑے فارموں کی صدر ہیں۔ سب ملا کر تقریباً دو سو عورتیں پنچایتی فارموں کے صدر اور نائب صدر کے عہدوں پر مامور ہیں۔ وہ سب بہترین کام کر رہی ہیں۔

ازبکستان مشرقی سوویت یونین کا ایک اہم صنعتی علاقہ ہے۔ صنعت میں بھی عورتیں اعلیٰ عہدوں پر مامور ہیں۔ ازبک محنت کش عوام کی ممتاز نمایندہ عورتوں میں یہ عورتیں شامل ہیں: تاشقند کے ٹیکسٹائل مشین تیار کرنے والے کارخانے میں ملنگ اوپریٹر محبت پاردایوا، چمڑے بنانے والے کارخانے کی ماہر مزدور مرادووا، چکی چلانے والی مزدور مالیگووا — اور ایسی بہت سی عورتیں ازبک کارخانوں کی نگراں اور ازبک کارخانوں اور ملوں کے مختلف شعبوں اور [illegible] صنعتی آرٹیلوں کے صدر کے عہدے پر فائز ہیں۔

اپنے کام کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے ازبکستان میں نو سو صنعتی مزدور عورتوں کو سوویت یونین کے اعزاز اور تمغے عطا ہوئے ہیں۔

ازبک عورتوں نے، تعلیم، حفظان صحت اور کلچر کے میدان میں بھی امتیازی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ جہالت تو ازبک عورتوں کے لیے قصۂ پارینہ بن چکی ہے۔ آج ستر ہزار عورتیں کالج کی تعلیم یافتہ ہیں۔ اور پچاس ہزار عورتیں ثانوی اسکول کی سند یافتہ ہیں۔ ازبک اور دوسری جمہوریوں میں ۲۵ ہزار عورتیں کالجوں میں تعلیم پاتی ہیں۔

ازبک عورتیں سائنس کے میدان میں بڑی کامیاب خدمت انجام دے رہی ہیں۔ سترہ عورتیں سائنس کی ڈاکٹر ہیں۔ دو سو تیس سائنس کے امیدوار کی سند یافتہ ہیں۔ ان میں سے بہت سی عورتوں کی عمر بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر ازبک سائنس اکادمی کے ادارۂ علوم مشرق کی ڈائرکٹر اور تاریخی سائنسوں کی امیدوار صباحت خان عظیم جانووا ہیں۔ بہت سے بیرونی سائنس داں ان کی ان رپورٹوں سے مانوس ہیں جو انہوں نے طہران میں بوعلی سینا کے یوم پیدائش کی سولویں سالگرہ کے موقع پر ماہرین علوم مشرق کی عالمی کانگریس میں اور لندن میں ماہرین علوم مشرق کے عالمی اجتماع میں پڑھی تھیں۔

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!

مکرمی خاں صاحب! ازاد نثر قلم۔ سلام مسنون و دعا خیر! غزلیات کا پیکٹ پہنچ گیا ہوگا۔ مطلع فرمائیے۔۔۔۔۔ اس کے بعد مضامین اور نظمیں بھی روانہ ہوتی رہیں گی۔ آپ کی مودت اور خلوصیت کی دل سے قدر کرتا ہوں۔۔۔ ان یادوں کا زمانہ کہاں؟ یہ زندگی یادیں تھیں جو ختم ہو چکیں اب تو موت کا سامنا ہے آپ نے آخر تک ایک حال میں اپنی محبت اور شرافت کا ثبوت دیا۔ تقریباً پندرہ برس ضرور ہوئے ہوں گے ایسے مستقل مزاج اب کہاں! ہر حال میں آپ شاد و آباد رہیں۔ خیریت نامے اور رسید سے آگہی بخشی جائے، ممنون ہوں گا۔ اور منتظر رہوں گا۔ والسلام۔ اس کے ساتھ اپیل کا ایک پرچا بھی شامل ہے دل نہ مانا لکھ دیا گیا۔ اگر مناسب سمجھا جائے تو آئندہ اشاعت میں دیدیا جائے۔

ناچیز فقیر افقر موہانی وارثی عفی عنہ

"ہندستانی ادب" جب نہ ہوگا۔۔۔۔!

تو زمانہ اپنی مردہ پرستی کا ثبوت دے گا۔ تاویلیں ہوں گی توجیہات کی جائیں گی کہ کیا ہوا۔ کیوں بند ہوا۔ بھائی کتنا ٹھوس اور پر مغز رسالہ تھا۔ اب ایسا حقیقتاً لگا پرچہ دوسرا نہیں۔ وغیرہ۔ مگر یہ سب کچھ مشتے بعد از جنگ سے زیادہ نہیں بقول کسے ع

"پس از آں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد"

وعدہ فرمایان تسلی سے کہتا ہے کہ۔۔۔۔

"تا تو برمن برسی من بخدا می رسم"

یعنی تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود مریض کی حالت دیکھنے والوں سے گذارش ہے جو زباں حال سے کہہ رہا ہے ؂

یہ شور ہے ہم آتے ہیں چارہ جو کرنے
اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

پھر بھی آنکھیں نہیں کھلتی ہیں، وہی تغافل وہی بے نیازی وہی وعدے وعید۔ عمل کا ایک قدم بھی آگے نہ بڑھا۔ زبانی طفل تسلیوں کا وقت گذر گیا ناتوانی کی حد نہیں۔ پھر جب تیمار دار خود بیمار ہو اس پر نادار کی مجبوری وائے سخت جانی کہ اب تک دم بھی نہ نکلا۔۔۔۔

مختصر یہ کہ اب بھی کچھ وقت ہے اگر واقعی عملی علاج کیا گیا تو امید زیست ہے کیونکہ یہ تو مرنے والے نہیں پائے جاتے ہیں وہی دم خم۔ وہی حق گوئی وہی لب لہجا اور وہی انداز نگارش اب بھی ہیں جو توانائی بین تھے۔ اگر علاج وقت پر اور عملی طور پر ہوا تو آئندہ کی ضرور امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں۔ ارباب کرم کے ساتھ ذوق ادب کا ہونا بھی ضروری ہے۔ گو یہ تعداد انگلیوں پر بھی شمار سے کم ہی پھر بھی جس قدر ہے کافی ہے مگر توجہ شرط ہے عمل لازم اور قصد مصمم کی ضرورت ہے سب ہی تو ہمارے ایسے فقیر امت نہیں ہیں۔ کیا تماشا ہے کہ ساحل سے ڈوبتے ہوئے کو دیکھا جائے اور نکالا نہ جائے یہ کہاں کی علم دوستی اور ہمدردی۔ اپنا ادب اور شرافت بلکہ کہنا پڑتا ہے کہاں کی انسانیت ہے۔ جب چراغ گل ہو گیا ڈوبنے والا تہ آب پہنچ گیا۔ آخری نفس بھی ختم ہو گیا تو ماتم سے فائدہ۔ ضرورت تو اس وقت برمحل نگہداشت اور چارہ سازی کی ہے تمام ہندستان نہ سہی کیا دکن میں چند ہستیاں بھی ایسی نہیں ہیں جو اپنے وطن کے نام لیوا

کے خاطر تھوڑی سی زحمت گوارا فرمائیں اور ایک دینے والے کو سنیال کر اپنے نام بالا و بلند کر دکھائیں؟ ہماری آواز صدا بہ صحرا ہی مگر آپ بھی تو بفضل خدا صاحب گوش و ہوش ہیں۔ خود دیکھیں سمجھیں اور سہارے کا ہاتھ بڑھائیں حکومت اپنی ہوتی تو بیگانہ کیوں بن جاتی۔ اس سے کہنا ہی کیا۔ مگر آپ تو اپنے ہیں آپ کیوں نہیں سنتے۔ ع

پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ والسلام

"ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کو یاد ہوگا کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے بھی مولانا کی ایک اپیل انہیں صفحوں میں چھپی تھی اس کے بعد واقعہ یہ ہے کہ کسی دوسری اپیل کی ضرورت نہ تھی مگر ہمیں مولانا کا احترام ملحوظ ہے ہم ان کی کسی بھی تحریر کو رد نہیں کر سکتے۔ محض مولانا کے حکم کی تعمیل میں اپیل جون کی توں دیدی گئی ہے۔ اس کے بعد "سپردم بتو ..." والا معاملہ ہے ہم اس بارے میں زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ ہاں اتنا ضرور کہیں گے کہ کم سے کم لکھے پڑھے لوگوں کو اس اپیل کی طرف ضرور دھیان دینا چاہیے۔ رسالے کی زندگی کا چراغ حقیقت میں ٹمٹما رہا ہے ـــــ نہ معلوم حوادث زمانہ کے کس تھپیڑے میں گل ہو! اس میں جان بھرنے کی ضرورت ہے نئی زندگی بخشنے کی حاجت ہے اور ترقی کے رستے پر لگانے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی سہائتا کی طرف خاص توجہ دی جائے۔ اس سے ہمارا مقصد ہرگز کسی قسم کی مدد امداد نہیں بلکہ ہم صرف یہی چاہتے ہیں کہ اس کا ہر ہمدرد اس بات کا بیڑا اٹھائے کہ نیا دانہ سہی چند خریدار ضرور فراہم کر دے گا۔ رسالا اپنا خرچ آپ نکال لے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے تو ہمیں آئے دن کی مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔ موجودہ حالات واقعی ہمارے لیے ناقابل برداشت بن گئے ہیں کسی رسالے کو مسلسل نقصان میں چلانے کے لیے حقیقت میں قارون کا خزانہ بھی کافی نہ ہوگا۔

اقفر کی مخلصانہ اپیل پر ضرور کان دھریں گے۔ ایڈیٹر

حیدرآباد دکن

برادر مکرم! احسن نواز کو آپ سے مل کر گھر آیا اسی شام سے بستر پر لیٹ گیا اور ایسا لیٹا کہ بس لیٹا ہی رہا۔ وہی سانس کی تکلیف مجبوراً رخصت اتفاقی ختم کر کے رخصت خاص لینی پڑی اب فی الطبیعت صاف ہوئی ہے دونوں مضمون "تمکین کی شاعری" اور "ابن سینا" بطور خاص آپ کے رسالے کے لیے لکھ رکھے ہیں۔ آپ مطمئن رہیں قریب ہی میں پہنچا دوں گا۔

آج آپ کا جون نمبر ملا۔ شکریہ! نظر بد سے بچے۔ رسالا تو واقعی معنوی اور صوری دونوں حیثیتوں سے ترقی کر رہا ہے۔ ٹائیٹل کو تو آپ نے اتنا جاذب نظر بنا دیا ہے کہ بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے کاغذ بھی بڑا اچھا استعمال ہو رہا ہے اور لکھائی چھپائی بھی خاص نفیس ہو گئی ہے مضامین بھی معیاری ہیں۔ غزلیں اور نظمیں بھی اچھی ہیں۔ سلام سندیلوی کی نظم "حیدرآباد" واقعی بہت اچھی ہے اس پر آپ کا مختصر نوٹ تو "سونے پر سہاگے" کا کام کر گیا ہے۔

اس ادب نشناس دور میں ایک خالص علمی ادبی رسالے کو چندا سال سے پابندی کے ساتھ جاری رکھنا آپ کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی کا ثبوت ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں ممکن ہے اس کی مدد امداد کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے۔ علالت کی وجہ سے یہ دن برے کٹے۔ خدارا آپ زحمت نہ فرمائیں اولین ہمت میں آپ کے پاس آؤں گا۔ اولین ہمت اس لیے کہتا ہوں کہ جب بھی ذرا نکلنے کے قابل ہو جاؤں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا اور کیا عرض کروں۔ بس آپ کی دعائے خیر کا طالب ہوں ... تمکین کاظمی کچھ نہ سہی ـــ گرد ھارس بندھانے ہی کا شکریہ! محترم! ایسی قلمی تعریفوں سے بھی کہیں کام بنتا ہے عملی اقدام کی ضرورت ہے ہمیں کسی کی "مدد امداد" کی کوئی ضرورت نہیں صرف رسالے کی ڈوبتی ناؤ کو بچانے کا سہارا چاہیے یہ کام خریداروں کی فراہمی سے بن سکتا ہے اگر آپ جیسے علم دوست اور ادب نواز حضرات یوں ہی تسلی اور دلاسا دیتے رہیں اور حقیقت میں کوئی عملی قدم نہ اٹھایا جائے اور محض قدر ہی وعدے کرتے چلے جائیں تو پھر یہ قول مولانا اقفر "تا تریاق از عراق آوردہ شود ..." والی مثال پوری اترے گی یعنی ہندستانی ادب ... عجب نہ ہوگا۔"

آپ صرف ادیب ہی نہیں بلکہ ایک کہنہ مشق صحافی بھی ہیں۔ آپ کو ان جھمیلوں کا تجربہ ہم سے کہیں زیادہ ہے آپ بہتر طریقے پر جانتے ہیں ایک خشک علمی ادبی رسالے کو مسلسل اور پابندی کے ساتھ چلانا کتنا ہی کٹھن کام ہے آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ایسے رسالے عموماً نقصان میں چلائے جاتے ہیں ــــ مگر کب تک ــــ آپ نے رسالے کی ظاہری اور معنوی خوبیوں کو تو سراہا۔ مگر اس پر روشنی نہیں ڈالی کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر ہوتا ہوگا۔ ہمیں آپ جیسے مخلصوں اور ہمدردوں سے آشا ہے کہ اس کٹھن کام میں ہمارا ہاتھ بٹا کر اور بھی زیادہ علمی ادبی سیوا کا موقع دیں گے۔ ایڈیٹر

لگتا ہے کہ رسالے سے سچی ہمدردی رکھنے والے مولانا

تبصرے

فقہ الحدیث

کتابی سائز حجم ۱۱۵ صفحے۔ کاغذ، لکھائی چھپائی پاکیزہ۔ آرٹ پیپر کے دو رنگی گرد پوش کے ساتھ معمولی جلد۔ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتا نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی (پاکستان) ہندستان میں ترسیل زر کا پتا: اشتیاق بک ڈپو۔ سہارن پور (یو۔پی)

دارالعلوم دیوبند کے مشہور محدث مولانا سید اصغر حسین نے عوام کی معلومات کی غرض سے اس مختصر سی کتاب میں مختلف موضوعات پر ۱۳۳ سوال پیش کیے ہیں اور ہر سوال کے جواب میں ایک یا ایک سے زیادہ احادیث ترجمے کی شکل میں دی گئی ہیں کتاب کو حسب ذیل ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے۔

ایمان کی باتیں۔ وضو اور غسل، طہارت و نجاست۔ نماز اور اس کے متعلقات۔ جمعہ اور خطبہ۔ زکوٰۃ کا حکم روزے کے مسائل۔ حج بیت اللہ۔ نکاح شادی اور اس کے متعلقات کھانے پینے کی اشیا اور حرام و حلال کا بیان۔ خرید و فروخت متفرق و عجیب باتیں اور علاج معالجہ گور و کفن حسن ظن۔

کتاب کے طویل ہونے کے خیال سے احادیث کا عربی متن تو نہیں دیا ہے لیکن رہبری کے طور پر ان کتابوں کا حوالا دیدیا گیا ہے جن سے یہ احادیث لی گئی ہیں۔ سوال اور جواب نہایت ہی آسان اور سیدھی سادی زبان میں ہیں اس لیے یہ کتاب ہر شخص کے مطالعے کے قابل ہے۔ "ا"

حیات ز۔خ۔ش

مولفہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ لکھائی چھپائی پاکیزہ اور نفیس کاغذ میکانیکل۔ ٹائیٹل رنگین سادہ اور پر کار صفحات ۲۲۶ قیمت تین روپے ملنے کا پتا سعود منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن

ز۔خ۔ش، زاہدہ خاتون / نزہت شروانیہ کا قلمی نام ہے زاہدہ بھیکم پور کے مشہور رئیس نواب مزمل اللہ خان کی دختر نیک اختر تھیں۔ ۱۸۹۴ء میں اس امیر گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور ۱۹۲۲ء میں اللہ کو پیاری ہوگئیں اپنی ۲۷ سالہ مختصر سی عمر میں ز۔خ۔ش نے دنیائے ادب سیاست اور شاعری میں وہ شہرت حاصل کی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

زاہدہ بچپن ہی سے ذکی، ذہین اور فہیم تھیں اس پر معقول تعلیم اور تربیت تو سونے پر سہاگے کا کام کر گئی۔ نتیجہ یہ کہ زاہدہ کے ادبی جوہر چمک اٹھے ان میں بچپن ہی سے شعر گوئی کا جذبہ موجزن تھا اور ۱۹۰۴ء دس سال کی چھوٹی عمر میں تو وہ اچھے خاصے شعر کہنے لگی تھیں اس کم عمر لڑکی کی فراست اور شعر گوئی کے چرچے شدہ شدہ گھر سے باہر بھی ہونے لگے۔ اس کے بعد ملک کے متعدد رسالوں اور اخباروں میں ان کا کلام اور مضامین وغیرہ چھپنے لگے۔ اور خوب خوب ہی خراج تحسین حاصل کیا۔ اپنی معرکہ آرا نظموں کے صلے میں انہوں نے کئی ایک انعامات اور تحفے بھی حاصل کیے

نزہت اگرچہ ایک رئیس گھرانے میں پیدا ہوئیں لیکن وہ ایک دردمند دل بھی رکھتی تھیں۔ چنانچہ ملک اور قوم کے ہر چھوٹے بڑے واقعے کا ان پر گہرا اثر ہوتا تھا۔ واقعہ کانپور اور جنگ طرابلس و بلقان سے متاثر ہو کر انہوں نے متعدد نظمیں لکھیں اس کا عوام پر کافی اثر ہوا۔ اور ساتھ ہی اس کے مفید نتائج بھی برآمد ہوئے وجہ یہ ہے کہ نزہت کے کلام میں سوز و گداز اور جا بجا درد کے جوہر پائے جاتے ہیں

زاہدہ کی ادبی قابلیتوں سے متاثر ہو کر ۱۹۱۷ء میں خواجہ حسن نظامی نے انہیں "فضائل بانو" کا لقب دیا تھا اور اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں "بزم خسروی" کے مشاعرے میں پڑھی گئی نظم سے متاثر ہو کر "مسلمان سروجنی" کے لقب سے شہرت دی۔ نہ صرف حسن نظامی بلکہ ہر شخص ز۔خ۔ش کی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کا قائل ہو چکا تھا۔ اور جا بجا ان کی شاعری کے چرچے ہو چلے تھے۔

نزہت نے اپنی مختصر سی علمی ادبی زندگی میں حسب ذیل

یادگاریں چھوڑیں۔ (۱) "فردوس تخیل" مجموعہ کلام مطبوعہ (۲) "دیوان نزہت" اخلاقی غزلوں کا غیر مطبوعہ مجموعہ (۳) "پُرکار ویان ناکام" ایک فرانسیسی کتاب کا نامکمل ترجمہ (۴) "بیاض شعر" مشہور شعرا کے منتخب کلام کا مجموعہ (۵) "روزنامچہ" مگر بہ قول مولفۂ کتاب ان تمام چیزوں، باستثنائے "فردوس تخیل" کے، نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں گئیں۔ یا کہاں ہیں؟ چھ ماہ کا مرتب شدہ روزنامچہ البتہ محفوظ ہے جو کہ بجائے خود ایک آدبی شاہکار ہے شاید کبھی تائید ایزدی اس کو منظر عام پر لے آئے۔

ان چیزوں کی طرح ز۔ خ۔ ش کے حالات زندگی بھی تاریکی میں پڑے رہتے۔ اگر اس کتاب کی قابل مولفہ انیسہ ہارون بیگم شروانیہ اس اہم کام کا بیڑا نہ اٹھاتیں مولفہ کتاب خود بھی ایک کہنہ مشق شاعرہ اور صاحب کلیات موسوم بہ "انیسیات" ہیں موصوفہ نزہت مرحومہ کی ماموں زاد بہن ہیں اسی لیے حالات زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کا پہلا باب "خاندان شروانی کی مختصر تاریخ" مولفہ کے شوہر پروفیسر ہارون خان شروانی سابق صدر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ کتاب نہایت ہی سلجھے ہوئے پیرایے اور دل چسپ انداز میں لکھی گئی ہے واقعات کا تسلسل کچھ ایسے نرالے ڈھنگ سے قایم کیا گیا ہے کہ ایک بار کتاب کو شروع کرنے کے بعد ناختم چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا اس لیے ایک ایسی دل چسپ اور پر از معلومات کتاب کے پڑھنے کی ہم ہر ایک سے سفارش کریں گے۔ "ت۔ ل"

ہندستانی زبان کراون سائز (۸۴) صفحات کاغذ معمولی، لکھائی چھپائی گوارا قیمت کتاب پر لکھی ہوئی نہیں ہے۔

یہ امام اکبر آبادی کے چند مضامین کا مجموعہ ہے ابتدا ظ۔ انصاری میرٹھی نے دو باتیں لکھی ہیں اور مخمور اکبر آبادی نے پیش لفظ لکھا ہے۔ اس مجموعے کے بیشتر مضامین نہایت کار آمد قیمتی اور معلومات سے بھرے ہوے ہیں۔ اعداد شمار بھی نہایت ہی صحیح اور بڑے اچھے دیے گئے ہیں۔

امام اکبر آبادی نے اردو کو ہندستانی ثابت کر کے ملک کی بڑی خدمت کی ہے حقیقت یہ ہے کہ اردو اسی وقت ختم ہو گئی۔ جب لشکر ختم ہوا اور ہندستان میں ہندستانی رہ گئی جسے مختلف مقامات پر مختلف ناموں سے پکارا گیا چنانچہ دکن میں ہندوی دکنی اور بعض مقامات پر ہندی اسی زبان کو کہا گیا جس کا نام آگے چل کر اردو ہوا اور جو اب ہندستانی کے نام سے مستعمل ہے۔

امام صاحب نے زیر تبصرہ کتاب کے ۶۵ ویں صفحے پر انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی رپورٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ سنہ ۱۹۲۰ء تک صرف ایک انجمن ترقی اردو نے ۶۰۰۰ ہزار اصطلاحات وضع کیے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے مگر وضع اصطلاحات کا کام صرف انجمن ترقی اردو نے نہیں کیا ہے بلکہ دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کی مجلس وضع اصطلاحات نے کیا ہے۔ جس کی روح رواں پروفیسر سلیم پانی پتی مرحوم تھے اور بقیہ فنون کی اصطلاحیں متعلقہ شعبوں کے پروفیسر نے پیش کیں جسے معمولی ترمیم کے ساتھ مجلس نے قبول کیا۔ اس طرح تقریباً چالیس ایک ہزار اصطلاحات اس مجلس نے وضع کیے تھے۔ جنہیں انجمن ترقی اردو سے شایع کر کے اس کا سہرا مولوی عبد الحق نے زبردستی بھی اپنے سر باندھا امام صاحب نے اس مختصر کتاب میں بڑی کار آمد چیزیں جمع کر دی ہیں۔ اپنی زبان سے دل چسپی رکھنے والوں کو چاہیے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اہل قلم حضرات اس کو پیش نظر رکھ کے خامہ فرسائی کریں۔ "ت۔ ل"

تبصرے

کے لیے بعض ادارہ داروں نے صرف ایک ایک ہی کتاب روانا کی ہے ان سے مکرر عرض ہے کہ وہ اور ایک ایک کتاب روانا کریں ورنا تبصرے کی آشنا نہ رکھیں اگر دو کتابیں دینا منظور نہ ہو تو رجسٹری کے لیے ٹکٹ روانا کر کے اپنی کتابیں واپس منگوا لیں۔ تین مہینے گذرنے کے بعد اس دفتر پر کتاب کی کوئی ذمہ داری نہ رہے گی تبصرے کے لیے ہر وقت دو جلدیں بھجوایا کیجیے!

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیہ)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

جلد (۱۵) ایڈیٹر نمبر (۱۱)

جی۔ ام۔ خان، ام۔ اے (عثمانیہ)

مہر ۱۳۶۴ف اگست ۱۹۵۵ء

چندا سالانا آٹھ روپے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
حقایق و معارف	لسان الحقیقت اقبر موہانی	۳
غزل	ناخدائے سخن نوح ناروی	۴
غزل	سراج (لکھنوی)	۵
غزل	سید حسن امام حسن وارثی	۶
غزل	جسٹس پنڈت آنند نراین ملا (لکھنوی)	۷
غزل	ام۔ اے۔ وارثی	۸
آہ! خواجہ حسن نظامی	عبدالماجد دریاآبادی	۹
غزل	صابر آروی	۱۲
رباعیات	ماجد ادیب (بریلوی)	۱۲
چتوڑ گڑھ کی تاریخی اہمیت	ا۔ ا	۱۳
"میری شاعری میری نظر میں"	تمکین کاظمی	۱۴
غزل	شفا گوالیاری	۲۰
برطانوی تعلیمی نظام سے متعلق میرے مشاہدات	ایس نٹراجن	۲۱
پندرہ اگست	سلام سندیلوی ام۔ اے۔ ال ال۔ بی	۲۲
ہمارا تھیٹر کا ڈراما	ا۔ ا	۲۴
غزل	معراج (لکھنوی)	۲۵
ہندستان اور ایران کا ملا جلا فن تعمیر	ا۔ ا	۲۶
شراب تلخ	ذکری (بھوپالی)	۲۷
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے	ایڈیٹر	۲۸
تبصرے	"ا" اور "ت۔ک"	۳۰

ہمارے خیالات

سنہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے کہ ہم "اسٹوڈنٹس یونین عثمانیہ یونیورسٹی" کے صدر کی حیثیت سے تیس طالب علموں کی جماعت کے ساتھ شمالی ہندستان کے "تعلیمی سفر" پر گئے تھے۔ مختلف مقاموں کی سیر کرتے کراتے دلی پہنچے۔ خواجہ حسن نظامی سے ملنے ان کے گھر گئے معلوم ہوا باہر گئے ہوئے ہیں۔ آج کل میں واپسی ہوگی۔ ہم پانچ روز تک انتظار کر کے دوسرے شہر گھومتے گھامتے لاہور پہنچے ڈاکٹر اقبال سے ملنے گھر پر گئے پتا چلا کہ بیمار ہیں نہیں مل سکتے۔ ہم نے لکھ بھیجا کہ دو ہزار میل کا سفر کرتے آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔ طالب علم آپ کے دیدار کے لیے بے چین ہیں مایوس نہ کیجیے۔ کم سے کم درشن تو دیجیے! تھوڑی دیر بعد اقبال کشمیری شال اوڑھے دیوان خانے میں آئے واقعی بیمار تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک بات چیت رہی اور لڑکوں کو آٹوگراف بھی دیا۔

"تعلیمی سفر" کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالب علم جہاں جائیں وہاں کے تعلیمی اداروں کا معائنہ کریں اطراف اور طلبا سے میل جول پیدا کریں۔ اور متعلقہ مسائل پر تبادلہ خیال کریں۔ مقامی عالم فاضل ہستیوں ادیبوں اور شاعروں وغیرہ سے بھی رابطہ پیدا کریں۔ ہماری رائے میں "تعلیمی سفر" میں اولیت انہیں باتوں کو دی جانی چاہیے۔ اور سیر تفریح کی حیثیت محض ضمنی ہو۔ چنانچہ شمالی ہندستان اور جنوبی ہندستان کے دونوں "تعلیمی سفر" میں ہم نے اس نظریے کی بڑی حد تک پابندی کی۔ اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے ہمیں اقبال جیسے بڑے شاعر سے ملنے پر مجبور کیا اور اسی خیال نے ہمیں حسن نظامی جیسے مشہور ادیب سے بھی ملنے کے لیے بے چین کر دیا تھا۔

دوسرے شہروں کی سیر کرتے کراتے ہمیں کلکتہ پہنچنا تھا۔ ہم چاہتے تو دلی چھوڑ لکھنؤ کے لیے دوسرا راستہ اختیار کر سکتے تھے۔ مگر ہم واپسی میں بھی دلی گئے۔ اور صرف خواجہ صاحب کے لیے گھر پر حاضری دی۔ معلوم ہوا آ گئے ہیں لیکن بیمار ہیں۔ ہم نے تحریری اطلاع کروائی اور ملنے کا مقصد لکھ بھیجا۔ جواب ملا تکلیف ہے نہیں مل سکتے۔ ہم نے دلی دوبارہ آنے کے سبب پر زور دیتے ہوئے پھر سے لکھ بھیجا۔ جواب آیا کہ مجبوری ہے کسی سے بھی نہیں مل سکتے۔ طلبا کو ملال آ گیا۔ بری طرح سے غصے میں بھر آئے۔ اور ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا ہم نے رکتے ٹھٹھکتے ایک آخری کوشش کی۔ اب کی بار بھی جواب نفی ہی میں ملا۔ حیرت ہے کہ خواجہ صاحب اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔ نہ معلوم کیوں۔ ؟

حیدرآباد میں کئی بار ہم نے خواجہ صاحب کو دیکھا اور سنا بھی تھا لیکن کسی کے قول سے "شرف نیاز" حاصل نہیں ہوا تھا۔ ہمیں ان کے مشائخانہ رنگ سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہم تو صرف ان کی تحریر کی سادگی کے دیوانے تھے ہم ان سے ایک ادیب کی حیثیت میں ملنا چاہتے تھے۔

چار پانچ سال پہلے کی بات ہے کہ نائب ناظم اطلاعات جانکی پرشاد صاحب ہمیں علی گڑھ لے گئے۔ عام جلسے کا رنگ تھا لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے وہاں چل کر معلوم ہوا کہ خواجہ حسن نظامی کی تقریر ہے یہ سن کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ہم نے نائب صاحب سے کہا کہ خیال ہے کہ آج تو ہم خواجہ صاحب سے ضرور ملیں گے۔ کہنے لگے ہاں ہاں بالیقین ملاقات رہے گی۔ برسوں بعد دیکھنے سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ خواجہ صاحب بڑھاپے کی لوچ سے ذرا سے جھک گئے تھے اور تقریر میں بھی وہ پہلی سی روانی نہ تھی۔ تقریر کے ختم پر لوگ ملنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ تھوڑی ہی دیر میں مجمع چھٹ گیا اور جانکی پرشاد صاحب نے ہمارا تعارف کرایا تو کہنے لگے "کون۔ جی۔ ام۔ خان "ہندستانی ادب" کے ایڈیٹر" نائب صاحب نے حامی بھری تو ارشاد ہوا "ارے بھئی ان سے تو ایک عرصے سے غائبانہ تعارف ہے" اور پھر ہنستے ہوئے کہا "جانتے ہو جانکی پرشاد ان کے رسالے کی لکھائی ایک خاص ڈھنگ پر ہوا کرتی ہے صوتی اصول پر لکھا کرتے ہیں۔ میں ان کا رسالہ پابندی سے دیکھا کرتا ہوں۔ اصول تو واقعی اچھا ہے" "پھر آپ کیوں نہیں اس کو رواج دیتے" جھٹ سے ہم نے کہا ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ہنسی اور قہقہوں کی گونج میں آواز نکلی۔ بات بگڑی دلی نا آ جناب نے" اور پھر یوں کہنے لگے "نیکوں کی باتیں نیکی۔ اور بروں کی باتیں برائی۔ ہم پرانے چوٹ ہے" ہنستے ہوئے دوسروں کی طرف دیکھا جنھوں نے ایک آواز ہو کر کہا "جی ہاں بجا ارشاد ہے"

حقایق و معارف

لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی
(لکھنوی)

دل ہے ازل سے بار امانت لیے ہوئے
ذرہ ہے آفتاب کی رفعت لیے ہوئے

آئی بہار منظر فطرت لیے ہوئے
ہر گل ہے اک نمونہ قدرت لیے ہوئے

اسکی ادا نہ کیوں ہو قیامت لیے ہوئے
وعدہ ہو جس کا حشر کی مدت لیے ہوئے

ہوتی ہیں ختم عشق کی مجبوریاں ہاں
قدرت بھی ہے جہاں غم قدرت لیے ہوئے

حسن و جمال یار کی وسعت تو دیکھیے
ہر بتکدہ ہے اک نئی صورت لیے ہوئے

دنیائے عقل کہتی ہے دیوانگی جسے
دنیائے عشق ہے وہی وحشت لیے ہوئے

اہل وفا نہ منزل تسلیم سے پھرے
اٹھے قدم تو کوچہ الفت لیے ہوئے

تیر نگاہ یار کی اللہ ری کشمکش
یکساں دل و جگر ہیں جراحت لیے ہوئے

سو بار آزمایئے سو بار دیکھیے
دل ہے ازل سے آپ کی الفت لیے ہوئے

تصویر میں بھی ہے وہی انداز دلکشی
رعنائی جمال کی ندرت لیے ہوئے

اب تک ہے جلوہ گاہ محبت میں زلزلہ
مدت ہوئی ازل کی امانت لیے ہوئے

اس سنگ در کی دیکھو مقدر نوازیاں
دنیا سمٹ کے آگئی قسمت لیے ہوئے

یہ کیا کہا کہ جان تمنا نہیں ہیں ہم
دنیا ازل سے کس کی ہے حسرت لیے ہوئے

نکلے گی دل سے ناوک مژگاں کی کیا خلش
لذت ہے کس غضب کی جراحت لیے ہوئے

تو جان آرزو ہے مری جان آرزو
میں ہوں بس اک تمنا راز محبت لیے ہوئے

افقر ہزار فکر کرے مدعی تو کیا
وہ بھی ہے میرا رنگ طبیعت لیے ہوئے

افقر کسی کی خاک کف پا ملی ہے کیا
ہم پھر رہے ہیں تاج شفاعت لیے ہوئے

غزل

ناخدائے سخن **نوح ناروی**

ایسے تارے اے فلک کس کام کے
صبح کو ڈوبیں جو نکلے شام کے

کیوں پجاری ہم بنیں اصنام کے
جو نہ کام آئیں وہ ہیں کس کام کے

اس قدر سمجھے گئے یہ کام کے
حرف لکھے ہیں تمہارے نام کے

جو نہ پورے ہوں وہ ہیں کس کام کے
روز و شب کے عہد صبح و شام کے

جان دیدیں گے ہم ان کے نام پر
کیونکہ ہم ہیں ایک ہی نام کے

عشق میں آرام ہم کو مل چکا
حرف تک ملتے نہیں آرام کے

چاہتا ہے ان کے دل میں گھر کروں
حوصلے دیکھو دل ناکام کے

دور میں جنت کی گیا تو لطف کیا
ہم ہیں قائل چلتے پھرتے جام کے

جائیں کیوں بے کار کوہ طور پر
دیکھنے والے تمہارے بام کے

تیسویں دن وہ مرے گھر آئے گا
ہیں عدد ابجد میں جتنے لام کے

چشم ساقی چاہیے بہر کرم
مستحق ہم ہیں چھوٹے جام کے

کیوں کسی پر وہ ستم کرتے نہیں
سیکڑوں ہیں اور میرے نام کے

حوض کوثر سے مری قسمت میں ہوا
چند قطرے بادۂ گلفام کے

یہ ہوا میرے پھڑکنے کا مآل
کس گئے کچھ اور حلقے دام کے

شب کو آنے کے لیے وہ کہہ گیا
دن پھرے اب عاشق ناکام کے

جس کو سن کر منھ تمہارا چوم لیں
ہم ہیں حقدار ہاں پھر اسی دشنام کے

عرش اعظم تک پہنچتی ہے دعا
چھوٹے چھوٹے ہاتھ نکلے کام کے

دے دیے ساقی نے سائل جانکر
تجھ کو نخرے ٹوٹے پھوٹے جام کے

آسماں نے دے دیے میں پا گیا
جس قدر صدمے تھے میرے نام کے

میکدے میں آج تک دیکھے نہیں
دور چلتے ہم نے خالی جام کے

صبر کرلیں حال میرا دیکھ کر
ہوں جو شاکی گردش ایام کے

ایک دو کیا سیکڑوں انسان ہیں
میرے تیرے اس کے اُس کے نام کے

اس کو سوچیں بادہ کش آغاز میں
جام میں کیوں حرف ہیں انجام کے

بار خاطر ہوں جو طبع دوست پر
کام اپنے عشق میں کس کام کے

نوح کاشان کا مجھے ملتا شرف
وہ پیمبر تھے جو میرے نام کے

غزل

ہر تازہ ستم کا ہوں نشانہ
یہ بھی ہے گردش زمانہ

شعلوں میں بھی حد کی دلکشی ہے
جلتا ہے یہ کس کا آشیانہ

کیا رائے ہے تیری کیوں نہ ہمدم
کچھ جیسے بدل گیا زمانہ

ترتیب میں ساری عمر گزری
اک سانس میں کہہ گیا فسانہ

پامال ستم کی نبض دیکھو
کچھ سست ہے گردش زمانہ

اے سرخوش عالم اسیری
ویران پڑا ہے آشیانہ

دامن پہ شگوفہ کاریاں دیکھ
آنسو ہیں فسانہ در فسانہ

محسوس ہوا یہ سر جھکا کر
ہے عرش ترا ہی آستانہ

اک مرد خدا کا خوں بہا کر
دم توڑ رہا ہے خود زمانہ

میں وجہ سکوت کیا بتاؤں
یہ بھی ہے نوائے عاشقانہ

کچھ دل میں سراج اسی قفس کو
تم خود بھی کہو گے آشیانہ

سراج (لکھنوی)

غزل

زندگی سلسلۂ کرب و بلا ہے تو سہی — مگر اس کرب میں بھی ایک مزا ہے تو سہی

افقِ دل پہ نئی کوئی گھٹا ہے تو سہی — پھر ذرا نم سی نگاہوں کی فضا ہے تو سہی

نزدِ ساقی نہ سہی دور سہی ساقی سے — آخر اس بزم میں میری کوئی جا ہے تو سہی

اب یہ تقدیر مری مجھ کو ملا زہرِ فنا — انہیں آنکھوں میں مگر آبِ بقا ہے تو سہی

نامِ الفت سے اگر چڑھ ہے تو کہہ لو کچھ اور — کوئی شے عقل سے عظمت میں سوا ہے تو سہی

آ گئی ہے اسے شاید کسی فردوس میں نیند — ورنہ دنیا کے غریبوں کا خدا ہے تو سہی

شک سا ہوتا ہے مجھے تو نے پکارا تھا کبھی — ایک بھولی ہوئی کانوں میں صدا ہے تو سہی

غمِ ہستی کے لیے یہ بھی مداوا نہ ہوئی — مئے تری چشم کی اندوہ ربا ہے تو سہی

میری غیرت نے کبھی تم سے تقاضہ نہ کیا — ورنہ دنیا میں محبت کا صلہ ہے تو سہی

ٹوٹتا ہے کہ نہیں یہ درِ زنداں اپنا — آج کچھ تند زمانے کی ہوا ہے تو سہی

کھولنے ہم بھی چلے تھے گرہِ دل اپنی — ایک الجھا ہوا ہاتھوں میں سرا ہے تو سہی

عشق کی شانِ وفا کا یہ تقاضا ہے کہ نہیں — اس کی پرسش پہ خموشی بھی گلا ہے تو سہی

وادیٔ شعر میں یہ جادہ ملا ہی نہ ہو
اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا ہے تو سہی

جسٹس پنڈت آنند نرائن مُلّا (لکھنوی)

غزل

کہیں سجدوں سے سیری ہوتی ہے پیر مغاں ہم کو
جبیں میں جذب کر لینے دے سنگ آستاں ہم کو

سمجھتے ہیں ابھی تک بندۂ فتنہ نشاں
دوبارہ پھر کریں سجدہ گروہ قدسیاں ہم کو

فنا کے بعد ملنا ہے کسی کا کچھ نشاں
تو اس ملنے سے پھر کیا فائدہ اے مہرباں ہم کو

ہر اک بچھڑے ہوئے قطرے کو دریا سے ملا دیں گے
ذرا آغوش میں لے لے محیط بیکراں ہم کو

ملامت ہائے گوناگوں جراحت ہائے بے مرہم
ملے ہیں بارگاہ عشق سے یہ ارمغاں ہم کو

کسی کی اس نگاہ ناز پر دونوں جہاں صدقے
کہ جس نے کر دیا ہے بے نیاز دو جہاں ہم کو

کسی کے حسن عالمگیر نے یہ رنگ بخشا ہے
ہر اک گل پر ہوا کرتا ہے جنت کا گماں ہم کو

اسے لطف و کرم سمجھوں کہ ظلم خوشنما سمجھوں
وہ خود آکر سناتے ہیں ہماری داستاں ہم کو

پر پرواز میں گر طاقت پرواز باقی ہے
کوئی مشکل نہیں مل جائیں گی آزادیاں ہم کو

رہ رسم گلستاں رفتہ رفتہ سیکھ جائیں گے
ابھی کے دن ہوئے رکھے بنائے آشیاں ہم کو

بھلا اے وارثی ان کے کرم کا کچھ ٹھکانا ہے
ملی کوئے بتاں سے محفل روحانیاں ہم کو

ام۔ اے
وارثی۔ (لکھنوی)

آہ! خواجہ حسن نظامی!!

عبدالماجد دریابادی

ایک صاحب طرز انشا پرداز چل بسا!!!

"زمانہ میں ایک ہی ہیں" خوب کہا جس نے یہ کہا، لیکن کس نے کس کو کہا؟ کہنے والا کوئی ہما شما نہیں وقت کا حکیم تھا، عارف تھا شاعر تھا سب کچھ تھا یعنی اکبر الہ آبادی اور کہا جس کو، وہی تو تھا، کل تک محفل کا نوشا۔ دلی کی خاک کا پتلا۔ قلم کی شوخیوں اور رنگینیوں کا متوالا۔ آج میں جس کی قلم کاریوں کی، سحر نگاریوں کی ایک ہلکی اچٹتی سی جھلک دکھا رہا ہوں۔

شعر دو مصرعوں کا ہوتا ہے اور ابھی آپ کے کانوں میں اکبر کا شعر کیا معنی پورا مصرع بھی نہیں پہنچا صرف آدھا عرض ہوا تھا پورا شعر اب ملاحظہ ہو۔

حسن نظامی ہیں نیک بیشک مگر نہ کہیے کہ نیک ہی ہیں
لطائف قلب کی نظر سے بھی اس زمانہ میں ایک ہی ہیں

خیر! وہ حسن نظامی نیک ہی تھے یا کچھ اور بھی اس سے تو کراماً کاتبین کو بحث ہوگی یا حضرت اکبر کو۔ ہمارا آپ کا اس سے کیا واسطا۔ اپنا سروکار تو بس اس حسن نظامی سے ہے جو قلم کا دھنی تھا۔ ہندستانی زبان کی دنیا میں فرد فرید اور ادب و انشا کے عالم میں صاحب طرز جدید۔

کوئی سلیس عام فہم بے تکلف دلی کا روزمرہ اور بول چال سننا چاہتا تھا تو حسن نظامی کی ہم کلامی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ کوئی اور میٹھی، سریلی، رسیلی، البیلی زبان کی بہار دیکھنا چاہے تو انہیں دلی والے خواجہ کے قلم کے تراشے ہوئے گل بوٹے نقش و نگار دیکھ کر ان پر اپنا سر دھنے — بانکپن شگفتگی اور ندرت بیان ان کا خاص ہنر تھا اور اثر درد و گداز ان کے قلم کا امتیازی جوہر۔ جب چاہتے روتے بسورتے ہوؤں کو ہنسا دیتے۔ اور جب چاہتے ہنستے کھل کھلاتے ہوؤں کو رلا دیتے بچوں کو طرح طرح کے کھلونے دے کر بہلاتے جوانوں کا خون گرماتے اور بوڑھوں کو تسکین قلب کی نیند سلا دیتے تھے۔ تصویر کشی میں یہ کمال کہ جس مضمون پر قلم اٹھایا قال کو حال بنا دیا حروف کے پیکر بے جان کو جاندار بنا کر دکھا دیا۔ شنید کو دید کا جامہ پہنا دیا۔ مضمون دیا سلائی پر لکھیں تو جیسے آنکھوں کے آگے اجالا پھیلا دے۔ عنوان آتشبازی ہاتھ آئے تو جیسے پھلجھڑی چھٹنے کا تماشا دکھا دے اور صاحب بڑی بات یہ کہ لکھتے لکھاتے جو کچھ بھی تھے سب بس اپنی خداداد ذہانت سے، اپنی جبلی جدت طبع کے بس پر۔ نہ انہوں نے کسی کا رنگ اڑایا اور نہ کسی اور کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ان کے معاصر ایک سے ایک بڑے ادیب و انشا پرداز اور ان کے بعض پیش رو جادو نگار و سحر طراز لیکن خواجہ اپنی انفرادیت میں سب سے ممتاز ان کا رنگ اگلوں اور پچھلوں سب سے نرالا۔ یہ نہ کسی کے شاگرد نہ کسی کے مقلد اور ادب و انشا کو اگر ایک قسم فقہ کی قرار دیا جائے تو یہ پکے غیر مقلد —

یہ بندوں کا ذکر اور ان سے خطاب جس طرح کرتے ہیں اس کے نمونہ کلام کی بسم اللہ کے طور پر سب سے پہلے یہ ملاحظہ ہو کہ یہ اپنے مالک مولا سے راز و نیاز کس انداز کا رکھتے ہیں۔ اپنی کتاب "آپ بیتی" کی تمہید اس مناجاتی لب و لہجے میں اٹھاتے ہیں۔

"یا اللہ میری مدد کر . . . . . . تو مراد ہے ہم مرید ہیں۔ تو حقیقت ہے ہم مجاز ہیں۔ تو چراغ ہے ہم شعاعیں ہیں۔ تو نور السموات والارض ہے ہم تیری شعاعیں ہیں ظاہر میں میرا ہاتھ تیرے بندوں کو مرید کرتا ہے اور ان کی بیعت لیتا ہے مگر باطن میں تیرا ہی ہاتھ ہمارے ہاتھوں پر ہے اور تو ہی ہمارے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بیعت

قبول کرتا ہے۔ پس مجھکو توفیق دے کہ اپنے ہات پر مرید ہونے والوں کو اپنے وجود سے کمتر نہ سمجھوں نہ اپنی ذات کو پیر اور مراد خیال کروں بلکہ تجھکو مراد اور پیر تصور کرکے اپنے مریدوں کو تیرا مرید اور اپنا پیر بھائی جانوں"۔ صلا ایک ٹکڑا یہ ہوا اور ایک صدا اسی مست الست کی اس سے چند سال قبل :—

"بجلی میں چمکنے والے چاند میں جھلکنے والے رات کے اندھیرے سورج کی روشنی آسمان کی بلندی دریا کی روانی جنگل کی سنسانی، دلگیری و دلداری کے مالک، عرش کی اقامت میں جدا دل کے گھرانے میں خدا۔ ہم تیرے آگے ہات جوڑتے ہیں۔ اگر تو عرش پر ہم کو سربلند کر فرش میں ہے تو وسعت وثابت قدمی عنایت فرما۔ دل میں دھڑکتا ہو تو رہنے کے قابل بنا دے رگ جاں میں ہو تو خون میں اپنی شان بان کا جوش پیدا کر۔ تو ہر جگہ ہے تو ہم کو بھی ہر جگہ پہنچا۔ تو عالم ہے تو اپنے علم کا حصا ہم کو بھی دے۔ رزاق ہے چار ہاتوں سے رزق بانٹ۔ رحمٰن ہے رحمت نازل فرما خیر کو وسعت دے کر شر سے بچا۔ ہماری آنکھیں تجھ سے دیکھیں کان تجھ سے سنیں۔ زبان میں تو ہی بول ہات سے تو ہی کام کر۔ تو بعید ہے تو قریب آجا۔ قریب ہے تو اقرب ہو جا اقرب ہے تو نحن اقرب کا حجاب بھی اٹھا دے"

صاف بے تکلف، چھوٹے چھوٹے سادا فقرے نہ پیچیدہ ترکیبیں نہ مغلق لفظیں نہ ادق عبارتیں اس اردو کو ہندیانا چاہیں تو مقصود بغیر محنت ومشقت حاصل گویا خواجہ حالی پانی پتی نے جو اعجاز اپنی "تو بہ کی مناجات" میں دکھایا ہے اس خواجہ دہلوی کی یہ نثر اس کی حامل ہے پھر ان کی زبان کسی مضمون پر بھی بند نہیں عنوان کوئی سا بھی ہو۔ ان کا قلم اس سے عاری نہیں۔ میدان بزم ہو تو

ہے قلم ان کا ابر گوہر بار
اور صف رزم ہو تو
ہے زباں ان کی تیغ جوہر دار

ان کی تحریرات کے مجموعے میں کیا کچھ نہیں ہے یہ قول شخصے ع

کس چیز کی کمی ہے خواجہ تیری گلی میں

اپنے معاصرین کے قلمی چہرے انہوں نے کثرت سے تیار کیے۔ اور ہر چہرے کی تیاری میں گویا نقاش کے برش اور فوٹوگرافر کے کیمرے کو مات دیدی ہے ایک مشہور اور بڑے تگڑے معاصر مولانا ظفر علی خاں کی شخصیت کی تصویر ملاحظہ ہو۔

"میانہ قد، گندمی رنگ، چھریرا بدن، آنکھیں روشن ومتحرک آواز بلند وبا وقار بولنے میں روانی اور بیباکی نظم ونثر لکھنے میں پنجاب کے پانچوں دریاؤں سے زیادہ رواں۔ قادر الکلام لیکن قادر المزاج نہیں بھک سے اڑ جانے والی بارود ہیں ان کی بول چال میں لہجہ اور تحریر میں پنجابی اثر بالکل نہیں ہوتا۔ مگر ان کی اردو عرب سے بن کر آئی ہے اور فارس کے راستے یہاں پہنچی ہے اچھو خوب لکھتے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں کوئی ان کی برابری نہیں کر سکتا۔ قیامت کے دن اپنی تصنیفوں کے باعث بخشے جائیں گے"۔

دلگی یہ ہے کہ ان معاصر سے حریفانہ چشمکیں بھی ان سے قدیم سے چلی آتی تھیں۔ چوٹیں برابر کی رہتی ہیں۔ ان کی نثر ان کے متعلق ہو چکی۔ اجازت ہو تو ذرا ان کی نظم بھی ان کی شان میں ہو جائے زیادا نہیں کل ایک شعر دفتر کے دفتر کا لب لباب ہے ؎

صوفی بھی ہیں، رئیس بھی ہیں اور ملنگ بھی
اور جانتے ہیں خواجہ تجارت کے ڈھنگ بھی

خواجہ کو مصور فطرت کا لقب جس کسی نے دیا بالکل ٹھیک دیا۔ اشیاے فطرت کی تصویر کشی میں لاجواب تھے اپنی نظیر بس آپ تھے۔ لیکن طبیعت کو مناسب غم والم سوز وگداز سے زیادا تھا ہنسی دلگی سے ذرا کم ڈراما نگاری پر آتے تو کامیڈی سے کہیں زیادا ٹریجڈی میں نام

پاتے۔ ایک لٹی پٹی امیر اور مٹی مٹائی رئیس خاتون کی داستان لکھتے ہیں۔ جو آخر میں دن بھر ایک قبرستان میں پڑی رہتی۔ اور رات کے وقت اپنی بچی کو ساتھ لے کر بھیک مانگنے نکلتی۔ اس بھکارن کی صدا ذرا دل تھام کر سن لیجے۔

"دولت والو ٹکڑا دو۔ عزت والو ٹکڑا دو۔ اپنے بچوں کا صدقہ ٹکڑا دو۔ اپنے لالوں کا صدقہ ٹکڑا دو۔ تمہاری جوڑی کی خیر۔ تمہاری مہندی کی خیر ایک نوالا لو میرا خالی پیالا۔

لوگو تمہارے محلے میں ٹھوکریں کھانے والی بھکارن آئی ہے ساتھ میں اس کی جائی ہے۔ ہم دونوں پر بھوک کی مار آئی ہے۔ دہائی ہے دہائی ہے ایک نوالا مجھ کو دو سونے والو جاگو ایک دن میں بھی سوتی تھی اپنا کا ہیر موتی تھی۔ دنیا نے تاراج کیا اس کو جس نے راج کیا اب گدڑی میرا جوڑا ہے اور پاؤں کا چھالا گھوڑا ہے۔

عیش کی راتیں فانی ہیں موت کے دن سب پانی ہیں کنڈی کھول ٹکڑا دو ہاتھ بڑھاؤ۔ ٹکڑا دو۔ روکھا ہو باسی ہو۔ سب ہے نعمت بھوک سے۔ میری پری ہے لو بیت یہ ننھی بچی روتی ہے یہ محل کی ملکہ گود میں تھی۔ اب گدا کی دختر پیدل ہے یہ باپ کی پیاری دکھ کی ماری۔ تمرے دوارے آئی بھکارن۔ ٹکڑا دو۔ پیسہ دو۔ یہ دنیا آنی جانی ہے ذرہ ذرہ فانی ہے۔ غفلت میں مدہوش نہ ہو عبرت سے باہوش ہو۔ صدقہ کا ایک ٹکڑا دو (جگ بیتی کہانیاں۔)

بھکارن کی یہ صدا بینک فطری اضطراری نہیں اس میں آرٹ (صنعت) کی آمیزش ہے۔ لیکن صنعت اور تصنع ہے اور تصنع اور۔ فقروں میں لفظی تراش خراش ہے کاوش و فکر سے کام لیا گیا ہے پھر بھی آمد ہی آمد ہے۔ آورد کہیں سے نہیں ہونے پائی۔ تکلف کا سایا بھی نہیں پڑنے پایا۔ قافیہ بندی ہے۔ لیکن وہ قافیے بھی جیسے ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہی ہوئے تھے۔ ٹھونس ٹھانس کا احساس بھی نہیں ہونے پاتا ــــ اور کہنے والوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ یہ آرٹ کی معراج کمال ہے۔

خواجہ صاحب نے دلی کے شہزادوں اور شہزادیوں کے حالات بڑی تفصیل سے اور بڑے درد و گداز سے لکھے ہیں اور غدر ۱۸۵۷ء کے حالات سے انکی کتابوں کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ ان کے قلم کی ندرت اور ان کے دماغ کی جدت ان میں سے ایک ایک سے ٹپکتی ہے اور پڑھنے والے کو اکثر رلا رلا دیتی ہے۔ بیگمات کے آنسو، انگریزوں کے قصے دلی کی آخری شمع، دلی کا آخری سانس، بہادر شاہ کا روزنامچہ وغیرہ چھوٹی بڑی خدا معلوم کتنی کتابیں انہیں داستانوں سے بھر دی ہیں۔ داستانیں کیسی؟ غفلت میں ڈالنے والی نہیں۔ عبرت کو بیدار کرنے والی، خوف خدا دلانے والی دل میں سوچ پیدا کرنے والی اور ہمارے آپ کے ڈھب کی بات یہ کہ داستان گو کی بانکی ٹیکھی شخصیت کا نقش دل پر بٹھانے والی۔

میلاد کی محفلیں آپ نے بہت سی دیکھ ڈالی ہونگی میلاد نامے بھی خدا جانے کتنے پڑھ ڈالے ہوں گے ایک عید میلاد کی تمہید ذرا حسن نظامی کی زبان سے بھی سن لیجے

" ایک سو ایک ضرب اللہ اللہ کی سلامی دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں۔ آنکھیں مژگاں کی سنان اور ابرو کی تیغ سنبھالے ادب سے پتلیاں جھکائے کھڑی ہیں زبان درود کا بینڈ بجائے بدن کی سب رگوں کو حکم دو کہ صلواتی بینڈ میں یک جان ہو کر سر ملائیں یہاں تک کہ ہر بن مو سے نغمہ صلی علی محمد نکلنے لگے۔ روزہ کی عید حج کی عید دونوں دست بستہ آئیں۔ اور عید میلاد کا خیر مقدم کریں، دودھ سویوں اور قورمہ چپاتی کو اس عید سے کچھ سروکار نہیں۔ جو کی روٹی کھاؤ اور خشی منا (سی پارہ دل ۳۲۶)

فرمایئے! ایسی البیلی تمہید کہیں اور نظر سے گذری ہے؟ شمع کو جلنے کس نے نہیں دیکھا؟ اب دیکھیے خواجہ صاحب اپنے قلم ندرت رقم کے زور سے اس معنوی نظارہ

سے حکمت کے کیسے کیسے پھول کھلاتے اور معرفت کے کیا کیا موتی برسانے ہیں۔

"حضرت اکبر کی میز پر مومی شمع گورے سنہری کی طرح تنی کھڑی ہے اس کا قد زیبا سر سے پاؤں تک سڈول تھا۔ جی کو بھا گیا چکنی چپڑی صورت پر دل آگیا چاہتا تھا کہ اس مس خاموش کو گویا کروں اور اپنی محبت کے پھندے میں پھنساؤں کہ کسی نے اس کے سر پر شعلہ کا تاج رکھ دیا آہا ہا۔ عالم ہی بدل گیا گلدۂ نور ہیں شمع پیاری کی شکل کیسی دل فریب بن گئی۔ پروانے باغ کی ڈالیوں سے اڑ اڑ کر کمرے میں آنے لگے۔ میرا لطف دید ختم نہ ہوا تھا کہ جناب اکبر کا شعر کان کی راہ سے آنکھوں میں سما گیا

زینت مقدمہ ہے مصیبت کا دہر میں
شب شمع کو جلاتے ہیں سانچے میں ڈھال کے

گفتگو شروع حضرت اکبر کے ایک فقرے سے ہوئی تھی۔ خاتمہ پر جی میں آتا ہے کہ اب اسی کو ذرا ادل بدل کر دہرا لیجیے۔ مردم شناس و فطرت شناس شاعر کے یہ قول مرحوم صاحب طرز انشا پرداز حسن نظامی ———
اس زمانے میں ایک ہی تھے"

غزل

الجھے ہیں کبھی خار سے، اُگا ہے گُل تر سے
گذرے ہیں بہر طور تری راہگذر سے
حسرت تھی کہ ملتا مری قسمت کو اجالا
افسوس مگر مل نہ سکی بھیک سحر سے
ایسے بھی جیالے ہیں دیوانے بہت ہیں
جو درس لیتے ہیں زنداں کے در سے
بڑھتی ہی گئی تشنگی شوق کا عالم
چھلکاتے رہے آپ مئے ناب نظر سے
صابر در گلشن پہ ہیں ہم آس لگائے
کیا جانیے کب باد صبا گذرے ادھر سے

میر صبا آروی

رباعیات

ظلمات کے طوفاں میں سحر ہے میری
دنیا ہے جواں زیر و زبر ہے میری
امروز کا قصہ تو کوئی بات نہیں
فردا کے تقاضوں پر نظر ہے میری

رندِ مئے گلفام بہت اچھے ہیں
آوارہ و بدنام بہت اچھے ہیں
یہ جذبۂ نفرت ہو مبارک تم کو
ہم بندۂ بے دام بہت اچھے ہیں

بدلی ہے زمانے نے یہ عادت کیسی
تہذیب کی دنیا میں جہالت کیسی
انساں تری محفل میں بنام الفت
یہ بغض یہ نفرت یہ عداوت کیسی

ماجد ادیب (بریلوی)

چتوڑ گڑھ کی تاریخی اہمیت

اردگرد کے درمیان ایک لمبی اور تنگ پہاڑی کی پانچ سو فٹ اونچی چوٹی پر واقع یہ قلعہ قریبؔ سوا تین میل لمبا ہے کسی ایک مقام پر اس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی نصف میل ہے اس کا کل رقبا لگ بھگ چھ سو نوے ایکڑ ہے اگرچہ اس کی تعمیر کی ٹھیک ٹھیک تاریخ کا تعین کرنا نہایت مشکل ہے تاہم روایت یہ ہے کہ اسے پانڈوؤں کے دوسرے بھائی بھیم نے تعمیر کرایا تھا تب اس جگہ کا نام شوی جن پر تھا۔ یا ور کیا جاتا ہے کہ خدمتری رام چندر جی نے بھی اس جگہ بارہ برس گذارے تھے۔ کھومن راسا میں لکھا ہے کہ کبھی اس جگہ چوراسی قلعوں کی ایک عظیم الشان سلطنت تھی ان قلعوں کے حفاظتی مینار ایک چٹان پر کھڑے کیے گئے تھے اس جگہ چوراسی بازار تھے۔ بچوں کی تعلیم کے لیے بہت سے اسکول اور ہر قسم کے علوم کے لیے کئی کالج تھے یہاں راجپوتوں کے چھتیس قبیلے رہتے تھے جن کے پاس بے شمار فوجیں تھیں۔

اس قلعے کی جگہ پر بعد میں جو قلعا تعمیر کیا گیا تھا اس کو موری راجپوتوں کے سردار عالا چترنگ کے نام پر چترنگ کوٹ کہا گیا۔ موری راجپوتوں نے اس علاقے پر ساتویں صدی میں حکمرانی کی تھی۔ ان کا تالاب اور محلات کے کھنڈر آج بھی پہاڑی کے دکنی حصے پر موجود ہیں۔ موری خاندان کا آخری حکمران لیشیا مترا تھا۔ کالیداس کی ایک تحریر کے مطابق لیشیا مترا نے اشومیدھ یگیہ رچایا تھا۔ جب جبلنج کے طور پر یگیہ کا گھوڑا چھوڑا گیا تو اسے انہی علاقے میں یونانی سپاہیوں نے پکڑ لیا جن کو بعد میں شکست دی گئی ۷۳۴ء میں باپا راول نے موریوں سے یہ قلعہ چھین لیا اور ۱۵۶۷ء تک یہ ریاست میواڑ کا پایہ تخت رہا۔ تب اودے پور شہر کو دار السلطنت بنایا گیا بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمان حملا آوروں نے چار مرتبا اس قلعے کا محاصرا کرنے کی کوشش کی ۱۳۰۳ء میں علاوالدین خلجی نے اس قلعے کو گھیر لیا تھا۔ چودویں صدی میں محمد بن تغلق نے اس کا محاصرا کرنے کی کوشش کی ۱۵۳۴ء میں گجرات کے بہادر شاہ اور ۱۵۶۷ء میں اکبر نے بھی اس قلعے کا محاصرا کیا۔

قلعا چتوڑ کے تین بڑے دروازے ہیں۔ پچھم میں رام پول پورب میں سورج پول اور اتر میں لکھوٹا باڑی قلعے کی ایک قدیم ترین عمارت کیرتی ستمبھ یعنی "مینار شہرت" ہے جسے بارویں یا تیرویں صدی میں بگھیڑ وال مہاجن نے جسے جیجا کہا جاتا ہے تعمیر کرایا تھا اور اولین جین تیر تھنکر آدی ناتھ کے نام سے منسوب کر دیا تھا لیکن اس پہاڑی پر سب سے زیادہ عظیم الشان یادگار جے ستمبھ یعنی مینار فتح ہے جو ۱۴۴۲ء اور ۱۴۴۹ء کے درمیان رانا کمبھ نے مالوہ اور گجرات کے بادشاہوں کی مشترکا فوجوں پر فتح پانے کی یادگار قایم کرنے کے لیے تعمیر کرایا تھا یہ ستون ایک سو بیس فٹ سے زیادہ اونچا ہے اور بنیاد پر اس کے گھیرے کا قطر تیس فٹ ہے اس کی اوپر کی منزلوں پر چڑھنے کے لیے چکر دار زینا بنا ہوا ہے جو باری باری سے مرکزی دیوار اور بیرونی برآمدے کی دیوار کے بیچ میں سے ہو کر چلا جاتا ہے اس ستون کے اندرونی حصے میں دھارمک تصویریں یا دیگر آرایشی تصویریں اور بیل بوٹے منقش ہیں۔ "راجستھان کے وقایع اور تاریخی یادگاریں" نامی کتاب کے مشہور مصنف جیمز ٹاڈ اپنی تصنیف میں اسے دلی کے قطب مینار سے بہت برتر خیال کرتے ہیں۔ فرگوسن نے اس مینار کو روم میں واقع ٹرِجن مینار سے بہت ہی بہتر کاریگری کا نمونا تسلیم کیا ہے۔

قلعے کے اندر دوسری قابل ذکر عمارتیں یہ ہیں۔ سوئی گرچھ درگ کا شاندار جین مندر جس میں بہت اعلا درجے کی منت کاری ہوئی

۱-۱

میری شاعری میری نظر میں

انیسویں صدی کے اواخر میں حیدرآباد میں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا۔ فیض کے ہزاروں شاگرد تھے۔ نقش انگیز معلّی ڈاکٹر مابل نے اپنی زمزمہ سنجیوں سے دکن کو رشک دلی بنا دیا تھا۔ اعلیحضرت میر محبوب علی خان غفران مکان کو اس طرف توجہ ہوئی تو سارا حیدرآباد اسی طرف جھک پڑا۔ استاد داغ، گرامی، ترکی۔ قدر بلگرامی وغیرہ بیسیوں شاعر باہر سے آگئے اور حیدرآباد رشکِ بغداد بن گیا۔

مشاعروں کی کثرت ہوگئی۔ بعض اساتذہ کے عرس دھوم دھام سے کیے جانے لگے اور اس تقریب میں مشاعرے بھی ہونے لگے۔ یوں بھی لوگوں نے سالانہ اور ماہانہ مشاعرے شروع کر دیے۔ اس طرح حیدرآباد شعر و نغمے سے گونج اٹھا۔ والد مرحوم ان دنوں جوان تھے۔ تعلیم کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ بھی اس طرف متوجہ ہوگئے اور ایسے متوجہ ہوئے کہ ہمہ تن شعر بن گئے، دن بھر شعر و سخن ہی کا چرچا رہتا تھا۔

اوائل بیسویں صدی میں میری ولادت ہوئی۔ آنکھیں کھلیں تو شعرا کا جمگھٹا نظر آیا۔ بات سمجھنے لگا تو شعر کان میں پڑا۔ تتلا کر باتیں شروع کیں تو شعر مونھ سے نکلنے لگے کیونکہ ماحول ہی شعر کا تھا۔ روزانہ دیوان خانے میں شعرا کا مجمع ہوتا۔ ترکی۔ کیفی۔ ناظم۔ بازغ۔ داد۔ برتر۔ ضیا گوگنی، جلیل، محفوظ۔ رسا۔ خلق، امیر گرامی آتے۔ نو دس بجے رات تک شاعری ہوتی۔ کبھی کبھی صبح میں بھی یہ مجمع ہوتا تو دن بھر لنترانیاں رہتیں۔ میں کھیلتے کھیلتے دیوان خانے میں آجاتا تو کسی نہ کسی کو شعر پڑھتے یا سناتے پاتا۔ یا ایک آدھ مصرع یوں ہی یاد رہ جاتا جسے میں دن بھر رٹا کرتا۔ اس طرح میں شعر سے مانوس ہوا۔

۱۹۰۸ء میں والد مرحوم کا تقرر ہوا۔ اور وہ گلبرگہ چلے گئے۔ مگر ہر جمعرات کی شام کو آتے۔ جمعہ کے روز وہی ہنگامہ شعر و سخن رہتا۔ اس طرح یہ روزانہ کا جمگھٹا ہفتہ وار ہوگیا۔ مگر جب والد کا تبادلہ گلبرگہ سے رائچور ہوگیا اور پھر وہاں سے عثمان آباد چلے گئے تو جلد جلد آنا ناممکن ہوگیا اور یہ جمگھٹا بند ہوگیا۔ اور اب ہمارے دیوان خانے میں جوان اور بوڑھے شاعروں کی جگہ بچوں نے جمع ہونا شروع کیا۔ سید شمس الدین علم، مرزا عبدالحلیم بیگ، ہاشم، عبدالرحمن عاجز، علیم الدین علیم، علی ملبعلا، حامد، اکرم وغیرہ اوقات مدرسے کے بعد جمع ہوتے اور وہی شعر و سخن کی محفل گرم ہوتی۔

میرا نام ہے "ابو رضا سید مصباح الدین" اور گھر میں عابد پکارتے تھے اس لیے میں نے عابد تخلص اختیار کیا اور لمبی لمبی غزلوں کے بڑے بڑے مقطعے اسی تخلص سے مزین ہونے لگے۔ نواب محمد علی خاں ناظم والد کے استاد بھائی اور میرے شفیق تھے انہیں دل لگی سوجھی تو اپنے ماموں نواب صولت جنگ مرحوم سے کہہ دیا کہ تجلی کا بیٹا شعر کہتا ہے۔ اور عابد تخلص اختیار کیا ہے۔ صولت جنگ مرحوم بڑے وضع دار بزرگ تھے استاد داغ کے شاگرد اور ایک چھوڑ دو تین دیوانوں کے مالک تھے۔ انہوں نے مجھے یاد فرمایا۔ میں حاضر ہوا تو اپنے مطبوعہ دو دیوان اور قلمی دیوان منگوا کر سامنے رکھ دیے اور کہنے لگے کہ میاں یہ دیوان عابد ہے جب تم نے میرا تخلص اختیار کیا ہے تو یہ دیوان بھی لیتے جاؤ۔ سرورق بدل کر چھپوا لو۔ بڑی جھینپ ہوئی۔ اور میں نے معافی مانگ کر قصہ

ختم کیا گھر آ کر مشورہ کیا تو بہتر نے کہا تسلی تخلص اچھا ہے۔ تمہارے والد تجلی ہیں ہم قافیہ بھی ہے۔ میں نے کہا چلو عابد نہیں تسلی سہی! دو چار غزلیں اسی تخلص سے کہیں مگر قطب الدین علی تسلی حیدرآباد کے مشہور شاعر اور والد کے دوست تھے انہیں کسی نے جا لگایا کہ تجلی کا بیٹا تسلی بن گیا ہے تو وہ کورٹ انسپکٹر اناتان سے آ دھمکے۔ اور لگے ڈانٹنے کہ میاں آخر مرا تخلص کیوں پسند آگیا کیا کوئی اور تخلص نہیں ملتا تھا اب کیا کرتا اس سے بھی تو باکی ان دنوں فسانہ آزاد مولفہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا چرچا تھا میں نے سوچا آزاد تخلص اچھا ہے بس کیا تھا فوراً آزاد بن گئے آزاد بنے دو تین روز گذرے تھے کہ ایک دوست نے دروازے پر آواز دی "میاں آزاد" والدہ مرحومہ نے پوچھا یہ آزاد کون ہے۔ ہمارے گھر میں ہم نے کہا جی میرا تخلص ہے کہنے لگیں بیٹا اور بھی تو تخلص تھے لچے لفنگے، شہدے، چور، ٹھگ، بدمعاش ان سب کو چھوڑ تم نے آزاد کو کیوں پسند کیا۔ مکہ مسجد سامنے ہی تو ہے۔ اس آزادی سے تو بہتر تھا شہدے بن جاتے۔ فرمایئے اب کیا کرتے ہم نے آزادی بھی ترک کر دی۔

کیفی صاحب والد مرحوم کے مخلص دوست تھے کسی نے یہ حال ان کو سنا دیا تو لگے بنانے، فرمانے لگے تجلی کی مناسبت سے نور اچھا تخلص ہے بنا ہے کسی کو اس پر عذر نہ ہوگا۔ بس ہم نے تو نورانیت اختیار کر لی۔ ایک دو غزلیں اس تخلص سے ہوئی تھیں کہ یو۔ پی سے کوئی طوائف آئی نور جان۔ جسے چچا حامد حسن نے کہیں دیکھ لیا۔ اور مجھ سے فرمانے لگے لو بیٹا خوش ہو جاؤ ایک طوائف بھی تمہاری ہم نام موجود ہے۔ ہم نے یہ تخلص بھی چھوڑا۔ مولوی عبدالجبار خاں آصفی ہمارے محلے کے ایک بزرگ بڑے عالم فاضل مصنف شاعر اور پر مذاق شخص تھے۔ ہم نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر صورت حال عرض کی۔ چونکہ عربی فارسی کے جید عالم تھے اس لیے عربیت رچی ہوئی تھی۔ فرمانے لگے جلی اچھا ہے تجلی سے صرف ت نکال دو ہم نے آداب بجا لا کر تخلص قبول کر لیا۔ اور اس روز سے جلی ہو گئے۔ ہمارے احباب میں ہنر مرحوم بڑے زندہ دل تھے انہوں نے دوسرے ہی روز سے پوچھنا شروع کیا کیوں جلی کیا جلی؟ بھلا پھر کیا تھا ہم خاصے کھلونا بن گئے اور اسی دن سے اس تخلص کو بھی طلاق دیدی اور تہیا کر لیا کہ اب بغیر تخلص کے زندہ رہیں گے۔ چند روز یوں ہی رہے مگر یار دوستوں نے کہا کہ بھئی بغیر تخلص کے لنڈورے معلوم ہوتے ہو کوئی نہ کوئی تخلص اختیار کر لو ہم نے کئی روز تک سوچ سوچ کر تسکین کا انتخاب کیا مگر علی بلعلا نے کہا مسکین شاہ کے خاندان میں ملنا گیا مزور ہے یہ تخلص نہ کرو۔ پھر تلاش شروع ہوئی اور ہم نے تمکین پسند کیا۔

تمکین تخلص اختیار کرتے ہی راجا کرسن بلی نے کچو لال پکارنا شروع کیا۔ کیونکہ کچو لال تمکین ایک شاعر ہو گذرے ہیں۔ مگر ہم تنگ آمد و بجنگ آمد کہہ کر اس پر استقامت اختیار کر لی۔ اور تمکین حیدرآبادی نام سے اپنا مانوگرام بنوا لیا ملاقاتی کارڈ چھپوا لیے اور سارے کاروبار ہونے لگے۔ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء میں "اخبار مشیر دکن" میں تمکین حیدرآبادی کے نام سے ایک ایسی نظم چھپی جس کے سر تھا نہ پاؤں۔ دریافت کیا تو پتا چلا کہ سکندرآباد میں کوئی صاحب رہتے ہیں یہ ان کی نظم تھی اب ان صاحب سے یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ تخلص بدل دیجیے اور نہ خود تخلص بدلنا چاہتا تھا۔ ہمارا خاندان بخارا سے ہندستان آیا تھا۔ اس لیے ہم بخاری تھے۔ اور والد اپنے نام کے ساتھ بخاری لکھا بھی کرتے تھے۔ مگر مجھے یہ ملکی نسبت پسند نہ تھی چونکہ ہم حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں اس لیے موسوی یا کاظمی سید کہلاتے ہیں اس لیے یہ طے پایا کہ نسبی نسبت تخلص کے ساتھ کر دی جائے اور ہم بن گئے تمکین کاظمی

بعض لوگوں کو ناموں کے ساتھ شیخ سید لکھنے کا

بہت شوق ہوتا ہے چنانچہ ہمارے ایک کرم فرمانے خط لکھا تو نام کے ساتھ مرزا لکھ مارا غور فرمایئے ہم ٹھہرے سادات نواریہ سے یہ مرزائیت بڑی ناگوار گذری اس لیے ہم نے سوچا مذہبی ہم سید کیوں نہ لکھنا شروع کر دیں چنانچہ ہم نے خود اپنے تخلص کے آگے سید کا اضافہ کر لیا۔ اس طرح تمکین تخلص جاکر نام بن گیا اور تیس سال سے دنیا ہمارے اسی نام سے واقف ہے۔

بدنصیبی سے ہمیں کئی جگہ ملازمتیں کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور چونکہ پہلی ملازمت کے وقت ہم نے اپنا نام سید مصباح الدین تمکین کاظمی لکھا تھا۔ اس لیے ہر ملازمت کے وقت یہی نام لکھنا پڑا۔ اور دفتر میں یہ نام رہ گیا۔ منصب کی اجرائی کے وقت بھی اسی نام کو لکھوانا پڑا کیونکہ تبدیلی نام سے جرم کا ارتکاب ہوتا۔

خیر یہ تو تھی تخلص کی سرگذشت رہی شاعری تو اس کا حال سنیے۔ چونکہ ہم نے بچپن سے شعر و سخن کو غزل کی صورت میں سنا۔ اور دیکھا تھا۔ اس لیے ہمارے دماغ میں غزل ہی کا خاکا تھا اور قافیہ پیمائی ہی شعر کی معراج سمجھی گئی تھی۔ اس لیے ہماری شاعری بھی غزل ہی سے شروع ہوئی۔ کیفی مرحوم کے صاحبزادے علم اکثر آجاتے۔ اور ہم دونوں مل کر فکر سخن کرتے کوئی ایک مصرع لے کر اس پر طبع آزمائی ہوتی ایک ایک نشست میں تیس چالیس شعر کہہ لیتے۔ اور اگر قافیے اچھے ملتے تو اس سے زیادہ بھی اس طرح مدت تک فکر سخن ہوتی رہی۔ استاد کا انتخاب بڑا مشکل تھا والد مرحوم ہماری شاعری کے خلاف تھے وہ فرمایا کرتے تھے کہ طالب علمی میں شاعری نہیں کرنی چاہیے اس لیے ان سے مشورہ ناممکن تھا دوسرے بزرگ بھی تقریباً ان کے ہم خیال تھے اس لیے ان لوگوں سے مشورہ کرنے کی ہمت بھی نہ تھی۔

ضیا گورگانی دہلوی سے والد مرحوم کے بڑے پرخلوص مراسم تھے۔ اس لیے ایک روز ان کی خدمت میں غزل لے دوڑے۔ ادا۔ حیا۔ قافیہ اور دیدہ خواہشند ردیف تھی بڑی لمبی چوڑی۔ تمہید کے بعد ہم نے غزل سنانی شروع کی مطلع سنتے ہی مرزا ضیا بھڑک گئے۔ وہ صلواتیں سنائیں کہ کچھ نہ پوچھیے فرمانے لگے یہ بکٹ کہانی کیا ہے ردیف فارسی کیوں رکھی۔ تم بڑے گاودی ہو۔ بہرحال خوب خفا ہوے اور ہم وہاں سے بے نیل و مرام لوٹے کئی روز تک ضیا پر غصہ رہا۔ بالآخر حضرت توفیق کا خیال آیا۔ یہ بھی والد کے دوست اور بڑے منکسر شاعر تھے۔ دوسری ایک غزل لے کر ان کی خدمت میں حاضری دی۔ لمبی چوڑی تمہید سنائی اور غزل سنانا چاہا تو انہوں نے نہایت انکساری سے فرمایا "میاں! میں شاگرد کی استادی کا قابل ہی نہیں ہوں۔ شعر کہتے جاؤ اور غور کرتے رہو۔ خود بخود تم اپنی غلطیاں اور کمزوریاں آپ محسوس کرلوگے مجھے غزل بنانا نہیں آتا"۔ اس پر بھی میں نے غزل سنائی تو توفیق صاحب نے نہایت ہی اطمینان سے غزل سن کر داد دی مگر کوئی مشورہ نہیں دیا۔ اسی زمانے میں ہم والد ماجد کے پاس عثمان آباد پہنچ گئے۔ اور وہاں پوسٹ کے ذریعے اپنی غزل کیفی صاحب کے ملاحظے کے لیے بھجوائی۔ اور انہوں نے اصلاح کے بعد واپس کردی۔ اس طرح بیس پچیس غزلیں کیفی صاحب نے دیکھیں اور پھر وہ اجمیر شریف جاکر وہیں کے ہو رہے۔

نواب محمد علی خاں ناظم استاد داغ کے شاگرد ہمارے ہم محلہ اور والد کے دوست اور خواجہ تاشی تھے اس لیے کیفی صاحب کے انتقال کے بعد ہم نے اپنی غزل ناظم صاحب کی خدمت میں روانہ کی۔ اور وہ بڑی محنت سے غزل بنانے لگے۔ والد مرحوم کا تبادلہ گلبرگا ہو گیا۔ اور نواب سردار نواز جنگ مرحوم صوبے دار تھے مجھے بھی دفتر صوبے داری میں مقرر فرمالیا تو مجھے گلبرگا جانا پڑا۔ وہاں ان دنوں شعر و سخن کا چرچا تھا۔ مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ان میں شرکت ضروری تھی۔ اس لیے مشق بڑھنے لگی۔ اور روزانہ شعر کہنے کی عادت سی

پڑگئی طبیعت میں اپج تھی اور روانی بلاکی۔ اس لیے روزانا پچاس ساٹھ شعر کہہ لینا کوئی بات نہ تھی والد مرحوم نے عثمان آباد میں مجھے عروض پڑھائی تھی اور قافیے کے متعلق سارے امور ذہن نشین کرا دیے تھے اس لیے عروض اور قافیے کی غلطیاں میرے پاس بہت کم رہتی تھیں البتا زبان اور محاورے پر عبور نہ تھا اس لیے زبان اور محاورے کے نقطۂ نظر سے بہت سی خامیاں رہ جاتی تھیں۔ جس کی وجہ سے مجھے اپنی غزل پر زیادہ سے زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی۔

گلبرگا میں شعرا کی خاصی تعداد تھی ایک بزرگ محمد ایوب رنگین تھے جو اپنے آپ کو امیر مینائی کا شاگرد بتاتے تھے۔ ایک مشاعرے میں انہوں نے بے نظیر شاہ وارثی کی غزل اپنے نام سے پڑھ دی ایک اور صاحب جو دلیار تخلص فرماتے تھے مشاعرے میں بے تکلف دوسروں کی پرانی غزلیں اپنے نام سے پڑھ دیتے تھے بعض لوگ اپنے طور پر شعر کہتے تھے مگر سب میری طرح قافیا پیمائی کرتے تھے ان قافیا پیماؤں کی وجہ سے مجھے بھی قافیا پیمائی کی عادت سی پڑ گئی اور سنگلاخ زمینوں ادق قافیوں میں شعر کہنے کا جنون ہو گیا۔ نتیجا یہ نکلا کہ لطافت شعر غایب ہو کر فقط موزونی باقی رہ گئی چھ سال اسی حال میں گذرے یہ میری انتہائی مصروفیت اور کارگذاری کا زمانا تھا گلبرگا کے ان چھ سالوں میں میں نے اتنا کام کیا ہے جتنا شاید ہی کوئی کر سکتا ہو۔ بڑے بڑے مضامین لکھے افسانے ڈرامے لکھے ترجمے کیے غزلیں اور نظمیں بے حساب کہیں۔ بہر حال ایک انسان جتنا کام کر سکتا تھا اتنا میں نے کیا۔ مگر شعر پر میرا جتنا وقت ضایع ہوا وہ اکارت ہی گیا۔ کیونکہ میری مشق بڑھ گئی۔ شعر کہنا آسان ہو گیا۔ مگر کوئی بات پیدا نہ ہو سکی جتنا میرا ذوق سخن نکھرتا گیا اتنی ہی مجھے اپنی شاعری سے نفرت ہوتی گئی۔ چنانچے گلبرگا چھوڑ کر حیدرآباد آتے ہی میں نے غزل کہنا چھوڑ دیا۔ البتا نظم کبھی کبھار کہہ لیتا تھا مگر نظم میں بھی جب کوئی بات پیدا کر سکا تو میں نے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ البتا اس عہد جہالت کی یادگار غزلوں کا ایک دیوان اور نظموں اور قطعوں کا ایک مجموعا رہ گیا ہے جسے دیکھ کر اب میں شرماتا ہوں کہ کیا کیا خرافات میں نے بکے ہیں۔

اسی غلط فہمی میں کہ میں شعر بڑے اچھے کہہ سکتا ہوں علامہ اقبال کے فارسی کلام کا ترجما بھی کیا مگر جب غور کیا تو اپنی سادا لوحی پر کوفت ہونے لگی اور اس حماقت پر اب ہنسی آتی ہے۔

اقبال کا قطعہ ہے۔

من این علم و عمل را بہ پے کاہے نمی گیرم
کہ با تیغ و سپر بیگانہ سازد مرد غازی را
بہر نرخے کہ این کارگری سودا فتد
بزور بازوے حیدر بدہ ادراک رازی را

اس کا ترجما میں نے یوں کیا تھا۔

میں اس علم و عمل کو مشت پر دے کر نہ لوں گا
کہ بیگانہ جو کر دے غازیوں کو تیغ و خنجر سے
تجھے مل جائے جس قیمت میں لے لے فایدہ ہوگا
بدل ادراک رازی قوت بازوے حیدر سے

غور فرمایے معلوم یہ ہوتا ہے کہ زر لفت کا تانا بانا نکال کر ٹاٹ کی سُتلی اس میں گھسیڑ دی گئی ہے۔ بالکل یہی حال میری غزل کا تھا چنانچے گلبرگا میں یہ غزل بڑی مشہور ہوئی اور پسند کی گئی تھی۔

یہ طرز نئی آپ نے سرکار نکالی
سو بار مرے قتل کو تلوار نکالی
تیوری چڑھی بل کھائی کمر کھل گئے گیسو
ظالم نے کس انداز سے تلوار نکالی
اس کم نہ پہ مسیحائی کا دعوی بھی ہے تم کو
یہ تم نے دواے دل بیمار نکالی

اک عاشق بے تاب کو پٹوایا عدو سے
اک طالب دیدار پہ تلوار نکالی
اک کشتۂ تسلیم کو تشہیر کرایا
اور نعش کسی کی سر بازار نکالی
بگڑے کسی عاشق پہ تو صلواتیں سنا دیں
ہر بات پہ گالی دم گفتار نکالی
ہر شخص سے بگڑے رہے کاوش رہی سب سے
ہر ایک سے ہر بات میں تکرار نکالی
ٹوکا کبھی اس کو تو لتاڑا کبھی اسکو
گالی کبھی دیدی کبھی تلوار نکالی
مژگاں کی جگہ کام لیا تیر سے تم نے
ابرو نہ دکھایا تھا کہ تلوار نکالی
قمری کو کبھی ذبح کیا کہہ کے یہ تم نے
کیوں تذکرۂ سرو رخسار نکالی
نرگس کو مسل ڈالا کہ کیوں تکتی ہے مجھکو
کیوں آنکھ مرے سامنے مردار نکالی
گل کو کبھی پاؤں سے کچل ڈالا یہ کہہ کر
کیوں سرخ سی رنگت سر گلزار نکالی
مارا کبھی بلبل کو کہ کالا ہے ترا رنگ
کیوں تو نے یہ لو تناک عزادار نکالی
یہ ڈھنگ نہیں جان جہاں عشوہ گری کے
ترکیب تو یہ تم نے دل آزار نکالی

سوا زبان کے چٹخارے کے کوئی بات اس میں نہیں۔ مگر یاردوستوں نے بہت پسند کیا۔ یہ ہماری غزل کا کمذتا تھا۔ کڑی زمینوں میں بھی بہت فکر کی ہے چند شعر ویسے بھی سن لیجے۔

سمجھ ہی میں نہیں آتا ٹپکتے ہیں یہ کیوں ہر دم
ہمارے دیدۂ تر ہیں کہ پانی کا بھرا مٹکا
تری مشق ستم نے کر دیا عالم تہ و بالا
ہزاروں کا صفایا کر دیا اک ہاتھ پا لٹکا

آنکھوں میں تیری صورت ظالم بسی ہوئی ہے
دل پر کھدا ہوا ہے مانو گرام تیرا
ابھی تو ابتدا ہے فصل گل کی صبر کر کچھ دن
بہ دست جنوں چاک گریباں دیدہ خواہد شد
خزاں میں تو یہ کی تھی موسم گل میں یہ پہنیں گے ہم
ذرا چھانے تو دو کالی گھٹا فہمیدہ خواہد شد
یہ تیرا ہی کلیجہ تھا جو کوہ بے ستوں کاٹا
نکالی تو نے اے فرہاد جوئے شیر پتھر کی
ان سے کہہ دو کہ وہ مقتل میں نہ لائیں تشریف
ڈر ہی جائیں گے مرا حال اگر دیکھیں گے
اک طرف ٹھوکریں کھاتا ہوا سر پائیں گے
اک طرف نعش مری خون سے تر دیکھیں گے
وہ بولے دیکھ کر میرے دل بدنام کے ٹکڑے
اٹھا کر پھینک دو باہر یہ ہیں کس کام کے ٹکڑے
جلی حرفوں میں روزانہ وہ لکھ کر مشق کرتے ہیں
عدو کے نام کے جملے ہمارے نام کے ٹکڑے
اس سرخ سرخ چیز میں تلخی بلا کی ہے
ساقی نے کیا نچوڑ دیا انگبیں میں سانپ
واں ہونٹ بھی ہلے نہ تھے یاں سونگھ ہی گیا
گویا چھپا ہوا تھا کسی کی ہنسی میں سانپ
یا تو نظر سے کہہ دے یا میں زباں سے کہہ دوں
یہ راز عشق ورنہ کس طرح فاش ہوگا
وہ ماہرو کبھی جو ہم آغوش ہوگیا
شکوہ گلا تمام فراموش ہوگیا

چند شعر جو یاد آ گئے بلکے نقل کر دیے ہیں۔ ورنہ ایسی بیہودہ گفتاری بہت کی ہے صرف غزل ہی تک طبع رواں‘‘ محدود نہ تھی۔ ہزل اور نظم رباعی اور قطعہ سب ہی جاری تھے۔ البتہ قصیدہ میں نے کوئی نہیں کہا۔ کیونکہ کوئی ممدوح سزاوار مدیح نہ تھا مگر واقعہ یہ ہے کہ میری غزل بھی ایسی ہی ہوا کرتی تھی۔ جیسا کہ کوئی معشوق ہزار وار غزل نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعری نام ہے دلی جذبات اور قلبی کیفیات کا جو تخئیل اور بلند خیالی کے سانچے میں ڈھل کر نکلی ہو۔ ورنہ شاعری نہیں تک بندی رہ جاتی ہے یہی وجہ ہے جو دنیا میں شاعر کم اور متشاعر (یعنی غیر فطری شاعر) زیادہ نظر آتے ہیں۔

عرب میں لاکھوں شاعر گذرے ہیں مگر عہد جاہلیت کے سبع معلقہ والے اور عہد نبوت کے اور اس کے بعد کے چند ہی شاعر مشہور ہیں بقیا سب بھلا دیے گئے اسی طرح ایران میں فردوسی انوری وسعدی بیغیر ان شعر مانے گئے باقی یوں ہی رہے۔ مولانا روم نے اتنی لمبی چوڑی مثنوی لکھی کہ ع

"ہست قرآں درزبان پہلوی"

مگر اس میں وہ بات نہیں جو فردوسی کے "شاہنامہ" میں ہے۔ بس یہی فرق شاعر اور متشاعر کا ہے

ہندستان میں میر سے صفی تک لاکھوں شاعر ہوے مگر میر درد۔ مومن، غالب۔ حسرت۔ اصغر فانی جگر وغیرا چند ہی "بروے کار" آے ورنہ باقی بیکار رہے

ہاں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس موزونی طبع کے سہارے میں شعر کہہ لیتا تھا کوئی بات پیدا نہ کر سکا مشق البتہ بہت بڑھ گئی تھی۔ نگہ گائین وفا۔ رنگین دلبا۔ زبیر نصیر وغیرا بیسیوں حضرات تھے ان سبھوں کو یہ خیال تھا کہ میں خد شعر نہیں کہہ سکتا بلکے والد شعر کہہ دیتے ہیں چنانچے ان لوگوں نے سازش کی اور ایک روز مجھے روک کر کہا کہ ہم طرح دیتے ہیں یہیں بیٹھ کر ہمارے سامنے شعر کہو میں تیار ہو گیا۔ اور انہوں نے ایک مصرع دیا جس کا قافیہ نقاب، حجاب وغیرا تھا۔ اور ردیف پتھر کا۔ غور فرمایے ایسے سنگلاخ قافیے اور پتھریلی زمین میں کیا شعر ہو سکتے تھے۔ مگر اتفاق سے انہیں دنوں میں ایلورا اور اجنٹہ کی سیر کر آیا تھا کاغذ قلم لے کر جو بیٹھا تو ایلورا اور اجنٹہ کا خیال آ گیا۔ اور میں نے سو سے زیادہ شعر کہہ ڈالے پورے شعر تو شایع کرنے کے قابل نہ تھے البتہ اس میں سے بیس پچیس شعر میں نے انتخاب کر کے نظام گزٹ ہفتہ وار کی ابتدائی اشاعتوں میں شایع کروا ے تھے۔ اتفاق سے نہ تو اس نظم کا مسودہ ہی میرے پاس رہا اور نہ نظام گزٹ کا پرچا۔ تیس سال پہلے کہے ہوے شعر کیا یاد رہیں گے۔ چند جو حافظے میں محفوظ رہ گئے سنیے۔ یہ یاد رہے کہ سارے شعر ایلورا کی منظر کشی سے متعلق تھے۔

دسا او تاری کہیں ہے تو ہے کہیں کیلاش
طلسم کیا ہی بنا ہے جناب پتھر کا
وہ دور سے نظر آتی ہے لمبی راون کی
کہیں یہ بجتا ہے چنگ و رباب پتھر کا
قلم ہے کان پہ ذرا تو یہ چوپڑی رکھے
کیے ہی جاتے ہیں لالہ حساب پتھر کا
بہن کو ماری جو بھائی نے لات غصے سے
وہیں یہ ہو گیا خانہ خراب پتھر کا
عجیب سیر پر شان کی دکھائی ہے
حسین ایک سے ایک انتخاب پتھر کا

اس ہرزہ سرائی سے مقصد اپنی روانی طبع دکھانا نہیں بلکے اوقات ضایع کرنے کا قصہ سنانا ہے۔ اس طرح میں نے شاعری کی اور پھر لطف یہ کہ غزل کے ساتھ ساتھ تمام اصناف سخن میں سوا قصیدے کے طبع آزمائی کی مگر نہ تو رباعی ڈھنگ کی ہو سکی نہ قطعہ اچھا کہہ سکا۔ تاریخیں تو میں نکال ہی نہ سکا۔ کیونکے شروع ہی سے حساب میں نیا زمند ہوں۔ البتہ گلبن تاریخ اور آئینہ تاریخ کی مدد سے بعض تاریخی مادے ضرور نکال لیے تھے۔ مگر ان میں بھی کوئی بات نہ تھی مثلاً اکبر آبادی کا مادہ رحلت "ناوک غم اکبر" جس نے نکالا ہو وہ کتنا ماہر تاریخ گوئی ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

ہندستانی کے علاوہ فارسی زبان پر بھی اس ہیچمدان نے بڑا احسان کیا ہے کہ حافظ اور نظیری کی غزلوں پر

غزلیں کہیں مگر ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی مادری زبان میں ایسی شاعری کرتا ہو وہ دوسری زبان میں کیا گلفشانی کرتا رہا ہوگا۔

بہرحال چند غزلیں فارسی میں بھی میں نے کہی ہیں جو—

دندان تو جملہ در دہان اند
چشمان تو زیر ابروان اند

— قسم کی تھیں۔

اب غور فرمایئے یہ شاعری بھی کوئی شاعری تھی۔ دس بارہ سال میں نے جو اس پر ضائع کیے اس کا افسوس ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس امر کی خوشی بھی ہے کہ میں بہت جلد اس سے بیزار ہو گیا اور شاعری ترک کر کے کام کا بن گیا اگر دوسرے شعرا کی طرح میں بھی بر خود غلط واقع ہوتا اور اپنی اس پوچ گوئی کو شاعری سمجھ کر جاری رکھتا۔ تو آج کل کے تک بند شعرا کی طرح مشاعروں کا شاعر ضرور بن جاتا۔ مگر درجہ سوم کے شعرا میں بھی شریک نہ ہو سکتا اور ملک و قوم کی کوئی خدمت نہ کر سکتا بلکہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ ہو کر رہ جاتا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں بروقت ہشیار ہو گیا۔ اور جلد ہی شاعری ترک کر کے ع

بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا!

میری طرح ہزاروں اسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ کہ وہ شاعر ہیں اور اچھے شاعر ان شعرائے کرام سے التماس ہے کہ ع

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو

اور میرے اس مضمون کو غور سے ملاحظہ فرمائیں ع

میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

اور اس یاوہ گوئی اور قافیہ پیمائی کو ترک کر کے وقت گذاری کا کوئی دوسرا مصرف تلاش کریں۔

زیادہ التماس دعا

یہ قول خدا اس ہرزہ سرائی سے نجات حاصل کرنے پر ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ایڈیٹر

غزل

بن کر حیات چھائیں گے سارے جہان پر
دیوانے کھیل جائیں گے جب اپنی جان پر

لاؤ زمین ہی کو بنا لیں نہ آسمان
لیکن بھی کیا پہنچ کے زمیں آسمان پر

اوروں کے نقش پر نہ چلو رہروان شوق
منزل ملے گی چل کے خود اپنے نشان پر

ہر اصطلاح حسن سے واقف ہوں میں حضور
کیوں رو رہے ہیں آپ مری داستان پر

دار و رسن تو گرد گذر گاہ بن چکے
نظریں لگی ہوئی ہیں نئے امتحان پر

اک دن نکھارتا ہے یہی جلوہ یقیں
فرمایئے نہ طنز کسی بدگمان پر

منصور تیرے بعد نہ ابھریں حقیقتیں
پھر دل کی بات کوئی نہ لایا زبان پر

دور خزاں ہیں کرتے رہے سب گلوں کا غم
کانٹوں کا ذکر کوئی نہ لایا زبان پر

پرواز ارتقا کی یہ توہین ہے شفاؔ
کیوں رک کے رہ گئی ہے نظر آسمان پر

شفا گوالیاری

برطانوی تعلیمی نظام سے متعلق میرے مشاہدات

ایس اے رحمن

مدراس کے ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایس اے رحمن نے برطانیہ میں اپنے ۷ ہفتے کے قیام کے دوران ۱۹۴۴ء کے تعلیمی ایکٹ کے تحت قایم کیے تعلیمی نظام کے متعلق معلومات حاصل کیں، نیچے دی جاتی ہیں۔

۱۹۴۴ء کے ایکٹ کی ایک اہم بات یہ بھی کہ انگلستان اور ویلز کے تعلیمی نظام میں کافی لامرکزیت داخل کر دی گئی تھی چنانچہ میں نے تراپ شایر کے کپتن اتھارٹی کی مدد سے برطانوی تعلیمی نظام کا سروے کیا ہے اور اپنے قیام کے دوران ہر قسم کے اسکول مثلاً نرسری اسکول، پرائمری اسکول سکنڈری گرامر اسکول اور فنی اسکول بھی دیکھے۔ اس کے علاوا میں نے تعلیم بالغان کے اداروں کا بھی معائنہ کیا۔

برطانیہ میں اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں اور ان کے اسٹاف کو جو آزادی حاصل ہے اس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اور آخر میں خود اس نتیجے پر پہنچا کہ بچوں کو کیا پڑھانا ہے اور کس طرح پڑھانا ہے۔ برطانوی نظام کی قوت کا راز اسی آزادی میں چھپا ہے۔ ٹیچروں کو اپنی قابلیت دکھلانے کے بہت زیادہ مواقع حاصل ہیں۔ اور وہ اپنے اپنے علاقوں کی ضرورتوں کے برابر طلبا کی تعلیم کا بندوبست کر سکتے ہیں صنعتی علاقوں کے سکنڈری اسکولوں میں عام تعلیم کے علاوا طلبا کو لکڑی اور دھات کے کام کی بھی تربیت دی جاتی ہے اور زرعی علاقوں کے اسکولوں میں طلبا زرعی کام بھی سیکھتے ہیں۔ یہ عملی سرگرمیاں عام تعلیم میں بہت معاون ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً طلبا ایسے موضوعات پر جن کا تعلق ان کی عملی سرگرمیوں سے ہوتا ہے نہایت اعلا معیار کے مضامین لکھ سکتے ہیں۔

میں نے ایسے بچوں کی تعلیم سے بہت زیادہ دلچسپی لی جو جسمانی یا دماغی نقص کی وجہ سے تعلیم حاصل کرنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں اور میں نے دیکھا کہ برطانیہ میں ایسے بچوں کی تعلیم کا معیار بہت بلند ہے۔ میں نے ایک فارم انسٹی ٹیوٹ بھی دیکھا جہاں نوجوانوں کو زراعت کے متعلق مکمل تعلیم دی جاتی ہے۔ مقامی تعلیمی اتھارٹیز نے ایسے کئی انسٹی ٹیوٹ قایم کر دیے ہیں۔

میں نے تعلیم بالغان کے ایک دو اداروں کا بھی معائنہ کیا۔ بکنگھم شایر میں واقع تعلیم بالغان کے ایک اسکول میں جب میں گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہیڈ ماسٹر حکومت ہندستان کے سابق مشیر تعلیم سر جون سارجنٹ ہیں ان سے مل کر مجھکو بے حد خوشی ہوئی اور ہم دونوں نے ہندستان اور برطانیہ کے تعلیمی نظاموں پر دیر تک تبادلۂ خیالات کیا۔

میں چونکہ ساؤتھ انڈین ٹیچرز یونین کا صدر رہوں اس لیے فطری طور پر میں نے برطانیہ میں اپنے قیام کے دوران ٹیچروں کی تنظیموں سے متعلق اداروں سے بہت دلچسپی لی۔ میں ایک مختلف تنظیموں کے جلسوں میں شرکت بھی کی۔ نیشنل یونین آف ٹیچرز کے عہدے داروں سے تبادلۂ خیالات بھی کیا۔ یہ یونین ۲½ لاک ٹیچروں میں سے ۲ لاک ٹیچروں کی نمایندہ جماعت ہے۔ میں نے اسکولی بچوں کی ایک کانفرنس میں شرکت بھی کی اس کانفرنس میں بچوں نے آزادی اور جمہوریت کے موضوع پر بحث کی تھی اور تعلیمی ماہرین پر مشتمل ایک برینز ٹرسٹ سے میں نے سوالات بھی پوچھے تھے۔ مجھکو اس ٹرسٹ کا ممبر بنایا گیا تھا۔

مختصر یہ کہ میرا یہ سات ہفتے کا دورا نہایت ہی سبق آموز اور دل چسپ تھا۔ اور میں نے تعلیمی ریسرچ کے ادارے نرسری اسکولوں کی اسوسی ایشن حادثات کی روک تھام کی رائل سوسائٹی ایشن وزارت تعلیم وغیرہ کا بھی معائنہ کیا۔

پندرہ اگست

(۱)

آزاد ہند میں پھر پندرہ اگست آیا — بزم طرب میں ساقی، ساغر بدست آیا
شیشے ہزار کھنکے، ساغر ہزار اچھلے — میخانہ پر امنڈ کر، یوں ابر مست آیا
ہنسنے لگے پیالے، جھکنے لگی صراحی — جب میکدے میں کوئی، بادہ پرست آیا
بوئے شراب رنگیں، لے کر اڑیں ہوائیں — زہد و ریا کے رخ پر، رنگ شکست آیا
وعدہ کیا ہے مے کا، پھر پیر میکدہ نے — رندوں کے واسطے پھر روز الست آیا
تاروں کو چھو رہے ہیں، اڑ کر زمیں کے ذرے — اوج سکندری پر، معیار پست آیا
ماحول میکدہ میں، مستی بکھر رہی ہے
ناظورۂ وطن کی، کاکل سنور رہی ہے

(۲)

ٹھنڈی ہوائیں سنکیں، گلزار جھوم اٹھے — نکھرے ہوئے افق پر، انوار جھوم اٹھے
نسرین و نسترن کے، ہونٹوں پہ ہے تبسم — ہنستی ہے چشم نرگس، بیمار جھوم اٹھے
صحن چمن میں ہر سو چھائی ہوئی ہے مستی — پھولوں کا ذکر ہی کیا، جب خار جھوم اٹھے
مطرب کا سوز نغمہ، جادو جگا رہا ہے — بربط بھی مسکرایا، یوں تار جھوم اٹھے
جیسے کہ گلستاں میں رنج و الم نہیں ہے — شبنم کے آنسوؤں کے یوں ہار جھوم اٹھے
دیکھی شگفتگی جو، جھکے ہوئے گلوں کی — تعمیر گلستاں کے، معمار جھوم اٹھے
پندرہ اگست آیا، لے کر خوشی کا ساماں
رنگینیوں سے پر ہے صحن چمن کا داماں

(۳)

موج ہوائے گلشن، آزاد ہو چکی ہے — نوک زبان سوسن آزاد ہو چکی ہے
قید عدو سے پائی جذبات نے رہائی — مجروح دل کی دھڑکن آزاد ہو چکی ہے
محصور اب نہیں ہیں افکار شیخ مجذوب — مجبوری برہمن، آزاد ہو چکی ہے
بجلی سے ڈر نہیں ہے اپنا نہ ہلے لو کو — بندش سے روح خرمن آزاد ہو چکی ہے
اب جس جگہ بھی چاہیں خاشاک اپنے رکھیں — تنہائی نشیمن، آزاد ہو چکی ہے
جس سحر و بحر چاہیں دوڑائیں اپنی نظریں — پلکوں کی اب یہ چلمن آزاد ہو چکی ہے
بے کشت و خون وطن کو، آزادیاں ملی ہیں
یہ نعمتیں جہاں میں کس کو کہاں ملی ہیں

اسلام مسلم علوی ایم اے ایل ایل بی
ریسرچ اسکالر

(۴)

لیکن اسیرِ نکبت ہندوستاں ہے اب بھی — زنجیرِ بندگی کا باقی نشاں ہے اب بھی
اہلِ وطن سے اب بھی کوسوں ہے دور منزل — گم کردہ راہ شب میں یہ کارواں ہے اب بھی
چھائی ہے گلستاں پر تاریکیِ جہالت — ماحول پر مسلط ہر سو دھواں ہے اب بھی
پھیلی ہوئی ہے ہر جا بیماریِ تعصب — عقل و شعور لاغر، دل ناتواں ہے اب بھی
فکر و نظر میں اب بھی پیدا نہیں ہے وسعت — فہم و خرد پہ قایم، زنگِ نہاں ہے اب بھی
ہیں مے پرست کتنے اب بھی جو تشنہ لب ہیں — میخانے میں شرابِ احمر گراں ہے اب بھی

بغض و حسد سے اب بھی تاریک ہیں فضائیں
زہرِ غبارِ دل سے، مسموم ہیں ہوائیں

(۵)

ماحولِ زندگانی آخر سیاہ کب تک — بے نور ہی رہیں گے یہ مہر و ماہ کب تک
دست و گریباں تا کے، سرمایہ دار و مفلس — ہوگا نہ خار و گل میں آخر نباہ کب تک
کب تک یتیم آخر یوں ہی رہیں گے نالاں — بیواؤں کے لبوں پر سسکے گی آہ کب تک
بیچیں گی جسم کب تک دوشیزگانِ مفلس — ہوتے رہیں گے یوں ہی شب میں گناہ کب تک
کب تک رہے گی یوں ہی، تفریقِ نسل و مذہب — جمہوریت کا آخر حال تباہ کب تک
آئے گی روشنی کب آخر دماغ و دل میں — کوتاہ و تنگ آخر، چشم و نگاہ کب تک

آئے گا ہند میں کب، دورِ جدید آخر
جمہورِ غم زدہ کی، کب ہوگی عید آخر

(۶)

پندرہ اگست آئے، تو یوں سلام آئے — گلنار صبح چمکے، رنگین شام آئے
فرطِ طرب سے چٹکیں، افسردہ دل کے غنچے — گلشن میں جب نسیم، نازک خرام آئے
اس طرح ہوں فروزاں، خاکِ وطن کے ذرّے — جس طرح آسماں پر ماہِ تمام آئے
تقسیمِ مے ہو یکساں، ہر بادہ کش ہو خنداں — رندانِ تشنہ لب تک الفت کا جام آئے
سرمایہ دار پونچھیں، فاقہ کشوں کے آنسو — دامانِ غنچہ و گل، شبنم کے کام آئے
ہر دل میں ہو مسرت، ہر لب پہ ہو ترانہ — فردوس سے خوشی کا، رنگیں پیام آئے

ٹپکے نہ چشمِ نم سے، اک اشک سرزمیں تک
منار[1] نیلگوں سے، کہسار[2] مرمریں تک

[1] راس کماری کے قریب منار ایک چھوٹی سی خلیج ہے۔ [2] ہمالیہ پہاڑ سے مراد ہے۔

مہاراشٹر کا ڈراما

اگرچہ جدید اصطلاح کے لحاظ سے مرہٹی ڈراما لگ بھگ ۱۱۵ سال پہلے عالم وجود میں آیا تاہم تنجور لائبریری میں مرہٹی ڈراموں کے پرانے مسودات کا جو ذخیرا موجود ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں بھی ڈراما مہاراشٹر میں مقبول تھا۔

جدید طرز کا پہلا مرہٹی ڈراما "سیتا سوئمبر" ۱۸۴۳ء میں لکھا گیا جسے وشنوداس بھاوے نے سانگلی کے مقام پر اسٹیج کیا۔

مرہٹی ڈرامے کا آغاز "للت" اور "تماشا" کی قسم کی تفریحات سے ہوتا ہے۔ "للت" دھارمک تہواروں پر اسٹیج کیا جاتا تھا اس کا موضوع مہابھارت اور پورانوں کے واقعات سے لیا جاتا۔ للت میں بھگتی کے گیت بھی شامل کر لیے جاتے۔ روایاتی شخصیتوں کے علاوہ برہمن، دھوبی اور درزی وغیرا کے کیرکٹر بھی ان میں جگہ پاتے۔ پیشواؤں کے آخری دور میں تماشے بہت مقبول تھے۔ دراصل تماشے "للت" اور جدید ڈرامے کی درمیانی کڑی ہیں۔ "تماشوں" میں نثر کا حصہ برائے نام ہوتا تھا۔ اصل کہانی شاعری کی ایک قسم "لاونی" کے ذریعے بیان کی جاتی۔

۱۸۸۰ء میں وشنوداس بھاوے کے ڈرامے سیتا سوئمبر کی بدولت مرہٹی ناٹک کی روایاتی ہیئت اور روپ میں خوشگوار تبدیلی عمل میں آگئی۔ بھاوے نے "وِدوشک" اور سوتردھار کو رواج دیا۔ ناٹک کے کیرکٹروں کا مکالمہ نثر میں ہوتا تھا لیکن سوتردھار کے ذریعے سنگیت کا وقفہ کیرکٹروں کے جذبات کے اظہار کا کام دیتا۔

سنگیت کے ڈرامے کی روایات کی مضبوط نیو اس وقت پڑی جب انا صاحب کرلوس کر نے شکنتلا کو اسٹیج کیا۔ متعدد ڈراما کمپنیاں عالم وجود میں آئیں۔ جنہوں نے آرٹ کی اس شاخ کو وسیع پیمانے پر مقبول بنانے میں مدد

دی۔ کرلوسکر ناٹک منڈلی کے بعد گندھرو ناٹک منڈلی قایم ہوئی جس کے موسس بال گندھرو تھے۔ بال گندھرو گانے اور زنانا پارٹ ادا کرنے میں ید طولا رکھتے تھے۔

اس کے بعد "سودیشی ہت چنتک منڈلی" نے جنم لیا اس کے بعد "للت کلا آدرش منڈلی" وجود میں آئی۔

اگرچہ ڈراما اس دور میں زیادا تر سنگیت کی تفریح کا ایک شعبہ تھا پھر بھی اس میں سماجی خیالات جذب ہونے لگے۔ اس مقصد کے لیے نثر کا ڈراما بہترین وسیلا ثابت ہوا۔ چنانچہ گڈکری کے ڈرامے "پریم سنیاس" نے بڑے موثر پیرائے میں بیوا کی شادی کا مسئلا پیش کیا۔

گووند بلال دیول نے بھی سماجی تنقید کی اس روایت کا ساتھ دیا۔ گووند بلال نے سدرکا کے ناٹک "مرچ کٹک" کا ترجما کیا اور اس طرح ڈرامے کی دنیا میں قدم رکھا۔ اس کے بعد انہوں نے "شاردا" جیسے سماجی ڈرامے بھی لکھے۔ "شاردا" کا انتخاب "نیشنل ڈراما فیسٹیول" کے لیے کیا گیا تھا۔ اس ناٹک کا پلاٹ ایک دولت مند بوڑھے آدمی کے اردگرد گھومتا ہے جو کسی غریب گھرانے کی نوخیز دوشیزا سے بیاہ رچانا چاہتا ہے۔

کرشناجی پربھاکر کی تصانیف کی بدولت تاریخی ناٹکوں کی داغ بیل پڑی۔ پربھاکر کا دوسرا نام کاکا صاحب کھاڈلکر ہے ان کے نثر کے ڈراموں میں شیواجی اور تاریخ مہاراشٹر کے دوسرے سورماؤں وغیرا کے حالات زندگی قلمبند کیے گئے ہیں۔ ان ڈراموں میں جہاں حب وطنی کا جذبا کارفرما تھا وہیں ان میں انقلابی مواد بھی کافی موجود تھا گو کہ یہ چیز روایاتی کہانیوں کی شکل میں پیش کی گئی تھی۔ مثال کے طور پر کھاڈلکر کے ڈرامے کیچک ودھ میں لارڈ کرزن کی پالیسیوں پر سخت نکتا چینی کی گئی تھی۔ اس کے بعد اس پر پابندی

لگا دی گئی۔ نیشنل فیسٹیول میں دیا راشٹر کے تاریخی ناٹکوں کی روایات کی نمایندگی کے لیے کھڈ یلکر کا ڈراما "بھاؤبندکی" چنا گیا تھا۔ اس ناٹک میں مرہٹا تاریخ کا ایک دردناک باب یعنی نارا این راؤ پیشوا کے قتل کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی ایک واضح اپیل ہے کیونکہ رام شاستری کا کیرکٹر لوکمانیا تلک کی شخصیت کے رنگ میں ڈھالا گیا تھا۔ ایکٹر رام شاستری کا پارٹ ادا کرتے وقت لوکمانیا تلک کا لباس پہنتا اور وہی الفاظ استعمال کرتا جو بعد کے شخص نے اپنے مقدمے کے دوران کہے تھے۔

رومانی ڈرامے کا رواج کولھٹکر نے شروع کیا۔ انھوں نے ہلکے گانوں اور ہلکے پھلکے گانوں کو مقبول بنایا۔ ہندستانی غزلوں کے نمونے پر لکھے گئے تھے۔ کولھٹکر نے ذومعنی الفاظ کا استعمال بڑی ہشیاری سے کیا۔ آج سماجی ڈرامے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے جہاں تک ناٹکوں کو اسٹیج کرنے کا تعلق ہے کولھاپور کے مرحوم کیشوراو بھونسلے نے بہت عمدہ کام کیا ہے انہیں آرٹ ڈائرکٹر مرحوم آنندراو پینٹر کا تعاون حاصل تھا۔ اس قسم کے جدید ڈراموں میں ماما وریکر کا ڈراما "سنّیاسی غلام" بھی تھا جسے ۱۹۲۲ء میں للت کلا آدرش نے اسٹیج کیا تھا۔ انھوں نے بلاؤں کے مناظر جدید فیلٹ جن میں نئے دور کے فرنیچر لگ رہے تھے اور بجلی کے قمقمے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے اور مکانات کے اندر کا وسیع اور شاندار حصہ — یہ ساری چیزیں اسٹیج پر مرہٹی ڈراما دیکھنے والوں کے لیے نئی تھیں۔ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے قومی آزادی کی جدوجہد کی تحریک شروع کی تھی۔ ماما وریکر کا یہ ڈراما "سنّیاسی غلام" جس کے معنی ہیں "حق کی رو سے غلام" اس تحریک سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔

جن تمثیل نگاروں نے نئے ذرایع کا استعمال کیا ان میں پی کے اترے اور رام جی رانگنیکر بھی ہیں۔ اترے کے ڈراموں میں طنز و مزاح کا عنصر غالب رہتا ہے جبکہ رانگنیکر میں سنجیدگی زیادہ پائی جاتی ہے اور ان کے ناٹک متوسط طبقے کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ ماما وریکر پہلے ڈراما نگار ہیں جنھوں نے ایک ایکٹ کے ڈرامے کو رواج دیا جس میں سماجی مسایل سے سنجیدگی سے بحث کی جاتی۔ ان کا پہلا ایک ایکٹ کا ڈراما "ترنگا چیا دارا تھنا" (جیل کے پھاٹک پر) ۱۹۳۳ء میں لکھا گیا تھا اس میں اچھوت چھات کے مسئلے کو چھیڑا گیا تھا۔ آج سماجی روایات کے حامل مرہٹی ڈرامے اپنے آپ کو برقرار رکھنے کے لیے سنیما کی صنعت سے دست و گریباں ہیں۔

غزل

دشمن ہوا تو ہوش میں اب آسماں نہیں
بجلی وہاں گرائی جہاں آشیاں نہیں
اب میری خودسری کو بھی سجدے گراں نہیں
اس آستاں کے بعد کوئی آستاں نہیں
ہم اہل عشق پر نہیں پابندیاں نہیں
دیر و حرم کا فرق ہمارے یہاں نہیں
میں نے ہی زندگی کو دیا درس زندگی
لوح جہاں پہ میرا ہی نام و نشاں نہیں
ہمت کے ساتھ ساتھ ہیں قسمت کے فیصلے
او ولے خبر حیات میں ناکامیاں نہیں
ہر آرزوئے دید شکست نظر کے بعد
کتنی ہی رائیگاں ہو مگر رائیگاں نہیں
اک حرف ناتمام ہے افسانۂ حیات
جب تک ترے لبوں پہ مری داستاں نہیں
ان بجلیوں کے ناز اٹھائے مری بلا
جو خود ہی تو نہ دے وہ مرا آشیاں نہیں
معراج آج تو بھی ذرا ڈوب کر تو دیکھ
ساحل پہ دوش شورش طوفاں کہاں نہیں

معراج (لکھنوی)

ہندستان اور ایران کا ملا جلا ورثا — آریا آرٹ

ا۔ا

آرٹ فن عمارت سازی اور کلاسکی ادب کے میدانوں میں ہندستان اور ایران کے درمیان میل جول کے پس پشت تقریباً تین ہزار سال کی پرانی تاریخ موجود ہے۔ جب آریا لوگ پہلے پہل ہندستان آے تو وہ اعلا درجے کی ٹیکنیکل مہارت رکھتے تھے اور ان کے فن کے کمال کی مثالیں آج بھی قدیم عمارات اور مورتیوں کی صورت میں موجود ہیں۔ بدقسمتی سے ان میں سے بہت سی عمارتیں زمانے کی دست برد سے بچ نہیں سکیں اور موسمی اثرات اور جنگوں کے طویل سلسلے نے ان کا نام ونشان مٹا دیا ہے تاہم جو عمارتیں زمانے کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہی ہیں یا جن عمارتوں کے کھنڈرات ابھی تک موجود ہیں وہ کم وبیش آریا لوگوں کے کمال کا نمونا پیش کرتی ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ کی حالیہ مہموں کے نتیجے کے طور پر کئی ایسی عمارتیں منظر عام پر آئی ہیں جو صدیوں زمین میں دفن رہی ہیں۔ ان مہموں کے نتیجے کے طور پر ہمیں آریوں کے آرٹ کا پتا چلتا ہے جو کہ ہندستان اور ایران کا ملا جلا ورثا ہے۔

سن عیسوی سے چند سو سال پہلے پرسیپولز نامی شہر ایران کی راجدھانی تھا۔ اس شہر کے کھنڈرات میں سے سنگ مرمر کے بعض ایسے ستون برآمد ہوے ہیں جو اشوک کے زمانے کے پتھر کے ستونوں سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ ایران کے علاقے تخت جمشید میں چٹانوں کو کاٹ کر تیار کیے گئے بعض ایسے مقبرے موجود ہیں جن پر خوب صورت منبت کاری کی گئی ہے سوسا اور بابل وغیرا کی قدیم عمارتوں اور ہندستان میں بدھ مت کے زمانے کی عمارتوں کے فن تعمیر میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔

عہد موریا کی عمارتیں اور ان کے کھنڈرات اس امر کا ثبوت مہیا کر رہے ہیں کہ اس زمانے میں عمارت سازی کا فن بہت ترقی کر چکا تھا۔ مورخوں اور تحقیق کاروں کا یہ خیال ہے کہ اشوک اور اس کے ہم عصروں کے عہد میں جو عمارتیں تعمیر کی گئیں انھیں تعمیر کرنے والے ضرور ہی انڈو ایرانی دستکار ہوں گے۔ جنھوں نے غالباً وادی فرات میں اپنے فن میں کمال حاصل کیا تھا عہد اشوک کے شیروں (جنھیں آزاد بھارت کی علامت قرار دیا گیا ہے) کی اصل بھی ایرانی فن میں تلاش کی جا سکتی ہے۔

دنیا کے لوگ اور خصوصاً بدھ مت کے پیرو انڈو ایرانی سنگ تراشوں کے مرہون منت ہیں جنھوں نے سب سے پہلے مختلف انداز میں مہاتما بدھ کی مورتیاں تیار کیں۔ اور ان میں سے ہر انداز مہاتما بدھ کے کسی خاص پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ ہیلن کے فن کاروں نے سب سے پہلے مہاتما بدھ کے جو بت تیار کیے تھے ان میں ایرانی تخیل غالب رہا۔ اور انھوں نے مہاتما بدھ کی شکل اولیس کے دیوتا سے ملتی جلتی تیار کی۔ لیکن انڈو ایرانی فن کاروں نے مہاتما بدھ کے ایسے بت تیار کیے جن میں انھیں سمادی کی حالت میں یا استغراق کے عالم میں پیش کیا۔ اور اس طرح انھوں نے آنے والی نسلوں کے لیے ایک نئے فن کا ورثا چھوڑا۔ اس کے بعد جب بدھ مت دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیل گیا تو دوسری جگھوں پر بھی مہاتما بدھ کے بت انڈو ایرانی فن کاروں کے طریقے پر ہی تیار کیے گئے۔

مصوری کے میدان میں رقص کرتی ہوئی لڑکیوں

شکاری عورتوں حیوانی اشکال اور پھولوں کے ذریعے زیبائش کی مختلف تصاویر ایران میں ساسانی عہد کے فن کی یادگار رہیں اور یہ تصاویر ہندستان میں اجنٹا کے غاروں میں مصوری کے نمونوں سے گہری مشابہت رکھتی ہیں۔

ہندستان کی تاریخ میں عہد گپتا ہندستان سے ایران کے رستے از پورب اور اتر بحیرہ کی طرف وسیع پیمانے پر نقل و حرکت کے لیے مشہور ہے اس زمانے میں چین اور خلیج فارس کے علاقے کے درمیان ریشم کی تجارت کی شاہراہ پر زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کو باہم ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا موقع ملتا تھا۔

اسلام کے داخلے کے بعد فن عمارت سازی نے جو شکل اختیار کی وہ ہندستان اور ایران میں تعمیر کی ہوئی مسجدوں سے ظاہر ہے۔ گنبد۔ محراب اور پیش دہلیز ان کے خصوصی جز تھے۔ ہندستان میں تعمیر کا یہ نمونہ کوئی نیا نہیں تھا بلکے اس کی بنیادیں اس سے کچھ عرصہ پہلے کے فن عمارت سازی پر ہی رکھی گئی تھیں۔ لودھی زمانے کی عمارتیں بھی گولائی میں ہوتی تھیں اور ان کے طاقچوں میں مہاتما بدھ کی مورتیاں بنائی جاتی تھیں۔

فن کی ایک اور تخلیق جس پر ایرانی بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ خشنویسی ہے جیسی یا کاغذ پر ان کے ہاتوں کی لکھی ہوئی خوب صورت تزین کتابیں اور خصوصًا قرآن شریف خاص طور پر مشہور ہیں یہ فن اسلام کے ساتھ ساتھ دیگر ملکوں میں بھی پھیلتا گیا اور ہندستان بھی اس سے روشناس ہوا۔ مغلوں کے زمانے کی مصوری بھی ایرانی اثر کا ہی نتیجا ہے ہمایوں تقریبًا پندرہ سال ایران میں جلا وطن رہا۔ اور اس عرصے میں سرکردہ ایرانی مصوروں سے اس کی جان پہچان ہوئی۔ ہندستان لوٹتے ہوئے وہ ایرانی مصوروں کو بھی ساتھ لیے آیا۔ اور انھوں نے مغلوں کے زمانے کی مصوری کی بنیادیں رکھیں۔ اس سلسلے میں سولہویں صدی کے امیر حمزا کی مصوری قابل ذکر ہے بعد ازاں راجستان گجرات کشمیر اور پنجاب کی مصوری مغلوں کے زمانے کے فن مصوری پر اثر انداز ہوئی۔

شراب تلخ

ذکری بھوپالی

جو دیکھا بے کسی میں زندگی کو
اُبھارا غم کے پردے سے خوشی کو
کہیں اب کیا کسی کی دوستی کو
ترستے ہیں مذاق زندگی کو
کیا روشن جو شمع بندگی کو
بجز اپنے نہ دیکھا پھر کسی کو
ابھی تک ہیں نگاہیں محو حیرت
کبھی دیکھا تھا دل کی روشنی کو
مہ و انجم کے رخ سے نور لے کر
بنایا صبح ہستی شام زندگی کو
مبادا عیش رفتہ یاد آئے
لگا رکھا ہے دل سے بیکسی کو
انہیں موجوں میں ہے آغوش ساحل
بنا کر دیکھ طوفان زندگی کو
ہوا برہم کچھ ایسا نظم گلشن
ہے مشکل سانس لینا بھی کلی کو
خودی میں بھی شراب تلخ ذکری
خودی سے دور رکھا بے خودی کو

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!!

ناراضلع الہ باد

یاد فرمائے نوح۔ سلام نیاز!

آپ کا رسالا اکثر پہنچتا رہتا ہے مگر میں بصارت سے بلکل مجبور ہوں اسی باعث سے اسی وقت اپنا کلام اشاعت کے لیے نہیں بھیج سکا۔ جب کوئی مل جاتا ہے تو اس سے خط لکھوا لیتا ہوں اور پڑھوا لیتا ہوں۔ فی الحال کچھ کلام اپنا بھیج رہا ہوں جو شعر پڑھا جائے اس کو درج کیجے اور جو نہ پڑھا جائے اس کو جانے دیجے زیادا نیاز۔ فقط

نوح ناروی

ہمیں اس کا سخت افسوس ہے کہ لکھائی چھپائی کی دشواریوں کے سبب رسالا دیر سے ضرور چھپ رہا ہے مگر ہر مہینے پابندی کے ساتھ آپ کی سیوا میں روانا کیا جاتا ہے اگر کسی مہینے ڈاک کی غلطی سے نہ پہنچے تو کرپا کرکے ایک کارڈ کے ذریعے ہمیں معلوم کرا دیجیے تاکہ دوبارا بھیجا جا سکے۔ "ہندستانی ادب" کی یہ عین خوش قسمتی ہے کہ نبی پیرانا سالی اور بینائی وغیرا کی مجبوریوں کے باوجود آپ نے اس رسالے کا خیال رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ رسالا دوسروں سے پڑھوا کر سننے میں آپ کو زحمت ضرور ہوتی ہوگی مگر اس کو ہم اپنے لیے باعث رحمت سمجھتے ہیں۔ بشمول آپ اس رسالے کو اور بھی چند بزرگ اور قابل احترام ہستیوں کی قلمی سرپرستی کا شرف حاصل ہے۔ اس کو "ہندستانی ادب" اپنے لیے باعث فخر سمجھتا ہے اس لیے آپ سے عرض ہے کہ مسلسل اپنے کلام فصاحت النیام سے اس رسالے کو ضرور نوازتے رہیں۔ ایڈیٹر

لکھنو

برادر محترم جناب خان صاحب۔ آداب عرض! مزاج گرامی۔ "ہندستانی ادب" ماہ جون ۱۹۵۵ء موصول ہوا۔ "حیدرآباد" نظم کی اشاعت مع ایڈیٹوریل نوٹ پڑھ کر بحد خوشی ہوئی یقین مانیے کئی چھٹانک خون بڑھ گیا اور زندگی کے کچھ لمحات میں اضافا ہو گیا۔ آپ کی عزت افزائی کا بیحد شکریا!

میں سن ۵۰ء سے ۵۵ء تک کی نظموں کا منتخب مجموعہ بعنوان "نکہت و نور" پریس میں طباعت کے لیے دینے جا رہا تھا کہ اتنے میں آپ کا رسالا ملا۔ رسالا پڑھ کر یہ خیال ہوا کہ آپ کا ایڈیٹوریل نوٹ نظم "حیدرآباد" میں شامل کر دوں۔ چنانچے کاتب صاحب کو وہ صفحات واپس کر دیے اور اب پرسوں تک انشاالله سارا مواد پریس میں جائے گا۔ اس سے قبل "ساغر و مینا" نظموں اور غزلوں کے پہلے مجموعے میں بھی آپ کا ایڈیٹوریل نوٹ "پاگل کوے" کے سلسلے میں موجود ہے۔ اور آپ کا نوٹ اب "نکہت و نور" کی چمک اور روشنی میں اضافا کرے گا۔ آپ کی قدردانی کا میں پھر ایک بار شکریا ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یوں ہی آپ مجھ پر مہربانیاں فرماتے رہیں گے فقط۔ نیاز آگیں

سلام سندیلوی

کسی کا کئی چھٹانک خون بڑھتا ہے تو لازم کسی کا کئی چھٹانک خون گھٹتا ہے۔ اس کا نام ہے صحافتی ٹرانس فیوژن (TRANSFUSION) اس کے نتیجے کے طور پر کسی کی عمر بڑھتی ہے تو کسی کی گھٹتی ہے صرف نظم "پاگل کوے" اور "حیدرآباد" ہی پر کیا منحصر ہے یہ "ہندستانی ادب" ہر اچھی چیز کی تعریف کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ "ہندستانی ادب" میں دوسری جو چیزیں چھپتی ہیں وہ اچھی یا معیاری نہیں۔ بلکے مطلب

یہ ہے کہ کسی چیز میں جب کبھی کوئی خاص بات خاص نکتا یا خاص پہلو نظر آئے تو اس کو نمایاں کرنے پر ہم اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارے نوٹ آپ کی نظموں کی زینت بن رہے ہیں اور ان کی چمک اور روشنی میں اضافے کا باعث بھی بنیں گے۔

آپ جیسے ہر قابل فرد کی "قدردانی" ہم اپنا صحافتی اور اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ اگر آپ اور دوسرے لایق حضرات بھی اپنے افکار عالیہ سے اس رسالے کے صفحات کو نوازتے رہیں گے تو یقیناً ہم اس کے بدلے آپ سب پر پھر بانیوں کی بوچھار کرتے رہیں گے۔

—— مگر یہ سب کچھ کب تک ——! جب تک کہ "ہندستانی ادب" زندا ہے اور بقول مولانا افقر موہانی "ہندستانی ادب" جب نہ ہوگا ——" تب —— ؟ نہ معلوم کس کی مہربانیاں آپ پر نچھاور ہوں —— ؟

یہ عجیب بات ہے کہ ہر طرف سے صرف تعریفی بلند ہی بلند بے چلے آتے ہیں لیکن آج تک کسی نے یہ نہ لکھا کہ "—— اس خوشی میں ایک عدد خریدار حاضر ہے ——" یہ مسئلہ ہماری سمجھ سے باہر ہوگیا ہے کہ محض زبانی اور خالی خولی تعریفوں سے ایک رسالہ کیسے چلایا جا سکتا ہے جب تک کہ اس کے چلانے کے سامان بھی ساتھ ساتھ فراہم نہ کیے جائیں۔

آپ کو تو کلی چھیٹا تک خون مل گیا، مگر ہم تو آپ سے صرف چند خریدار .... دیجیے نا!!

ایڈیٹر

شاہجہاں پور

بھائی صاحب۔ پر خلوص سلام!

آج پھر ایک تعطیل میں وطن آیا! تو یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ "ہندستانی ادب" محض زندا ہی نہیں بلکہ پھر اپنی جوانی کی طرف رجوع ہو رہا ہے ورنہ اس زمانے میں کسی پیسے کی زندگی کا قایم رہنا اور وہ بھی ادبی رسالے کی زندگی کا ایک معجزے سے کم نہیں کہا جا سکتا۔

میں اپنی کوتاہیوں پر نادم ہوں۔ کہ آج تک کچھ بھیجنا تو درکنار خیریت کے دو لفظ بھی نہ لکھ سکا۔ بہر حال آپ کی وسیع القلبی سے امید ہے کہ آپ چنداں اس کا خیال نہ کریں گے .... آپکا

مرزا مشتاق علی بیگ

مرزا صاحب! آپ نے یہ تو ٹھیک کہا کہ "رسالا پھر اپنی جوانی کی طرف رجوع ہو رہا ہے"! مگر ساتھ ہی یہ نہ بتایا کہ اس خون چوس رسالے نے ہمیں بڑھاپے کی طرف "رجوع" کر دیا ہے۔ یلا میا لغا ہم نے اپنا خون پلا پلا کر اس کو جوانی بخشی ہے اور جب بدن میں ایک قطرہ خون بھی نہ رہے گا تو تب ہم رہیں گے اور نہ آپ کا جواں سال چہیتا رسالا۔ اس کو بچانے اور سدا بہار رکھنے کی تدبیریں ابھی سے کرنی چاہئیں۔ ورنہ جب ہم دونوں چل بسیں گے تو سوائے افسوس کرنے کے اور کوئی چارا نہ ہوگا۔

اپنی کوتاہیوں کا دکھڑا رونا مناسب نہیں! اگر لکھنے والا یہی عذر تراشتا رہے تو پھر مضامین اور نظمیں وغیرا کہاں سے آئیں۔ یہ اور بات ہے کہ امریکا اور روس کے سائنسداں کوئی ایسی مشین ایجاد کر دیں جو بٹن دباتے ہی مضامین اور نظمیں ڈھالنا شروع کر دے اس وقت ہو سکتا ہے کہ ایڈیٹر حضرات مضمون نگاروں اور شاعروں کی بے التفاتیوں سے بے نیاز ہو جائیں مگر مہربان اس وقت تک تو "اپنی کوتاہیوں" کو بھلا دیجیے۔

ایڈیٹر

ایلی — مکرمی۔ تسلیم

ہندستانی ادب کا تازہ شمارہ مدیر روح بلکھنڈ سے بغرض مطالعہ ملا۔ پرچہ بہت خوب ہے بلکہ اپنی طرز کا انوکھا کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ چند غیر مطبوعہ رباعیاں برائے "ہندستانی ادب" ارسال خدمت ہیں اگر پسند آجائیں تو کسی قریبی اشاعت میں شامل فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

ماجد ادیب بریلوی

تبصرے

لغات القرآن

قرآن پڑھنے والوں کے لیے مژدہ! یعنی یہ کہ قرآن پڑھ کر اس کے مطلب اور مفہوم کو آسانی سے سمجھ بھی سکتے ہیں۔ ترجمے کے ساتھ قرآن پڑھ کر سمجھ لینا تو ظاہر ہے کہ نہایت ہی آسان ہے لیکن بغیر ترجمے کے قرآن پڑھ کر اس کے معنی اور مفہوم کو سمجھنا مشکل ہے لیکن مولانا شہید الدین نے "لغات القرآن" لکھ کر اس دشوار کام کو بھی آسان بنا دیا ہے۔ یہ کتاب صرف قرآنی لغت ہے "جس میں تمام الفاظ قرآنی کی تشریح آسان زبان میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ و نیز سلف صالحین کی تفاسیر کے تراجم کی روشنی میں کی گئی ہے" اور تمام الفاظ قرآنی کو حروف تہجی کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر وہ شخص جو قرآن پڑھ سکتا ہے اس لغت کی مدد سے بہت جلد قرآن کے مطالب اور مفہوم پر عبور حاصل کر لے گا۔ اور اس طرح بغیر استاد کے عربی زبان بھی آسانی سے سیکھ سکے گا۔

تمام الفاظ قرآنی اور ان کے معنی نہایت ہی صحت کے ساتھ دیے گئے ہیں۔ اس لیے غلط رستے پر لگنے کا کوئی امکان ہی نہیں اس لحاظ سے "لغات القرآن" ایک نہایت ہی مفید کتاب ہے نہ صرف قرآن پڑھنے والوں بلکہ عربی سیکھنے والوں سے بھی ہم اس کتاب کی خریدی کی سفارش کریں گے۔ اس لیے کہ عربی زبان سیکھنے والوں کے لیے یہ کتاب دراصل "عربی گائیڈ" کا کام دیتی ہے۔

عام کتابی سائز چکنے کاغذ کے ۳۷۰ صفحے کی یہ مجلد کتاب جزدی پشتے اور آرٹ پیپر کے دو رنگی نفیس گرد پوش اور نہایت ہی پاکیزہ لکھائی چھپائی کے ساتھ صرف چار روپے میں نور محمد۔ اصح المطابع۔ کارخانہ تجارت کتب مقابل آرام باغ۔ فریر روڈ۔ کراچی۔ پاکستان سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ہندستان میں ترسیل زر کا پتہ اشتیاق بک ڈپو۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی) "ا"

کتاب التوحید

لکھائی چھپائی نفیس کاغذ چکنا۔ بڑا سائز مجلد آرٹ پیپر کے کئی رنگی نہایت ہی نفیس اور جاذب نظر گرد پوش کے ساتھ ۹۴ صفحے قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتا۔ نور محمد اصح المطابع۔ کارخانہ تجارت کتب۔ مقابل آرام باغ فریر روڈ کراچی (پاکستان) ہندستان میں ترسیل زر کا پتا اشتیاق بک ڈپو۔ دیوبند۔ ضلع سہارنپور (یو۔پی)

ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن محمد السورتی کا شمار ہندستان کے مشہور عالموں میں ہے آپ نے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کی مشہور عربی تصنیف "کتاب التوحید" کا ترجمہ پیش کیا ہے ترجمہ عربی متن کے ساتھ ساتھ دیا گیا ہے ترجمہ نہایت ہی آسان، سادہ اور سلیس زبان میں ہے۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب عرب کے مشہور عالم فاضل اور کئی ایک مستند کتابوں کے مصنف گذرے ہیں۔ شیخ نے ابتدا میں باپ سے علم حاصل کیا۔ مگر چونکہ بلا کے ذہین واقع ہوئے تھے۔ اس لیے فقہ و حدیث اور تفسیر و عقاید کی کتابوں کا کثرت سے مطالعہ کر کے بطور خود اپنی علمی اور دینی معلومات میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ حدیث کے گہرے مطالعے نے بدعت اور رسوم کی برائیوں کی طرف ان کی آنکھیں کھول دیں۔ چنانچہ شیخ نے اپنوں اور بیگانوں سب ہی کو ان برائیوں سے روکنا چاہا۔ شیخ کے اس پرچار کے لوگ مخالف ہو گئے اور خود ان کے باپ نے بھی ان کے خیالات کی مخالفت کی۔ باپ کے انتقال کے بعد شیخ نے کھلے طور پر رسوم اور بدعتوں کی مخالفت شروع کر دی۔ لوگ مخالفت

پر اتر آئے۔ اور ان کے قتل کی ٹھانی مگر یہ بچ کر بھاگ نکلے۔ اور عُیَیْنَہ پہنچے۔ وہاں کے امیر عثمان پر اپنا گہرا رنگ جمایا اور اسلامی دنیا کی تباہی و بربادی۔ فسق و فجور شرک و بدعت رسوم میں انہماک توحید سے نفرت قبر پرستی پیر پرستی اور دوسری تمام لغو باتوں اور خرافات سے آگاہ کرایا۔ چنانچہ شیخ کا جادو چل گیا اور عثمان نے ہر طرح سے مدد کا عہد کر لیا۔ شیخ نے اس کی مدد سے اپنے کام کو بہت آگے بڑھایا۔ شیخ کے چرچے عرب اور عرب سے باہر ہونے لگے۔ شیخ یہاں سے دارعیہ گئے، اور ابن سعود پر اپنی غیر معمولی علمی فضیلت کا سکہ جما کر انہیں اپنا ہم خیال بنا لیا۔ سعود نے شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے مشن کی کامیابی میں ہاتھ بٹانے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد شیخ کی دعوت حق عام تھی۔ اور انہیں اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

انہیں کوششوں کے نتیجے کے طور پر شیخ نے زیر تبصرہ کتاب لکھی یہ کتاب کئی ابواب پر مشتمل ہے ان ابواب میں شرک اور بدعت کی برائیاں ایک ایک کرکے گنائی گئی ہیں۔ بے جا رسوم سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ التعویذ فلیتہ۔ گنڈا، جادو، ٹوٹکا، منتر، نجوم فال، قبر پرستی، پیر پرستی، دنیا پرستی اور ریاکاری وغیرہ جیسی بدعتوں اور برائیوں سے بچنے اور دور رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور یہ تمام ہدایتیں شیخ نے قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کی روشنی میں دی ہیں۔

کتاب کے شروع میں نہایت ہی تفصیلی مقدمہ ہے جس میں شیخ کے حالات زندگی پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شیخ نے اپنے نقطۂ نظر کی جو دعوت دی۔ اس کے نتیجے کے طور پر ان کی شدت کے ساتھ مخالفت بھی کی گئی۔ مگر آخر کار شیخ کے پیرو پیدا ہو گئے، اور یہی پیرو "وہابی" کہلائے۔ یہ کتاب اسی فرقے کے عقاید کی آئینہ دار ہے یہ کہ یہ عقاید صرف اسی فرقے سے مختص ہیں بلکہ یہ

دعوت عام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا تصفیہ تو پڑھنے کے بعد ہر شخص خود ہی کر سکے گا۔

مترجم کتاب نے "وہابی" فرقے کو "وہابی مذہب" کے نام سے یاد کیا ہے۔ حالانکہ مذہب اور فرقے میں نمایاں فرق ہے۔ مذہب کی مثال بالکل ایک پیڑ کی سی ہے اور فرقے اس کی شاخیں ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام ایک مذہب ہے جس کے ۷۲ بہتر فرقے ہیں اور انہیں میں سے ایک "وہابی" فرقہ بھی ہے۔ یہ غلطی سہو قلم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے آیندہ اشاعت میں اس کی اصلاح ضروری ہے۔

مختصر شعب الایمان

تالیف امام ابی جعفر بیہقیؒ
پاکٹ سائز۔ لکھائی چھپائی

کاغذ عمدہ ۱۴۰۔ صفحات قیمت عصر ملنے کا پتا۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ فریر روڈ۔ کراچی پاکستان ہندستان ترسیل زر کا پتا۔ اشتیاق بک ڈپو۔ دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔ پی)

نور محمد کارخانہ تجارت کتب آج کل بڑا اچھا کام کر رہا ہے بڑی نفیس اور نہایت عمدہ کتابیں شائع کیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے چنانچہ اسی سلسلے کی یہ کتاب بھی ہے جو باوجود مختصر ہونے کے بڑی کارآمد اور مفید ہے۔

امام بیہقیؒ چوتھی صدی ہجری کے مشہور عالم اور محدث گذرے ہیں۔ جن کی کتاب شعب الایمان بڑی مشہور اور بہترین کتاب ہے اس میں ایمان کی (۷۷) شاخوں کی تفصیل امام صاحب نے قلم بند کی ہے اس کتاب کا نہایت ہی نفیس خلاصہ زیر تبصرہ کتاب ہے۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ ایمان کے ہر شعبے سے متعلق قرآن حدیث اور اکابر اسلام کی آرا نہایت ہی صحت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس کتاب کو غور سے پڑھ لے اور اس پر عمل شروع کر دے تو یقیناً بہت جلد مرد صالح بن جائے گا۔

امام صاحب نے نہایت ہی اصولی طریقے پر ایک کل حلال

اور صدق مقال کی وضاحت کی ہے اور ادر سادا زور اس بات پر دیا ہے کہ مسلمان عملی انسان بن کر زندگی گذارے اور کما یا ہے نیے چنانچہ جگہ جگہ ایسے چٹکلے تحریر فرمائے ہیں کہ پڑھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔

"مثلاً جب کسی عابد کو شیطان دیکھتا ہے کہ عبادت میں تو وہ — چست و چالاک ہے مگر کھانے پینے میں حلال وحرام کا امتیاز نہیں کرتا تو دوسرے شیطان سے کہتا ہے کہ اسے بہکانے کی ضرورت نہیں اسے چھوڑ دو یہ چاہے جس قدر کوشش کرے اور عبادت بجا لائے اس کی حرام روزی کی وجہ سے اس کا ایک عمل بھی خدا کے ہاں قبول نہ ہوگا۔" یا

"حضرت سفیان ثوری سے لوگوں نے اول صف کی فضیلت دریافت کی آپ نے فرمایا پہلے یہ تو دیکھ لو تمہاری کمائیاں حلال ذریعے سے ہیں یا حرام سے — صف چاہے آخری ملے لیکن روزی حلال کی ہونی چاہیے" اور "تقویٰ صرف خدا ہی سے ڈرنے کا نام نہیں بلکہ تقویٰ کی بنیاد حلال کھانا پینا اور معاش کا ذریعہ حلال ہونا اور بات چیت نرم اور اچھی کرنا ہمارے نبی نے یہ سب باتیں اپنے رب سے سیکھ کر ہمیں بتائی ہیں۔"

اسی طریقے سے امام صاحب نے مسلمان کو عملی انسان بنانے کی کوشش کی ہے انتہا یہ کہ ایک جگہ حضرت فضیل بن عیاض کا قول نقل کیا ہے کہ "دین کے کام دنیا کمانے کے لیے کرے اس سے بدتر ہیں کہ انسان طبلے اور باجے سے دنیا کمائے۔"

کتاب مختصر مفید ہے گویا کہ "دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے" — ایمان و رشد کے اس وسیع سمندر سے ہر شخص بہ قدر ظرف جرعہ کشی کر کے استفادہ کر سکتا ہے۔ "ق۔ک"

اردو غزل کے پچیس سال | نوشتہ خلیق ابراہیم۔ کراون سائز ۱۰۸ صفحات کاغذ نفیس لکھائی چھپائی عمدہ قیمت عہ ملنے کا پتا حلقہ ارباب فکر۔ تین ہٹی کراچی۔

خلیق ابراہیم نئے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ اور آج کل اچھا لکھ رہے ہیں۔ انہوں نے غزل کا مطالعہ ضرور کیا ہے۔ مگر بہت ہی سطحی اور رواروی سے۔ نفس غزل پر انہوں نے روشنی اتنی کم ڈالی ہے کہ ان کی اس کتاب میں غزل ابھر ہی نہ سکی۔ صفحا ۷ سے صفحا ۴۹ تک اردو غزل کے پچیس سال مکمل ہو گئے ہیں ظاہر ہے کہ —

"سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے"

یہ کوئی مضمون تھا جسے حلقہ ارباب فکر نے نہایت بے فکری کے ساتھ شائع کر دیا ورنہ یہ موضوع بڑی تفصیل چاہتا ہے۔

صفحا ۵۰ تا ۱۰۸ سے ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۵ء تک کے پچیس سالہ دور کی غزل کا انتخاب پیش کیا گیا ہے جس میں جگر مراد آبادی، آنند نراین ملا، مجاز، معین احسن جذبی، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیار پوری، احسان الحق حقی، فضل احمد کریم فضلی، ظہیر کاشمیری، اختر انصاری اکبر آبادی، سلیم احمد، مجروح سلطان پوری، جمیل الدین عالی۔ ابن انشا، ناصر کاظمی، طفیل احمد جمالی، سراج الدین ظفر، خلیل الرحمن اعظمی۔ تابش دہلوی۔ ابو مسلم صحافی۔ تابش صدیقی۔ کرار نوری۔ شفق خواجہ، شاد عارفی، ڈاکٹر مسعود حسین۔ عابد حسن منٹو۔ شائستہ، بزم انصاری، زاہدہ، خلیق الزماں۔ من موہن تلخ، اطہر نفیس، جمیل ملک، روشن نگینوی، قتیل شفائی۔ غلام ربانی تاباں۔ اصغر سلیم، شہاب جعفری، عبدالحمید عدم کے تغزل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے معنی میں یہ انتخاب با ترقی پسند شعرا کے تغزل کا کہا جا سکتا ہے گذشتہ پچیس سال میں اردو کے بڑے اچھے غزل گو پیدا کیے شاگردان داغ و امیر بھی اسی پچیس سال کے شروع دور میں آ سکتے تھے۔ بہرحال بعض جلیل القدر غزل شعرا کو خلیق نے بالکل بھلا ہی دیا ہے اور اس لحاظ سے اس کتاب کا نام "اردو غزل کے پچیس سال" کی بجائے ترقی پسند غزل گو شعرا رکھا جاتا تو بہتر تھا۔ تتمہ ہے آئندہ ایڈیشن

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی - ام - خان - ام - اے (عثمانیہ)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

جلد (۱۵) ایڈیٹر نمبر (۱۲)

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

آبان ۱۳۶۴ف چندا سالانا آٹھ روپے ستمبر ۱۹۵۵ء

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۳	غدر ۱۸۵۷ء	سرن چندر گوما	۱۶
حقایق و معارف	لسان الحقیقت افقر موہانی وارثی	۳	غم معتبر	ارشد صدیقی	۱۹
غزل	ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی		تاج محل یا پاگل خانہ	سکندر سلیم	۲۰
غزل	اعتبار الملک لی شاہجہاں پوری	۵	غزل	ظفر جبین ظفر (لکھنوی)	۲۳
غزل	جسٹس پنڈت آنند نرائن ملا (لکھنوی)	۶	رباعیاں	ماجد ادیب بریلوی	۲۳
غزل	اختر عباسی	۷	امن عالم کے لیے جسمانی صحت کا عالمی معیار ضروری ہے۔	ام سی کینڈا ڈائرکٹر جنرل عالمی ادارہ صحت	۲۴
غزل	سلام سندیلوی ام اے ال ال بی ریسرچ اسکالر	۸	غزل	یونس علی ہنر (لکھنوی)	۲۵
مولانا ابوالکلام آزاد	قاضی عبدالغفار	۹	غزل	شاہ بیدل وارثی	۲۵
غزل	معراج (لکھنوی)	۱۳	فردوسی لائبریری کی سیر	تاسس	۲۶
اشتراکی نمونہ پر تعلیم	پروفیسر ہمایوں کبیر سکریٹری وزارت تعلیم حکومت ہندستان	۱۴	اپنی بے لبی کے نام	صبا نقوی	۲۸
غزل	خورشید اعجاز	۱۵	ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے	ایڈیٹر	۲۹
تبصرے	"ن" اور "ا"	۳۱			

ہمارے خیالات

سب طبقوں کے لیے یکساں طور پر تعلیم

سکریٹری ہمایوں کبیر کا مضمون "انشرا کی نمونے پر تعلیم" اسی نمبر میں دیا گیا ہے۔ ہمایوں کبیر نہ صرف یہ کہ ماہر تعلیم ہی ہیں بلکہ مرکزی حکومت کے ایک ذمے دار عہدے دار بھی ہیں۔ ان کے قلم سے نکلی ہوئی باتیں خاص وزن اور اہمیت بھی رکھتی ہیں۔ آپ حکومت ہندستان کے محکمہ تعلیم کے ایک کلیدی عہدے پر فائز ہیں۔ اس لحاظ سے تعلیم کے بارے میں آپ کا بیان سننے کی چیز ہے۔ ہندستان میں ابتدائی اور اونچی تعلیم کا خاکہ سکریٹری موصوف نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:

"...... دس سال سے بھی کم مدت میں ابتدائی اسکولوں کے بچوں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ سے بڑھ کر لگ بھگ دو کروڑ اور سکنڈری اسکولوں نیز اونچی تعلیم کے اداروں میں بھرتی ہونے والوں کی تعداد دگنی ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ کیونکہ ابتدائی اسکولی عمر کے پچاس فیصدی بچے ابھی اسکولوں سے باہر ہیں۔"

یہ سچ ہے کہ دس سال کے عرصے میں تعلیم پانے والے بچوں کی تعداد دگنی ہو گئی ہے لیکن یہ اضافہ قابل تعریف اس لیے نہیں کہلوا سکتا کہ بقول سکریٹری صاحب "پچاس فیصدی بچے ابھی اسکولوں سے باہر ہیں۔" سوشلسٹ سماج کبھی بھی اسکو گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی اولاد تعلیم جیسے جوہر سے محروم رہے۔ ملک سے جہالت اسی وقت دور ہو سکتی ہے جبکہ تعلیم عام اور مفت ہو۔ اس لیے کہ ملک کے معاشی حالات خراب ہیں۔ عوام اپنی معاشی مجبوری کے سبب اپنی اولاد کو پورے طور پر تعلیم نہیں دلا سکتے۔ چنانچہ خود سکریٹری صاحب کو بھی اس بات کا اعتراف ہے اور وہ کہتے ہیں کہ:

"بسا اوقات اقتصادی وجوہ کی بنا پر ماں باپ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم کے اسکولوں سے بھی نکال لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔"

اہل ملک کی ان مجبوریوں کو انہیں صفحوں میں ہم نے بارہا گنایا ہے۔ اور اس کا حل ہم نے یہی پیش کیا تھا کہ تعلیم مفت اور عام ہو۔ اس اہم ترین ضرورت کو اب کہیں حکومت نے محسوس کیا ہے۔ چنانچہ انہیں ذمے عہدے دار تعلیم نے اس کا حل یوں پیش کیا ہے۔

"...... اس لیے یہ لازم آیا کہ سوشلسٹ سماج ابتدائی تعلیم کو مفت بنانے کے علاوہ بچوں کی خوراک، کپڑے لتے اور کتابوں کے لیے بھی فیاضانہ امدادی تدابیر اختیار کرے۔"

جب تک یہ صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک عوام پر تعلیم کے دروازے مساویانہ طور پر نہیں کھل سکتے۔ اور جب تک تعلیم عام نہ ہو ملک سے جہالت کی تاریکی دور نہیں ہو سکتی۔ اور جب تک یہ تاریکی دور نہ ہو اس وقت تک ملک صحیح معنی میں ترقی یافتہ نہیں کہلوا سکتا۔ ہمیں اس کا پورا پورا علم ہے کہ دنیا کے بہت سے ملک تعلیمی لحاظ سے ہندستان سے بہت آگے ہیں اور ہندستان کا تعلیمی فیصد ان ترقی یافتہ ملکوں کے مقابل بہت ہی کم ہے ہم اس وقت کسی ملک سے اپنے ملک کا مقابلہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہم اپنے ملک کے حالات کے لحاظ سے یہاں کی تعلیمی ترقی کے متمنی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خود حکومت کو بھی اس کا احساس ہے لیکن ہم یہ کہے بغیر نہ رہیں گے کہ تعلیم کے سلسلے میں حکومت کے احساسات کچھ مفلوج سے ہیں ورنہ یہ ناممکن تھا کہ دیس کی دوسری ترقیوں کے مقابل تعلیمی ترقی کی رفتار اس قدر سست رہے۔ ہمیں آشا ہے کہ حکومت

حقائق و معارف

لسان الحقیقت
افقر موہانی وارثی

پہلے کچھ یوں ہی سی عادت ہو گئی — پھر تو فطرت ہی محبت ہو گئی
تم پہ مایل کیا طبیعت ہو گئی — زندگانی ایک آفت ہو گئی
جب سے دیکھی ہے بہار کوے دوست — محو دل سے یاد جنت ہو گئی
چار دن کی زندگی تھی وہ بھی حیف — عشق کے ہاتھوں مصیبت ہو گئی
ہو گئی پامال مشق ناز جو — حاصل تربت وہ تربت ہو گئی
جب سے دیکھا مرنے والے نے انہیں — اور ہی کچھ دل کی حالت ہو گئی
تیرے ہر فتنہ پہ اے محشر خرام — صدقے سو جاں سے قیامت ہو گئی
میں نے جو پایا وہ قسمت تھی مری — تم نے جو چاہا مشیت ہو گئی
ہو گیا رخصت مریض شام غم — ہو گئی صبح قیامت ہو گئی
ان کے سنگ در پہ سجدہ کیا کیا — میری قسمت میری قسمت ہو گئی

قید ہستی سے ہوئی افقر نجات
اب فراغت ہی فراغت ہو گئی

غزل

سیکڑوں دن تجھ پہ ستم دن ہو کہ رات
وقت کی خوبی ہے یہ قسمت کی بات

کیا کریں بے خوف ہو کر کوئی بات
کتنے ہم کتنی ہماری کائنات

تھا مسرت کا زمانہ بے ثبات
اب نہ ویسا دن نہ اب ویسی ہے رات

ان کی اک اک بات میں لاکھوں نکات
بات یہ ہے خوب ہے ایک ایک بات

دل لیا پہلے پھر اس نے جان لی
واردات اور اس طرح کی واردات

مٹ گیا اب فرق مرگ و زیست کا
ایک ہے اپنی حیات اپنی ممات

کیا کہوں ناصح کو اور اس کے سوا
ہے تو وہ انسان لیکن واہیات

وقت پر محشر میں دیکھا جائے گا
کیوں ابھی سے میں کروں فکر نجات

تیر کی بخت مر کر بھی رہی
دن نہیں ہے قبر میں ہے صرف رات

ایک دو کا تذکرہ میں کیا کروں
روز ڈھاتے ہیں ستم وہ پانچ سات

جن کو مر کر بھی بھلا سکتے نہیں
چند گذرے ہم پر ایسے واقعات

دل ہی تنگ تھی کثرت رنج و الم
جب نہ ہو دولھا تو پھر کیسی برات

خواب بے تعبیر ہم دیکھا کیے
بعد مرنے کے کھلا راز حیات

کیا عجب مقبول ہو جائے دعا
ایک ساتھ اٹھیں جو میرے ان کے ہات

کیوں نہ ہو اونچی دکان مے فروش
ہے یہاں بس ایک دام اور ایک بات

غور سے دیکھے کوئی تو کم نہیں
حشر کے دن سے مری فرقت کی رات

وہ بگڑ بیٹھے پیام شوق پر
تھی نہ کچھ تھی صرف تھی اتنی سی بات

دیکھنے والو ذرا دیکھو کہ
کس طرف ہے ان کی چشم التفات

کتنی لذت خیز ٹھہری فصل گل
یعنی اک اک شاخ ہے شاخ نبات

بیخود و ناطق بھی جوش و نوح بھی
ہیں بہ شاعر باقیات الصالحات

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر نوح ناروی

غزل

بے سود ہے یہ جوشِ گریہ اے شمعِ سحر ہو جانے تک
چھینٹا ترے اشکِ پیہم کا پہنچا نہ کبھی پروانے تک

اے اہلِ نظر میری ہستی سب کچھ تھی کبھی اب کچھ بھی نہیں
زندہ ہوں مگر مہمانِ بقا اک سانس کے آنے جانے تک

برہم سا نظامِ ہستی ہے کچھ اور نہ برہم ہو جائے
مشاطۂ گیتی کے ہاتھوں گیسوئے بتاں سلجھانے تک

وعدہ ہے مگر کس پردے میں اک شوخِ تغافل فطرت کا
جب لیلیٰ شب کے بل کھاتے گیسو اتر آئیں شانے تک

ہاں غور سے اک خوددار نظر اپنے ہی گریباں پر ناصح
کیا جانے رہے گا کس حد میں دیوانہ ترے سمجھانے تک

اے خاکِ پریشاں کے ذرّو آغوش میں تم مجھ کو لے لو
تمکین و خودی کو ٹھکراتا میں آیا ہوں ویرانے تک

مینا سے مئے سرجوش ڈھلی پیمانہ رہا فردوسِ نظر
یہ لطف تھا بزمِ ساقی میں یہ کیف رہا مے خانے تک

یہ کیا کہ جگر کے ٹکڑے ہوں وا دامنِ مژگاں اے دل
یہ کیا کہ تڑپ اٹھے دنیا افسانہ رہے افسانے تک

اعتبار الملک
دل شاہجہاں پوری

غزل

مجھے ممکن ہے دھوکہ ہو کہ میں روحِ حقیقت ہوں
مگر جو کچھ بھی ہوں اس دورِ باطل میں غنیمت ہوں

مجھے روشن نہیں کرنی کوئی میلی سی چنگاری
فروزاں ہوں تو اس آتش فشانِ دل کی بدولت ہوں

مذاقِ بزم نے کیا کیا نہ زک دینے کی کوشش کی
ہواؤں سے جو لڑ لڑ کر بنی ہے وہ عمارت ہوں

میں اپنے وقت کا یہ تو زمانہ ہی بتائے گا
یہ قولِ خود اک آئینہ یا گردِ کدورت ہوں

ازل سے آج تک گونجے ہیں جو دنیا کے کانوں میں
وہی آنکھوں کا نغمہ ہوں وہی دل کی حکایت ہوں

میرے نغموں سے ہے بیزار آج اک جنگجو دنیا
ابھی کانٹوں میں جو پلتا ہے وہ برگِ محبت ہوں

بنائے زندگی رکھتا ہوں فطرت کے تقاضوں پر
جو فخرِ آدم پہ کرتا ہے وہ جرمِ آدمیت ہوں

مری تقدیر یہ ہے خود جل کے اوروں کو ضیا دینا
غم اپنے حق میں ہوں، اوروں کا سامانِ مسرت ہوں

بھٹک کر آ گیا اس دور میں کیسے خدا جانے
خرد کی یخ زدہ صبحوں میں اک شامِ محبت ہوں

خزاں کے تند جھونکوں میں بھی خوابِ رنگ و بو دیکھا
جہنم میں بھی جس نے گل کھلائے ہیں وہ جنت ہوں

مجھی پر ایک دن ایمان لائے گا جہاں ملاؔ
اگر الفت خدائی ہے تو میں دل کی نبوت ہوں

جسٹس پنڈت آنند نرائن ملاؔ ——— (لکھنؤ)

غزل

اختر عباسی

بنایا ہم نے دل کو دل نے میر کارواں ہم کو
بحمد اللہ کہ رہزن بھی ملا تو راز داں ہم کو

مزہ دینے لگیں اب زندگی کی تلخیاں ہم کو
نگاہ لطف بھی پیغام مرگ ناگہاں ہم کو

ملا اس بے نشاں کے جب سے دل میں کچھ نشاں ہم کو
مٹا کیا دیتے ہیں مکین لا مکاں ہم کو

کچھ ایسے دل جلے ساقی ترے مے خانہ سے اٹھے
فراز عرش اعلیٰ تک ملے جن کے نشاں ہم کو

وہ ساعت وہ گھڑی بھی حاصل عمر دو روزہ
کہ جس میں چھیڑتی ہے آ کے یاد رفتگاں ہم کو

وہ رند لاابالی سرخوش جام حقیقت ہیں
کہ بیرنگئ مطلق میں ملیں رنگینیاں ہم کو

دکھا دیں حسن جاں پرور کی رنگینی زمانہ کو
مگر سر تو اٹھانے دیں نظر کی شوخیاں ہم کو

لب ساقی سے نکلی چھا گئی اقصائے عالم پر
صدائے اشربوا اٹھی یا کہ گلبانگ اذاں ہم کو

کبھی وادی ایمن پر کبھی فاراں کی چوٹی پر
مگر وہ اپنے ہی دل میں ملا جلوہ کناں ہم کو

جہاں چاہیں وہیں پر ختم کر دیں زندگی اپنی
ملا ہے موسم پیری میں وہ بخت جواں ہم کو

یہاں تو کوئی اہل دل سے واقف ہی نہیں اختر
یہ اپنے ساتھ آخر آپ لے آئے کہاں ہم کو

غزل

سلام سندیلوی ایم۔ اے، ایل ایل بی ریسرچ اسکالر

کہیں ملتی نہیں اس دور میں جائے اماں ہم کو
چمن میں بھی نظر آئیں لہو کی سرخیاں ہم کو

اسی رخ پر قفس کو رات بھر صیاد رہنے دے
دکھائی دے رہا ہے چاندنی میں گلستاں ہم کو

ابھی تک سبزۂ گلشن کو بیگانہ سمجھتا ہے
نظر آتا ہے خام اب بھی شعور باغباں ہم کو

اندھیری رات میں جیسے طلوع ماہ ہوتا ہے
بڑھایا اس طرح ساقی نے جام ارغواں ہم کو

غم دوراں سے نالہ کش ہوئے نوخیزانِ گلشن بھی
جوں ہی چٹکا کوئی غنچہ، سنائی دی فغاں ہم کو

ہوئے شبنم کے آنسو خشک لیکن ہیں نشاں باقی
نظر آتی ہیں برگ گل پہ کچھ کچھ دھاریاں ہم کو

ابھی کچھ اہل گلشن، ہم کو اپنا ہی سمجھتے ہیں
مگر دشمن سمجھتا ہے ہمارا باغباں ہم کو

غنیمت ہے پلا دے آج اے ساقی گھٹاؤں میں
اڑا لے جائیں پھر جانے کہاں کل آندھیاں ہم کو

غم دوراں نے حسن و عشق کی دنیا بدل ڈالی
ہزاروں جلوہ رنگیں، مگر فرصت کہاں ہم کو

یہ فصل گل میں بربادی کا عالم، اے معاذ اللہ
بہت یاد آ رہا ہے آج وہ دور خزاں ہم کو

سلام اس درجہ ہے ماحول گلشن ہم سے بیگانہ
قفس معلوم ہوتا ہے ہمارا آشیاں ہم کو

مولانا ابو الکلام آزاد

وزیر تعلیم حکومت ہندستان

(ایک صاحب طرز انشا پرداز)

قاضی عبد الغفار

ایک ادیب کی حیثیت سے مولانا ابو الکلام آزاد کی ادبیت کا مطالعہ اور تجزیہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مولانا کے علم و فضل کی انفرادیت ان کے ادب پر اس قدر چھا گئی ہے کہ ان دونوں چیزوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ ہماری زبان کے صاحب طرز ادیبوں میں ہم آسانی کے ساتھ غالب۔ محمد حسین آزاد سرسید احمد خاں اور چند ایسے صاحب طرز ادیبوں کی ادبیت کا تجزیہ کر سکتے ہیں لیکن مولانا کی شخصیت ان کے ادب سے اس قدر وابستہ ہے کہ اس انفرادیت سے جدا کر کے ان کے ادب کا مطالعہ کرنا ایک بڑا ہی کٹھن کام ہے۔ خاص طور پر مولانا کے فکر و نظر کا انداز ان کی تحریر کی بلاغت اور فصاحت میں ان کی انفرادیت کو اس قدر نمایاں کرتا ہے کہ کوئی لفظ اور کوئی فقرہ ان کے قلم سے ایسا نہیں نکلتا جو ان کے ہمعصر اور پیشرو ادیبوں کے طرز نگارش سے ملتا جلتا ہو۔ غالب ہی تنہا ایک شخص ایسا تھا جس نے اپنی نثر اور نظم کا انداز اپنے ہی لیے مخصوص کر لیا تھا کبھی کوئی ادیب اس کی صحیح تقلید نہ کر سکا لیکن مولانا غالب کی اس خصوصیت سے بھی دو قدم آگے نکل گئے اور انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اس کو اپنی ہی مکمل شخصیت کے قدرتی سانچے میں اس طرح ڈھال دیا کہ بہت سے اہل قلم اسی طرز تحریر کو اپنانے کی کوشش کر کے ہار گئے لفظوں کی قوت اور جذبات کی بے پناہ روانی کے ساتھ ساتھ مولانا کا طرز تحریر ایک لطیف آرٹ بن گیا۔ مجھے مولانا کی محترم شخصیت اور ان کے مخصوص طرز تحریر کا مطالعہ کرنے کے کافی مواقع حاصل ہوئے اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر مولانا اتنے بڑے انشا پرداز اور ادیب نہ ہوتے تو بہت بڑے مصور یا ماہر موسیقی یا شاعر ضرور ہوتے ان کی رومانیت کو اگر ایک طرف مذہب کے تقدس اور دوسری طرف سیاست کی سنجیدگی نے پابند نہ کر دیا ہوتا تو ان کے قلم کا یہ آبشار جو آزاد ہندستان کے دور جدید کا نقیب ہوا، وجدانیت اور رومانس کی پر فضا وادیوں میں بہا لے جاتا۔

مولانا کا طرز تحریر اور اسلوب بیان اپنے اندر چند خصوصیات رکھتا ہے جو ہمارے ادب میں بڑی حد تک صرف اسی کے لیے مخصوص ہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی اشارہ کیا۔ مولانا کی فطری انفرادیت سے ان کا ادب بھی بھرپور ہے۔ وہ کوئی بات ایسی اپنے قلم سے لکھ ہی نہیں سکتے جس کا انداز انشا پردازی کے عام اسلوب سے مماثلت نہ رکھتا ہو۔ وہ ایک پیش پا افتادہ بات کو بھی اس طرح لکھیں گے جس طرح کہ کبھی کسی نے نہ لکھا ہو۔ اور اس کے ساتھ فصاحت اور بلاغت کا اشارہ اور کنایہ اور قوت اظہار ان کے لفظوں کی معنویت کو بہت بھاری بھرکم اور دلوں اور دماغوں پر اثر کرنے والا بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات بہت سادہ حقیقتیں وہ ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں کہ وہ دلوں میں اثر کر جاتی

ہیں۔ اگر ہم الہلال، البلاغ، تذکرہ اور غبارِ خاطر کی تحریروں کو ایک پیمانا بنالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان کے قلم سے جو نقش و نگار بنتے ہیں وہ ایک آرٹسٹ کی روح ہیں جو اپنے کو کبھی رومانیت، کبھی فلسفہ اور کبھی طنز و مزاح اور کبھی ادبیت لوازِ رنگینی کے پیرائے میں ظاہر کرتی ہے اگر مولانا کے علمی اندازِ بیان اور ادبی اسلوب کا تجزیہ کیا جا سکے تو معلوم ہوگا کہ مولانا کے افکار کا بہاو ایک صحرائی چشمے کی طرح آزاد ہے جب وہ بہتا ہے تو کوئی رکاوٹ اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ اس چشمے پر نہ تو کوئی پل باندھا جا سکتا ہے نہ اس کے پانی پر ملاحوں کی کشتیاں تیرتی ہیں۔ اور نہ اس کا پانی نہروں اور بستیوں کے خس و خاشاک سے آلودہ ہو سکتا ہے۔ — یہ چشمہ ایک خاموش وادی کے آغوش میں جو مولانا کی فطرت ہے بہتا چلا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے مولانا کی دوسری تحریروں پر "غبارِ خاطر" قابلِ ترجیح ہے جس کے مکتوبات غالباً اس لحاظ سے لکھے گئے تھے کہ وہ کبھی شائع نہ ہوں گے۔ اور اسی لیے ان مکتوبات میں مولانا نے اپنے افکار کے بہت سے گوشے بے تکلف ظاہر کر دیے ہیں۔

مولانا کے ادب کی بنیادی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ناقدین کی خوش قسمتی یہ ہے کہ مولانا نے "غبارِ خاطر" میں اپنے ادب کی فطرت کے بعض حقائق کو بے تکلف بے نقاب کر دیا ہے۔ وہ اپنے ادب کے لیے "انانیتی ادب" کی اصطلاح استعمال فرماتے ہیں۔ اپنے ایک مکتوب میں ایسے اہلِ قلم کی نفسیات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

"— ایسے افراد اپنی "میں" کا سر جوش کسی طرح دبا نہیں سکتے۔ ان کی خاموشی بھی چیخنے والی اور ان کا سکون بھی پرشور ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ایسے افراد جب کبھی "میں" بولتے ہیں تو اس میں قصداً بناوٹ اور نمایش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ ۔"

"ایسے شخصی اغراض افراد کو عام معیارِ نظر سے دور رکھنا پڑے گا۔ ایسے لوگ فکر و نظر کی عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے ادب و تصنیف کے عام قوانین انھیں نہیں پکڑ سکتے۔ زمانہ کو ان کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" بولتے رہیں ان کی "میں" "ان کی ہر دہ" اور "تم" سے زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔"

اس آئینے میں مولانا کی نفسیات کا جو عکس نظر آتا ہے اس سے ان کے ادب کو ناپنے اور تولنے کے بہت سے ڈھنگ معلوم ہو جاتے ہیں۔ بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں۔ اور بہت سے دھندلے نقوش ابھر آتے ہیں۔ زندگی کے فلسفے کو مولانا نے خود اپنی زندگی کے بعض گوشے بے پردہ کر کے بیان فرمایا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

"انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے جسم کا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ غور کیجیے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہے کہ سر و سامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردہ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آ جائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں بلکہ خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔"

اپنی سیاسی زندگی کے متعلق ایک جگہ بہت بلیغ فلسفیانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ "ان کی طبیعت کی رفتار نے — بڑا کام یہ دیا کہ زمانہ کے بہت سے حربے میرے لیے بیکار ہو گئے، لوگ اگر میری طرف سے رخ پھیر لیتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو۔ اور زیر منت گزار ہونے لگتا ہے۔ چونکہ جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے وہ میرے لیے لیا اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے میں اگر عوام کا رجوع اور ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی اور تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا۔ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے

ساتھ وہ ہوا جو غالب کی شاعری کے ساتھ ہوا تھا۔"

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

ایک اور مقام پر زندگی کے فلسفے کو اپنی فطرت کے آئینے میں اس طرح نمایاں کرتے ہیں کہ احمد نگر کے قلعے میں اپنی قید کا حال لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود کے باہر تھا اگر چھن گیا تو کیا مضائقہ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر اور نظارے میں محو رہتا ہوں۔"

مولانا کے ادبی افکار کا ایک نیا پہلو "غبار خاطر" میں نمایاں ہوا۔ جو ان کے مطالعے کی گہرائی اور قوت کا آئینہ دار ہے۔ "غبار خاطر" کے صفحات پر مولانا نے اپنے خاص انداز میں چڑیا چڑے کی ایک کہانی لکھی ہے جس میں انہوں نے مطالعہ فطرت کے جواہر پارے بکھیر دیے ہیں۔ کہنے کو تو آپ اسے چڑے چڑیا کی کہانی کہہ لیجیے۔ لیکن حقیقت میں مولانا نے اس پردے میں جو فلسفۂ زندگی بیان کیا ہے وہ حسن بیان اور مشاہدۂ فطرت اور مطالعہ تخلیق کا ایک مخصوص انداز ہے۔ اس کہانی کی چند سطریں مختصراً پیش کرتا ہوں۔

"..... پھر جوں جوں بچوں کے پر بڑھنے لگتے ہیں وجدان کا فرشتہ آتا ہے اور ماں کے کانوں میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ اب انہیں اڑنے کا سبق سکھانا چاہیے معلوم ہوتا ہے کہ موتی (یہ نام مولانا نے احمد نگر کے قلعہ میں اپنے کمرہ کی ایک چڑیا کا رکھ دیا تھا۔) کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہو گئی تھی ایک دن صبح کیا دیکھتا ہوں کہ گھونسلے سے اڑتی ہوئی گزری تو اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھوری پرواز کے پر و بال کے ساتھ نیچے گر گیا۔ موتی بار بار اس کے پاس جاتی اور اڑنے کا اشارہ کر کے اوپر کی طرف اڑنے لگتی۔ موتی چاول کے ٹکڑے چن چن کر لاتی۔ اور اسے کھلا دیتی وہ چوں چوں کی مدھم اور اکھڑی سی آواز نکال دیتا۔ اور پھر دم بخود آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔.. میرا خیال تھا کہ یہ ایک بچے گا نہیں لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔ دھوپ کی ایک لکیر کمرے کے اندر دور تک چلی گئی تھی۔ یہ اس پر جا کر کھڑا ہو گیا اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر گرے ہوئے پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا اور بند کیا۔ پھر جو ایک مرتبہ جست لگا کر اڑا تو یک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا۔ اور پھر ہوائی کی طرح فضا میں اڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا۔..... دراصل یہ کچھ نہ تھا زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشا تھا۔"....

"چڑیا کے بچے میں اڑنے کی استطاعت ابھر چکی تھی جب تک وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا ماں بار بار اشارے کرتی تھی...... لیکن جوں ہی اس کی سوئی ہوئی خود شناسی جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ میں اڑنے والا پرندہ ہوں اچانک قلب بے جان کی ہر چیز جاندار بن گئی......"

"چشم زدن کے اندر جوش پرواز کی ایک برقی آسا تڑپ نے پورا جسم ہلا کر اچھال دیا اور پھر جو دیکھا تو درماندگی و بے حالی کے تمام بندھن ٹوٹ چکے تھے۔"

مولانا نے اس کہانی کے انداز میں اسرار خودی کا سارا فلسفہ بیان کر دیا اور اپنے مطالعے کی گہرائی سے چڑیا چڑے کی کہانی میں زندگی کی بے بہا حقیقتیں ظاہر فرما دی ہیں۔

مولانا کے ادب کا ایک اور پہلو طنز و مزاح ہے جو ایک شمشیر بے نیام ہے "البلاغ" میں اس کے نمونے نظر آتے ہیں۔ مولانا کے ادب کی قوس و قزح میں یہ

رنگ بھی بہت دلنواز اور ان کی ہمہ گیر...... شخصیت کو ظاہر کرنے والا ہے۔ مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ذہانت بہت تیزی سے ہر شخص یا چیز کی تضحیک کا پہلو دیکھ لیتی ہے۔ اس قسم کے نظاروں کے زیادہ نمونے "غبار خاطر" ہی میں ملتے ہیں۔ مثلاً اپنی قید کے ساتھی ڈاکٹر سید محمود کے شان میں مزاح اور تفنن کا پہلو دیکھتے ہیں اور اپنے ایک مکتوب میں بے ساختہ اس کو اجاگر کر دیتے ہیں —

"(ڈاکٹر صاحب) ہر روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لے کر نکل جاتے اور صحن میں جا کھڑے ہوتے پھر جہاں تک حلق کام دیتا آ۔ آ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے۔ یہ صلائے عام میناؤں کو تو ملتفت نہ کر سکی۔ البتہ بہرستان ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی یعنی کوؤں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا...... بہرحال محمود صاحب آ۔ آ کے تسلسل سے تھک کر جوں ہی مڑتے یہ دریوزہ گران کوتہ آستین ٹوٹ پڑتے اور دستر خوان صاف کر کے رکھ دیتے محمود صاحب کی صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کوؤں کی کائیں کائیں کی رونق جو کچھ بھی رہتی تھی اب جو دستر خوان کرم بچھا تو نقاروں پر بھی چوب پڑ گئی۔ ایک دو دن تک تو لوگوں نے صبر کیا۔ آخر ان سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دست کرم کی بخششیں رک نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں کے لیے ملتوی ہی کر دیجیے۔ ورنہ ان ترکان یغما کی ترکتازیاں کمروں کے اندر کے گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے بیٹھنے نہ دیں گی۔ اور ابھی تو صرف احمد نگر ہی کے کوؤں کو خبر ملی ہے اگر فیض عام کا یہ لنگر خانہ اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں کہ تمام دکن کے کوے احمد نگر پر حملہ بول دیں"

مولانا کے مزاح کی یہ خصوصیت ہے کہ کہیں عامیانہ لہجہ یا بدمذاقی کا شائبہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ طنز میں بھی مولانا کے قلم کی نوک کتنی ہی باریک ہو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ زہریلی یا تعصب و عناد سے آلودہ ہے۔ طنز کے پیرایے میں مولانا کے مشہور مضامین میں سے ایک وہ ہے جو "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تجویز کے متعلق "الہلال" میں لکھا گیا تھا فاونڈیشن کمیٹی کے جلسے کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک مقام پر مولانا لکھتے ہیں کہ:—

"اتنے میں خبر آئی کہ ہز آنر کے یہاں ڈنر ہے ہم نے کہا انا للہ و انا الیہ راجعون قومی طاقت کے ہزاروں آہنی حربے ایک طرف اور ان نقرئی چھری کانٹوں کی جھنکار ایک طرف۔ حریت پسند سے پوچھا کہ کیسے اس ناوک کا بھی جواب آپ کے ترکش میں ہے۔ جواب ملا کہ نہیں شکست کا اعتراف...... لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی۔ اطبائے قدیم اور جدید کا اتفاق ہے کہ چھ گھنٹے کے بعد غذا کے ہرش سے معدہ خالی ہو جاتا ہے جلسہ رات کو نہیں بلکہ صبح آٹھ بجے تک تھا اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ اور بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہوگی کہ صبح تک معدے میں فروکش رہے۔ اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدوں سے مگر افسوس کہ دوسرے دن ہماری طبی معلومات میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوا۔"

"ہمیں اب یقین ہے کہ غذا جس قدر نفیس اور لطیف ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے نیز اگر بقراط بھی کہیں تو ہم ان سے اس بارے میں لڑنے کو تیار ہیں کہ شام کی غذا دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے۔"

یہ اشارہ ہے اس واقعے کی طرف کہ ان لوگوں نے جو مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق حکومت کی شرائط قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ رات کو لفٹننٹ گورنر کے یہاں کھانا کھانے کے بعد صبح کو اپنی رائے بدل دی۔ مولانا کے طنز کا رنگ چند ہی مضامین تک محدود رہا۔ اور نہ تیرا سو چودا نقیبوی

کے بعد اس رنگ کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ادب میں یہ جو کچھ سرمایا مولانا کے قلم نے جمع کیا ہے وہ میعادی ہے؟ باقی رہنے والا اور سدا بہار ہے۔ صدیوں بعد بھی مولانا کے فکر و نظر کے شاہکار اپنے مقام پر باقی رہیں گے اور ہر عہد کی ادبیات کا فاضل جب ہندستان کے ادب کا تحقیقی مطالعہ کرے گا تو یہ ناممکن ہے کہ اس ملک کی اجتماعی زندگی اور سیاسی اور تہذیبی جدوجہد میں مولانا کے ادب نے جو حصہ لیا ہے اسے نظر انداز کر سکے۔

غزل

معراج (لکھنوی)

غم محبت سے زندگی کو کہیں بھی کوئی مفر نہیں ہے
کبھی یہ عالم کہ آنکھ تر ہے کبھی یہ عالم کہ تر نہیں ہے
ترا تصور رہے سلامت اب آرزوئے سحر نہیں ہے
وہیں پہ سورج چمک رہا ہے جہاں نظر کا گذر نہیں ہے
خلاف رسم و رہ محبت ہمارا کوئی سفر نہیں ہے
اسی طرف زندگی بڑھی ہے جدھر تری رہگذر نہیں ہے
فنا کی منزل پہ بھی پہنچ کر غم جدائی ستا رہا ہے
حیات کتنی ہی مختصر ہو حیات غم مختصر نہیں ہے
بڑی جسارت کا کام تھا یہ کسی کے عارض کو چاند کہنا
تری تجلی میں سچ ہے لیکن جواب ذوق نظر نہیں ہے
بہار نو میں یہ حادثہ بھی ہے ایک قیامت کا پیش خیمہ
کہ رات بھر رو چکی ہے شبنم اور ایک غنچہ بھی تر نہیں ہے
یہ جام و مینا کے تذکرے کیوں یہ میکدے میں شکست کیسی
سنا تو یہ تھا کہ شیخ صاحب کو آرزوئے دگر نہیں ہے
غزل تو کیا کہہ سکیں گے حضرت مگر یہ فیضان حسن قسمت
ان ہی کو حاصل ہوئی ہے شہرت جنہیں شعور ہنر نہیں ہے

الٹیمیٹم

—— جی ہاں! دنیائے صحافت کی یہ بالکل نئی ایجاد ہے اور نہایت ہی خطرناک! مگر صرف ان لوگوں کے لیے جن پر اس کا اثر ہوگا!

o —— ان پر جو رسالا ایک طویل عرصے سے رعایتی طور پر حاصل کر رہے ہیں جب تک رسالے کے حالات بہتر تھے ہم نے ایسی کوئی شکایت نہیں کی۔ رسالا ہر مہینے پابندی کے ساتھ بھیجے چلے جا رہے تھے۔ مگر اب جبکہ حالات حد سے بدتر ہو چلے ہیں یہ صورت حال ہمارے لیے ناقابل برداشت سی ہو گئی ہے اس لیے مجبوراً اب ہم ایسے حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ سالانہ چندہ ابتک بھجوا کر مستقل خریدار بن جائیں اور رسالے کے ساتھ اپنے قدیم تعلقات کو قائم رکھتے ہوئے ہمیں ممنونیت کا موقع دیں ——!

oo —— ان پر جو ایک عرصے سے مضامین اور افسانے وغیرہ نہیں بھجوا رہے ہیں جب رسالے کو آپ کا قلمی تعاون حاصل نہ رہے تو رسالا آپ کے ساتھ اپنے تعلقات کیسے برقرار رکھ سکتا ہے؟ ان لوگوں سے عرض ہے کہ یا تو پہلے کی طرح قلمی معاونت کا پھر سے بیڑا اٹھائیں یا چندہ ادا فرما کر خریدار بن جائیں ——!!

ooo —— ان پر جنہوں نے کافی طویل عرصے سے اپنا کلام وغیرہ بھجوانا چھوڑ دیا ہے اگر آپ اسی طرح سے چپ سادھے رہیں گے تو پھر لازم ہے ہمیں بھی قطع تعلق کر لینا پڑے گا۔ قلمی طور پر ساتھ دینا گوارا نہ ہو تو خریدار بن کر رقمی شکل میں سلسلے کی مدد کیجیے!!

—— ہمیں جو کچھ کہنا تھا ہم نے صاف کہہ دیا ہے۔ رسالے کے ساتھ اپنے پرانے تعلقات کو قائم رکھنا نہ رکھنا اس کا تصفیہ آپ کے ہاتھ ہے ہمیں آشا ہے کہ آپ یک صحیح فیصلے پر پہنچتے ہوئے رسالے کے ساتھ اپنے قدیم تعلق کو ضرور قائم رکھیں گے —— ورنہ اس پرچے کو "آخری نمبر" سمجھا! دیجیے گا آپ کے حق میں

الٹیمیٹم

اشتراکی نمونے پر تعلیم

ہمایون کبیر
(سکریٹری وزارت تعلیم حکومت ہندستان)

ہندستان نے جس سوشلسٹ نمونے کے سماج کو اپنا منتہائے مقصود قرار دیا ہے اس کا تصور جمہوریت سے ہی پیدا ہوا ہے کیونکہ نہ تو کوئی حقیقی سوشلسٹ سماج غیر جمہوری ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی حقیقی جمہوری سماج سوشلسٹ کے علاوہ کچھ اور بن سکتا ہے۔ جمہوریت کی یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ فرایض اور حقوق کے درمیان یکسانیت نہ بھی سہی مساوات ضرور قایم کر دے۔ پچھلے زمانے میں کسی بھی جماعت کے اکثر افراد کے لیے فقط فرایض ہی ہوا کرتے تھے لیکن حقوق اگر کچھ تھے بھی تو معدودے چند ہی تھے۔ اب تک تمام جماعتوں نے قوم کے بڑے اور غیر رعایت یافتہ یا کم رعایت یافتہ فریقوں پر فرایض تو لاد رکھے تھے۔ مگر ان کے حقوق بہت ہی تھوڑے تھے اس کے خلاف جمہوریت کا آغاز ہی قوم کے عام افراد کے لیے حقوق اور فرایض کے درمیان قیام مساوات کی کوشش سے ہوا ہے۔ یعنی ان حقوق اور فرایض کے درمیان مساوات قایم کرنا ہی جمہوریت کا اصلی جوہر ہے اور اس کا سوشلزم تک پہنچنا امر ناگزیر ہے گویا سوشلسٹ سماج کے قیام کی پہلی شرط یہ ٹھہری کہ سب کے لیے ترقی کے مساوی مواقع بہم پہنچائے جائیں اور یہ تب ہی ممکن ہے جب تعلیم کے دروازے سب پر مساوی طور پر کھلے ہوں۔

ہندستان نے ایک جمہوریہ بننا پسند کیا ہے اور اس مقصد کو آگے لے جانے کے لیے تعلیمی سہولتوں کی توسیع کے لیے موثر اقدام کیے ہیں۔ نتیجتہً دس سال سے بھی کم مدت میں ابتدائی اسکولوں کے بچوں کی تعداد تقریباً ایک کروڑ سے بڑھ کر لگ بھگ دو کروڑ اور سکنڈری اسکولوں نیز اونچی تعلیم کے اداروں میں بھرتی ہونے والوں کی تعداد دگنی ہو گئی ہے۔ اگلے زمانے میں دیہاتی حلقے جن رکاوٹوں یا خامیوں سے دوچار تھے ان کی بھی اصلاح ہو رہی ہے۔ اجتماعی منصوبے اور قومی توسیعی پروگرام بھی ملک کے انتہائی گوشوں تک رسائی حاصل کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے کیونکہ ابتدائی اسکولی عمر کے پچاس فیصدی بچے ابھی اسکولوں سے باہر ہیں۔

ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ ہم جتنی ابتدائی تعلیم کا مناسب اہتمام ابھی نہیں ہو پایا جیسے شہریت کے قلیل ترین فرایض کے انجام دینے کے لیے چودہ برس کی عمر کی ابتدائی تعلیم قلیل ترین تعلیم ہے۔

"جہاں اونچے درجے کی تعلیم کے مواقع کا انحصار کنبے کے وسایل پر ہو۔ وہاں لیڈر شپ کے مواقع بھی زیادہ تر دولت مند طبقے تک ہی محدود رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں پورا پورا اس کا احساس ہے اور ہماری یہ کوشش ہے کہ مفت تعلیم کا دایرہ ان طبقوں تک بھی وسیع کر دیا جائے جو پچھلے دور میں اس عنایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ نیز جبری مفت تعلیم کی مدت بھی زیادہ کر دی جائے مگر ہر درجے کی مفت تعلیم کا صرف انتظام کر دینے سے مساوی تعلیم کے مواقع ہی پیدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اقتصادی

وجوہ کی بنا پر ماں باپ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم کے اسکولوں سے بھی نکالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اس لیے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سوشلسٹ سماج ابتدائی تعلیم کو مفت بنانے کے علاوہ بچوں کی خوراک، کپڑے وغیرہ اور کتابوں کے لیے بھی فیاضانہ امدادی تدبیریں اختیار کرے۔

ہندستان اگرچہ اپنے ناکافی مالی وسایل کے پیش نظر ضروری پیمانے پر فوری امداد بہم پہنچانے کے قابل نہیں ہو سکا۔ مگر جو جماعتیں اور علاقے اب تک اس قسم کی رعایت حاصل نہیں کر سکے تھے انہیں خاص تعلیمی وظیفے دے کر ان کی تعلیمی رکاوٹیں دور کرنے کی طرف اس نے قدم بڑھانا شروع کر دیا ہے۔ اس ضمن میں شیڈولڈ ذاتوں اور شیڈولڈ قبائل اور دوسری پسپت جماعتوں کے لیے وظیفے کی اسکیموں کا نفاذ ایک صحیح سمت میں مناسب قدم ہے اور اس سے ان گروہوں کے طلبا کی تعداد میں بے حد اضافہ ہوا ہے اس کے علاوہ اگر ہم اپنے عوام میں باہمی تعاون کی اسپرٹ پیدا کرنے کے متمنی ہیں تو ہمیں اپنے تعلیمی تصورات اور اسالیب میں تبدیلی کرنی ہوگی۔

ہم معلم کے کام کی اہمیت اور اس کے پیشے کی بلند منزلت کی باتیں تو کرتے ہیں مگر اس کے کام کی جو قیمت ہم نے لگائی ہے وہ ادنا درجے کی رہی ہے۔ معلمین کی بہتر ٹریننگ موجب ترقی بن سکتی ہے مگر یہ تو ظاہر ہی ہے کہ جہاں باطنی قابلیت ہی گھٹیا درجے کی ہو وہاں ٹریننگ کے جیسے کہ چاہیے نتیجے نہیں نکل سکتے۔ اس لیے شعبۂ تعلیم میں بھرتی ہونے والوں کی قابلیت کو بڑھانے کے لیے تنخواہوں کے اسکیلوں میں اضافے کا لحاظ رکھنا نہایت اہم اور ضروری ہوگا۔ یوں تو ہر قسم کی بیروزگاری بری چیز ہے اور سوشلسٹ سماج کا یہ فرض ہے کہ وہ سب کے لیے کام مہیا کرے۔ مگر تعلیم یافتہ طبقے کی بیروزگاری تو دوگونا عذاب ہے کیونکہ اس سے نہ صرف وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جن پر اس کی بیدی چوٹ پڑتی ہے بلکہ ساری قوم ہی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ بے روزگار تعلیم یافتہ طبقہ زبان کے آلے سے کام لے کر دوسرے جاہل لوگوں میں بھی اپنی بے اطمینانی کے جراثیم داخل کر دیتا ہے۔ تاہم کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس نے سوشلسٹ سماج کے قیام کا حلف لے رکھا ہو، اس ملک میں کسی بھی قسم کا تعلیم یافتہ بیروزگار طبقہ موجود ہو۔ اگر ہم چودہ برس کی عمر تک کے تمام بچوں کے لیے صرف ابتدائی تعلیم کا بھی انتظام کر سکیں تو ہمیں اس کے لیے ۲۰ لاکھ زاید معلمین درکار ہوں گے اور نتیجتاً سکنڈری اور یونیورسٹی کے درجے کی تعلیم کے معلمین کی تعداد میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔

سوشلسٹ سماج میں تعلیم کا کام بردباری، مفاہمت اور خیرسگالی کی روح کو نشو و نما دینے کے ساتھ ساتھ ہر ایک فرد بشر کو اس بات کی ضمانت دینا بھی ہے کہ دوسروں کے حقوق پر چھاپا مارے بغیر اپنی استعداد بھر آزادانہ طور پر ترقی کر سکے۔ اور ہندستان اپنے عوام کے لیے سوشلسٹ سماج کے نتہائے مقصود کے حصول کے لیے جو کوشش کر رہا ہے اس کی تہ میں یہی جذبہ کارفرما ہے

غزل

مسکرا کر جو برق لہرائی | یاد پھر آشیاں کی یاد آئی
عید کا چاند چاک داماں ہے | ساری دنیا بنی تماشائی
اس قدر بڑھ گئی پریشانی | موت خود زندگی سے شرمائی
یہ بھی ہوتا ہے کیا محبت میں | دل کو بھانے لگی ہے تنہائی
تم نے دیکھا ہوا یہی محسوس | کوئی شے دل میں جیسے لہرائی
شغل کیا ہوگا دل بہلنے کا | یاد پھر ان کی یاد بار آئی
تم نے کیا مسکرا کے دیکھ لیا | چاند لینے لگا ہے انگڑائی

خورشید اعجاز

عام طور پر انگریزی مورخوں نے برطانوی راج کے خلاف ہندستانی سپاہیوں کی بغاوت کو جسے ہندستان کے قوم پرست بجا طور پر پہلی جنگ آزادی کہتے ہیں محض چربی لگے ہوئے کارتوسوں کے رایج کرنے کے خلاف مذہبی تعصب اور بعض معزول شدہ دیسی حکمرانوں اور ان کے حمایتیوں کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ حقیقت میں یہ ایسی عام بغاوت تھی جس کی حمایت ملک کے تمام لوگ غدر مخذ اور کسی کی تحریک کے بغیر کر رہے تھے۔ لیکن کم سے کم ایک انگریز مورخ کرنل مالیسن نے بڑے موثر پیرایے میں باقی برطانوی مورخوں کے اوپر کے نظریے کو جھوٹا قرار دیا ہے۔ اس نے اپنی یادگاری کتاب "انڈین میوٹنی آف ۱۸۵۷ء" میں لکھا ہے کہ "چربی والے کارتوس اگر حقیقت میں فوج کو جاری کیے گئے تھے تو وہ فوجیوں کی بہت بڑی تعداد کو ہرگز ہرگز جاری نہیں کیے گئے تھے یقیناً کوئی نہ کوئی ایسی خفیہ محرک طاقت لازمی طور پر موجود رہی ہوگی جس نے ایک بغیر جاری شدہ کارتوس کو ایک ایسی خوفناک شکایت بنا دیا تھا جس کے باعث وہ تمام لوگ جنہوں نے خود اور جن کے باپ دادا تک سب ہی نے ہندستان میں برطانوی سلطنت کے قیام میں اہم حصہ لیا تھا اس طرح بغاوت پر آمادہ ہوگئے"۔ اسی کتاب میں کرنل مالیسن پھر لکھتے ہیں "حالات نے صحیح پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو لوگ ایک سو برس سے ہمارے نہایت سچے اور بہترین وفادار خدمت گذار چلے آتے تھے۔ ان کے دلوں میں ذاتی نہیں بلکہ قومی نفرت اور تعصب پیدا کرنے کے لیے بیرونی اسباب کارفرما تھے"۔ اس بغاوت کے تمام مشہور لیڈروں میں سے نانا صاحب کے سوائے کوئی معزول شدہ دیسی راجا نہیں تھا جھانسی کی رانی لکشمی تو اس جنگ میں بہت دیر بعد شامل ہوئیں۔ بلکہ اس کے برعکس قریب قریب تمام دیسی راجے ہمارا جے برطانوی حکومت کے ساتھی رہے۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ چند ایک افراد کی بے اطمینانی اور ناراضگی ہی سپاہی بغاوت کی اصل وجہ تھی بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری تھیں ہندستان میں حکومت کرنے والے اور کاروبار کرنے والے انگریزوں کی توہین آمیز بدتمیزی اور نسلی برتری کا یقینی ردعمل برطانوی حکومت کے خلاف سب سے اطمینانی اور نفرت پیدا کرنے اور اس کو ہوا دینے کا باعث تھا اخبار ٹائمز کے ایک جنگی نامہ نگار مسٹر ولیم ہاورڈ رسل نے انگریزوں کے نسلی گھمنڈ کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اور اسے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی وجہ قرار دیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ بغاوت صرف چند غیر مطمئن افراد کے خبط کی بجائے قوم کی خواہش و تمنا کی مظہر تھی۔ اس لیے ہماری قومی حکومت نے برطانوی راج کے خلاف اس پہلی قومی جنگ آزادی کی تاریخ، ۱۹۵۷ء میں اس کی سو سالہ سالگرہ پر شایع کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے وہ نہایت مناسب اور موزوں ہے۔

کئی برس گذر چکے ہیں میں نے ایک کتاب "دنیا کے گوریلا لیڈر" پڑھی تھی۔ اس کتاب میں تانتیا توپی پر ایک باب شامل ہے جس میں مصنف نے تانتیا توپی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ کرنل لیسن نے بھی تانتیا توپی کے بارے میں لکھا ہے "تانتیا توپی حیرت انگیز طور پر جنگ باز تھا۔ اس کے تعاقب میں بریگیڈیر سمرسٹ نے دو سو تین میل کی مسافت نو روز میں اور پھر ستر میل کا فاصلہ اڑتالیس گھنٹوں میں کرنل ہومز نے ریگستانی صحرا میں ۵۴ میل کا سفر چوبیس گھنٹوں سے قدرے زیادہ وقت میں اور بریگیڈیر ہونر

ارن چندر گوہا

نے ایک سو سینتالیس میل کا سفر چار روز میں طے کیا۔ لیکن وہ پھر سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کر صاف بچ کر نکل گیا حالانکہ جس جنگل میں وہ چھپا ہوا تھا اس کے چپے چپے پر دشمن کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور سخت کڑا پہرا تھا۔ آخرکار وہ ایک معتمد دوست کی غداری کا شکار ہو گیا اور پکڑا گیا۔"

اس مختصر سے مضمون میں نانا تیا کی زندگی کی کہانی بیان کرنا ممکن نہیں ہے نہ ہی یہ میرا مقصد ہے بلکہ آج تو ہمیں اپنے قومی شہید کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے جس کی فوجی قابلیت کا خود دشمنوں اور غیر ملکی مورخوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔"

نانا تیا کا جنم ۱۸۱۴ء میں مہاراشٹر کے ایک برہمن خاندان میں ہوا تھا۔ ان کے پتا آخری پیشوا باجی راؤ ثانی کے گھرانے میں شامل تھے۔ ۱۸۱۷ء میں باجی راؤ ثانی کو انگریزوں نے شکست دی۔ اس کی حکومت ختم ہو گئی اور وہ ہندستان کی برطانوی حکومت کا پنشن خوار بن کر رہ گیا۔ اس کی ہر طرح سے ہتک کی جاتی رہی۔ نانا تیا اس طرح قومی بے عزتی کی فضا میں جوان ہوا۔ باجی راؤ ثانی کے ہمراہ نانا تیا کے کنبے کے لوگ بھی کانپور سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع بٹھور میں جا بسے۔ نانا تیا پیشوا باجی راؤ ثانی کے متبنے نانا صاحب کا مصاحب بن گیا۔ ۱۸۵۱ء میں باجی راؤ فوت ہو گئے۔ انگریزوں نے نانا صاحب کو اس کے باپ کی سالانہ پنشن دینا بھی بند کر دیا جس سے تلخی بڑھ گئی۔ اور قومی منافرت کا جذبہ زوروں پر ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ نانا تیا نے کچھ عرصے تک بنگال توپ خانے میں کام کیا تھا اور اسی لیے وہ توپی کہا جاتا تھا لیکن وہ زیادہ عرصے تک برطانوی فوج میں نہیں رہ سکا۔ اور واپس نانا صاحب کی مصاحبی میں بٹھور چلا آیا۔

ان ہی دنوں ہندستان بھر میں بغاوت پیدا کرنے کے لیے زمین تیار کی جا رہی تھی۔ کافی عرصے تک مسلم مولوی ہندو براہمن طبقہ امرا کی خواتین اور عام طبقے کے افراد سازشیں کرتے رہے اور قومی منافرت کا پہلی بار کھلم کھلا اظہار ۲۹ مارچ کو کلکتہ کے قریب بارک پور میں ہوا۔ جب بنگال رجمنٹ کے سپاہی منگل پانڈے نے کھلم کھلا ہر ایک سپاہی کو جوش دلانا شروع کر دیا کہ "جو بھی یورپین نظر آئے اسے گولی مار دو۔" ایک انگریز افسر منگل پانڈے کو گرفتار کرنے آیا تو لڑائی ہو پڑی۔ جس میں وہ افسر زخمی ہو گیا۔ منگل پانڈے پر مقدمہ چلا اور اس کو پھانسی دے دی گئی۔ اس چھوٹے سے واقعے سے سارے ملک میں کئی طرح کی افواہیں پھیل گئیں۔ ماہ مئی میں بنگال رجمنٹ کی سات کمپنیاں جو بارک پور میں تھیں بلک پریڈ کرانے کے بعد توڑ دی گئیں۔ ان سب کو بڑی بے عزتی کے ساتھ نکال دیا گیا۔ اور اس طرح حکومت کے سخت مخالف باغیوں سازشیوں کو نہایت نازک وقت پر ملک بھر میں کھلا چھوڑ دیا گیا۔"

حقیقی بغاوت کا آغاز مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ سے ہوا ہندستانی رجمنٹیں باغی ہو گئیں۔ اور انہوں نے دلی کی جانب کوچ کر دیا۔ اس کے بعد کانپور کی رجمنٹیں بھی باغی ہو گئیں۔ نانا صاحب اور نانا تیا توپی باغی سپاہیوں سے مل گئے۔ بغاوت کی باقی داستان نانا صاحب اور بعد ازاں لکشمی بائی رانی جھانسی کے ساتھ وابستہ ہے لیکن گوریلا لیڈر کے طور پر نانا تیا توپی کے اصل جوہر اس وقت کھلے جب قومی بغاوت کی کمر عملی طور پر ٹوٹ چکی تھی مصیبت نازل ہونے پر نانا تیا کی فطری قابلیت زیادہ درخشاں ہوا تھی۔ ۱۸۵۸ء میں سر ہیو روز کو کالپی میں متحدہ قومی فوجوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ بڑی خوں ریز اور فیصلہ کن جنگ تھی۔ سر ہیو روز کی فوج بے حد تھکی ہوئی تھی۔ اور بیدل ہو چکی تھی۔ اس کی حالت بہت مایوس کن تھی تاہم اسے تھوڑی سی کمک مل گئی۔ اور لڑائی کا پانسہ ہندستان کی آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے خلاف پلٹ گیا۔۔۔ سپاہیوں میں ابتری اور مایوسی پھیل گئی اس کے باوجود

رانی جھانسی اور تانتیا نے ہمت نہ ہاری اور آخری کوشش کی۔ تانتیا نے زبردست جوابی حملہ کر دیا۔ وہ اپنی بکھری ہوئی فوجوں سے بہت آگے بڑھتا ہوا دشمن کی فوجوں میں گھس گیا اس نے برطانوی حکومت کے وفادار سیندھیا کے ہیڈ کوارٹر گوالیار کی فوجوں پر کامیاب تابڑ توڑ حملہ کیا۔ سیندھیا خود اپنی فوجوں کی رہنمائی کے لیے میدان میں نکل آیا لیکن اس کے سپاہی تانتیا سے جا ملے خود سیندھیا آگرہ بھاگ گیا لیکن تانتیا بھی گوالیار کے قلعے میں بہت دیر تک قابض نہ رہ سکا۔

تانتیا دکن کی جانب نکل جانا چاہتا تھا؛ جہاں نظام کی وفاداری انگریزی حکومت کی یقینی پشت پناہ بنی ہوئی تھی۔ تانتیا کی وہاں موجودگی یقیناً سپاہیوں کو قوم پرست فوجوں سے مل جانے پر آمادہ کر لیتی لیکن تانتیا کو ادھر جانے سے روک لیا گیا۔

سر روز نے قلعہ گوالیار پر طوفانی حملہ کیا اور اس پر قابض ہو گیا۔ رانی جھانسی انگریزوں سے دست بدست لڑائی کرتی ہوئی شہید ہو گئی۔ لیکن تانتیا بچ کر نکل گیا۔ یہیں سے گوریلا لیڈر کے طور پر اس کی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس وقت تک بغاوت کو عملی طور پر دبا لیا گیا تھا۔ اور انگریزوں نے ہندستان کو پھر سے فتح کر لیا تھا۔ کانپور دلی۔ لکھنؤ۔ جھانسی۔ بریلی اور قوم پرست فوجوں کے سب ہی دیگر قلعے پھر فتح ہو چکے تھے۔ بہادر شاہ شہنشاہ دلی کو قید کر کے عمر بھر کے لیے جلا وطن کر دیا تھا۔

کئی برطانوی رجمنٹیں تانتیا کے پیچھے لگا دی گئیں اور اس کے گرد گھیرا ڈال لیا گیا تھا۔ جو روز بروز تنگ کیا جا رہا تھا لیکن اس عظیم الشان شخص کی غیر معمولی قابلیت کا ہی کارنامہ تھا کہ تو پخانے سے زیادہ عرصے تک اس نے برطانوی فوجوں کو اپنے نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ اور ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ تانتیا پچھم کی جانب پسپا ہو گیا، لیکن بریگیڈیر جنرل سر می سرگون نے اس کا تعاقب کر رہا تھا

چوڑے کے قریب ایک جھڑپ لینے کے بعد وہ راجستھان میں جے پور کی جانب بھاگ گیا۔ جے پور کا راجا بھی انگریز حکومت کا حامی تھا اس کا ارادہ جے پور پر قبضہ کرنے کا تھا لیکن ایک انگریز جنرل رابرٹس نے اس کو ناکام بنا دیا تب وہ دکن کی جانب ٹونک کو چلا گیا۔ اس نے ٹونک کا شہر لوٹ لیا بہت سا اسلحہ اور قیمتی اشیا اس کے ہات لگیں وہ اودے پور کی جانب بڑھ رہا تھا کہ سانگانیر کے اور بناس کے مقام پر اگست ۱۸۵۸ء کو اس کا رابرٹس سے مقابلہ ہوا اس کے بعد وہ بوندی کی طرف جا رہا تھا۔ جب بریگیڈیر پارکس نے اس کا تعاقب کیا اور یہ تعاقب جاری رہا اس وقت ہندستان کی ساری کی ساری انگریزی فوج صرف ایک ہی مقصد کے حصوں کے لیے ماری ماری پھر رہی تھی وہ تانتیا کو گرفتار کرنا چاہتی تھی۔

جن علاقوں کو آج کل راجستھان، مدھیہ پردیش مدھیہ بھارت۔ وندھیا پردیش اور گجرات کہا جاتا ہے ان سب میں تانتیا کا تعاقب کیا گیا کئی جگہ حملے اور جوابی حملے ہوے۔ اس علاقے کا رقبہ ایک لاک ستر ہزار مربع میل کے قریب ہو گا۔ مختلف سمتوں سے تمام انگریزی فوجیں تانتیا کو گھیرنے کے لیے بڑھ رہی تھیں لیکن وہ ان سب پر دھول ڈال کر صاف نکل گیا۔ کئی ماہ تک اس کا پتا نہ مل سکا اس حقیقی گوریلا لیڈر نے اپنے وہ جوہر دکھاے کہ دشمن بھی اس کے معترف ہو گئے وہ جہاں بھی جاتا تھا لوگوں میں جوش بھر دیتا تھا لوگ سے آنکھوں پر بٹھاتے پناہ دیتے اور رضاکارانہ طور پر بخشی ہر ممکن امداد اور تعاون دیتے تھے۔

ایک سے دوسرے علاقے کو میلوں دوری کا فاصلہ طے کرتے ہوے بھی اس کی فوج کا جوش اور حوصلہ برابر قائم رہا۔ ان دنوں اس کے دو قریبی ساتھی تھے ایک مان سنگھ نام کا راجپوت سردار اور دوسرا شہزادہ فیروز شاہ اس نے بڑودہ پر دلیرانہ حملہ کیا جنرل مائیکل نے اس کے تعاقب میں دو سو نوے میل کا فاصلہ نو دن میں طے کیا

تاکہ یہ وہ پر اس کا حملہ ناکام بنا سکے۔ اس نے یکم دسمبر کو تانتیا کو چھوٹا اودے پور میں شکست دی اسے بنسواڑا کے جنگلوں میں پناہ لینی پڑی اس کے گرد مکمل محاصرا کرلیا گیا اس کے باوجود وہ اس گھیرے کو توڑ کر نکل گیا۔ اور اس نے اودے پور جانے کی کوشش کی لیکن یہ بھی انگریز جنرل راک نے ناکام بنا دی۔ تانتیا نے جنگل میں پناہ لی۔ اور جنرل راک کو پریشان کردیا۔ اس کے بعد اسے دیواس اور سیکر میں شکستیں ہوئیں وہ پھر جنگل میں پناہ گزیں ہوا۔ اس کا قدیم ساتھی راجپوت سردار مان سنگھ اس کے ساتھ تھا انگریزی حکومت نے تانتیا کے سر کے لیے انعام مقرر کردیا تھا۔ مان سنگھ کے دل میں اس وقت اس جنگ کی مایوس کن حالت کو محسوس کرکے انگریز سے معافی حاصل کرنے کی خواہش اٹھی۔ مالیسن لکھتا ہے کہ مان سنگھ کو ذاتی لالچ اور فائدوں کے وعدوں کے ذریعے ترغیب دی گئی اور اس نے اپنے ساتھی سے غداری کرتے ہوئے اس کی خفیہ پناہ گاہ کا پتا دیدیا۔ اپریل کی رات کو تانتیا کو سوتے ہوئے اچانک گرفتار کرلیا گیا۔ فوجی عدالت میں اس کے خلاف مقدما چلا اور ۱۸ اپریل ۱۸۵۸ء کو اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

اس نے اپنے مقدمے میں بہت دلیرانا بیان دیا۔ اور جو کچھ اس نے کیا تھا اس کا اقبال کیا۔ وہ نہ تو سرکش سپاہی تھا نہ ہی وہ باغی تھا۔ وہ ایک دیش بھگت تھا۔ گرفتاری کے بعد وہ صرف ایک جنگی قیدی تھا" دنیا کے گوریلا لیڈر" نامی کتاب میں لکھا ہے کہ ہندستانی فوجوں میں تانتیا سب سے زیادہ مدبر لیڈر تھا۔ اگر ان جیسے چند لیڈر اور ہوتے تو ہندستان کو انگریزوں کے ہاتھ سے چھین لیا جاتا۔"

تانتیا کو پھانسی دینا قانونی طور پر کس طرح جائز تھا یہ امر انتہائی مشکوک ہے خود انگریز حکام نے بھی اس بارے میں اپنے شبہات کا اظہار کیا ہے کویل مالیسن نے بھی لکھا کہ تانتیا اپنی قوم کا ہیرو تھا اس کو پھانسی دینا جائز نہ تھا وہ آج بھی امر ہے۔ سارے ہندستان میں اس کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا ہے" وہ قوم کی خاطر آج ۱۸ اپریل کے دن غیر ملکی فاتحوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ ساری قوم اس قومی بہادر کو آج خراج عقیدت پیش کرے گی۔

غمِ معتبر

اپنے جو غم اغم معتبر بن گئے
سب چراغ سر رہگذر بن گئے
یوں بھی محسوس اکثر ہوا ہے مجھے
جیسے جلوے سمٹ کر نظر بن گئے
چند تنکے ہی تھے جب نہ تھا آشیاں
مل گئے جب تو برق و شرر بن گئے
شام غم جو ستارے تھے وجہ سکوں
رات ڈھلتے ہی سب نیشتر بن گئے
باغبانوں نے پھونکا کچھ ایسا فسوں
پھول کھلتے ہی داغ جگر بن گئے
ہو چکا اب علاج غم زندگی
جتنے قاتل تھے سب چارہ گر بن گئے
پھیل کر جانے کیا بنتے قطرۂ اشک غم
جو سمٹ کر بھی شمس و قمر بن گئے
جب چراغوں کے دل بھی دھڑکنے لگے
خود اندھیرے نکھر کر سحر بن گئے
منزلوں نے جہاں بڑھ کے چومے قدم
راہزن بھی وہاں راہبر بن گئے
ایسی راتیں بھی گذری ہیں ارشد کہ جب
جام و ساغر فروغ سحر بن گئے

ارشد صدیقی

تاج محل یا پاگل خانا

سکندر سلیم

رات کے دو بجے آگرہ اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں زندگی سے فرار کر آیا ہوں مگر وہی لیکا و تنہا زندگی میرے پیچھے پرانے قرض خواہوں کی طرح دوڑتی چلی آئی۔ پلیٹ فارم پر قدم رکھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی میرے پیچھے کھڑے ہو کر گھور گھور کر مجھے دیکھ رہا ہے میں نے پلٹ کر دیکھا وہی تھی ـــــ وہی زندگی جس سے میں فرار کر آیا تھا۔ وہ کھڑی ہانپ رہی تھی ـــــ "تم!! تم یہاں کیوں چلی آئی ہو۔ جاؤ چلی جاؤ خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔" مگر وہ کھڑی ہنستی رہی اور پھر بڑھ کر مجھے اس بری طرح لپٹا لیا کہ اس کا وجود ہی ختم ہو گیا۔ میں قریب کے ایک بجلی کے کھمبے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ پلیٹ فارم خالی ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کا بوڑھا چوکیدار ٹمٹماتی قندیل لیے ہر ڈبے میں جھانک جھانک کر دیکھ رہا تھا کہیں چور اچکا تو دبکا نہیں پڑا ہے جب وہ میرے قریب پہنچا تو کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو تم ـــــ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"اوہ ـــــ اوہ معاف فرمایئے" وہ مجھے تعجب سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسٹیشن سے باہر آ گیا ـــــ سنسان سڑکیں تھیں اور میں تنہا تھا ـــــ بے مقصد پاگلوں کی طرح بھاگ آیا تھا اب جاؤں تو کہاں جاؤں! اتنے بڑے شہر میں نہ کوئی مونس و غمخوار ہے اور نہ ہی کوئی دوست۔ اسٹیشن کے دروازے میں بڑی تاریکی تھی نہ جانے کدھر کس سمت میں ـــــ اور میرے قدم اس وقت رک گئے جب میں نرم نرم گھاس پر چل رہا تھا۔ نہ جانے کب اور کیسے میرے قدموں سے سڑک چھوٹ گئی اور میں یہاں چلا آیا ـــ سامنے نظر پڑتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ سامنے تاج محل کھڑا جگمگا رہا تھا ـــــ شاہجہاں کے خوابوں کی تعبیر ـــــ ہندستان کے ماتھے کا خوب صورت ٹیکا۔ ایک شہنشاہ نے اپنی محبت کا کھلے بندوں مظاہرہ کیا تھا اور ایک میں ہوں کہ اپنی محبت کو سینے میں دبائے چلا آ رہا ہوں۔ مبادا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ مگر یہ تاج محل ـــــ تاج محل کو گر جانا چاہیے یہ تاج محل نہیں بلکہ ایک شہنشاہ کی محبت کا ڈنکا ہے۔ اس کی ایک ایک اینٹ شاہجہاں کے خلوت شاہانہ کے رازہائے سربستہ کو عیاں کر رہی ہے۔ یہ وہی تاج محل ہے جو حقیقی ہوا اور جو لہو کی بنیاد پر تعمیر ہوا۔ لیکن پھر بھی اس کے ماتھے پر شاہجہاں کا نام جگمگا رہا ہے۔ وہ مزدور مر گیا جس نے اس کی بنیاد رکھی تھی لیکن وہ شاہجہاں آج بھی زندہ ہے جس کے خوابوں کی یہ تعبیر ہے ـــــ یہ تاج محل آج تک جوں کا توں کھڑا ہے۔ یہاں کے در و دیوار مجھے ایک کہانی سناتے ہیں۔ عیش و عشرت کی کہانی، شان و شوکت کی کہانی۔ ایسی کہانی جس کو سننے کے بعد میرے سینے میں بھی حسرتیں تڑپنے لگتی ہیں کہ اپنی ممتاز محل کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ میں جب یہ سنتا ہوں کہ شاہجہاں زندہ رہنے کے لیے کھاتا تھا، سانس لیتا تھا۔ چلتا پھرتا تھا اپنی محبوبہ سے محبت کرتا تھا اور اپنی محبوبہ کی گھنی زلفوں کی چھاؤں میں سوچا کرتا تھا تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ ـــــ کہ اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو میں بھی شاہجہاں ہوں۔ مجھے بھی ایک تاج محل بنانا چاہیے۔ مگر نہ جانے کیوں یہ خیال میرے دماغ میں آتے ہی میرے منھ پر ایک انجانا طمانچہ پڑ جاتا ہے اور میں جھکا کر گال سہلاتے رہ جاتا ہوں۔ میری ممتاز محل اپنی بیٹھی ہوئی، تھرتھراتی ہوئی انگلیاں چھید لیتی ہے ـــــ تو پھر یہ تاج محل کیسے کھڑا ہو گیا ـــــ

مجھے تعجب ہونے لگا۔ میں آگے بڑھتا گیا۔ آگے ہی آگے جیسے میں بڑھ کر ایک ہی جھٹکے سے ہزاروں سال سے کھڑی ہوئی اس عمارت کو گرا دوں گا اور رات کی سنسان تاریکی میں سوتا ہوا ہندستان جاگ اٹھے گا۔ پھر —— پھر کسی نے میری گردن پکڑ لی ——

"اوئے۔ اِدر کدر گھسا آتا ہے رات کے وکت"

میری گردن ایک لحیم شحیم چھ فٹ کے غان کے ہات میں تھی جس کے دوسرے ہات میں ایک موٹا سا ڈنڈا بھی تھا۔

"ارے بھائی غان صاحب" میں نے التجا کی "پہلے میری گردن تو چھوڑ دو"

"نہیں چھوڑے گا" غان نے کہا "ام تم کو مرگی کے ماپک گردن توڑ کر مار دے گا۔ تم چور معلوم پڑتا ہے سالا۔"

"نہیں غان صاحب میں چور نہیں ——"

"تو پھر رات کے وکت اِدر کاے کو آیا سچ بتا ——"

"غان صاحب بات دراصل یہ ہے کہ مجھے یہ تاج محل گرانا ہے ——"

"تاج محل گراتا ہے!" اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ غان کے کئی ڈنڈے مجھ پر برس پڑے اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ غان نہیں بلکہ خود شاہجہاں مجھے مار رہا ہے۔ سیکڑوں سال پیچھے کا انسان مار رہا ہے۔ جب میں ہوش میں آیا تو اپنے آپ کو دواخانے میں پایا۔ ایک پولیس انسپکٹر اپنی ڈائری لیے میرے سامنے کھڑا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"شاہجہاں"

"کیا کہا ——" انسپکٹر نے چونک کر دریافت کیا۔

"جی ہاں ٹھیک تو کہہ رہا ہوں"

"باپ کا نام!"

"اورنگ زیب"

انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"کام کیا کرتے ہو؟"

"شہنشاہیت"

"خوب!" انسپکٹر نے ہنستے ہوئے کہا "تو تم..."

"ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔ میں شہنشاہ ہوں"

انسپکٹر نے ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے بیچارے کا دماغ چل گیا ہے"

"آپ کو غلط فہمی ہے انسپکٹر صاحب! میں پاگل نہیں ہوں"

یہ سنکر پولیس انسپکٹر مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا پھر وہ ڈاکٹر کے کان میں کچھ کہنے لگا۔ ڈاکٹر نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اس کے بعد مجھے پاگل خانے بھجوا دیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں لیکن میں پاگل نہیں تھا ——۔

ایک عرصہ گذرنے کے بعد جب میں نے داروغہ پاگل خانہ کو اپنی دردبھری کہانی سنائی تو اس نے میری رہائی کے لیے ڈاکٹر سے سفارش کی۔ مگر ڈاکٹر نے ایک نہ سنی اور اپنے داروغہ کی باتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ میری طرف سے غیر مطمئن رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ بعض پاگل اچھے خاصے صحیح دماغ دکھائی دیتے ہیں مگر پاگل خانے سے چھوٹتے ہی "مٹھی میں موٹر بس" والا دھندا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے افسر کی باتوں پر داروغہ بھی غور کرنے لگا۔ جب بھی وہ میرے پاس آتا تو میری حرکات و سکنات کو بڑے غور سے دیکھنے لگتا کہ کہیں میری طرز روش میں ہلکی سی پاگل پن کی آمیزش تو نہیں۔ اس کی تاڑنے والی نظریں مجھے گھورتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ ایک دن میں نے ان نظروں کے خلاف احتجاج کیا تو اس نے مجھ سے معافی مانگتے ہوئے کہا کہ پاگل خانے کے متعلقین کو ان ہی نظروں سے دیکھنا پڑتا ہے اسے میرے اچھے ہونے پر یقین ضرور تھا۔ مگر پھر بھی ——

مجھے داروغہ کی زبانی ایک پاگل کا واقعہ معلوم ہوا۔ جس کو ڈاکٹروں نے اچھے ہونے کا سرٹیفکٹ دیکر پاگل خانے سے چھوڑ دیا تھا۔ مگر پاگل صاحب جوں ہی پاگل خانے سے چھوٹے تو سیدھے سڑک پر جا پہنچے اور لگے لوگوں کو سائیڈ بنانے جب پولیس والے [illegible] دو چار ڈنڈے برسے

تو چپ چاپ وہاں سے کھسک گئے اور پھر دو روز کے بعد نمودار ہو کر سڑک کے فٹ پاتھ پر دوائیاں بیچنے لگے۔ نہ جانے کہاں سے —— ان کے ہاتھ جلاب کی گولیاں لگ گئیں تھیں جن کو وہ ہر مرض کی مجرب دوا کہہ کر بیچتے رہے اور جب ہر مرض کے مریض کو جلاب ہونے لگے تو حکیم صاحب دھر لیے گئے۔ اور پھر اپنی پرانی جگہ بھیج دیے گئے۔

میں نے اس پاگل سے ملاقات بھی کی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے زبردستی پاگل خانے میں ڈال دیا گیا ہے لیکن جب بھی ڈاکٹر اسے رہا کرنے اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو وہ یہی کہتا کہ "دیکھو ڈاکٹر صاحب تمہاری جیب میں موٹر بس چل رہی ہے ——"

کچھ عرصا گذرنے کے بعد میں نے داروغا کے ساتھ ایک رسٹورنٹ میں چائے پی۔ وہ بڑا اچھا آدمی تھا —— اسکی میری بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ میری باتیں بڑی مزیدار ہوتی ہیں خصوصاً میری محبت بھری کہانی کو وہ بڑے غور سے سنتا جو میرے ساتھ پیچھے سے آکر اچلی آئی تھی —— زرینا نہ جانے کہاں تھی مگر اس کی محبت کی ایک کہانی میرے پاس رہ گئی ہے۔ خاص طور پر کہانی کا وہ ٹکڑا تو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جبکہ زرینا کے باپ نے مجھے زرینا سے محبت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اور پھر مار مار کر میرا بھرکس نکال دیا تھا۔ غریب بے زبان زرینا کو ایک دور دراز مقام پر لے جا کر نہ جانے کس سے شادی کر دی تھی —— داروغا کو میری کہانی سنکر بہت افسوس ہوا تھا۔ اور وہ اب تک یہی سمجھ رہا ہے کہ میں محبت میں پاگل ہو گیا تھا۔ مگر اس غریب کو کیا معلوم کہ میں پاگل نہیں بلکہ ایک فلسفی کی طرح محبت کا تجزیہ کر رہا تھا۔ اور تاج محل کو اس لیے گرانے پر آمادہ تھا کہ میری محبت تڑپتی تھی۔ جس کی زندہ لاش کو میں کاندھوں پر اٹھائے پھر رہا ہوں۔ مگر —— باوجود ہزار تلاش اس دھرتی کا ایک انچ بھر ٹکڑا بھی مجھے اپنے "تاج محل" کی تعمیر کے لیے نہیں مل سکتا۔ اس لیے میں نے اپنے دل میں ہی اپنی زرینا کا "تاج محل" کھڑا کر لیا تھا جس کے مینار اس مجسم تاج محل کے میناروں سے بھی بلند تھے۔ میرے دل کے اس شاندار تاج محل کے آگے یہ مجسم تاج محل کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے میں اسے گرا دینا چاہتا تھا لیکن مجھے پاگل سمجھ کر پاگل خانا بھجوا دیا گیا۔ پاگلوں کی دنیا میں صرف داروغا کی ہی واحد ہستی میری مونس و غمخوار تھی۔

داروغا نے ایک دن اپنے گھر میری دعوت کی —— باوجود میرے سخت انکار کے اس نے مجکو اپنی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کر ہی لیا —— جس وقت میں اس کے گھر پہنچا تو وہ میرا منتظر تھا —— اس کا گھر مجھے شان و شوکت کا مرقع تو نظر نہیں آیا۔ مگر ٹوٹا پھوٹا بھی نہیں تھا۔ میرے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد اس نے اپنی بیوی کو آواز دی اور مجھ سے کہا "اپنی بھابی سے ملو" اور جب میری بھابی میرے سامنے آئی تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اگرا اسٹیشن پر مجھ سے لپٹ کر مجھ میں جذب ہو جانے والی زندگی میرے جسم سے نکل کر سامنے کھڑی ہو گئی ہو اور مجھ سے کہہ رہی ہو ——

"تم مجھ سے فرار کر کے بھاگ نہیں سکتے ہو ——
ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

میں —— میں نے کیا کہا اور کیا کر گیا مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا صرف اتنا معلوم تھا کہ داروغا نے اپنے پاگلوں کو مارنے والے کوڑے سے مجھے بے انتہا پیٹا تھا اور جب میں بیہوش ہو کر گر پڑا تو مجھے دوا خانا پہنچا دیا گیا اور جب مجھے ہوش آیا تو میرے سامنے ڈاکٹر کھڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے پھر پاگل خانا بھیج دیا گیا —— بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میں نے داروغا کی بیوی کو "زرینا" کہہ کر گلے لگا لیا تھا اور اس کو چوم چوم لیا تھا مگر وہ زرینا ہی تو تھی —— وہی زرینا جس کی معطر گھنی زلفوں کی چھاؤں میں، میں سوچا کرتا تھا —— وہ مجھے اپنے "مکان

میں اپنے شوہر کے دوست کی حیثیت سے دیکھ کر چونک پڑی تھی ——— اس کی خوب صورت آنکھوں کے پیالے چھلک گئے تھے ——— وہ زرینا ہی تو تھی! میری زرینا جس کے لیے میں تاج محل بنانے چلا تھا ———
مگر یہ دارو غائے تاج محل کا وہی خان رکھوالا جس نے دوسری مرتبہ پٹ کر بے ہوش کر ڈالا تھا۔ اب میں پھر دوسری مرتبہ پاگل ہو گیا ہوں۔ ———
اب میں تاج محل نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ میرے اپنے دل میں نبلے ہوئے تاج محل پر بھی ایٹم بم گرائے جاتے ہیں۔

غزل

ظفر حسین ظفر (لکھنوی)

یں موسیٰ بھلی معلوم کیا ہو داستاں ہم کو
کہاں حسن بیاں وہ۔ کیا ملے لطف زباں ہم کو
غلط انداز نظریں بھی نہ ڈالیں پڑ گئے آگے
کہ سمجھا قافلے والوں نے گرد کارواں ہم کو
سحر ہونے تو دو پوچھو یہ منظر ہے سحر تک ہے
نہ ہونگے شمع و پروانے نہ پاؤ گے یہاں ہم کو
سمجھ میں آگیا بعد اسیری اتنے پلٹ کے
کہ رخصت کرنے آیا آج در تک باغباں ہم کو
بلا کی ناتوانی تھی۔ مگر چاہا کہ مل جائیں
نظر آتی رہی جب تک کہ گرد کارواں ہم کو
قیامت میں ہمارے واسطے تازہ قیامت ہے
وہ کہتے ہیں سنا دو عمر بھر کی داستاں ہم کو
بھیانک رات۔ وہ صحرا کا سناٹا وہ تنہائی
بتایا ٹوٹتے تاروں نے منزل کا نشاں ہم کو
فنا ہو کر حباب آب رواں میں جب ہوا شامل
ہوا ثابت ملے گی یوں ہی عمر جاوداں ہم کو
ظفر کیا کیا مناظر عالم رویا میں دکھلائے
ملی قدرت کی جانب سے عجب طرح رواں ہم کو

رباعیاں

ہر گردش دوراں پہ نظر رکھتا ہوں
ہر زیست کے عنواں پہ نظر رکھتا ہوں
ماحول کے بگڑے ہوئے تیور کی قسم
بدلے ہوئے انساں پہ نظر رکھتا ہوں

دل کو مرے آلام شبانہ دیدو
ہر درد و مصایب کا فسانہ دیدو
فطرت ہے مری غم سے نباہے رکھنا
لاو مجھے آزار زمانہ دیدو

سوتے ہوئے لوگوں کو جگا سکتا ہوں
آلام زمانے کے مٹا سکتا ہوں
میں شاعر فطرت ہوں زمانے کی قسم
تدبیر سے تقدیر بنا سکتا ہوں

ماجد ادیب بریلوی

دنیا کی دوسری اقوام کی طرح آج ہندستان بھی دنیا میں قیام امن سے وابستہ ہے اس لیے اسے بھی صحت کی برقراری اور ترقی کی اشد ضرورت ہے اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے امن سے صحت کا کیا تعلق ہے اور بغیر صحت کے عالمی امن کیوں نا ممکن ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے آپ چند منٹ کے واسطے اسی ڈھنگ سے سوچیں جس طریقے سے میں سوچتا ہوں۔

تکمیل کا نام صحت ہے صرف بیماری اور کمزوری کے فقدان کا نام صحت نہیں ہے۔ اس زمانے کی جدید سائینی تحقیقات سے بھی یہی ثابت ہوا ہے کہ جسم اور دل و دماغ جدا جدا کام نہیں کر سکتے۔ وہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ نہرو نے بھی یہی نظریہ پیش کیا تھا کہ اگر ہمارا دماغ صحت مند نہیں ہے تو ہماری جسمانی صحت بھی پارہ پارہ ہو جائے گی اس لیے "عالمی ادارہ صحت" کے نظریے کے مطابق جسمانی

امن عالم کیلیے جسمانی صحت کا اعلا معیار ضروری ہے

ابھی حال ہی میں میں نے ہندستان کے وزیر اعظم نہرو سے ملاقات کی تھی ہندستان آنے سے پہلے میں نے ان کی وہ تقریر بھی پڑھی تھی جو انہوں نے کچھ عرصہ پہلے عالمی ادارہ صحت کے تحت جنوب مشرقی ایشیا کی علاقائی کمیٹی کے اجلاس کا افتتاح کرتے وقت کی تھی ان دونوں موقعوں پر نہرو کے خیالات سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آج دنیا میں شاید چند ہی رہنما ایسے ہوں گے جو امن اور صحت کے تعلق کی بابت مسایل حاضرہ کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

عالمی ادارہ صحت کا کام

اس علاقائی کمیٹی کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے نہرو نے یہ کہا تھا کہ اگرچہ بظاہر عالمی ادارہ صحت اور یونیسکو کے ادارے دنیا کے سیاسی مسایل کے حل میں بلواسطہ اور موثر رسائی" رکھتا ہے۔ میرا بھی یہی عقیدہ ہے اور اب میں اس بات کی وضاحت کروں گا کہ یہ میرا عقیدہ کیوں ہے۔

عالمی ادارہ صحت کے دستور کی اصطلاح کے مطابق جسمانی دماغی اور سماجی بہبودی کی

اور دماغی عمل میں ہم آہنگی اشد ضروری ہے۔

تعلیم صحت کی ضرورت

آج دنیا انسانی بیماریوں کے اسباب اور متعلقہ علاج معالجے اور انسدادی کارروائیوں سے کافی زیادہ واقف ہو چکی ہے۔ ہندستان میں بھی دوسرے مسایل کے علاوہ صحت کی مضبوط اور عمدہ سروسوں کے قیام کی اہمیت کا احساس پیدا ہو گیا ہے تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ دیہات میں صحت کی تعلیم کے نئے اور موثر اصول رایج کیے کیونکہ غیر صحت مند آبادی میں نہ تو آزادی قایم رہ سکتی ہے اور نہ ہی اقتصادی امور میں ترقی ہو سکتی ہے اس لیے امن عالم کے لیے صحت ایک لازمہ بن گئی ہے۔

جسمانی صحت کے مسایل حل کرتے وقت ہمیں دل و دماغ اور انسانی روح کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کیونکہ بعض صنعتی ممالک میں دماغی بیماریوں اور رحیاتی انتشار نے جسمانی بیماریوں کی جگہ لے لی ہے لیکن یہ خطرہ سوسایٹی میں صنعت کاری کی بڑی بڑی جماعات قایم کرنے کی صورت میں رونما ہوتا ہے مغرب کے ایک صنعتی طبقے کا

ام-سی-کینڈاو-ڈایرکٹر جنرل عالمی ادارہ صحت

جایزہ لینے سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ خلل اعصاب کی بیماریوں کے باعث محنت کش کے پیداواری کام میں بہت کمی واقع ہو جاتی ہے۔

حادثاتی مسایل ان مسایل کی حادثاتی اصلیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان بیماریوں کے باعث گھریلو زندگی بھی امن و امان سے بسر نہیں ہو سکتی۔ بہر حال اب سوچنا ہے کہ ان خطرات کو کس طرح دور کیا جائے اس کا علاج یہ ہے کہ ہر ملک کے بالغ اور صحت مند دماغ والے مرد اور عورتیں بغیر کسی نسلی اور قومی امتیاز کے اور بغیر کسی سیاسی اختلاف کے اشتراک عمل سے جد و جہد کریں۔ ایشیا کو جو ابتدا ہی سے فلسفا اور حکمت کے مشاغل میں مصروف رہا ہے اس سلسلے میں ایک اہم خدمت سر انجام دینا ہے۔ اور ایشیا سے باہر کے ملکوں میں بھی پھر ایسی نئی مشعل روشن ہو جو انسانوں کو امن اور جسمانی دماغی اور سماجی بہبود کے رستوں کی طرف گامزن کرے۔ عالمی ادارہ صحت بھی اس مقصد کے حصول کے لیے جد و جہد کر رہا ہے۔

غزل

یونس علی مہر (لکھنوی)

معاذ اللہ زمانے کی ملیں ناکامیاں ہم کو — قیامت ہے جو یاد آئے قفس میں آشیاں ہم کو
ارے تو پا بنا کر بے نشانوں کا نشاں ہم کو — کہیں ہنسنے نہیں دیتے زمین و آسماں ہم کو
اثر اتنا ہوا تو صحبت شیخ و برہمن میں — صدا ناقوس کی معلوم ہوتی ہے اذاں ہم کو
نہ حرف آئے کہیں عشق و حیا پر ان کی دیکھو — لبِ نازک بات چپ لگی ہے وقتِ امتحاں ہم کو
نگاہیں جھکی جاتی ہیں فلک پر ان کی کئی — کوئی الزام کیوں لغزش کا دینا ہے یہاں ہم کو
وہیں سے پھر قدم بھٹکے وہیں کیا بھولے — ملا جس راہ پر کوئی نشاں کارواں ہم کو
چمن میں ہائے دم بھر کے اجالے کے لیے ہم — جلانا ہی پڑا ہاتھوں سے اپنے آشیاں ہم کو

جہاں عشق بتاں سے بہرہ دیر و حرم ٹھہرے
ملے جو ابھرے ابھرے سے نقوش آستاں ہم کو

غزل

نہیں درکار واعظ روضۂ باغ جناں ہم کو
ہم ان کے ہیں مہیا کیا در ان کا آستاں ہم کو
بجا ہے اپنے ہونے پر نہ ہونے کا گماں ہم کو
کہاں تک اب مٹائیں گے زمین و آسماں ہم کو
ہمارے دل سے پوچھے کوئی رفعت تیرے احساں کی
زمیں پر ہم کریں سجدہ جزا دے آسماں ہم کو
گرے آخر گرے بے ہوش ہو کر بابِ ساقی پر
کیا ایسا خمارِ مے نے بے تاب و تواں ہم کو
شہیدانِ وفا کا خوں شفق کے رنگ میں لے کر
رلائے گا قیامت تک لہو یہ آسماں ہم کو
زمانا کیا مٹائے گا ہم ایسے خاکساروں کو
زمانا خود ہی مٹ جائے گا کر کے بے نشاں ہم کو
سبق آموزِ عالم ہے ہماری خانا بربادی
محبت نے بنایا اس طرح بے خانماں ہم کو
نشیمن پھونک کر سوئے فلک واپس گئی بجلی
چمن میں اب تو رہنا ہی پڑا بے آشیاں ہم کو
مئے عرفاں کی مستی تک بنا جب کھا گئی
بلا ہی لے گئی اس دم محفل روحانیاں ہم کو
خدائی بھر جہاں سجدے کے عالم میں نظر آئی
ملا ایسا بھی اک بت کدے کے درمیاں ہم کو
کفن پہنے جو پھرتے ہیں دیارِ عشق میں بیدل
نظر آیا انہیں میں حاصلِ عمرِ رواں ہم کو

شاہ بیدل وارثی

اپنے لبسی کے نام ....

صہبا نقوی

کاشانۂ غم

جانِ جفا!

وفاؤں بھرا سلام!

تم نے مجھے رخصت کیا ہے۔ اور میں نے شہر کو — شہر والوں کو — وہاں کی رنگینیوں کو — مدھ بھری فضا کو — رس بھری ہواؤں کو — رخصت کر دیا۔ اور کاشانۂ غم کی راہ لی — میں اسی جگہ ٹھیک ہوں — ناشاد ہی — مغموم سہی — مجھے خوشی کی ضرورت نہیں — مسکراہٹوں اور قہقہوں کی آرزو نہیں — کسی بھی چیز کی تمنا نہیں — تم سے ملنے کی بھی نہیں — تمہیں خط تک لکھنے کی نہیں — اور — نہیں — یقین جانو میں لاہور تم تک پہنچنے کے لیے ہرگز نہیں آیا تھا — مجھے خدشا ضرور تھا کہ تم وہاں ہو — میں سرے سے اس شہر میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوریاں کیا کچھ نہیں کرا لیتیں — اس کے بعد میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ تمہارا سامنا نہ ہو۔ تمہارے ہاں نہ جانے کا قطعی ارادہ تھا تمہارے محلے طرف بھی میں نے رخ نہیں کیا۔ تمہارے کالج کی طرف سے گذرنے والی کسی بس تک میں نہیں بیٹھا ہر اس جگہ جانے سے قدموں کو روکا جہاں تمہارے ملنے کا ذرا سا بھی امکان ہو سکتا تھا — ایسا نہ ہو کہ تم کو مل جاؤں — پرانی یادیں تازہ ہو جائیں — زخم پھر ہرے ہو جائیں — ارادے پھر متزلزل ہو جائیں — اور میں پھر اسی سنگ میل پر واپس پہنچ جاؤں جسے بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں — لیکن یہ اتفاقات کس کے بس کے ہوتے ہیں کس قدر غیر متوقع — کتنے ظالم کس قدر بے رحم۔ بھلا تم ہی بتاؤ — کیوں مل گئی تھیں تم مجھے — میں بس کے انتظار میں ٹھہرا تھا — کھڑا رہے دائیں —

مانتا ہوں کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔ اور دل کو تسلی دینے لگا تھا کہ تم نے مجھے ہرگز نہیں دیکھا۔ لیکن تمہاری آنکھوں سے اور شکار بچ کر چلا جائے۔ اتنا ہی کیا کم تھا کہ تم نے لاہور میں مجھے دیکھ لیا تھا۔ اور میں یقیناً تمہارا مجرم ہوتا — تم سے ملے بغیر واپس ہو کر۔ تو پھر مجھے پکارنا کیا ضرور تھا اور تمہارے ساتھ کوئی سہیلیاں بھی تھیں۔ ان سے میرا تعارف بہت ضروری تھا کیا؟ جیسے کوئی آرٹسٹ اپنا بنایا ہوا کارٹون دوستوں کو دکھائے۔

آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ہماری ملاقات ہوئی۔ دبی ہوئی چنگاریاں ابھریں — شعلے اٹھے — آگ بھڑکی — اور تم نے مجھے ایک بار پھر اس آگ میں جھونک دیا۔ تماشا دیکھنے کے لیے صرف تسکین نظر کی خاطر — محض مجھے ستانے جلانے اور دکھ دینے کے لیے صرف اور صرف رقص بسمل کا تماشا کرنے کی خاطر۔

اس خط کے لکھنے سے میرا مقصد تم سے صرف ایک بات دریافت کرنا ہے مجھے کیوں ستایا جاتا ہے — کیوں چرکے لگائے جاتے ہیں کیوں نشتر لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے ہیں۔ کیا حاصل ہو جاتا ہے تمہیں؟ میں زبردستی دل پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں اور تم بے رخی کی شکایت لیے موجود ہوتی ہو۔ اور اس کے بعد — تمہارا رویہ — بے رخی — سرد مہری — ستم گری اور بے وفائی۔ آخر ایسا کیوں؟ تم اپنے ہر وعدے کو کئی کئی بار بھلا چکی ہو — ہر پیمان کو بار بار روند چکی ہو۔ ہر عہد کے جگہ جگہ پرزے بکھیر چکی ہو۔ پھر یہ دعوا کیا؟ — بے رخی کی شکایت کیوں؟ — تم کیوں بار بار یہ ایک ہی کھیل کھیلے جا رہی ہو — آخر یہ سوانگ کب تک جاری رہے گا؟ اور تمہارا مقصد کیا ہے اس سے؟ میں کب تک تمہارے ہاتوں کا کھلونا بنا رہوں؟ مجھے کٹھ پتلی کیوں سمجھا جاتا ہے۔ اور میرے دل کو گوشت کے ایک بے جان لوتھڑے کا درجہ کیوں دے دیا گیا ہے —؟

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے!!

کراچی

مکرم محترم خالصاحب بسلام مسنون!

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ آپ کے خطوط ملتے رہے لیکن میں جلد جواب نہ دے سکا جس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری مصروفیات کے پیش نظر آپ اسے نظر انداز فرما کر مجھے مزید شکریے کا موقع دیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

"ہندستانی ادب" باقاعدہ مل رہا ہے اور آپ کی ہمت اور اولوالعزمی کا قایل ہونا پڑتا ہے کہ آپ باوجود متعدد مشکلات کے اسے زندہ رکھے ہوے ہیں۔ خداتعالی سے دعا ہے کہ وہ اس کے لیے ایسے سامان پیدا کر دے کہ آپ اسے عالا پیمانے پر شایع کر سکیں۔

محترم! عوام کا صرف "ہندستانی ادب" ہی کے ساتھ یہ حوصلا فرسا سلوک نہیں بلکے ہر ادبی پرچے کے ساتھ یہی رویہ ہے۔ نہ معلوم یہ سلسلا کب تک جاری رہے! عوام کے ذوق پستی کا رونا کہاں تک رویا جاے! بہرحال مستقبل سے کبھی مایوس نہ ہونا چاہیے ــــ آپ کا عزم صمیم تو واقعی قابل رشک ہے!

"شہناز" کی معاصرانا خدمات "ہندستانی ادب" کے لیے ہر وقت حاضر ہیں۔ میرے لایق کوئی خدمت ہو تو بلاتکلف تحریر فرمایے۔ زیادہ شکریا! آپ کا مخلص

خالد عرفانی۔ ایڈیٹر "شہناز"

ایڈیٹر صاحب! چونکے آپ اور ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں اس لیے ہماری کٹھنائیوں کا آپ کو بڑی حد تک صحیح اندازا ہے یہ تو ایک کھلی حقیقت ہے کہ "ہندستانی ادب" سراسر نقصان میں چلایا جا رہا ہے۔ بھی ہم لوگ ارادا کیسے نہ کرتے! آج جب علمی ادبی سیوا کی ٹھان لی ہے تو دکھ درد سب ہی سہنے پڑیں گے ـــ اسی "عزم" ہی کا تو نتیجا ہے جو آج "شہناز" کے حالات بہتر ہو چلے ہیں۔ ابھی تھوڑے ہی عرصے کی تو بات ہے کہ معاصر "شہناز" بھی کٹھنائیوں سے دوچار تھا۔ یقین! اس کا حال بہت ہی پتلا ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی کی ناو مصایب کے تھپیڑوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ایک وقت ایسا بھی آ گیا تھا کہ اس کی شمع حیات کی لو ــــ گل ہونے کے قریب تھی ـــ! مگر آپ نے ہمت نہ ہاری آپ نے ان تمام مشکلوں اور آفتوں کا ڈٹ کر مقابلا کیا ــ اور آخرکار "شہناز" میں پھر سے جان سی بھر دی! ہم آپ کو آپ کے اس "عزم صمیم" پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور "شہناز" کی ترقی کے لیے اپنی دلی آرزووں اور تمناوں کا اظہار کرتے ہیں۔

عوام کے ذوق پستی کا آپ نے جو دکھڑا رویا ہے وہ کسی حد تک صحیح نہیں ــ! اس لیے کہ ذوق ہے ضرور، لیکن صرف زبانی تعریفوں اور واہ! واہ! کی حد تک جب خریداری اور مالی امداد کا سوال پیدا ہوتا ہے تو بقول کسے ؎

گر جاں طلبی مضائقہ نیست
گر زر طلبی "سخن درین است"

کہتے ہوے گونگے ہو جاتے ہیں نہ معلوم یہ افسوس ناک ذہنیت کب دور ہو۔ دیکھیے ہم بھی تو مایوس نہیں ــــ! ایڈیٹر

کراچی

مکرمی! تسلیم!

کرم نامہ ہمدست ہوا۔ پرچے کی زبوں حالی کا ذکر پڑھ کر بے حد صدما ہوا۔ یہ صرف آپ ہی پر منحصر نہیں بلکے ہندستان اور پاکستان کے تقریبا سب ہی ادبی رسایل کا یہی حال ہے۔ صرف چند ہی رسایل ایسے ہیں جو اتفاقی طور پر آگے بڑھ گئے۔ آپ کو ان ادبی رسایل کے انجام پر بھی نظر دوڑانا پڑے گا جن کا دنیاے ادب میں ایک خاص معیار اور

خاص مقام تھا۔ ملک کے گوشے گوشے میں ان کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے مگر افسوس! کہ ایسے مشہور رسایل بھی عوام کی کور ذوقی کا شکار ہوئے بغیر نہ رہے۔ عوام کو تو صرف جنسیات سے بحث کرنے والے گندے لٹریچر سے زیادہ لگاو ہے۔

—— آپ کے پرچے کا معاملہ تو دنیا سے نرالا ہے۔ شروع ہی سے آپ انقلابی ذہنیت لے کر اٹھے۔ مگر خانصاحب! مولانا حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تو میدان صحافت میں اپنے جھنڈے گاڑ چکے تھے۔ ان دونوں علمبرداران صحافت کا بھی حشر آپ کے سامنے ہے۔ مختصر یہ کہ پیشۂ صحافت میں لذت زیادہ اور آمدنی کم ہے۔

خانصاحب۔! آپ نے صحیح لکھا ہے کہ "خون پلا پلا کر پال رہا ہوں۔" اخبار ہو یا رسالہ اس کی بقا کا انحصار چندے اور اشتہار کی آمدنی پر ہے۔ اشتہار اتنا ہی ضروری ہے جیسے انسانی جسم کے لیے خون۔ پرچے کی شہ رگ بھی اشتہار ہی ہے۔ مگر آپ نے تو "ہندستانی ادب" کی شہ رگ ہی کاٹ کر رکھ دی۔

...... میں سمجھتا ہوں کہ پیشۂ صحافت اور ادبیات صحافت کو کسی بزرگ کی بد دعا ہے ورنہ کیا معنی کہ رات دن جھک مارنے کے بعد بھی "کولھو کا بیل" بنے رہتے ہیں۔

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں مقالے، مضامین، افسانے فیچر، ڈرامے، نظمیں اور غزلیں وغیرہ حاصل کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہوں۔ جیسے جیسے یہ چیزیں فراہم ہوتی رہیں گی بھیجتا رہوں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ حالات سازگار ہوں تو کبھی ادھر بھی ہو جایئے۔ تھوڑی سی مدت کے لیے سہی آپ کو آرام بھی مل جائے گا۔ تفریح بھی ہو جائے گی۔ خدا حافظ

خاکسار۔ عظیم الدین محبت ایم۔ اے (عثمانیہ)

محبت کی باتوں میں واقعی مزا آتا ہے۔ ان میں لذت اور کھلاوٹ بھی ہے۔ مگر حقیقی شیرینی مفقود ہے!

مٹھاس کا احساس ـــــ تو اس وقت ہوتا جب میٹھے میٹھے بولوں سے ہمارے حوصلے بڑھائے جاتے! ہم گذرے ہوؤں کے "حشر" پر نظر دوڑانا پسند نہیں کرتے۔ ہمارے حوصلے تو ہر حالت میں بلند ہیں۔ ہم ہمیشہ ایک "خوش آیند" مستقبل کے میٹھے سپنے دیکھا کرتے ہیں یہی ہے ہمارا حوصلہ اور یہی ہے ہمارا "عزم" اسی بلند ہمتی کے سہارے آگے بڑھے چلے جا رہے ہیں......

.. ہم حشر کے میدان سے ڈرنے والے نہیں جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا! مگر جب تک "ہندستانی ادب" زندہ ہے آپ ہر طرح سے اس کا ساتھ دینے کا "بیڑا" تو اٹھایئے اور ہماری یہی "اپیل" "ہندستانی ادب" کے ہر ہمدرد سے بھی ہے۔ آپ نہ صرف مضامین وغیرہ بھجوائیں بلکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدار فراہم کرنے کی مہم بھی چلائیں اسی میں ہماری بھلائی ہے۔ ایڈیٹر

مکرمی تسلیم!

"ہندستانی ادب" کا گذشتہ شمارہ نظر سے گذرا کافی نکھرا ہوا اور صاف ستھرا پرچا ہے۔ اگرچہ ضخامت کچھ کم معلوم ہوتی ہے مگر بیشتر مضامین نظم و نثر معیاری ہیں۔ ایک تازہ غزل آیندہ اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں کار لائقہ سے یاد فرماتے رہیں امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص۔ ارشد صدیقی

ہماری یہی کوشش ہے کہ رسالے کو زیادہ سے زیادہ نکھرا ہوا اور صاف ستھرا بنائیں۔ مضمون کی کمی کی شکایت بجا ہے ہم خود نہیں چاہتے کہ رسالے کے صفحے کم ہوں مگر موجودہ ناگوار حالات میں صفحوں کی تعداد میں اضافہ کرنے سے ہم بالکل مجبور ہیں اتنے کم حجم کے باوجود ہم آپ کو اور "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کو یقین دلاتے ہیں کہ رسالہ سراسر نقصان میں چلایا جا رہا ہے۔ اگر آپ کو "ہندستانی ادب" سے واقعی ہمدردی ہے تو اس کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدار فراہم کیجیے ـــ اور پھر دیکھیے ـــ رسالہ پہلوان جیسا موٹا اور تگڑا ہوتا یا نہیں!

ایڈیٹر

تبصرہ

ترانۂ دل
سائز ۱/۱۶ کراؤن۔ لکھائی چھپائی پاکیزہ کاغذ چکنا۔ ۳۴۸ صفحے قیمت ہے ملنے کا پتا۔ شفیق حسن خاں محلہ ہاتھی تھان۔ شاہجہاں پور (یو۔پی)

زیر تبصرہ کتاب حضرت دل کے قدیم اور جدید کلام کا مجموعہ ہے۔ دل کا مجموعہ کلام پہلی بار ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا تھا اس پر نیاز فتحپوری نے ایک زبردست اور نہایت ہی معرکۃ آرا مقدمہ لکھا تھا جس میں دل کی قادر الکلامی اور شاعرانہ عظمت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی تھی۔ اس کے علاوہ ۳۸ مشاہیر اور شعرا کی رائیں بھی دل اور ان کی شاعرانہ خصوصیات سے متعلق درج ہیں۔ ان میں امیر مینائی سے لے کر مالک رام تک شامل ہیں۔

اس کے بعد حضرت دل نے خود بھی "گذارش" لکھی ہے جس میں اپنی خصوصیات کو گنوایا ہے اور جو کچھ لکھا ہے واقعیت پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر لکھتے ہیں۔

"میں نے غالب مرحوم کی بھی پیروی کی ہے مگر ایک حد تک پیچیدہ ترکیبوں اور بعید الفہم استعاروں سے احتراز کیا ہے۔ مومن کے جذبات اور خدارائی عشق سے بھی استفادہ کیا ہے۔ میر دہلوی کی سادگی بھی میرے اشعار میں نظر آئے گی حضرت استاد (امیر مینائی) کے پرشکوہ الفاظ اور متین انداز بیان کا بھی مقلد ہوں"۔

دل کے ان جملوں کا ماحصل یہ ہے کہ ان کے کلام میں غالب، مومن، میر تقی میر اور امیر مینائی کا رنگ موجود ہے۔ اور انہوں نے ہر ایک کی تھوڑی تھوڑی پیروی کی ہے گویا کہ دل بجائے خود مومن۔ غالب۔ میر اور امیر کے نمائندہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دل نے بڑی خوبی اور ایک خاص انداز سے ان شعرا کی پیروی کی ہے۔ اس کا ثبوت "ترانۂ دل" پڑھنے کے بعد ہی ملتا ہے یہ خصوصیت صرف حضرت دل ہی کو حاصل ہے کہ ایک ہی وقت میں انہوں نے دلی اور لکھنؤ دونوں اسکولوں کی پیروی کی ہے۔ اس کو بڑی بڑی خوبی اور نزاکت کے ساتھ نبھایا بھی ہے۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ یہ کلیہ صرف دل ہی سے مختص نہیں بلکہ قدیم زمانے سے ایک روایت سی چلی آرہی ہے کہ ہر اچھا شاعر کسی نہ کسی بڑے شاعر کی پیروی کرلیتا ہے مثلاً غالب نے شروع میں ناسخ اور میر کی پیروی کی مگر بعد میں اپنا ایک خاص اور الگ رنگ قائم کرلیا۔ امیر مینائی نے ابتداً اپنے استاد اسیر کی پیروی کی اور بعد میں داغ کا رنگ اختیار کیا لیکن آگے چل کر اپنا خود ایک رنگ جما لیا بالکل یہی حال دل کا بھی ہے کہ پیروی تو سبھوں نے کی مگر طویل مشق سخن کے بعد اپنا ایک خاص انداز بیان پیدا کر لیا۔

اس وقت حضرت دل کی عمر ۸۰ سال سے بھی متجاوز ہے، اور تقریباً ۶۵ سالہ مشق سخن ہے۔ "ترانۂ دل" اسی طویل عرصے کی شاعرانہ صلاحیتوں کا ماحصل ہے اس مجموعے کے مطالعے کے بعد پتا چلتا ہے کہ دل نہ صرف ایک پرشکوہ اور قادر الکلام شاعر ہیں بلکہ ساتھ ہی ان کے اشعار میں جا بجا متانت، سنجیدگی پاکیزگی نزاکت اور ندرت خیال بھی پائی جاتی ہے یوں تو میں شروع ہی سے دل کے کلام کا قائل تھا لیکن اب "ترانۂ دل" کے نئے ایڈیشن کے گہرے اور تفصیلی مطالعے کے بعد دل کو واقعی اس طرح پر پایا جس کا ذکر نیاز نے اپنے بے نظیر مقدمے میں کیا ہے مختصر یہ کہ دل کے کلام میں وہ تمام خوبیاں اور شاعرانہ عظمتیں اپنی پوری قوت کے ساتھ آ جاگزیں ہیں جو ایک ایک کرکے دوسروں کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ میری اپنی

ناقص رائے میں دل "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کے مصداق ہیں۔

دل کی شاعرانا خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے نیاز نے اپنے سحر طراز مقدمے میں لکھا ہے۔

"امیر کے شاگردوں میں دل کی شاعری سب سے الگ ہے یہاں تک کہ جلیل سے بھی دل کی شاعری اتنی ہلکی نہیں جتنی امیر کے دوسرے شاگردوں کی۔ ان کے یہاں غور و فکر کا عنصر غالب ہے اور کہیں کہیں آواز میں بلندی بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر نہایت گوارا قسم کی۔ پختگی اور مشاقی ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے لیکن والہانہ ربودگی یا خود رفتگی بہت کم پائی جاتی ہے ان کے کلام میں موسیقیت تو نہیں ہے۔ سنبھلی ہوئی دردمندی ضرور ہے جو کہیں کہیں ترنم کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ چونکہ وہ جذبات کے اظہار میں کبھی بے اعتنا نہیں ہوتے اس لیے ابتذال اور سطحیت ان کے یہاں بلکل نہیں پائی جاتی"

نیاز نے اپنے اس ماسٹر پیس میں جو بھی لکھا ہے اس پر حضرت دل پورے پورے اترتے ہیں۔ دل دراصل غزل گو شاعر ہیں اور ان کی تمام تر شاعرانا صلاحیتیں اور خوبیاں غزلوں ہی میں نمایاں ہیں اس لحاظ سے حضرت دل کو "استاد غزل" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

دوسرے شعرا مجکو معاف فرمائیں۔ کہیں یہ نہ خیال کریں کہ میں نے دل کو اچھالنے اور بڑے بنانے کی کوشش کی۔ حق تو یہ ہے کہ دل اپنے دور کے واقعی بڑے شاعر ہیں جن کی شاعری کے شروع ہی سے ڈنکے بج رہے ہیں دل کا کلام مقبول عام اور زبان زد عوام ہے۔ ان کی غزلیں عام طور پر پڑھی اور گائی بھی جاتی ہیں۔ اس لحاظ سے حضرت دل دنیائے شاعری کے ان چند خوش نصیب شعرا میں سے ہیں جنہیں اپنی زندگی ہی میں قبول عام حاصل ہوا، اور ساتھ ہی شہرت دوام بھی نصیب ہوئی۔ دل جیسے مشہور اور ہر دل عزیز شاعر کے کلام کے مطالعے کی میں کیا سفارش کر سکتا ہوں۔ مگر اس کے باوجود یہ ضرور مشورہ دوں گا کہ ہر صاحب ذوق کو چاہیے کہ "ترانۂ دل" کے اس نئے ایڈیشن کو ضرور خرید ے تاکہ اس کے پڑھنے کے بعد شاعری کی پیاس کو بجھا سکے۔

"ت"

نئے اجالے — سائیز ۱/۱۶ کراون۔ کاغذ رف۔ لکھائی چھپائی ناقص ضخامت ۱۰۴ صفحے۔

قیمت ۱۲؍ ملنے کا پتا: ادارہ ہمت لکھنو۔

زیر تبصرہ کتاب اعجاز خورشید کاشمیری کے آٹھ عدد ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے جن میں بابر کی موت۔ نادانی۔ اجنبیا دارا شکوہ۔ وہم۔ دھوپ۔ چھاوں۔ شہنشاہ جہانگیر اور روپ سنگھار۔ یہاں شامل ہیں۔

کتاب کے شروع میں سلامت علی مہدی ایڈیٹر "ملت" لکھنو کا "تعارف" ہے معلوم ہوتا ہے "تعارف" میں اپنا زور قلم صرف کر کے مہدی نے حق دوستی ادا کیا ہے۔ صاحب موصوف نے جو کچھ لکھا ہے کاش کہ ڈرامے اس معیار پر پورے اترتے ——!

ڈراما کی فنی نقایص سے ہٹ کر مصنف پر یہ الزام بھی عاید ہوتا ہے کہ انہوں نے کتاب انتہائی ناقص شکل میں پیش کی ہے۔ کتاب کا بہترگٹ اپ بھی ایک قسم کا آرٹ ہے ہر کتاب ایک خاص انداز میں یا انوکھے آرٹسٹک نقطہ نظر سے پیش کی جانی چاہیے۔ جمالیاتی نقطہ نظر سے اسی لیے تو آرٹ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کتابیں اگر ردی کے پلندوں کی شکل میں پیش کی جائیں تو ان کا صحیح مقام "ردی دان" ہوگا نہ کہ ادب اور لٹریچر کی مزین الماریاں۔ ہمیں امید ہے کہ ہر مصنف اور مولف ہمارے ان زرین اور مفید مشوروں سے ضرور سبق حاصل کریگا۔

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں روانا کی جائیں ورنا تبصرا نہیں کیا جائے گا۔

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیہ)

ہندستانی زبان میں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

جلد (۱۵) نمبر (۱)

ایڈیٹر

جی۔ ام خان ام۔ اے (عثمانیا)

آذر ۱۳۶۴ف اکتوبر ۱۹۵۴ع

چندا سالانا آٹھ روپیے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
حقایق و معارف	افقر موہانی	۴
غزل	سراج الحسن سراج (لکھنوی)	۵
غزل	نازش پرتاب گڑھی	۶
ترنمات محضر	ابو البیان محضر سندیلوی	۷
غزل	شفیق بینائی (شاہجہانپوری)	۸
یونیورسٹی گرانٹس کمیشن	مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم حکومت ہندستان	۹
غزل	مشتاق پردیسی	۱۱
جوش ملسیانی کی نثر نگاری کے نمونے	سیدل محمد فضا جالندھری (ملتان)	۱۲
لوح مرقد پر	حکیم یوسف اعظمی	۱۶
بلبل داغستان	گ۔ یوسف	۱۷
پنجاب کی لوک کہانیاں	شمشیر سنگھ نرولا	۲۰
انجام زیست	حبیب پرویز (لکھنوی)	۲۳
کشمیر کی سیر	۱-۱	۲۴
امریکا کے ساتویں صدر اینڈریو جکسن	یو سیس	۲۷
امریکا میں بیرونی طلبا	ی۔ س	۲۹
ہندستان میں پرائمری تعلیم کی ابتدا	۱ - ۱	۳۱

ہمارے خیالات

"ہندستانی ادب" پندرویں سال میں

آج ہم یہ کہنے کے قابل ہیں کہ "ہندستانی ادب" نے اپنی زندگی کے چودا سال پورے کر لیے۔ اور پندرویں سال میں قدم رکھا ہے۔ ہر سال ہمارے لیے ایک نحوست ساین کر آتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس رسالے کو سال بھر کی پوری زندگی نصیب ہوگی۔ یا سال کے کسی حصے ہی میں اس کی باقی حیات اور بقا سے ہات دھونا پڑے گا۔ ایسے مایوس کن حالات سے نہ صرف "ہندستانی ادب" بلکے اور بھی کئی ایک علمی ادبی خدمت گذار دوچار ہیں ——

آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصا پہلے ہم نے پاکستانی رسالوں کی ایک کانفرنس کا حوالا دیتے ہوے بعض مقرروں کے بیانات نقل کیے تھے۔ اور ان کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ صرف ہندستان ہی کے علمی ادبی رسالے نہیں بلکے پاکستان کے بھی رسالے تباہ حالی کا شکار بنے ہوے ہیں، اسی لیے اس کانفرنس میں بعض ایڈیٹروں نے نہ صرف عوام بلکے حکومت سے بھی پر زور اپیل کی تھی کہ ماہوار رسالوں کی ضروری امداد اور سرپرستی کی جاے، ورنا یہ علمی ادبی خدمت گذار تباہی کے گڑھے میں دھڑام سے گر جائیں گے۔ ہم یہ بتانے سے مجبور رہیں کہ اس خصوص میں پاکستانی حکومت کا کیا رویا رہا ——— ؟

ہماری حکومت اور ہم

——— لیکن ہم اپنی حکومت کی شکایت کیے بغیر نہ رہیں گے کہ اس نے ہماری اپیل کو بری طرح سے ٹھکرا دیا۔ اور ٹکا سا یہ جواب دیدیا کہ "رسالوں کو مدد نہیں دی جا سکتی"! ——— ہم یہ پوچھتے ہیں کہ آخر کیوں، حکومت جب مصنفوں، افسانہ نگاروں اور ڈراما نویسوں کو مدد دے سکتی ہے تو رسالوں کی کیوں نہیں سرپرستی کی جاتی۔ رسالے بھی تو علم و ادب ہی کی سیوا کرتے ہیں۔ ایک مصنف یا افسانہ نگار یا ڈراما نویس اپنی انفرادی حیثیت میں ادب کی صرف کسی ایک شاخ کی سیوا کرتا ہے مگر ایک رسالا تو ان تمام شاخوں کا مجموعا یا گلدستا بنا ہوتا ہے جس میں نظم و نثر کی رنگینیاں بہار رجا نفزا سے کم نہیں ہوتیں گویا کہ ایک رسالا "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کے مصداق ہوتا ہے، اس لیے ایسی خوبیوں والی چیز کو بری طرح سے نظر انداز کر دینا . . . . . . ہم کیا کہیں ——— ! سانقا ایک ایسی ہستی سے پڑا ہے کہ اس خلا کو پر کرتے ہمارا قلم لرز رہا ہے۔

حکومت کے صفا انکار کے باوجود ہم یہ کہنے ہر گز نہیں جھجکتے کہ ہماری حکومت نے یہ جھل سا جواب دے کر اس خصوص میں سراسر اپنی ——— "بے ادبی" کا ثبوت دیا ہے، اس لیے ہم پھر سے ایک بار اپنی حکومت سے زوردار اپیل کریں گے کہ وہ اپنے بے معنی اور غلط فیصلے پر پھر سے غور کرے۔ علمی ادبی رسالوں کی مدد اور سرپرستی کرنا حکومت کے فرایض میں داخل ہے اگر حکومت ان سیوکوں کی رکھوالی اور حفاظت نہ کرے تو بھیڑ کی طرح ایک ایک کر کے سب علمی ادبی رسالے میٹھی نیند کے مزے لینے شروع کر دیں گے ——

ہمیں یہ کہتے دکھ ہوتا ہے کہ بعض علمی ادبی رسالوں کی زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے، اور کسی آن بھی گل ہونے کو ہے۔ اس لیے حکومت کے علاوا ہم جنتا سے بھی یہ اپیل کریں گے کہ وہ بھی اس طرف خاص طور پر دھیان دے۔ عام لوگوں کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ ان رسالوں کے خریدار بنیں اور مالدار طبقے کے لیے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے رسالوں کی مالی امداد کرے اگر یہ لوگ تھوڑی سی توجہ کریں تو نہ صرف

موجود رسالے تباہی سے بچ رہیں گے۔ بلکہ اور بھی کئی ایک علمی ادبی سیوک میدان عمل میں کود پڑیں گے۔

"ہندستانی ادب" کے لکھنے والے

مستقل لکھنے والوں میں مولانا افقر موہانی وارثی۔ سلام سندیلوی ام۔ اے ال۔ ال۔ بی۔ ایاز عصمی، مرزا مشتاق علی بیگ۔ اطہر شیر صاحب۔ ناظم جلد یبوی صلاح الدین بی۔ اے عظیم آبادی۔ نازش پرتاب گڑھی۔ ظفر عالم گیز بی۔ اے قمر الدین قمر۔ عصمت آرا عصمت۔ دل محمد فضا جالندھری ادیب فاضل۔ شاہد اختر۔ صفی احمد بہاری۔ قدیر لکھنوی۔ اجمل رشید اور رضیا نقوی شہباز پرویز کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ادارا ان حضرات کی قلمی امداد کے لیے ممنون ہے اور آشا رکھتا ہے کہ آیندا بھی وہ اس رسالے کی اسی طرح امداد کرتے رہیں گے۔

پروفیسر سید محمد ام۔ اے اور اختر انصاری اکبر آبادی ایک عرصے کے بعد اس محفل میں شامل ہوئے ہیں۔ ان ہر دو حضرات سے توقع ہے کہ وہ اپنی پچھلی روایات کو قایم رکھتے ہوئے ہمیں ممنونیت کا موقع دیں گے۔

نئے لکھنے والوں میں اعتبار الملک دل شاہجہاں پوری معراج لکھنوی، شبنم رومانی بی۔ اے اور شفیق مینائی کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور یقین رکھتے ہیں کہ یہ حضرات اس بزم کی مستقل رکنیت قبول فرمائیں گے۔

ناطق گلاوٹھی کا نام "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کے لیے نیا نہیں۔ آپ کا کلام عرصے تک "ہندستانی ادب" میں چھپتا رہا ہے۔ مگر کچھ عرصے سے آپ نے انجانی اختیار کر لی ہے۔ اب پھر سے ہم آپ کو دعوت عمل دیتے ہیں یقین ہے کہ آپ مستقل طور پر اپنا کلام بھجوایا کریں گے۔

آخر میں ہم مشہور شاعر نوح ناروی سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اپنے کلام فصاحت التیام سے اس رسالے کے صفحوں کو نوازا کریں گے۔

ممکن ہے روا روی میں ہم بعض نئے اور پرانے لکھنے والوں کے نام بھول گئے ہوں۔ ایسے تمام حضرات سے ہم اس اتفاقی چوک کی معافی چاہتے ہوئے ان کی ہمدردیوں اور عنایتوں کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ آشا ہے کہ وہ اپنی روایتی قلمی امداد کو اسی طرح برجاری رکھتے ہوئے ہمیں زیادہ سے زیادہ علمی ادبی سیوا کا موقع دیں گے۔

ان کے علاوا "ہندستانی ادب" نئے لکھنے والوں کو بھی دعوت دیتا ہے جن لوگوں کے قلم میں لکھنے لکھانے کی صلاحیت موجود ہے انہیں ہرگز تکلف سے کام نہ لینا چاہیے۔ اس لیے کہ آج کے چھوٹے ہی کل کے بڑے لکھنے والے ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنی چند سالا زندگی میں "ہندستانی ادب" نے کئی ایک نئے لکھنے والوں کا سواگت کیا۔ انہیں موقع دیا اور ان کے آگے بڑھانے میں اپنی تمام تر قوت صرف کر دی اور آج وہی چھوٹے بڑے لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں ——— مگر نکلے ——— باغی۔ اسی رسالے سے بغاوت کر گئے۔ اور ایسے بھلا دیا جیسے کبھی کے تعلق تھا بھی یا نہیں۔ ہمیں اس کی مطلق پروا نہیں۔ ہمارا کام تو نئی علمی ادبی سیوا کرنا ہے، اور چھوٹوں کو بڑے بنا دینا ایک باکمال سیوا ہے۔ علم اور ادب کی سیوا ہی ہمارا اصلی مقصد ہے۔ اس لیے ایک سیوک کو کبھی بھی اور کسی سے بھی شکایت نہیں کرنی چاہیے ہم اپنی حد تک خوش اور مطمئن ہیں کہ ہمارا مقصد پورا ہو گیا۔

بہر حال "ہندستانی ادب" جاری ہی ہوا ہے ان نیک مقاصد کے ساتھ۔ وہ اپنے مقاصد کو اور بھی آگے بڑھاتا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سے گلا شکوا کیے بغیر نئے لکھنے والوں کو میدان عمل میں آنے کی دعوت دے رہا ہے ایسے تمام باعزم لکھنے والوں کے لیے اس رسالے کے صفحے ہر وقت کھلے ہیں۔

چندے میں اضافا

اس نمبر سے رسالے کا چندا چند در چند مجبوریوں کے تحت آٹھ روپے سالانا کر دیا گیا ہے۔ اطلاع عرض ہے۔ خریدار نوٹ فرمالیں۔

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

نسیم صبح یہ مژدا جہاں میں لائی ہے   شباب پر ہے گلستاں بہار آئی ہے
عجب طرح سے چمن میں بہار آئی ہے   کہیں بہار کہیں پر خزاں بھی چھائی ہے
زہے نصیب کہ اپنی وہاں سائی ہے   سمٹ کے ساری خدائی جہاں پر آئی ہے
دہائی ہے دل درد آشنا دہائی ہے   لبوں پہ جان محبت میں کھنچ کے آئی ہے
سنا تو ہے کہ چمن میں بہار آئی ہے   مگر خزاں کو بھی ہمراہ اپنے لائی ہے
دل و نگاہ میں تصویر جس کی چھائی ہے   اسی نے آنکھ مرے دل سے اب چرائی ہے

وہی ہے قید قفس اور وہی غم صیاد   اسیری کہتے ہیں کس کو جو یہ رہائی ہے
جہاں پہ ایک طرح سب کی زندگی گذرے   اسی چمن میں سمجھ لو بہار آئی ہے
جہاں پہ کانٹوں ہی کانٹوں سے ہو بہار چمن   تو اس بہار سے یارب تری دہائی ہے
نہیں یقین جو مری سرفروشیوں کا انہیں   وفا کہیں گے کسے گر یہ بے وفائی ہے
بتا دے وسعت کونین اسے کہاں رکھیں   ذرا سی خاک کسی در کی ہم نے پائی ہے
مرے بھی سر کو تمنائے جبہہ سائی ہے   مرے بھی دل میں محبت تری سمائی ہے
میں خود ہی بزم سے اٹھ جاؤں گا کوئی دم میں   قیامت آپ نے کس واسطے اٹھائی ہے
نگاہ یار کی وہ مستیاں معاذ اللہ   کہ جس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مے پلائی ہے
فریب اور فریب نظر خدا کی پناہ   جو بات دل میں ہے وہ کب زباں پر آئی ہے
اسی کا نام قیامت ہے دل کی دنیا میں   جوانی ان کی لباس قضا میں آئی ہے
مزاج یار میں کچھ برہمی سی پیدا ہے   یہ کس نے داستاں میری انہیں سنائی ہے
کیا ہلاک کسی کو، کسی کو خانہ خراب   یہ رہ نوردوں کی کیا خوب رہنمائی ہے
اسی زباں کو مٹاتے ہیں اب وطن والے   وطن پرستوں کی جو مشترک کمائی ہے
خزاں کے دور کو دیکھے وہ کس طرح افقر   کہ جس نظر میں بہار چمن سمائی ہے

سراج الحسن سراج (لکھنوی)

غزل

تصویر کاش کھینچتی اس شرح آرزو کی
یہ دیکھنا تھا ہم نے کس طرح گفتگو کی

ہیں آج آنسوؤں میں چھینٹیں سی کچھ لہو کی
غم نے ترے ہلا دیں بنیادیں آرزو کی

دل کھو کے خود بھی کھوئے تجدید آرزو کی
اس آڑ میں بھی ہم نے تیری ہی جستجو کی

اک اصطلاح یہ بھی ارباب عشق کی ہے
دل نام رکھ لیا ہے اک بوند ہے لہو کی

دیکھو جو مسکرائیں یہ بے دہن بہاریں
سائے میں خار غم کے کلیاں ہیں آرزو کی

اب کیا اسیر ہو کر چاک قفس سے جھانکیں
دل کھول کر بہاریں لوٹی ہیں رنگ و بو کی

اک داستاں نظر کی کیا جاں ستاں کھٹک تھی
ناپید کر کے چھوڑی جنبش رگ گلو کی

دیوانا وار طے کی ہم نے رہ محبت
تجھکو تو ڈھونڈ لائے اپنی نہ جستجو کی

اس پھول سی نظر کا رشتہ کسے میسر
ورنا قبائے گل بھی محتاج ہے رفو کی

اب تو سراج دیکھو جو حشر ہو ہمارا
اللہ کا نام لے کر اس بت کی آرزو کی

غزل

نازش پرتاب گڑھی

بجا ہے منزل مقصود اگر وہ پا نہ سکے
جو صرف ہات اٹھائے قدم اٹھا نہ سکے

چمن میں رہ کے بھی لطف چمن وہ پا نہ سکے
جو بجلیوں کو چراغ چمن بنا نہ سکے

ہزار جبر کیا پھر بھی مسکرا نہ سکے
چھپانا چاہا غم دل، مگر چھپا نہ سکے

نشاط غم کی بلندی کبھی وہ پا نہ سکے
جو دل کے درد کو بھی عین دل بنا نہ سکے

تجھی سے پوچھ رہا ہوں میں اے حیات
وہ کیا کرے کہ جو رسماً بھی مسکرا نہ سکے

نہ جانے کتنی ہی شاخوں سے اٹھ چکے شعلے
چمن کو اہل چمن پھر بھی جگمگا نہ سکے

کبھی کبھی تو خدا اپنے جنون کے ہاتوں
تمہارے پاس ہی رہ کر تمہیں کو پا نہ سکے

اس اک نظر کو نشیمن بھی ہے قفس کی طرح
وہ اک نظر جو نشیمن سے دور جا نہ سکے

نہ جانے پختگی شوق تھی کہ خامی ذوق
حضور حسن جو ہم خود ہی لڑکھڑا نہ سکے

بس اک نہ تجھ سے تبسم کا پاس خاطر تھا
نہ جانے کتنے ہی آنسو مژہ تک آ نہ سکے

اسے گلا نہ سمجھیے تو عرض کرتے ہیں
ہم ایک بار بھی جی بھر کے مسکرا نہ سکے

اس ایک آہ پہ قربان سیکڑوں نغمے
وہ آہ دل سے جو اٹھے لبوں تک آ نہ سکے

نہ پوچھ گذری ہے کس طرح زندگی نازش
ہنسی بھی آ نہ سکی اشک بھی بہا نہ سکے

ترنمات محضر

ابوالبیان محضر سندیلوی

رقص میں ہے کلی کلی دامن لالہ زار میں
پھر نہ ابھر پڑے کہیں داغ جگر بہار میں

بات تو جب ہے جذب دل اتنا ہو اختیار میں
سب کو ہمیں نظر پڑیں عکس جمال یار میں

کس کے خرام ناز نے کر دیا دل کو مضطرب
لطف اٹھا رہا تھا میں عالم انتظار میں

تربت نامراد پر کب تھا چراغ کیسے گل
اس کی تو رسم ہی نہیں جیسے دیار یار میں

اف وہ فلک کی کجروی برق کی فتنہ گری
غنچہ جو مسکرا دیا آگ لگی بہار میں

وعدے کے ساتھ مٹ گئی حسرت دید یار بھی
اشک ہیں اب نہ روشنی دیدہ انتظار میں

دونوں جہاں کی رفعتیں اس کی نظر میں ہیچ ہیں
جس کو مزار کی زمیں مل گئی کوے یار میں

زخم بھی ہو گئے ہرے داغ لہلہا اٹھے
کوئی کمی نہ رہ گئی میرے لیے بہار میں

جوش جنوں کا ہو بھلا بن کے حریف مدعا
ڈھونڈھ رہا ہوں نقش اڑتے ہوئے غبار میں

یاد ہیں محضر حزیں پچھلی تباہیاں مجھے
آئے خزاں خدا کرے آگ لگے بہار میں

شفیق مینائی (شاہجہاں پوری)

غزل

دل مضطر کو فرط یاس میں یوں آسرا دینا
جب آنکھیں ڈبڈبا آئیں مری تم مسکرا دینا

اگر یارا نہ گویائی کا ہو آنسو بہا دینا
اسی صورت سے حال سوز دل انکو سنا دینا

مجھے تسکیں نہیں ہوتی فروغ لالہ و گل سے
ذرا کھل کر نگاہ شوق کو جلوا دکھا دینا

تصدق دین و ایماں تھے بس اک موج تبسم پر
معاذ اللہ اس کافرادا کا مسکرا دینا

مرا ذوق طلب منت کش ساقی رہے کب تک
مجھے تھوڑی سی مے ان مست آنکھوں سے پلا دینا

کلی کو ناز ہے اپنے تبسم کی لطافت پر
ذرا تم جلوہ رنگیں دکھا کر مسکرا دینا

رہے وابستہ نظروں سے کہاں تک ذوق نظارا
نقاب رخ اٹھا کر تم یہ پردا بھی اٹھا دینا

بقدر ظرف لطف ندوز دل بھی ہو سکے یارب
جو غم دینا مجھے میعا ہستی بھی بڑا دینا

نظر پاس حجاب حسن سے مجبور ہے ورنہ
شفیق اپنے لیے مشکل نہ تھا پردا اٹھا دینا

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن

مولانا ابو الکلام آزاد
وزیر تعلیم حکومت ہندستان

یہ معلوماتی اور بصیرت افروز خطبہ مولانا نے پچھلے سال یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے پہلے اجلاس میں دیا تھا۔ مضمون کی غیر معمولی افادیت کے پیش نظر آج ہم "ہندستانی ادب" کے پڑھنے والوں کی خاطر پیش کر رہے ہیں۔ ایڈیٹر

سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (تعلیم کا مرکزی مشاورتی بورڈ) کی سفارشات میں سے ایک سفارش کی بنا پر حکومت ہندستان نے ۱۹۴۵ء میں ایک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قایم کرنے کا فیصلا کیا تھا اس کمیشن کا مفوضا کام تین مرکزی یونیورسٹیوں تک محدود تھا اور وہ صرف ایک مشاورتی ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ کمیٹی کے چند غیر سرکاری ارکان تھوڑے سے وقت کے لیے کام کرتے تھے۔ اور پورے وقت کے لیے ایک افسر مقرر تھا۔ جو کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ ان محدود اختیارات اور عملے کی موجودگی میں یہ کوئی حیرت انگیز بات نہ تھی کہ یونیورسٹی کی تعلیم کی ترقی کے لیے کمیٹی موثر امداد نہ دے سکی ۱۹۴۷ء میں ارکان کی تعداد میں اضافا کرکے کمیٹی کی دوبارہ تشکیل کی گئی لیکن کمیٹی کے مفوضا اختیارات اور سرکاری امداد کی صورت حال کم و بیش ویسی ہی رہی۔ چنانچہ یہ کمیٹی بھی کارآمد ثابت نہ ہوئی۔

۱۹۵۲ء میں حکومت ہندستان نے فیصلا کیا کہ ایک نیا یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قایم کیا جائے جس کے چیرمین اور سکریٹری پورے وقت کے لیے کام کریں۔ اور ارکان کی تعداد بھی بڑھا دی گئی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ کمیشن کو خصوصیت سے چار مرکزی یونیورسٹیوں کی نگرانی کرنی چاہیے۔ اور حسب ذیل امور بھی اس کے فرایض میں شامل ہونے چاہئیں۔

(۱) مرکزی یونیورسٹیوں کے لیے پبلک فنڈوں سے مالی امداد متعین کرنے کے سلسلے میں حکومت کو مشورا دے۔

(۲) عالا تعلیم کی ایسی دوسری یونیورسٹیوں اور درس گاہوں کے لیے مالی امداد متعین کرنے کے سلسلے میں حکومت کو مشورا دے جن کی مالی امداد سے متعلقا معاملات حکومت نے کمیشن کے پاس بھیجے ہوں۔ اور عالا تعلیم کی یونیورسٹیوں اور درس گاہوں کو ان مسایل کے متعلق مشورا دے حکومت کی طرف سے کمیشن کو پیش کیے گئے ہوں۔

آئین کی منظوری کے بعد مرکزی حکومت پر یہ اہم ذمے داری عاید ہو گئی ہے کہ وہ عالا تعلیم سے متعلق سہولتوں کے سلسلے میں متعدد اقدامات پر غور و خوض کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے ایک قانون کے ذریعے یونیورسٹی تعلیم کی ایک کونسل قایم کرکے ہی اس ذمے داری سے عہدا برآ ہو سکتی ہے ان حالات میں یونیورسٹی تعلیم کی ایک کونسل قایم کرنے کی غرض سے قانون کا مسودا مرتب کیا گیا اور گشت کے لیے یونیورسٹیوں میں بھیجا گیا تاکہ ان سے زیادا سے زیادا امکانی امداد اور تعاون حاصل کیا جائے۔ اس قانون کے مسودے پر انٹر یونیورسٹی بورڈ نے غور کیا اور اس کے اغراض و مقاصد پر اتفاق رائے کا اظہار بھی کیا ہے لیکن بورڈ نے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی محسوس کیا کہ شاید قانون کی ان دفعات سے جیسے چاہیے نتایج برآمد نہ ہوں چونکہ حکومت ہندستان یونیورسٹیوں کی امکانی امداد اور تعاون سے ان اصلا حالات کو نافذ کرنا چاہتی ہے اس لیے حکومت نے ان اعتراضات پر غور کیا اور اس معاملے پر غور کرنے اور مقصد کی بجا آوری کے لیے مناسب اقدامات تجویز کرنے کی غرض سے اپریل ۱۹۵۳ء میں ریاستوں

کے وزرائے تعلیم اور وائس چانسلروں کی ایک کانفرنس منعقد کی اس کانفرنس نے متفقہ طور پر سفارش کی کہ سہولتوں میں ربط اور معیار برقرار رکھنے کے لیے کوئی جداگانہ ادارہ قایم کرنے کی بجائے یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کی سفارشات کے مطابق یونیورسٹی گرانٹس کمیشن مقرر کیا جائے اور اس کمیشن کے فرایض میں وہی امور شامل کر دیے جائیں جو یونیورسٹی کی تعلیم کی کونسل کے سپرد کیے جاتے ہیں۔ کانفرنس نے یہ رائے ظاہر کی کہ وسیع اختیارات اور فرایض کی بدولت یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سہولتوں میں ارتباط قایم رکھنے اور اصلاح کے لیے موزوں اقدامات تجویز کرنے کے لیے زیادہ بہتر ثابت ہوگا کیونکہ متعلقہ یونیورسٹیوں سے کمیشن کا تعلق مسلسل قایم رہے گا۔ اور اس کو ان کی ضروریات اور مطالبات کا بھی احساس ہوگا۔

حکومت نے اس سفارش کو منظور کر لیا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ موزوں طریقے سے قایم کردہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (جس کے اختیارات اور فرایض بھی وسیع ہوں گے) اپنے فرایض زیادہ موثر طریقے پر سرانجام دے سکتا ہے۔

یہ امر یونیورسٹی ایجوکیشن کی سفارشات کے عین مطابق ہے کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس امر کی سفارش کی تھی کہ برطانیہ کے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے اصولوں پر ہی ایک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن جلد سے جلد قایم کیا جائے۔ سائنٹفک مین پاور (جن سکتی کی سائنسی کمیٹی) نے بھی سفارش کی تھی کہ یونیورسٹیوں میں بعد از ڈگری تعلیم کی سہولتوں کی ترقی کے سلسلے میں فراخدلی سے مالی امداد فراہم کی جائے۔ حکومت نے اصولاً ان سفارشات کو منظور کر لیا ہے۔ لیکن مالی مشکلات کے باعث فی الحال کوئی کاروائی کرنے سے معذور ہے۔ پانچ سالہ پلان کی منظوری کے بعد یہ معلوم ہو گیا ہے کہ یونیورسٹی تعلیم کی ترقی کے لیے کچھ مالی ذرائع مہیا کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ وزارت تعلیم نے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قایم کرنے کے لیے یہی وقت موزوں خیال کیا۔ ان فنڈوں میں اضافے کی غرض سے حکومت نے مزید بحث و تمحیص بھی کی ہے خصوصاً اس حقیقت کے پیش نظر کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو نہ صرف مرکزی یونیورسٹیوں کے معاملات طے کرتے ہیں بلکہ وہ ہندستان کی کل یونیورسٹیوں کے معاملات کی نگرانی بھی کرے گا۔ یہ اعلان کرنے میں مجھے مسرت ہے کہ ہم ایک ایسا باضابطہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قایم کرنے کے قابل ہیں۔ جس کے پاس تمام یونیورسٹیوں پر نگرانی رکھنے کے لیے فنڈ بھی کثیر مقدار میں موجود ہوں اور جو یونیورسٹیوں کی اصلاح کے لیے ممد ثابت ہوگا۔ ایک قانون کا مسودہ تیار کر لیا گیا ہے اور توقع ہے وہ پارلیمنٹ میں جلد ہی پیش کر دیا جائے گا۔

قدرتی طور پر پارلیمنٹ میں بل پر غور و خوض اور اسے پاس کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ بہر حال حکومت کو اس امر کا احساس ہے کہ یونیورسٹیوں کے روز افزوں مسایل فوری توجہ کے محتاج ہیں یہی مناسب خیال کیا گیا ہے کہ گذشتہ نومبر کی ایک قرارداد کے مطابق ایک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قایم کر دیا جائے۔ اور اسے فوری طور پر فرایض انجام دینے کا اختیار دیدیا جائے۔ اس کمیشن کے پانچ ارکان ہوں گے اور ڈاکٹر ایس۔ ایس بھٹناگر اس کے چیرمین ہوں گے۔ اس امر کا اطمینان حاصل کرنے کی غرض سے کہ یونیورسٹیاں اس کمیشن کو کوئی بیرونی ادارہ تصور نہ کریں۔ متعدد وائس چانسلروں کو بھی اس میں شامل کرنے کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس امر سے اتفاق ہوگا کہ یہ ایک عظیم الشان فیصلہ ہے اور ہندستان میں یونیورسٹی کی تعلیم کی ترقی کے سلسلے میں اس کے اثرات بہت دور رس ہوں گے۔ اس لیے میری خواہش یہ ہے کہ اس اقدام کی اہمیت اور اس کمیشن کی وساطت سے جن نتایج کے حصول کی توقع ہے عوام ان کو موزوں طریقے پر محسوس کریں گے سب سے پہلے میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگرچہ حکومت کو لازمی طور پر چیرمین اور ارکان کا انتخاب کرنا پڑا ہے۔

لیکن کمیشن اپنے روز روز کے کام میں بالکل آزاد رہے گا۔ اور حکومت کی طرف سے کوئی مداخلت نہ کی جائے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کمیشن کی تجاویز سفارشات کی نوعیت کی بھی ہوں تو بھی حکومت انہیں لازمی تصور کرے گی۔ اور کمیشن کے مشورے کے مطابق عمل کرے گی۔ حکومت کی طرف سے اس سال کا بجٹ منظور ہونے کے بعد یونیورسٹی تعلیم کے لیے جو رقم دستیاب ہو سکے گی کمیشن کو اس کی اطلاع دیدی جائے گی۔ کمیشن یونیورسٹیوں کے لیے مقررہ مقدار کے اندر اندر رقمیں معین کرنے کے سلسلے میں آزاد رہے گا۔ اور اس سلسلے میں حکومت بھی کمیشن کے مشورے پر عمل کریگی۔ حکومت ہندستان کسی نئی یونیورسٹی کے قیام کے مسئلے پر غور کرے گی اور ایسی قایم کردہ یونیورسٹیوں کو مالی امداد بھی نہ دے گی۔ ماسوائے اس یونیورسٹی کے جس کے متعلق کمیشن نے سفارش کی ہو۔

اس امر کے پیش نظر کہ کمیشن اپنی ذمے داریوں سے تسلی بخش طریقے پر عہدہ برآ ہو سکے۔ کمیشن کو معلومات حاصل کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔ اور کمیشن کی طرف سے مطلوبہ تفصیلات یونیورسٹیوں کو بغیر رکاوٹ کے مہیا کرنی پڑیں گی۔ کمیشن ان تفصیلات کی جانچ پڑتال کر کے اپنی سفارشات مرتب کرے گا۔ اور معاملے کی نوعیت کے لحاظ سے ان سفارشات کو حکومت یا یونیورسٹی کے پاس بھیجے گا۔ حکومت اور یونیورسٹیاں اس کے مشورے پر پوری پوری توجہ مرکوز کریں گی۔ دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ اس طرح سے کمیشن غیر ضروری دوہری کارروائی کا ازالہ کرنے میں مدد دینے کے علاوہ محدود عملے اور محدود مالیات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کی تعلیم میں سہولتوں کا ارتباط حاصل کرنے اور معیار کو برقرار رکھنے کے اغراض و مقاصد کو سمجھنے کے سلسلے میں کمیشن حکومت کی مدد کرے گا۔ ان تمام امور سے کمیشن پر بھاری ذمے داری آ پڑی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ کمیشن اپنے مفوضہ کام ایسی خوش اسلوبی سے انجام دے گا جو حکومت اور یونیورسٹیوں کے لیے تسلی بخش ہوگی۔

غزل

مشتاق پردیسی

راہزن، خار، تاریکیاں، آبلے
ہم سلامت تو کیا شے ہیں یہ مرحلے
طے ہوئے ضبط غم کے سب ہی مرحلے
جب کہیں جا کے اشکوں کے دیپک جلے
ہم بعزم سفر جب بھی اٹھ کر چلے
اپنا دم سادھنے لگ گئے زلزلے
موت سے کم نہیں ساحلوں کا سکوں
ہم تو اے ساتھیو، سوئے طوفاں چلے
اپنی نظروں میں تھی عظمت زندگی
"مسکراتے رہے پھانسیوں کے تلے"
کوئی طاقت انہیں روک سکتی نہیں
موت کو کھیل کہتے ہوں جو منچلے
بے خبر مل گئے رہبر و راہزن
کارواں سے کہو اب سنبھل کر چلے
ڈھونڈتی آئیں گی تجھکو خود منزلیں
شرط یہ ہے کسی کا سہارا نہ لے
اب تو مشتاق ابھرنا ہے انساں کو
تا بکے آدمی پستیوں میں پلے

جوش ملسیانی کی نثر نگاری کے نمونے

(پہلی قسط)

بیدل محمد فضا جالندھری
(ملتان)
منشی فاضل ادیب فاضل

پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی منشی فاضل شاگرد رشید داغ دہلوی آج کل نکودر ضلع جالندھر مشرقی پنجاب میں قیام پذیر ہیں۔ آپ ایک زمانے سے رہنمائے تعلیم دلی (سابق لاہور) کے حصہ نظم کے ایڈیٹر بھی ہیں آپ نے اب تک اپنے مقالات کو یکجا کرکے کتابی شکل میں پیش نہیں کیا لیکن مضامین ملک کے موقر جراید میں شائع ہوکر اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کا دایرہ خیال علمی ادبی مضامین تک ہی محدود رہا۔ افسانے ڈرامے وغیرہ آپ نے نہیں لکھے۔ آپ کے رشحات قلم سے جو گوہر ہائے آبدار ٹپکے میں ان میں سے چند شذرات کا اقتباس پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں تاکہ اہل نظر پر حضرت جوش کی علمی ادبی قابلیت واضح ہو جائے۔ آپ بیک وقت شاعر بھی ہیں مضمون نگار بھی اور نقاد بھی۔

آپ کی سنجیدہ نثر نگاری اور مزاحیہ نثر نگاری کے نمونے "ہندستانی ادب" میں ناظرین کی تفنن طبع کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ جوش کا نثر میں اپنا ایک خاص رنگ ہے کسی کے مقلد نہیں۔ خاصی انفرادیت جھلک رہی ہے کاش یہ اپنے علمی ادبی مقالات جمع کرکے شایع کروا دیں تو ہمارے ادب پر احسان عظیم ہو۔ (فضا)

۱۔ تخیل کے کرشمے۔ اس عنوان کے تحت مضمون کا ابتدائی حصہ ملاحظہ ہو۔

یوں تو دنیائے تخیل کی ہر ایک چیز لبھانے والی ہوتی ہے مگر اس میں بعض مناظر ایسے بھی ہیں جن میں ہم ناممکنات کو ممکنات کے رنگ میں جلوہ گر پاتے ہیں۔ عقل انسانی اس سیمیائی جلووں سے اس قدر متحیر و مبہوت ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے مسلمہ دعاوی کے اطل ہو جانے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اور وہ عالم وارفتگی میں ان شعبدوں کو جو حقایق کی شکل میں اس کے مذہب پر غالب آجاتے ہیں خراج تحسین ادا کرتی ہے۔ شاعرانہ تخیل کے یہ کرشمے بالکل خلاف قیاس باتوں کو قرین قیاس بلکہ ناقابل انکار ثابت کر دیتے ہیں۔ اور ہم اس اعجاز نما ہنرمندی کی بے اختیار داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً خزاں کے موسم میں پھول نہیں کھلا کرتے۔ جو کھلے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی مرجھا کر رہ جاتے ہیں۔ مگر تخیل کی یہ بہار ملاحظہ فرمائیں کہ کس طرح خزاں کے موسم میں پھول کھلا رہی ہے ؂

باغ عالم میں شگفتہ رو ہیں ہم پیری میں بھی
کون کہتا ہے خزاں میں پھول کھلتے ہی نہیں

۲۔ کبھی ہم بھی نئے نئے بچے۔ یہ مضمون نشترگاہ دل سے نشر ہوا تھا ابتدائی حصہ یہ ہے

شاعری یا شطرنج۔ انہیں لوگوں کو یہ شغلے زیب دیتے ہیں جو فکر معاش سے ہر طرح فارغ ہوں۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی کہنا چاہیے کہ ہمیں بھی اس عطیے کے قابل سمجھ لیا جس پہ لکھے والدین کو ہر وقت یہی غم کھائے جا رہا ہو کہ ؏

چہ خورد بامداد فرزندم

اسے اس جنون میں مبتلا کرنا اور بیکار رہنے کا راز سکھانا ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔ ظفر نے کیا خوب کہا ہے۔

تنگ نکلا طوق الفت ہائے صیاد ازل
گردن قمری کو پہلے چاہیے تھا ماپنا

اب اس جنون کی کیفیت بھی سن لیجیے۔ یہ فتنا بیدار تو ہوا تیرا چودہ سال کی عمر میں۔ مگر اس کی شورش کے آثار

پانچ چھ سال ہی کی عمر میں نظر آنے لگے تھے۔ طبیعت نظم کی طرف بہت زیادہ مایل تھی۔ درسی کتابوں کی ہر ایک نظم شوق سے کرے اٹھتا ماں کی محبت، گنبد کی آواز وغیرا سب لوک نوک زبان تھیں پھر ان کی یادداشت اتنی گہری اور پائیدار کہ آج بھی جب کہ اس واقعے کو ساٹھ سال ہونے آئے ان نظموں کا بہت سا حصہ یاد ہے۔ ہم جماعت اس غیر معمولی یادداشت پر انگشت بدنداں تھے۔ مگر یہ حقیقت انہیں معلوم تھی نہ ہیں کہ یہ کسی عارض ہونے والے عارضے کی ابتدائی علامت ہے سالویں جماعت میں پڑھتے تھے کہ ایک دو استادوں کے ادبی ذوق نے اس فتنۂ خوابیدہ کے شانوں کو ہلایا اور اس نے انگڑائیاں لینی شروع کیں۔

۳۔ فارسی کے ایک گم نام پنجابی شاعر کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے

عبرت کدہ عالم میں خدا جانے کتنے صاحب کمال ایسے ہو گذرے ہیں جن کے شاہکار نہایت قابل قدر ہونے کے باوجود پردہ گم نامی میں چھپ کر رہ گئے۔ آج اس جماعت کا کوئی فرد فرید حسن اتفاق سے اپنے جواہر پاروں کی صورت میں سامنے آجاتا ہے تو دیدہ عبرت خون کے آنسو بہاتا ہے اور اس کی گم نامی زمانے کی بے اعتنائی و ناشناسی کا ماتم کرتی نظر آتی ہے۔

اندرجیت متخلص بہ منشی کا شاعرانہ کمال بھی اسی گم نامی اور غیر معروف سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ فارسی زبان کا یہ یکتا گو اور خوش نوا شاعر جس قصبے کا باشندا تھا آج اس قصبے (نکودر۔ ضلع جالندھر۔ پنجاب) میں ادبی مذاق کے فقدان کا یہ عالم ہے کہ نہ کوئی اس فاضل مصنف کے نام سے واقف ہے اور نہ کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کون تھا اور کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ دو ڈھائی سو سال میں ایک ہنرمند شاعر کی یاد اور اس کے حسب نسب کا اس طرح مٹ جانا قابل افسوس ہے

کھل کے مرجھا بھی گیا آنکھ کسی کی نہ پڑی
میں چمن زار جہاں میں گل صحرائی تھا

سسی اور پنوں کی داستان عشق زبان زد عوام ہے۔ سینما نے اس قصہ پارینا کی یاد اب تازا کر دی ہے۔ اندرجیت نے بھی یہ قصا فارسی نظم میں تصنیف کیا ہے۔ جو قلمی مسودے کی صورت میں اب تک منشی غلام دستگیر نامی ساکن لاہور کے خاندانی کتب خانے کی زینت ہے اسی مسودے کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ مثنوی ایک ہندو فاضل کی تصنیف ہے۔

۴۔ اسی مضمون میں حمد مناجات کے کچھ نمونے پیش کرنے کے بعد لکھا ہے

دونوں عنوانوں کے ماتحت جو کچھ کہا گیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ منشی نے باکمال سخنوروں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ اور اپنے زمانے کے کسی قابل ترین استاد کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا ہے۔ طبیعت کا رنگ مثنوی کے لیے بہت ہی مناسبت اور تطابق رکھتا ہے۔ درد مند دل اس خوش بیانی کو اور بھی لے اڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شعر تاثیر کی دولت سے بے بہرا نہیں۔ وہ حسن بیان اور یکتا کلامی اور جدت آرائی کا حق ہر شعر میں ادا کرتا چلا جاتا ہے۔ الفاظ کا دروبست اس کے ہاں زیادا سے زیادا معنیٰ خیز ملتا ہے۔ اسلوب بیان بھی بالکل اسی زمانے کا ہے، جس میں منشی نے اپنی زندگی بسر کی۔ ہر شعر کی بندش، الفاظ کی تراش ترکیبوں کی جدت اور لطافت اسی زمانے کے انداز سخن گوئی کی یاد دلاتی ہے۔ مثلاً اگر رگ آرام رسیدے تا ہے دہ۔ مقام رہا جابت آشنا کن مژہ را شاخ مرجان جگر دہ۔ ملا یک شبنم صبح جمالش۔ سخن چوں گشت ناہی نہد در م دار وغیرا مصرعے اور اسی قبیل کے اشعار اس زمانے کی معنی آفرینی و رنگین بیانی کا نمونا ہیں۔ جس کی آب و ہوا میں منشی اور اس کی شاعری نے پرورش اور نشو و نما پائی۔ زمرہ عشاق کی گنتی میں ہیرا اور رانجھے کا نام ایک پنجابی ہی کو سوجھ سکتا ہے اسی ضمن میں نل دمن کا نام ایک ہندو شاعر ہی کے خیال میں آسکتا ہے۔

۵۔ اسی مضمون میں حمد و مناجات کے بعد ــــــ

مناجات اور توحید کے عنوانوں پر زور قلم دکھانے کے بعد منشی مرحوم نے صفحۂ قرطاس پر جو آب دار موتی بکھیرے ہیں ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازا جوہریانِ سخن ہی کو بخوبی معلوم ہو سکتا ہے چار سال کی عمر میں منشی کا کیا عالم تھا۔ یہ جاننے کے لیے اس شعر کو پڑھیے ؎

چہارم سال از رنگیں بیانی
رباعی شد ز دیوان فغانی

اسی طرح سات سال کی عمر میں جو کیفیت تھی وہ بھی ملاحظہ ہو ؎

بہ ہفتم سال چوں برلبست ہر ہفت
عنانِ ہوش ہفت انجم ز کف رفت

معنی آفرینی۔ نزاکت خیال اور رنگین گفتاری کے ثبوت میں یہی دو شعر کافی ہیں۔ یہ دو شعر دو قصیدوں پر بھاری ہیں۔ تمام مسودے میں حسن بیان کا یہی عالم جا بجا نظر آتا ہے۔ نہایت افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ زمانے کے شیوۂ کمال ناشناسی نے ایسے گراں مایا اور نغز گو شاعر کو پردۂ خمول میں رکھا۔ اور سب سے زیادہ ماتم اس بات کا ہے کہ سوائے ان دو تین باتوں کے جو مرحوم نے نظم کر دی ہیں مزید تفصیلی حالات اس کے وطن مالوف میں بھی کوئی نہیں جانتا۔

۶۔ ذوق سے ناانصافی ـ اس مضمون میں مرزا غالب کی قدر و منزلت کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔

ایک باکمال شاعر کی یہ قدر و منزلت دنیائے ادب میں بلا شبہ غیر معمولی ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ مرزا غالب کے کمالات نظم و نثر فی الواقع اسی عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ مگر جس طرح ہر روشنی کا ایک تاریک پہلو بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح غالب شناسی بھی جنون انگیز غالب پرستی میں تبدیل ہو چکی ہے وہ جو کسی نے کہا ہے۔ "پیراں نمے پرند مریداں مے پرانند"۔ خوش اعتقاد ارباب ذوق غالب پرستی کے نشے میں چور ہو کر جادۂ مستقیم سے دور جا نکلے ہیں۔ وہ غالب کو دور آخر کا بہت بڑا سخن ور اور زبردست انشا پرداز ہی نہیں مانتے، بلکہ حکیم فلاسفر۔ عارف۔ ولی اللہ۔ محب وطن اور قوم پرست بھی مانے جاتے ہیں۔ ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ دیوان حافظ کی طرح دیوان غالب سے فال دیکھنے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ ہندستانی اردو داں کے تمام اساتذہ کے حقوق بھی ان سے چھین کر غالب اور صرف غالب کی جھولی میں ڈال دیے گئے ہیں۔ متقدمین و متوسطین میں کوئی بھی ان کا مد مقابل تسلیم نہیں کیا جاتا۔ غالب کی پاپرستی کا جذبا اگر اسی حد تک رہتا تو بھی کسی کی خوش اعتقادی پر متعجب ہونے کی چنداں ضرورت نہ تھی "لیلیٰ را بہ چشم مجنوں باید دید" کا مقولا مشہور رہے۔ مرزا غالب کا کلام بلاغت نظام بجائے خود حسن و جمال کا مخزن بھی ہے۔ مگر اس خوش اعتقادی نے کورانا خوش اعتقادی بن کر یہ خرابی بھی پیدا کر دی ہے کہ دوسرے باکمالوں کی جایز عزت و تکریم تو درکنار ان پر افتاد طبیعت، رکاکت، ابتذال۔ پستی ذوق۔ نقالی۔ کور سوادی اور عریاں نگاری کے الزام عاید کیے جا رہے ہیں۔ معاملا یہیں ختم نہیں ہو جاتا، ان کے لیے سرقے کی تہمت بھی تراشی جاتی ہے ذوق مرحوم اس ناانصافی میں سب سے زیادہ مورد عتاب ہیں۔ اس مضمون میں ہمارا موضوع بحث یہی ہے کہ اس قسم کے غلط اور ناروا الزامات پر منصف مزاج ارباب فہم کی توجہ مبذول کرائیں

مرزا غالب کی اس قدر پرستش کرنے میں زمانہ حال کا مذاق سخن فہمی کتنا ہی حق بجانب کیوں نہ ہو اسے اتنا ناانصاف تو نہ ہونا چاہیے کہ دوسروں کے کمالات کی تحقیر و تذلیل اور اہانت بھی گوارا کر لے۔

۷۔ حضرت احسن مارہروی کی غزل گوئی پر مضمون کا ایک پیراگراف

ہر ترقی پسند شاعر اور ادیب (ان الفاظ سے آج کل کے

وہ گم کردہ راہ شاعر او ر ادیب مراد نہیں ہیں، جن کی افتادِ طبیعت اور جن کے مذاقِ ادب پر ان کی نثر کا ہر فقرہ اور ان کی نظم کا ہر مصرع صفِ ماتم نظر آتا ہے اور جنہوں نے ترقی پسند ادب کا مفہوم عریاں قسم کی جنسی محبت یا اشتراکیت ہی کو سمجھ رکھا ہے) ہمیشہ اپنا مذاقِ سخن زمانے کے مذاقِ سخن اور پسندِ عام کے ماتحت رکھنا چاہتا ہے اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا کلام مقبول نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت احسن کی کی غزل میں رنگِ قدیم کی وہ عریانی جو ذوق، غالب، داغ اور امیر وغیرہ کے کلام میں بھی کم و بیش پائی جاتی ہے کہیں نظر نہیں آتی۔ مبتذل محاورے مبتذل قافیے اور مبتذل مضامین سے وہ پورے محتاط نظر آتے ہیں۔ پاکیزہ مضامین کی دولت سے ان کا دامنِ سخن مالا مال نظر آتا ہے اس لیے ان کے اشعار ترقی یا فتہ غزل کی مثال میں بڑی جرأت سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بیخود بدایونی پر جو تبصرہ لکھا ہے اس کا آخری حصہ دیکھیے

تغزل میں جس چبھتی ہوئی مگر لطیف شوخ بیانی کی ضرورت ہے وہ جناب بیخود کی طبیعت میں بدرجۂ اتم موجود تھی ان کی زندہ دلی اور رنگین مزاجی نے بھی اس حسنِ سخن کو چمکایا درد دل اور سوز و گداز نے اس میں وہ تاثیر پیدا کر دی، جو ایک کامیاب شاعر کے کلام میں ضروری عنصر ہوتی ہے۔ اس چبھتے ہوئے اندازِ بیان کی مثالیں ان کی غزل میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اتنا دلکش اتنا مرغوب اور اتنا معروف ہے۔ عاشقانہ نوک جھونک اور معاملہ بندی میں وہ ہر جگہ بازی لے جاتے ہیں۔ اور بندش تو اتنی چست اور بے ساختہ ہوتی ہے کہ شعر پڑھتے ہی دل میں اتر جاتا اور ایک مستقل اثر چھوڑ جاتا ہے۔ تخیل کی نزاکت و مضامین کی نفاست زبان کی فصاحت برمحل الفاظ کا تناسب نرالے اسلوبِ بیان، حسنِ ادا الغرض استادانہ کلام کے جملہ اوصاف میں وہ امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ غزل ہو یا رباعی قطعہ ہو مخمس ہر ایک چیز محاسنِ صوری و معنوی کی دولت سے مالا مال ہے۔ آہ اب اس پایہ کے خوش بیان کہاں جو دو چار باقی ہیں۔ وہ بھی کوئی دن کے مہمان ہیں۔ سیکڑوں خاموشیوں اور سہمی ہوئی مدہوشیوں کے دورِ حاضر میں یہ امید بھی نہیں کہ جذبات نگاری کی یہ دنیا آیندہ بھی عہدِ ماضی کی طرح آباد نظر آئے گی اور رنگِ قدیم کو نباہنے والے جادو نگار آیندہ بھی اس محفل کو گرم رکھیں گے جیسے بیخود جیسے جادو رقم شعرا نے زینت دی تھی باتیں بنانے والے تو بہت ہوں گے۔ مگر ان خوش بیانوں کا صحیح جانشین کوئی نہ ہوگا۔ جناب بیخود ہی کے ایک حسرت ناک شعر پر اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔

تذکرہ بیخود کا یارانِ وطن میں رہ گیا
کیا فسانہ حیف کیسی انجمن میں رہ گیا

۹۔ کراچی کا سفر اور وہاں کے سالانہ مشاعرے کی صرف ایک جھلک

میں شرکتِ مشاعرہ کی غرض سے یہ خیال کر کے کہ دو راتیں سفر میں نہ رہوں، ۹ راپریل ۵۴ء کی شام کو لاہور پہنچ گیا۔ رات وہاں آرام کیا۔ ۱۰ راپریل کی صبح ۹ بجے کراچی میل میں سوار ہوا۔ ملتان اور بہاول پور کے گرم خطے رستے میں پڑتے تھے۔ نیز اس سال موسم گرما بھی قبل از وقت شروع ہو گیا تھا، اس لیے منٹگمری سے حیدر آباد سندھ تک کا سفر بہت ہی صبر آزما تھا۔ ملتان کی چار چیزیں مشہور ہیں۔ گرد و گرما گدا و گورستان۔ اس میں سے دو چیزیں گرد و گرما تو ملتان دیکھے بغیر اس سفر ہی میں دیکھ لیں۔ مسافروں کی بھیڑ نے گرمی کو اشتداد تک پہنچا دیا۔ گاڑی کی تیز رفتاری نے وہ خاک اڑائی کہ ملتان کا گرد و غبار بھی گرد ہو گیا۔ لباس کے علاوہ سر، مونھ ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک کان سب اتنے گرد آلود کہ مسافروں کی ہیئت کذائی دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ "این عالم، عالم دیگر است"۔ الٹی پڑنے والے اس سفر میں بہت ہی شامت زدہ نظر آئے۔ گاڑی کے جھروکے بند کیے جائیں، تو گرمی کی شدت اور حبس دم گھونٹ دیے

جائیں تو بے پناہ گرد و غبار کی آفت مسافروں کا یہ حال کہ کوئی کپڑے جھاڑتا ہے کوئی اپنی نشست صاف کرتا ہے کوئی چھینکتا ہے کوئی کھانستا ہے بالائی تختوں پر اگر کوئی سو گیا ہے تو بے انداز اگرد جمع ہو ہو کر اس کی شکل بھی پہچانی مشکل ہو گئی ہے۔ پلکیں تک گرد آلود نظر آتی ہیں۔ گاڑی دو دو ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے تک کہیں نہیں رکتی۔ ساٹھ ساٹھ ستر ستر میل تک مسلسل دوڑتی چلی جاتی ہے۔ پانی کی ٹھلیا ساتھ لیے بغیر اس سفر میں گذارا مشکل ہے۔ بار بار ہاتھ موبنھ دھونے اور پیاس بجھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مجھے بھی کئی دفعہ یہ احساس ہوا کہ اس مشاعرے کا دعوت نامہ منظور ہی کیوں کیا ــــ ؟

۱۰۔ شعرا کا ذہنی ارتقا۔ بہت سے موازنوں میں سے صرف ایک سہ

ناقوس برہمن سے تکبیر سے اذاں سے
آواز آ رہی ہے ان کی کہاں کہاں سے

اک طرف ہے شور ناقوس اک طرف بانگ اذاں
عشق حیراں ہے کہ تیری کونسی آواز ہے

یہ دونوں شعر از ندا شعرا کے ہیں۔ ایک الم مظفر نگری کا ہے۔ اور دوسرا امید ڈبائیوی کا۔ دونوں شعر اپنی اپنی جگہ بہت اچھے اور قابل داد ہیں فنی لحاظ سے کوئی بات کہنے کی گنجائش نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ الم نے شعر ایسے مقام پر کھڑے ہو کر کہا ہے جہاں مغایرت فنا ہو جاتی ہے۔ اور ہر ایک آنہ زیں چاہے وہ کہیں سے آئے۔ وحدت ہی وحدت پائی جاتی ہے۔ امید اس شعر میں ایسی منزل پر ہیں جسے عالم حیرت کہا جاتا ہے یہ منزل بھی ہر سالک کے رستے میں ضرور آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابھی شور ناقوس اور بانگ اذاں کو دو مختلف آوازیں خیال کرتے ہیں اور حیران ہو کر عشق کی زبان سے پوچھتے رہیں کہ اے محبوب ان دونوں میں تری آواز کونسی ہے۔ عشق کو حیران بتانا اس شعر میں بہت ہی برمحل ہے وجہ یہ کہ عشق صادق ابھی اس منزل یا اس مقام پر نہیں پہنچا جہاں مختلف آوازوں کو ایک ہی ذات کی آواز خیال کرے۔ اور ہمہ اوست کے راز کا شناسائی ہو جائے۔ جب وہ اس مقام سے بھی بلند مقام پر پہنچ جائے گا تو اس کی حیرانی بھی جاتی رہے گی اور اس قسم کے سوال اس کے دماغ میں کبھی نہ آسکیں گے گویا جس جس مقام پر کھڑے ہو کر یہ شعر کہے گئے ہیں۔ ان کے لحاظ سے صداقت بیان میں کوئی کلام نہیں اور کسی شعر کو کسی شعر پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ البتہ فنی نقطہ نگاہ سے یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ الم کا شعر چونکہ مطلع ہے اور مطلع کے دونوں مصرعے خوب چست اور برابر کے ہیں۔ اس لیے وہ زیادہ داد کا مستحق ہے۔

لوح مرقد پر

حکیم یوسف اعظمی

خوشی میں زندگی کاٹی خوشی سے مر رہا ہوں میں
مگر اک آرزو نذر احبا کر رہا ہوں میں

کشادہ آسماں جس جا ستاروں سے بھرا پاؤ
اسی کے سائے میں اک قبر کھودو مجکو دفنا دو

بس اتنی ہی تمنا ہے کہ لکھوا دو سر تربت
جہاں چاہا وہاں رہنے کی پوری ہوگئی حسرت

مسافر کی طرح دنیا میں رہنے کی ضرورت ہے
نکل آئے مجھے سیر گل کو بس اتنی ہی فرصت ہے

سمندر سے تھکا ملاح جیسے گھر کو جاتا ہے
پہاڑوں سے شکاری پلٹ مسکن کو آتا ہے

اسی صورت سے واپس آگیا میں اپنی منزل پر
کہ اب تو زندگی اک بوجھ تھی یوسف مرے دل پر

بلبل داغستان

ک۔ یوسف

پہاڑی گاؤں اشاگاستال کا مشہور نغمہ خواں اور داغستان کا عوامی شاعر استالسکی، جس کی شہرت سوویت یونین سے باہر دور دور تک پھیل چکی ہے، ۸۵ سال قبل ۱۷ مئی کو پیدا ہوا تھا۔

ایک غریب کسان کا چشم و چراغ استالسکی جس نے اپنے بچپن اور جوانی میں افلاس اور بدحالی کے مصایب جھیلے تھے اپنے عوام کی شاندار خدمت کرتے ہوئے فن کی بلندیوں پر پہنچا وہ ــــ ایک معمولی کسان ــــ ایک مایہ ناز اور عزت مآب شاعر ہی نہیں بلکہ ایک ممتاز سیاست داں بھی ثابت ہوا۔

میکسم گورکی نے جب اس کو "بیسویں صدی کا ہومر" کہہ کر یاد کیا تو اس نے سلیمان استالسکی کو خداداد قسم کی نئی اور تابناک صلاحیتوں کو خراج عقیدت پیش کیا۔

سلیمان استالسکی کی زندگی کے کئی سال انقلاب سے پہلے کے زمانے میں بیتے جب عوام قومی محکومی، لوٹ اور افلاس کا شکار تھے۔

۱۴ سال کی عمر میں اپنے گاؤں کو خیرباد کہنے کے بعد سلیمان استالسکی نے اہل زر کے لیے اپنا خون پسینا ایک کیا۔ اس نے انگور کے چمن میں باغبانی کی۔ اصطبلوں میں کام کیا۔ انہوں نے لکڑیاں پھاڑیں اور احاطوں کی صفائی کی۔ اس کے بعد کے سالوں میں اس نے باغوں میں تیل کے چشموں میں اور ریلوے کے کارخانوں میں کام کیا۔ بعد میں استالسکی نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہا "اس زمانے میں میں نے بہت کچھ دیکھا اور سیکھا لیکن اس دور میں سب سے اہم بات میں نے یہ سیکھی کہ ہر جگہ محنت کشوں کی زندگی یکساں مصایب و آلام کا شکار ہے۔ اور یہ غریب عوام سیر دریا کے کنارے اور میرے پیدائشی گاؤں میں یکساں ناخوش اور پریشان حال تھے۔"

سلیمان استالسکی نے غریب عوام کی زبوں حالی کے بارے میں گیت لکھنا شروع کیے۔ اور ان گیتوں میں اس نے عوام پر ظلم ڈھانے والوں اور ظلم و تشدد کی دنیا کے خلاف اپنی نفرت کی آگ بھر دی۔ آگے چل کر اس چیز کو یاد کرتے ہوئے جس نے پہلی بار ان میں ایک نغمہ خواں بننے کے خیال کو ابھارا۔ اس نے یہ کہانی بیان کی۔ ایک دن جب وہ کھیت سے زمیندار کے لیے گیہوں کاٹ کر واپس آ رہا تھا تو گاؤں کی سڑک پر اس کو ہجوم نظر آیا۔ قریب آیا تو اسے معلوم ہوا کہ گاؤں کے لوگ خانہ بدوش گویوں کے نغمے سننے کے لیے باہر نکل آئے ہیں۔ جھرمٹوں میں اٹے ہوئے اور اپنے ہاتھوں میں طنبورے لیے یہ گویے زمین پر بیٹھے گا رہے تھے۔ سلیمان آنکھیں بند کیے ان کے گیت سن رہا جیسے کوئی سینما دیکھ رہا ہو۔

اس نے اپنے پڑوسی سے کہا۔ "سلطان ــ یہی باتیں تو میں ہر روز اپنے آپ سے کہا کرتا ہوں۔ لیکن آخر اس کے بارے میں گیت گانے کا خیال پہلے کبھی پیدا کیوں نہ ہوا ــــ یہ تو میرے اپنے الفاظ ہیں۔"

اور سلیمان نے کھیت میں محنت کے دوران میں گیت بنانا شروع کیے۔ کھیت سے شام کو گھر لوٹتے ہوئے وہ اپنے دوستوں کو گیت گا گا کر سناتا۔ استالسکی کہتا "مجھے پتا ہی نہ چلا آخر یہ سب کس طرح اور کیوں کر ہوا۔ لیکن یکایک میرے گیت گاؤں میں سنے جانے لگے۔"

استالسکی کے سادہ گیت عوام کے دلوں میں اتر گئے یہ گیت آزادی اور دلیری کے ساتھ داغستان میں اور اس کے بعد پورے قفقاز میں پھیل گئے۔ ہر نئے گیت نے اپنے

نغما ساز کے اندر زیادہ مہارت اور شہرت پیدا کی۔ استالسکی نے ہمت اور جذبے دل کے ساتھ امیروں، زار کے احکام اور رجعت پسند خداوندان کلیسا پر تازیانے لگائے۔ اس نے اپنے گیتوں کے لیے موضوع اور تخیلی تشبیہیں، عوام اور اپنے جیسے غریب ساتھیوں کی زندگی سے حاصل کیں اور پھر یہ گیت اس کے وطن میں ہر طرف پھیل گئے۔

مقامی امرا اور زار کے حکام نے عوام کے ان خطرناک نغما خواں کو ٹھنڈا کرنے اور توڑ کر اسے اپنے قابو میں لانے کی کوشش کی۔ جب اس میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے اس شاعر کو جیل اور جلا وطنی کی دھمکی دینا شروع کی۔ لیکن بیکار امن پسند گیت اور زیادہ تاب و توان کے ساتھ گونج اٹھے۔ وہ آخری دم تک اپنے عوام کے وفادار رہے۔ سلیمان استالسکی نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ اکتوبر کے عظیم سوشلسٹ انقلاب کا خیر مقدم کیا۔

اس کی صلاحیتیں انقلاب کے بعد جس طرح جلا پا کر ابھریں اور پروان چڑھیں اس سے پہلے کبھی اس طرح ابھری اور پروان نہیں چڑھی تھیں۔ شاعر نے اپنے بہت سے گیتوں کا انتساب فاتح عوام کے نام سے کمیونسٹ پارٹی کے نام سے انقلاب کے رہنما لینن، اسٹالن اور سوشلزم کی نئی اور درخشاں دنیا کے نام سے کیا۔ استالسکی کے گیت اخباروں اور رسالوں کے صفحوں میں، درسی کتابوں اور سوویت شاعری کے انتخابوں میں اور ریڈیو اور کنسرٹ کے اسٹیجوں پر گونجتے رہے۔

سلیمان استالسکی نے اپنے پیدائشی گاؤں کی تعمیر اور داغستان کی سوشلسٹ تعمیر میں عملی حصہ لیا۔ وہ بار بار مقامی سوویتوں کا ممبر منتخب ہوتا رہا۔ سلیمان استالسکی نے اپنے وطن کے علاقے میں اور سوویت یونین کی راجدھانی ماسکو میں لوگوں کو اپنے نغموں اور تقریروں کے ذریعے پہاڑیوں کی نئی زندگی اور آزاد پر مسرت محنت کے متعلق بتایا۔ جو ماضی میں اپنی ایک تحریری زبان سے بھی محروم تھے۔ اس نے سوویت قومیتوں کی دوستی اور اور یک جہتی کے گیت گائے۔ اس نے نئی زندگی کے گیت سوویت فوج کی طاقت کے گیت، کمیونسٹ پارٹی کے فہم و ادراک اور سوشلزم کی سرزمین کے رہنماؤں کے گیت گائے۔

سلیمان استالسکی کی شاعری کے بیش بہا موتی سوویت یونین کی مختلف قومیتوں کے ادب کی دولت ہیں۔ اس نے اپنے گیتوں کے لیے واضح ترین، زوردار اور صد درجہ خیال آفریں اور بصیرت افروز تشبیہوں کا انتخاب کیا۔ استالسکی میں گہرے اور واضح خیالات کو حد درجہ ایجاز و اقتصار، اور تیز و تند مگر واضح رنگین اور جامع اور بلیغ انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت تھی۔

عظیم نغما خواں استالسکی اپنے ملک میں رونما ہونے والے ہر اہم واقعے سے متاثر ہوتا تھا۔ وہ صحیح معنی میں ایک انتھک انسان تھا۔ جب کبھی کوئی ان کی ضعیفی کا ذکر کرتا اور انہیں اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ تھکانے سے باز رہنے کو کہتا تو اس سے اس کے دل کو تکلیف پہنچتی "کیا میں ایسے وقت خاموش رہ سکتا ہوں؟ ــــ نہیں میں خاموش نہیں رہ سکتا کیونکہ میں شاعر ہوں ــــ ایک سچے شاعر کا دل ہمیشہ شعلہ فشاں رہنا چاہیے ــــ" اور پھر وہ جواب میں کہتا "اس کے دل کو گرما کی دھوپ کی طرح فیاض ہونا چاہیے۔ اس کی نفرت کو طوفان بدوش دریا کی طرح غضبناک ہونا چاہیے"۔

ستر سالا بوڑھا اور میانا قد استالسکی جن کی صاف شفاف آنکھوں سے ایک چبھتی ہوئی نظر جھانکا کرتی جن کے طور طریق غیر معمولی طور پر نیک اور مختاط تھا۔ جو قفقاز کے پہاڑیوں کا قومی لباس پہنا کرتا تھا۔ لوگوں میں ہر دل عزیز اور مقبول بھی تھا۔ جو کوئی اس سے ایک بار بھی ملتا ان کا احترام اور ان سے محبت کرنے لگتا ــــ

سلیمان استالسکی نے اپنی بہت سی چھوٹی نظموں کے علاوہ رزمیہ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً "داغستان" "سرگو اور جونکیدزے کی نظم" (بہترین نظموں میں سے ایک) "کمیونسٹ پارٹی اور سوویت ریاست کے رہنما" "خیال وطن" وغیرہ۔ ادب کے میدان میں ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں

سویت حکومت نے سلیمان استالسکی کو لینن تمغا عطا کیا۔ انعام لیتے ہوئے اس نغما خواں نے کہا "میں ستر سالا بوڑھا ہوں۔ لیکن میری پوری زندگی اس وقت کے ستر لمحوں کے مقابلے میں ہیچ ہے۔ میں ایک زنگ آلود ہتھیار کی طرح ہوں۔ جو زمین کے اندر دفن تھا۔ کمیونسٹ پارٹی اور سویٹ حکومت نے اس ہتھیار کو زمین کے اندر سے نکالا۔ اس پر صیقل کی۔ اور اس میں آب و تاب پیدا کی۔"

قزاقستان کے شاعر جمبول جابر، سلیمان استالسکی کو "بلبل داغستان" کہہ کر یاد کرتے تھے۔

سلیمان استالسکی نے داغستان کے لوک گیتوں کے سرچشمے سے اپنے موضوع اور تخیلی تشبیہیں حاصل کیں۔ مشرقی قوموں کی شاعری پر وہ ایک عظیم سند کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے گیتوں اور نغموں میں بہت سے ٹکڑے ہیں۔ جو آج قفقاز میں کہاوتوں اور ضرب المثل کی حیثیت سے زبان زد عوام ہیں۔ اس نغما خواں کا شاعرانا ورثا عظیم مرتبت اور نادر ورثا ہے۔

۲۳ نومبر ۱۹۳۷ء کو سلیمان استالسکی کی موت سے سویت ادب کو ایک زبردست نقصان پہنچا۔ سویت ادیبوں کی یونین نے اس کی موت کی خبر شایع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ——

"سلیمان استالسکی نے اپنی طویل زندگی کا زیادہ تر حصا عوام کے دکھ درد اور آزادی مستقبل کی امید کا گیت گانے کی نذر کر دیا اور اس نے اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے وہ دن دیکھا جب عوام کے خوابوں کی تعبیر حقیقت میں بدل گئی ان امیدوں اور خوابوں کے نغما خواں کو اس بات کی خوش نصیبی میسر ہوئی کہ وہ سوشلسٹ سماج کے معماروں کی سب سے اگلی صف میں تھے۔"

"عوام کے شاعر کی حیثیت سے داغستان کے نغما خواں کی حیثیت سے عوام مسرت و شادمانی کے لیے لڑنے والے ایک مجاہد کی حیثیت سے سلیمان استالسکی کی شاندار زندگی، عوام اور مادر وطن کی ثابت قدم خدمت کی ایک مثال ہے۔"

وسط قطب شمالی میں سویت سائنس دانوں کی دریافتیں

جنگ کے بعد کے زمانے میں، وسط قطب شمالی میں سویت تحقیقات کا جو کام ہوا ہے اس کے بارے میں —— وسطی شمالی سمندری رستوں کے انتظامی محکمے کے قطب شمالی تحقیقاتی ادارے نے پچھلے دنوں، سویت یونین کی سائنس اکادمی کی مجلس صدارت کے سامنے ایک رپورٹ پیش کی۔

سویت تحقیقاتی مہموں نے زیر آب پہاڑی سلسلے کا پتا چلایا ہے جو ڈھائی یا تین کلو میٹر (اکلو میٹر = ۵/۸ میل) اونچا ہے اور نئے سائبیریائی جزیروں سے گرین لینڈ کی سمت میں بحر منجمد شمالی کو کاٹتا چلا گیا ہے۔ مہموں نے اور بھی کئی پہاڑی ابھار کا سراغ لگایا ہے جنہوں نے سمندر کو متعدد گہرے بیسنوں میں تقسیم کر دیا ہے ان دریافتوں کی بنیاد پر بحر منجمد شمالی کے وسطی حصے کی گہرائیوں کا پہلا مستند نقشا تیار کر لیا گیا ہے۔

سویت سائنس دانوں کا یہ مفروضا کہ وسط قطب شمالی میں ارضیاتی مقناطیسی لہروں کی کچھ اپنی خصوصیات ہیں خاص قسم کی مقناطیسی خطوط کی بے ضابطگی کی دریافت اور سراغ سے جو قطب شمالی کے بہت بڑے حصے پر محیط ہیں۔ پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے ان مہموں کی کاوشوں کے نتیجے کے طور پر جو نقشا تیار ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ٹائمر جزیرا نما کے علاقے میں تو مقناطیسی خطوط بہت گھنے ہیں۔ لیکن اس سے آگے شمال مشرق کی طرف یہ خطوط ڈھل جاتے ہیں۔ اور قطب کے گرد حصے کینیڈا اور قطبی مجمع الجزایر کی طرف دوڑتے ہوئے تقریباً متوازی خطوط کا ایک تنگ بنڈل بن جاتے ہیں۔ یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ قطب شمالی کے علاقے میں کوئی دوسرا مقناطیسی قطب نہیں ہے۔ اونچے عرض البلاد میں مقناطیسی انتشار کے بارے میں بھی دلچسپ معلومات اور اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں۔

پنجاب کی لوک کہانیاں

شمشیر سنگھ نرولا

پنجاب کے لوگوں کے لیے "لوک کہانیاں" یہ ان کتھائیں اور روایتی سورماؤں کے قصے نہ صرف تفریح و مسرت کا سرچشمہ ہیں بلکہ ان میں زندگی کی لگن اور نت نئی امنگیں پیدا کرنے کا موجب بھی ہیں۔ ان میں سے کئی داستانوں کا منبع "رگ وید" اور "مہابھارت" ہیں اور بعض کا "پنچ تنتر" اور "جاتک"

پنجاب کی سب سے قدیم "لوک کہانیاں" ان روایتی سورماؤں کے کارناموں کو بیان کرتی ہیں جو مافوق فطرت قوت کے مالک تھے۔ اور جنہوں نے بدی کے خلاف نبرد آزما ہو کر ان پر فتح پائی۔ اس قسم کی کہانیاں پنجاب میں ضرب مثل ہیں۔ اور ان میں سے راجا رسالو کی کہانی سب سے زیادہ مقبول ہے راجا رسالو کی بہادری کی داستان کو ایک کہانی کی بجائے مختلف کہانیوں کا مجموعہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا جو پنجاب کے مختلف حصوں میں مختلف شکلوں میں مروج ہیں۔ اس کی مقبول ترین روایت اس طرح پر ہے۔

راجا سالباہن کی دو بیویاں تھیں۔ رانی اچھرا اور رانی لونا، بڑی رانی اچھرا کا ایک خوب صورت بیٹا تھا جس کا نام پورن تھا۔ رانی لونا نے اگرچہ بہت منتیں مانیں اور جتن بند کیے لیکن اس کی گود ہری نہ ہوئی۔ اس طرح اس کے سینے میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ راجکمار پورن کو جوان ہوتے دیکھ کر وہ اپنے جلاپے پر قابو نہ پا سکی۔ اور پورن کے خلاف راجا سالباہن کے کان بھرنے لگی۔ اس نے پورن پر الزام لگایا کہ وہ اسے بری نظر سے دیکھتا ہے۔ راجا سالباہن نے غصے سے آگ بگولا ہو کر پورن کے ہاتھ پاؤں کٹوا دیے اور اسے اندھے کنوئیں میں ڈلوا دیا۔ گورو گورکھ ناتھ کا جب ادھر سے گذر ہوا تو انہوں نے پورن کو کنوئیں سے باہر نکالا اور اس کے ہاتھ پاؤں بحال کر دیے۔ اس دن سے پورن نے بھی جوگی بننے کا عہد کیا۔ اور گیروا لباس زیب تن کر کے شہزادہ پورن، پورن بھگت بن گیا۔

پورن کو معلوم ہوا کہ اس کی ماں (اچھرا) رو رو کر اندھی ہو چکی تھی۔ جس باغ میں وہ کھیل کر جوان ہوا تھا وہ سوکھ چکا تھا۔ گھر پہنچ کر پورن نے ماں کی بینائی بحال کی اور باغ کو ہرا بھرا کیا۔ اس نے اپنی سوتیلی ماں کے لیے بھی دعائے خیر مانگی اور اسے کھانے کو چاولوں کا ایک دانہ دیا جس سے وہ امید سے ہو گئی اور اسے آشیرباد دی کہ اس کا لڑکا بڑا نام پیدا کرے گا لیکن اس کے باپ کو بارہ سال تک اس کی شکل نہیں دیکھنی چاہیے رانی لونا کے اس بیٹے کو رسالو کا نام دیا گیا۔ اسے باپ کی نظروں سے اوجھل رکھنے کے لیے ایک تہ خانے میں رکھا گیا۔ جب رسالو گیارہ سال کا ہوا تو وہ اس تہ خانے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور گاؤں کے کنوئیں پر پہنچ کر اس نے پانی بھرنے والی عورتوں کے گھڑے توڑ دیے۔ عورتوں نے راجا سالباہن سے شکایت کی بادشاہ نے رسالو کو کچھ کہنے کی بجائے عورتوں کو پیتل کی گاگریں دیدیں۔ رسالو نے تیروں سے ان میں بھی سوراخ کر دیے۔ تب رسالو خود اپنے باپ سے ملنے گیا لیکن باپ نے بیٹے کی طرف پیٹھ پھیر دی۔ اس پر رسالو اپنے باپ کے دربار سے چلا آیا۔ اور قسمت آزمائی کے لیے جہاں نوردی کی ٹھانی اس کا سعید گھوڑا اور دو دوست اس کے ساتھی تھے ایک دوست لوہار کا لڑکا اور دوسرا بڑھئی کا بیٹا تھا۔

رانی سندران کا ستی ہونا

دوران سفر میں تینوں کے قوی ہیکل جانوروں اور دیووں بھوتوں سے لڑنے کے متعدد واقعات رائج ہیں۔ ایک دفعہ رسالو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر نیلا نامی ایک شہر میں جا پہنچا جہاں ایک آدم خور دیو کے سپرد کیے جانے کے لیے ایک مصیبت زدہ بوڑھی بیوا کے اکلوتے بیٹے کی باری تھی۔ رسالو نے بوڑھی بیوا کے بیٹے کی جگہ اپنے آپ کو پیش کیا اور دیو کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دیونی بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئی جس کے باہر رسالو نے ایک پتھر رکھ دیا۔ دیونی باہر جھانکتی اور خوفزدہ ہوکر اندر گھس جاتی۔ نیلا شہر سے رسالو ہونڈی نگری پہنچا۔ جہاں کی رانی سندران کے حسن کا چار سو چرچا تھا۔ سندران کے محل کے باہر ایک یوگی بائیس سال سے دھونی رمائے بیٹھا تھا لیکن اسے ملکہ حسن کا دیدار نصیب نہیں ہوا تھا۔ رسالو اس یوگی کا چیلا بن گیا اور بھیک مانگنے کے لیے نکلا۔ محل کے پاس اس کے صدا لگاتے ہی رانی سندران نے اپنی داسیوں کے ہاتھ مٹھائی کے تھال بھیجے۔ داسیاں رسالو کو دیکھ کر دم بخود رہ گئیں۔ رانی سندران نے پھر ہیروں کی تھال بھیجے اس بار بھی داسیاں رسالو کے نوخیز حسن کی تاب نہ لا سکیں۔ آخر رانی سندران خود نیچے آئی۔ رسالو اس خیال سے کہ رانی اس کا شہزادہ ہونا پہچان لے وہاں سے چل دیا۔ سندران کے یوگی سے رسالو کے بارے میں دریافت کرنے پر یوگی حسد سے جل اٹھا اور اس نے رانی کو جھوٹ موٹ بتایا کہ بھوک کی شدت سے مجبور ہوکر اس نے رسالو کو بھون کر کھا لیا ہے یہ سن کر رانی سندران کو اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ وہاں ہی چتا تیار کر وا کر ستی ہو گئی۔

بہت سی معرکہ آرائیوں کے بعد رسالو راجا سرکپ کے ساتھ چوسر کھیلنے کے لیے اس کے شہر میں پہنچا۔ شہر کے باہر قبرستان میں اسے ایک بے سر لاش ملی۔ جب اسے زندہ کیا گیا تو وہ بادشاہ سرکپ کا بھائی نکلا جسے دیوتاؤں کے لیے قربان کیا گیا تھا۔ بادشاہ کے بھائی نے رسالو سے کہا کہ اگر وہ سرکپ کے جادو والے پانسے کے مقابلے میں جیتنا چاہتا ہے وہ اسے اسی قبرستان کی ہڈیوں سے پانسا تیار کرنا چاہیے رسالو نے ایسا ہی کیا اور راجا سرکپ سے ملاقات کرنے کے لیے روانا ہوا۔ رستے میں اس نے ایک جھینگر کو آگ کی زد سے باہر نکال کر اس کی جان بچائی جھینگر نے اسے ایک بال دیا اور کہا کہ اگر رسالو کو کسی مصیبت کا سامنا ہو تو وہ اس بال کو جلا کر اسے مدد کے لیے بلا سکے گا۔

اس کے بعد رسالو نے بلی کے چھ بچوں کی جان بچائی۔ جو ایک بھٹی میں جل کر راکھ ہونے والے تھے بلی نے اظہار تشکر کے طور پر اسے ایک بلوٹا دیدیا۔ سرکپ کے محل کے باہر ستر حسین دوشیزاؤں نے اس کا رستا روک لیا۔ اور کہا کہ جب تک وہ انہیں کچھ معجزے نہیں دکھلائے گا تب تک اسے آگے نہیں بڑھنے دیں گی۔ رسالو نے انہیں کئی معجزے دکھائے جب اسے بہت سی ریت ملے سے ایک من جو الگ کرنے کو کہا گیا تو اس نے جھینگر کا بال جلا کر مدد کے لیے اسے بلا لیا۔ اس کے بعد ان لڑکیوں نے اسے اتنا بڑا جھولا تیار کرنے کو کہا۔ جس پر وہ سب چڑھ سکیں رسالو نے ایسا ہی کیا۔ اور جب تمام لڑکیاں اس جھولے پر بیٹھ گئیں تو اس نے جھولے کی رسی کاٹ دی اور جھولا گرنے سے سب سے چھوٹی دوشیزا جسے رسالو سے محبت ہو گئی تھی، ہی زندہ بچی۔

رسالو نے حسب معمول سات گھڑیال بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا۔ سرکپ کے ساتھ چوسر کا کھیل شروع ہونے سے پہلے سرکپ نے اسے زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ لیکن رسالو نے زہریلی خوراک سرکاپ کے کتے کو کھلا دی۔ کھیل کے آغاز میں رسالو ہارنے لگا۔ دو بار ہارنے کے بعد جب وہ اپنی زندگی کا داؤ لگانے ـــــ لگا تو اس کے گھوڑے نے اسے ایک چوہے کی چالاکی سے آگاہ کیا۔ جو پانسے کو ہلا کر سرکپ جیتنے میں مدد دیا کرتا تھا۔ رسالو نے اب بلی کے بچے کی مدد سے چوہے کو نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ ہڈیوں کا استعمال کر کے رسالو نے بازی جیت لی۔ سرکپ کو زندگی میں پہلی بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ عین اسی وقت اس کی بیوی نے کنک نامی بیٹی کو جنم دیا۔ (سنسکرت میں کنک کا مطلب سونا اور پنجابی میں گندم ہے)

سرکپ نے غصے میں آکر اپنی بیٹی کو قتل کرنا چاہا لیکن رسالو نے ایسا نہ ہونے دیا۔ سرکپ نے وعدا کیا کہ رسالو کے ہاتوں لگایا ہوا آم کا پودا جب بارا سال کے بعد بار آور ہو گا تو وہ راج پاٹ کنک کے حوالے کر دے گا۔ اس کے بعد رسالو اپنی سلطنت میں واپس پہنچا اور وہاں لوگوں نے انتہائی مسرت اور شادمانی سے اس کا استقبال کیا۔

رسالو کی کہانی کی مختلف شکلیں

یہ ہے رسالو کی کہانی کے بیان کی ایک شکل۔ ہر علاقے اور ہر قبیلے میں اس کہانی کی روایت میں کچھ نہ کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ مالوا (ضلع فیروز پور اور اس کے نواحی اضلاع) کے لوگ رسالو کو سیستان لے جاتے ہیں، جہاں وہ سنہری بالوں والی ایک لڑکی کو ایک دیو کے قبضے سے نجات دلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دو ہزار سال ہوے مالوا کے لوگ سیستان سے وارد ہوے تھے ان کے بادشاہ "موگا" کے نام پر ہی پنجاب کے موجودا شہر موگا کا نام رکھا گیا تھا۔ دوآبا (جالندھر اور ہشیار پور) میں رایج روایت کے مطابق رسالو ہمالیا کی جھیل مانسرور کے کنارے اور سچے موتیوں پر رہنے والے ہنسوں کی جان بچانے کے لیے وہاں جاتا ہے۔ اسی طرح ماجھا (دریاے راوی کے کنارے کا علاقا) کے لوگ رسالو کی کہاوت کو رگ وید کے ساتویں منڈل میں بیان کی گئی "دس راجاوں کی لڑائی" سے جوڑ دیتے ہیں۔ ایک تذکرے میں رسالو الوپ کرا دینے والی ٹوپی پہنتا ہے تو دوسرے بیان کے مطابق اس کے پاس ایسا لباس ہوتا ہے جو ہر چیز کو سونا بنا دیتا ہے یا اس کے پاس کھانے پکانے کا ایک ایسا برتن ہوتا ہے جو کبھی خالی نہیں ہوتا۔ کبھی اس کے پاس شیر کا ایک ایسا دانت ہوتا ہے جو خصوصی کرامات کا حامل ہے۔ کبھی کوئی ایسی چیز جس کے ذریعے غیر معمولی طاقت حاصل کر سکے وہ تاساکی رکاوٹ پر فتح حاصل کر لیتا ہے الغرض ایک بات ان سب میں مشترک ہے کہ رسالو نے غیر معمولی قوت کا مالک ہونے کے باوجود کبھی بھی اس طاقت کا نامناسب استعمال نہیں کیا۔ اور آج بھی اس کے نام کو فیاضی و نیکدلی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

سبق آموز کہانیاں

پنجاب میں مشہور دوسری قسم کی لوک کہانیاں ایسی ہیں جنہیں ہم نصیحت آموز کہہ سکتے ہیں۔ ان سے کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق اخذ کیا جا سکتا ہے۔ پنج تنتر کی کہانیوں کی طرح ان میں سے بعض کے کردار مختلف قسم کے جانور ہیں۔ ان میں قابل ذکر ایک چوہے کی کہانی ہے۔

ایک چوہا بارش سے بچنے کے لیے سوراخ نکال رہا تھا زمین کھودتے کھودتے اسے ایک خشک جڑ ملی۔ چوہے نے سوچا کہ یہ جڑ ایندھن کا کام دے سکے گی۔ اور وہ اسے اکھیڑ کر ساتھ لے گیا۔ رستے میں اس نے ایک شخص کو گیلی لکڑیاں سلگانے کی کوشش کرتے ہوے دیکھا۔ چوہے نے اسے سوکھی جڑ دی جس کے عوض اسے روٹی مل گئی۔ تب چوہا دوڑتا ہوا ایک کمہار کے پاس پہنچا۔ اور روٹی دے کر ایک برتن لے لیا۔ اس کے بعد رستے میں اسے ایک کسان ملا۔ جو برتن نہ ہونے کے باعث بھینس کا دودھا پنے جوتے میں دوہ رہا تھا۔ چوہے نے اسے برتن دے کر اس کے عوض بھینس مانگی جو مذاقاً اسے دے دی گئی۔ چوہے کو اب اس امر کا یقین ہو گیا کہ وہ سودا بازی میں بہت ماہر ہے تب اس نے ایک برات کو آتے دیکھا جس کے کچھ افراد ایک پالکی اٹھائے ہوے تھے۔ پالکی اٹھائے ہوے اشخاص نے چوہے سے بھینس مانگی۔ چوہے کی نظر دلہن پر تھی۔ بھینس ان کے سپرد کرنے کے کچھ دیر بعد جب وہ ایک دم چلایا کہ بھینس کے حقیقی مالک آگئے ہیں تو وہ سب پالکی کو وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس طرح چوہا دلہن کا مالک بن گیا چوہا اسے بیچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دلہن کی والدہ اسے مل گئی اور اس نے بیٹی

واپس لے لیا۔ چوہا جب اپنا حق جتانے کے لیے اس کے گھر پہنچا تو اسے ایسی تپائی پر بٹھایا گیا جس کے نیچے انگارے رکھے گئے تھے۔ چنانچہ چوہے کی دم اور آدھا جسم جل گیا۔ اور اسے وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اس طرح سے یہ کہانی ختم ہوتی ہے اور اس کہانی سے ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق اخلاقی نتیجا اخذ کیا جا سکتا ہے۔

حجام کی چالاک بیوی

ایک حجام اپنا سب کچھ کھو بیٹھا اور اس کی بیوی نے اس کے پاس جانے کو کہا۔ بادشاہ نے پیچھا چھڑانے کے لیے اسے کچھ بنجر زمین دے دی۔ بیوی نے اسے اس زمین میں کچھ تلاش کرنے میں مصروف رہنے پر مجبور کیا۔ اور یہ افواہ پھیلا دی کہ وہ زمین میں دبے ہوئے سونے کے ایک برتن کی تلاش کر رہا ہے۔ یہ خبر جب چوروں کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے راتوں رات اس برتن کو تلاش کرنے کے لیے تمام زمین کھود ڈالی۔ اس طرح یہ بنجر زمین بھی قابل کاشت بن گئی اور اس میں اچھی فصل پیدا ہوئی۔ حجام کی بیوی نے اس فصل کو بہت سی اشرفیوں کے عوض بیچ دیا۔ جب چور ان اشرفیوں کو چرانے کے لیے پہنچے تو اس نے اپنے خاوند سے بلند آواز میں کہا کہ اشرفیاں کی صندوقچی طاق میں پڑی ہوئی ہے۔ چور اس صندوقچی کو اٹھا کر بھاگ گئے۔ لیکن اس میں لید تھی۔ جب چور دوبارہ آئے تو اس نے اپنے خاوند سے کہا کہ اشرفیاں باہر درخت کے ساتھ لٹکے ہوئے تھیلے میں ہیں۔ چوروں نے جوں ہی اسے ہاتھ لگایا وہ بھڑوں کا چھتا نکلا۔ جس سے انہوں نے بمشکل جان بچائی۔ چور بھی اپنی ضد کے پکے نکلے اور وہ تیسری بار چوری کرنے کے لیے آئے۔ کہانی کے مطابق جب چوروں نے اس بار کھڑکی سے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو حجام کی بیوی نے ان میں سے ہر ایک کی ناک کاٹ لی۔ اس کے بعد وہ ایک دفعہ سوئی ہوئی تھی کہ چور اسے پلنگ سمیت اٹھا کر لے گئے۔ بڑ کے ایک درخت کے نیچے سے گذرتے وقت وہ ٹہنیاں پکڑ کر اوپر چڑھ گئی اور پری ہونے کا بہانا کیا۔ چور اس سے بہت خوفزدہ ہوئے اور تمام سامان وہیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ طاقت سے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے پر چوروں نے قانون کا سہارا لینے کا فیصلا کیا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران حجام کی بیوی نے چوروں کے ناک اور ان کا سامان پیش کر کے اپنا کیس اس خوبی سے پیش کیا کہ بادشاہ نے خوش ہو کر حجام کو اپنا وزیر بنا لیا۔ اور کہا "جب تک اس کی بیوی زندہ ہے اس سے ایسی حماقت پھر کبھی سرزد نہ ہو گی"۔

اوپر کی اسی قسم کی دوسری لوک کہانیاں پنجاب کے گاؤں میں مقبول ہیں۔ والدین بچوں کو ان سے زندگی کا سبق سکھاتے ہیں۔ اور گاؤں کے لوگ ان کو فرصت کے وقت بڑ کے پیڑوں کے سائے میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو سناتے ہیں۔ پنجابی عوام کے دلوں میں ان لوک کہانیوں کے لیے کشش کبھی ختم نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ قدیم اقدار کے خالق ہیں۔

وہی ان کے نگہبان ہیں۔ اور ان کے ہی ذریعے یہ تہذیبی ورثا نسلؔ در نسلؔ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

انجامِ مسرت پریشاں میں کیوں چمن ہے
نہ جانے آج [illegible] بجلی غبار اُٹھا ہے
گری ہے پھر کہیں بجلی سر اہلِ غم
[illegible] گرد و غبار اُٹھا ہے
سینے کی آگ ہے جو بھی ہے وہ [illegible]
حبیب (لکھنوی)

کشمیر کی سیر

ا ۔ ا

کشمیر کی سیر اور پہاڑوں پر چھٹیاں منانا ایک حسرت بھرا خیال ہے کیونکہ جس سے مغل شہنشاہوں نے گرمیوں کے دن کشمیر میں بسر کرنے کا رواج ڈالا ہے۔ تب سے وہاں تفریح اور چھٹیاں منانے کا فخر صرف امیروں کو ہی حاصل رہا ہے لیکن اب یہ بات نہیں رہی۔ آمد و رفت کے اخراجات میں رعایت اور سفر کی سہولتوں کے باعث سیر و تفریح کرنے والے ہر طبقے کے لوگوں کو یہ استطاعت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ ہندستان کے پہاڑی مقامات پر جا سکیں۔ اور خاص کر کشمیر کے بارے میں تو یہ بالکل درست ہے موجودہ سال کے شروع سے ریلوے کے ہر درجے میں سفر کرنے والے سیاحوں کو یہ مراعات دی گئی ہیں تاکہ لوگ سفر کے مہنگے اخراجات کے پیش نظر پہاڑوں پر سیر و تفریح کے لیے جانے کے خیال کو ترک کر دینے کی ضرورت محسوس نہ کریں۔

آج کل سب لوگ اپنی جیب پر بہت زیادا بوجھ ڈالے بغیر کشمیر کی سیر کر سکتے ہیں۔ سمجھدار سیاح عام طور پر اپنے تفریحی دورے کا اوقات نامہ پہلے سے تیار کر لیتے ہیں اپنے روپے اور وقت کا پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے سمجھداری کا تقاضا یہ ہے کہ روانگی سے پہلے ہی یہ اچھی طرح جان لیا جائے کہ موسم گرما کے کسی پہاڑی صحت بخش مقام پر کیا کیا تفریح کے سامان میسر آ سکتے ہیں۔ اور کشمیر کے بارے میں تو یہ بات خاص کر اہم ہے کیونکہ اس ملک میں ہر لحاظ سے قابل دید چیزوں کی اتنی بہتات ہے کہ کوئی چھٹیاں گذارنے والا سیاح ان سب کو نہیں دیکھ سکتا ہے۔

کشمیر میں چھٹیاں گذارنے والے شخص کے لیے سفر میں پٹھان کوٹ کو مقام روانگی فرض کر لینا بہتر ہو گا۔ حقیقت میں وہ ریل گاڑی کے ذریعے وہاں پہنچ چکا ہے اور اگر وہ تجربے کار مسافر ہے تو اس نے دیکھا ہو گا کہ اب ریل کے ذریعے سفر کرنے والے کنبوں اور گروہوں کو کرائے کی رعایت دی جاتی ہے ۔۔۔

پٹھانکوٹ سے سری نگر جانے کے لیے دو ہی رستے ہیں ہوائی جہاز کے ذریعے یا سڑک کے رستے، پہلے رستے سے جانا صرف اسی صورت میں ضروری ہو گا۔ اگر مسافر کسی کاروبار کے سلسلے میں کشمیر جا رہا ہو یا اسے جلدی ہو کیونکہ سڑک کے رستے بس میں یا کرائے کی اسٹیشن ویگن یا ٹیکسی میں سفر کرنے میں جو دلکشی ہے وہ اپنا جواب نہیں رکھتی۔

پٹھان کوٹ سے سری نگر تک دو سو سترستر میل کی مسافت ہے اگرچہ یہ کافی لمبا سفر ہے پھر بھی یہ اپنے انداز میں جوش انگیز اور فرحت بخش ہے۔ میدانی علاقوں کی جھلس دینے والی گرمی کے سفر کے برعکس اس رستے میں بہت سے سحر آفریں پڑاو آتے ہیں۔ جب کوئی آدمی ایک کے بعد ایک میلوں تک لہردار پہاڑی ڈھلانوں میں سے گذرتا ہے تو اسے ایک عجیب تبدیلی کا احساس ہونے لگتا ہے فرحت کے ایک نئے احساس کے ساتھ جسم میں تازگی سرایت کر آتی ہے پرسکون عظمت کے منظر پہاڑوں کی قربت کے باعث دل کو آرام و سکون میسر آتا ہے رستے میں کدیا بٹوٹ کے مقام پر سب لیری کے لیے قیام کرنے پر سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ بلند پہاڑ کی سرد ہوا کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

اس سے آگے درہ بانہال اور پیر پنجال کے سلسلے کو تک کا رستا پہاڑی ڈھلان سے گذرتا ہے۔ اس بلند پہاڑی دیوار کے دوسری جانب آپ کو کشمیر کی لہو یدار وادی نظر پڑے گی۔ جو حسن منظر کے عشاق کے لیے ایک لاجواب نظارا ہے

میلوں تک تا حدِ نظر سبز دھان کے کھیت قطار اندر قطار چلے جاتے ہیں ساں کے بیچوں بیچ برفانی پانی کی درخشاں ندیاں بلند قامت بید مجنوں کے درختوں کی دورویا قطاروں والی سڑکیں کہیں کہیں انہیں قطع کرتی نظر آتی ہیں ساری وادی سرسبز حسن اور سکون کا رنگارنگی منظر پیش کرتی ہے۔

ہر نئے مسافر کو سری نگر پہنچنے کے فوراً بعد سیدھے کشمیر گورنمنٹ کے وزیٹرز بیوروہیں جانا چاہیے۔ جہاں سے اپنی چھٹیاں گذارنے کا پروگرام بنانے کے لیے ماہرانہ مشورہ مل سکتا ہے۔ سری نگر میں قیام کے لیے مقررہ دن تیزی سے گذر جاتے ہیں۔ بہت روز تک اس شہر کے ہوٹلوں اور ہاوس بوٹوں میں قیام کرنے اس کے باغات اور جھیلوں کے کنارے گلگشت کرنے اور دستکاری کی مشہور چیزیں فروخت کرتے والوں سے سودا کرنے میں گذار دیتے پھر بھی جی نہیں بھرتا۔ اور یہ خواہش ہی رہتی ہے کہ اٹھلاتے ہوئے دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر پھیلے ہوئے اس دلفریب شہر میں چند روز اور ٹھہرا جائے لیکن آخر کار سری نگر چھوڑنے کا وقت آجاتا ہے۔

بلاشبہ سری نگر کا نظارا حسن اور خوب صورتی کی بھوک مٹا دینے والا ہے۔ لیکن یہ اس ہوس کو اور زیادہ تیز کرنے والا بھی ہے اس کے بعد مسافر گلمرگ اور پہلگام کے زیادہ سر دصحت افزا پہاڑوں کی جانب روانہ ہوتا ہے کشمیر کی سیر کرنے والے ہر ایک شخص کو یہ دو مقام ضرور دیکھنے چاہییں گلمرگ سطح سمندر سے آٹھ ہزار سات سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے یہ جگہ لہریں لیتے ہوئے سبزہ زاروں کی قطاروں سے بھرپور پیالے کی شکل کی وادی ہے یہ جگہ روئے زمین کا سب سے زیادہ مسحور کن حصہ ہے اس کی جانفزا پہاڑی ہوا صنوبر اور شاہ بلوط کے گھنے جنگلات ہر ایک نئے سیاح کو یہیں ٹھہرنے کی ترغیب — دیتے ہیں۔ گلمرگ کے گرداگرد سات میل لمبی سڑک چلی جاتی ہے جس کے ہر موڑ پر سیر کرنے والا چیل کے جنگلات کی عجیب سناٹی اور ان سے پیدا ہونے والے خامشی اور پر اسرار احساسات کے بالکل قریب چلا جاتا ہے۔ جس روز مطلع صاف ہو گلمرگ سے نانگا پربت کی چھبیس ہزار چھ سو فٹ بلند برف پوش چوٹیاں حسین دھندلے افق میں سر اٹھائے نظر آتی ہیں۔

گلمرگ سے صرف چالیس منٹ پیدل سفر کرنے پر کھلن مرگ آجاتا ہے۔ جہاں سے بہت دور فاصلے پر واقع نانگا پربت کے خدوخال نظر آتے ہیں یہاں سے دور دراز فاصلے پر واقع ولر، انچھر اور ڈل جھیلوں کی چپ چاپ چمک، دمک دیکھی جا سکتی ہے۔ اور بعض اوقات تو قصے کہانیوں کے مشہور شنکر آچاریہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع مندر بھی نظر آجاتا ہے۔

گلمرگ کو اپنی قیام گاہ بنا کر گرد و نواح کے کئی مقامات کی سیر کرنے والے کو یہ اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ اسے اپنی محنت کا پورا معاوضہ مل گیا ہے ان میں آلپ تھر کی مثلث جھیل ہے گہرے فیروزی رنگ کی جس کی سطح پر گرمیاں شروع ہونے سے پہلے سفید برف اور برف کی چھوٹی چھوٹی چٹانیں تیرتی پھرتی ہیں۔ گلمرگ سے پانچ میل دکن پچھم کی جانب ننگل نالا ہے۔ جو دلآویز جنگل میں سے گذرتا ہے۔ پکنک کے لیے یہاں بہت سے مقام ہیں۔ بابا رشی بھی قریب ہی واقع ہے اس جگہ سنت بابا رشی کی سمادی ہے اسے گرداگرد دکابر آمدا نہایت عمدا قسم کی چوبکاری سے مزین دیودار کے تختوں اور کھمبوں سے بنا ہوا ہے۔

خوب صورت وادی لدر میں واقع پہلگام ایک اور ایسا مقام ہے جو سات ہزار فٹ کی بلندی پر تفریح، سیر سپاٹے پہاڑی، چڑھائی، ماہی گیری، گھوڑسواری یا سنسان پہاڑیوں کی پرامن تنہائی میں سکون اور تازگی حاصل کرنے کے خواہشمندوں کے لیے خوشنما جگہ ہے پہلگام کو جانے والی سڑک دور تک پھیلے ہوئے دلفریب دیہات سیب کے باغوں، بید مجنوں کی دورویا قطاروں والی سڑکوں۔ بلور جیسے شفاف پانی کے جھرنوں پانی سے بھرپور دھان کے کھیتوں میں سے گذرتی ہے۔ پر شکوہ اور بلند قامت چنار، اخروٹ اور بادام کے

درخت ہر طرف آپ کے خیر مقدم کے لیے موجود کھڑے ہیں۔

پہلگام کو جاتے ہوئے یا واپسی پر رستے میں دوسرے قابل دید مقامات یہ ہیں۔

باوان۔ مارتنڈ۔ اننت ناگ۔ اچھابل۔ کوکرناگ چندن واڑی۔ جھیل۔ ششناگ اور برف کا تودہ امرناتھ کی غار۔ جھیل تارسر۔ ارو۔ لدڑواٹ۔ بہاؤ باجو وغیرہ لیکن کونسے مقامات دیکھے جائیں۔ ان کا انتخاب مقامی گائیڈ کے مشورے سے کیا جانا چاہیے۔

اس کے علاوہ وادی کشمیر میں بے شمار دوسرے خوب صورت مقامات مثل سونامرگ، گیندربل، وادی لولاب اور گریز بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کشمیر کی سیر کے لیے پہلی بار جانے والے ہر ایک مرد اور عورت کے لیے ایک ضروری نصیحت یہ ہے کہ اپنی چھٹیوں کا پروگرام روانگی سے پہلے تیار کریں۔

ہندستان کے اسکولوں میں تاریخ کی تعلیم

وزارت تعلیم نے اپنے "تعلیمی اور نفسیاتی مطالعات" کے سلسلے اشاعت کے تحت سری کے۔پی چودھری کا ایک کتابچہ "ہندستانی اسکولوں میں تاریخ کے مضامین" شائع کیا ہے اس میں ہندستان کی متعدد ریاستوں میں تاریخ کے نصاب پر تبصرہ اور تجاویز پیش کی گئی ہیں۔

مصنف نے موجودہ تعلیمی نصابات پر تبصرہ پیش کرنے کے بعد نصابات کے متعلق کچھ تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ چنانچہ مصنف نے تجویز کیا ہے کہ گریڈ نمبر ا میں تاریخ قدیم انسانوں کی کہانیوں کی صورت میں پڑھائی جائے اور گریڈ نمبر ۲ میں قدیم تہذیبوں کی کہانیاں پڑھائی جائیں اسی طرح گریڈ نمبر ۳ سے نمبر ۵ تک سوانح عمریاں پڑھانے کی تجویز پیش کی ہے اور گریڈ نمبر ۶ سے نمبر ۸ تک تاریخ حسب معمول پڑھائی جائے۔

ریڈیائی علم نجوم کی ترقی

چند سال پہلے ایک نئی سائنس ایجاد ہوئی۔ اس کا نام ہے ریڈیائی علم نجوم یعنی اجرام فلکی سے پیدا ہونے والی ریڈیو کی لہروں کے مطالعے کا علم۔ زیر مطالعہ کائنات کی ریڈیائی لہریں دس پندرہ میٹر (ا میٹر = ۳۹ ۳/۸ انچ) سے لے کر ایک سنٹی میٹر تک لمبی ہوتی ہیں۔ ہمارے نظام شمسی سے ماورا اجرام فلکی سے خارج ہونے والی لہروں کی چھان بین میں کافی کامیابیاں حاصل کی گئی ہیں۔ بہت پہلے اس بات کا پتا لگا لیا گیا ہے کہ کہکشاں کے پورے علاقے میں ریڈیائی لہریں پیدا ہوتی اور اس چیز کا پتا چل گیا ہے کہ سب سے زیادہ ریڈیائی لہریں برج قوس کے حلقے میں خارج ہوتی ہیں۔ اسی سمت میں کہکشاں بھی واقع ہے شروع شروع میں یہ کہا گیا تھا کہ ریڈیائی لہروں کا اخراج ان ستاروں سے ہوتا ہے جو کہکشاں کے جھرمٹ میں شامل ہیں لیکن حال میں یہ تفتیش پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ان لہروں کے اخراج کے سرچشمے ان ستاروں کے درمیانی حصے میں ہیں اس کہکشاں میں بین النجوم کی بہت ہی باریک اور لطیف گیس کے بڑے بڑے "بادل" شامل ہیں جو سالہا سال میں جمع ہوتے ہیں جب کبھی یہ "بادل" بہت زیادہ گرم ستاروں کے قریب آجاتے ہیں جن کی سطح کی حرارت ہزاروں لاکھوں ڈگری تک ہوتی ہے تو بین النجوم گیس میں ہزاروں ڈگری کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور تب اس میں سے ریڈیائی لہروں کا اخراج ہوتا ہے۔

حال ہی میں اس بات کا پتا چلا ہے کہ زیادہ تر کہکشاں کی ریڈیائی لہروں کا تعلق کائناتی شعاعوں سے ہے۔ بیس تیس کیلو میٹر (ا کیلو میٹر = ۵/۸ میل) کی بلندی پر ابتدائی کائناتی شعاعیں زمین کی فضا کے ایٹمی ذرات کے "نیوکلائی" سے ٹکراتی ہیں تو وہ اپنی کافی قوت کھو بیٹھتی ہیں۔

امریکا کے ساتویں صدر اینڈریو جیکسن

یوسیس

ایک غریب ماں باپ کا بیٹا جو پدری محبت و شفقت سے پیدائش سے پہلے ہی محروم ہو چکا تھا اور امریکا کے غیر آباد جنگلی علاقے میں رہنے کے باوجود وہ کس قدر جفاکش محنتی اور ہونہار نکلا کہ آخر امریکا کا صدر بن گیا۔ اور امریکا میں صحیح قسم کی جمہوری حکومت قایم کی۔ اور امریکا کی مشہور سیاسی جماعت ڈیموکریٹک پارٹی کی بنیاد رکھی۔

امریکا کی تاریخ میں نہایت شاندار اور جاذب و پرکشش شخصیتیں رہی ہیں۔ اینڈریو جیکسن کی ہستی نظر آتی ہے جو ۱۸۲۹ء سے ۱۸۳۷ء تک امریکا کا صدر رہا۔ اور امریکا کا ایک عظیم ہیرو۔ سیاسی رہنما اور مدبر تھا۔

مغربی امریکا کے ابھرتے ہوئے علاقے کا پہلا صدر جیکسن "عوام" کی نمایندگی کرنے اور ان کے جذبات کو سمجھنے والا پہلا شخص تھا۔ ۱۸ویں صدی کے امرا کا طبقہ اور نفاست پسند امریکہ کے سیاسی منظر سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اور ایک ناتجربہ کار اکھڑ سرحدی آدمی نئے دور کی نمایندگی کرنے لگا۔

لیکن جیکسن عام آدمی کی فتح مندی کا مظہر ہی نہیں تھا بلکہ اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر ہی تھا۔ اس کی حکومت نے تقریباً ہر ایک اہم واقعے پر اس کے خیالات اور کیرکٹر کی چھاپ ہے۔

جیکس زمانہ جدید کی امریکی سیاسی تنظیم "ڈیموکریٹک پارٹی" کا بانی ہونے کے علاوہ امریکی نیشنل ازم اور وطن پرستی کا بھی اولین رہنما تھا۔ اس نے صدارتی اختیارات اور فرائض کو نئے رنگ میں پیش کیا جس کا اثر اس قدر دیرپا ہے۔

اینڈریو جیکسن کی زندگی کامیابی کی ایک سچی کہانی ہے جو امریکی روایات کے عین مطابق ہے یہ ایک ایسے لڑکے کی کہانی ہے جس نے خوفناک مشکلات پر قابو پایا ہے

وہ ۱۷۶۷ء میں شمالی کیرولینا کے دیہاتی علاقے میں آئرلینڈ سے آئے ہوئے غریب ماں باپ کے گھر ۱۵ مارچ ۱۷۶۷ء میں پیدا ہوا تھا۔

جیکسن نے اپنے باپ کی صورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی پیدائش سے تھوڑا سا عرصہ پہلے ہی اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ جیکسن کی ابتدائی تعلیم جس قدر قلیل تھی اتنی ہی سادہ بھی۔ اور معمولی لکھنے پڑھنے اور حساب وغیرہ کی معمولی سدھ بدھ سے قدرے زیادہ علمیت اور استعداد رکھتا تھا۔

ایک نوجوان کی حیثیت سے وہ بہت دلیر اور جذبات سے بھرا ہوا دل رکھتا تھا اور ۱۳ برس کی عمر میں برطانیہ کے خلاف انقلابی جنگ میں اس نے شرکت کی۔

جب انقلاب کا دور ختم ہو گیا تو جیکسن اپنے دیہاتی علاقے میں چلا گیا۔ اور یہ ارادہ کر لیا کہ وہ قانونی پیشہ اختیار کرے گا۔ ۱۷۸۷ء میں وہ شمالی کیرولینا میں قانونی تربیت اور تعلیم کے بعد بیرسٹر بن گیا۔ ۲۳ برس کی عمر میں یہ زبردست گھڑ سوار اپنے آپ پر اعتماد کرنے والا نوجوان مغرب کے غیر آباد جنگلی علاقے میں امریکی اٹارنی مقرر کیا گیا۔ قانون کا یہ نوجوان محافظ دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ براہ راست معاملات نپٹانے اور مقابلہ کرنے میں بے خوفی سے عمل کرتا۔ اس کے بعد جیکسن کو جلد ہی ملک گیر اہمیت حاصل ہو گئی۔

۲۹ برس کی عمر میں وہ امریکی کانگریس کا ۳۰ برس کی عمر میں امریکی سینیٹ کا ممبر ۳۱ ویں برس میں ٹینسی کی سپریم کورٹ کا جسٹس اور ۳۵ ویں سال میں امریکی ملیشیا (فوج) ایک میجر جنرل بن گیا۔

۱۸۱۲ء کی جنگ نے جیکسن کو اپنی عالا قابلیت ثابت کرنے کا موقع دیا اور ملک بھر میں اسے بڑی ہردلعزیزی حاصل ہوگئی۔

۱۸۲۱ء میں جیکسن کو فلوریڈا کا گورنر بنایا گیا۔ لیکن اس عہدے سے اس نے چھ مہینے کے بعد استعفا دیدیا ۱۸۲۳ء میں وہ سینیٹ کا دوبارہ ممبر چنا گیا۔ آنے والے چند برسوں میں جیکسن کو امریکا کا صدر بنائے جانے کا چرچا ہوگیا چنانچہ ۱۸۲۸ء میں اسے صدارتی انتخاب میں زبردست فتح حاصل ہوئی اور مسٹر جان کونسی ایڈمز کے ۵۰۸۲۷۳ ووٹوں کے مقابلے میں اسے ۶۶۸۲۷۳ ووٹ ملے۔

اگرچہ جیکسن کی پچھلی نا پختگی۔ اکھڑپن اور وحشی پن میں بھاری تبدیلی آگئی تھی لیکن امریکا کا صدر بننے پر بھی اس میں زیادہ علمی استعداد۔ فلسفیانہ لیاقت یا سیاسی سمجھوتی کے ادراک میں کوئی ترقی نہیں کی۔ اپنے بڑے بڑے ہمعصروں کے برعکس اس نے کوئی تصانیف، مضامین یا اپنے بنیادی عقاید سے متعلق کوئی یادگار نہیں چھوڑی ہے۔

وہ ایک عملی طبیعت اور جارحانا سپرٹ رکھتا تھا اور اس لیے انہیں سمجھوتی اور دلیل میں کوئی یقین نہیں تھا۔

جب اور جیسے بھی مسایل پیدا ہوتے وہ یا تو ان کو اپنے خیال اور رائے کے مطابق حل کرتا اور کبھی دوسروں کے تھکا مشورا کرنے کے بعد بعض اوقات وہ جلدبازی اور جوش میں آکر کارروائی کرتا۔ اس کی حکومت کے بعد امریکا میں جو مالی کساد بازاری پیدا ہوئی تاریخ داں اس کا الزام اسی پر رکھتے ہیں کیونکہ اس نے امریکا کے بینک کا چارٹر دوبارہ منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

لیکن اس کے برعکس جیکسن کی حکومت نے امریکا کا ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ ڈالر کا قرضا بھی اتار دیا۔ اور امریکی خزانے میں زاید روپیا بھی جمع کر دیا۔

جیکسن امریکی یونین (ریاست ہائے متحدا) سے وفاداری کا زبردست جذبا رکھتا تھا جس کا ثبوت جنوبی کیرولینا کے ساتھ تنازعے کو ختم کرنے سے ملتا ہے (وہاں کی ریاستی حکومت نے امریکا کی مرکزی حکومت کی کھلی مخالفت کی تھی۔) اس اقدام سے شمالی اور جنوبی امریکا میں جو نا اتفاقی اور ناچاقی بڑھ رہی تھی وہ کچھ وقت کے لیے دب گئی۔ اور امریکا کے اتحاد کی اسپرٹ کو زندا رکھا۔

جیکسن کی حکومت نے جتنے بھی عالا کام کیے ان میں سب سے زیادا اہم بات یہ ہے کہ اس کے عہد میں امریکا میں جمہوریت کا آغاز ہوا۔

۱۸۳۷ء میں جیکسن نے اپنے الوداعی خطبے میں اپنے اہل ملک کو آگاہ کیا کہ وہ فرقا واریت اور نا اتفاقی سے بلکل بچے رہیں۔

اس کے بعد وہ اپنے گھر "ہرمی ٹیج" کو روانا ہوگیا جو ٹینسی کے قریب واقع تھا اور ۸ جون ۱۸۴۵ء کو اس یقین کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوگیا کہ امریکی لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے بے پناہ محبت ہے اور یہ کہ جس ملک کی تعمیر میں اس نے مدد دی اس کی تاریخ میں اس کی شہرت کا باب بھی ہوگا۔

برطانوی انجمن برائے ترقی سائنس کا نیا صدر

۱۹۴۷ء میں کیمسٹری کا نوبل پرایز حاصل کرنے والے سر رابرٹ رابنسن کو برطانوی انجمن برائے ترقی سائنس کا ۱۹۵۵ء کے لیے صدر چنا گیا ہے۔ یہ انتخاب انجمن کے سولویں اجلاس میں جو بمقام آکسفورڈ منعقد کیا گیا تھا عمل میں لایا گیا ہے۔

ی۔ س

امریکا میں بیرونی طلبا

(امریکا میں بیرونی ملکوں کے طلبا کو انگریزی زبان اور امریکی طرزِ زندگی اور رسم و رواج سے واقف کرانے میں یونیورسٹیاں بڑی مدد دیتی ہیں — ایک مفید اور اطلاعاتی مضمون۔)

پردیس میں زندگی بہت پریشانی اور مایوسی کا باعث ہو سکتی ہے خاص کر جب آدمی وہاں کی زبان سے غیر واقف ہو۔ امریکا میں نو وارد طالب علموں کو اس کی مشکل سے بچانے کے لیے ملک بھر میں ایسے مختلف پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں جن سے باہر سے آنے والوں کی انگریزی بہتر بنائی جاتی ہے اور انہیں امریکی طرزِ زندگی اور رسم و رواج سے واقفیت پیدا کرنے میں مدد دی جاتی ہے۔ عورتوں کے کلبوں میونسپل اداروں اور نوجوانوں کی تنظیموں کلیساؤں اور دوسری تنظیموں نو واردوں کی مہمان نوازی، سیر و تفریح مناظر اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے پروگرام جاری کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکا بھر کے تمام تعلیمی ادارے بدیسی طلبا کے لیے خاص تربیتی جماعتیں کھولتے ہیں۔

مثلاً پاساڈینا کیلی فورنیا میں مختلف تعلیمی اداروں میں تعلیم پانے والے بدیسی طلبا شہری اسکولوں کو درخواستیں بھیجتے ہیں کہ انہیں انگریزی سیکھنے میں مدد دی جائے۔ پاساڈینا کے سٹی کالج میں ۵۳ ملکوں کے ۳۱۷ طلبا ہیں جن میں سے سب کو وہاں کے اسکولوں اور سماجی زندگی واقفیت پیدا کرنے میں مدد کی ضرورت ہے۔ کالج میں بھی انہیں انگریزی زبان اور امریکا کی تاریخ اور جغرافیہ کے متعلق تعلیم دی جاتی ہے۔ کالجوں میں دوسرے ملکوں کی زبانوں کے متعلق جماعتوں کے طالب علم بھی ان کی مدد کرتے ہیں اور کیلی فورنیا اسکالر شپ فاؤنڈیشن (وظیفہ دینے کا ادارہ) انفرادی طور پر انگریزی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا ہے۔ کالج کی سروس کلبوں اور رضاکاروں کی تنظیموں کے ذریعے بدیسی طلبا کے لیے تہذیبی اور تعلیمی مرکزوں کے دوروں کا بھی مفت انتظام کیا جاتا ہے۔

جب کالج نے دیکھا کہ کام پورا کرنے کے لیے عملہ کافی نہیں تو انہوں نے کمیونٹی کے بزرگوں سے امداد کی اپیل کی اور رضاکار مانگے اس اپیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاساڈینا کی طلبا کی بین تہذیبی امدادی تنظیم (پی۔ آئی۔ ایس۔ اے) نے وہاں کے ڈاکٹروں، قانون دانوں تاجروں، کلب کی عورتوں کلیسا اور میونسپل محکمہ اور پنشن آنے جانے والے پچاس سے زاید پروفیسروں کی امداد حاصل کر لی۔

پہلے سال کے آخر تک پی۔ آئی۔ ایس۔ اے نے ۶۰ معلموں کی خدمات کالج میں پڑھانے کے لیے حاصل کر لیں۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ لوگ صرف انہیں انگریزی ہی نہیں پڑھاتے تھے بلکہ انہیں رہنے کے لیے گھر ڈھونڈنے نوکریاں حاصل کرنے اور ذاتی مسایل حل کرنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح بین قومی اور بین تہذیبی تعلقات کے متعلق ان کی معلومات بڑھ گئیں۔

نیویارک شہر میں امریکن لینگویج سنٹر (امریکی زبانوں کا مرکز) کے نام سے ایک تنظیم قایم ہے۔ جو بدیسی طلبا کی مدد کرتی ہے اسے سنہ ۱۹۵۰ء میں قایم کیا گیا تھا۔ اور کولمبیا یونیورسٹی کے اسکول آف جنرل سٹڈیز کا یہ ایک حصہ ہے۔ یہ اپنا پروگرام انٹرنیشنل ہاؤس کے ساتھ مل کر چلاتا ہے جہاں نیویارک میں مقیم بہت سے بدیسی طلبا سکونت رکھتے ہیں۔

انگریزی پڑھانے کا ہفتے کا پروگرام ہوتا ہے جس میں گرامر مضمون نویسی۔ درس خوانی۔ تلفظ۔ الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے۔ باہمی مباحثوں اور بول چال میں کام آنے والی انگریزی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

دوپہر کے بعد امریکا کے دوسرے علاقوں اور دوسرے ملکوں سے آئے ہوئے طلبا کے ساتھ سماجی سرگرمیوں لیکچروں جماعتی مباحثوں اور امریکی زندگی کے متعلق بحث مباحثوں میں حصہ لیتے ہیں۔

اس مرکز نے ایک ہزار سے بھی زیادہ بدیسی طلبا کو اپنے پروگراموں سے مستفید کیا ہے۔ تعلیم کے لیے اس مرکز میں چھوٹے چھوٹے گروہوں یا جماعتیں بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ ہر جماعت میں اوسطاً ۵۰ طالب علم ہوتے ہیں۔

مرکز کے پروگرام مرتب کرنے والے صدر مسٹر ولیم کلن برینٹ کا کہنا ہے کہ زیادہ بڑی کلاس چلانے سے طلبا کو اچھی طرح تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ہم لڑکوں کو گھریلو طرز زندگی اور ایک غیر ملک میں سلامتی کا احساس دلاتے ہیں۔ جو ان کے لیے نیا ہوتا ہے۔ ہم انہیں سماجی طور طریقوں رسم و رواج اور بازاروں میں سودا سلف خریدنے اور سیر و سیاحت کے متعلق طریقوں اور بول چال کی بھی تربیت دیتے ہیں۔

نوجوان ترقی پسند افسانہ نگار قمرالدین قمر
کے افسانوں کا مجموعہ
فٹ پاتھ
عنقریب منظر عام پر آرہا ہے
ناشر۔ مرکز ادب بندر روڈ (کراچی)

سویت کرغیزیا کے اخبار اور رسایل

پہلے کرغیز اخبار "ایرکین تو" (آزاد کوہستان) کا پہلا شمارہ ۱۰ نومبر ۱۹۲۴ء کو شایع ہوا۔ یہ کرغیز عوام کی تہذیبی زندگی میں ایک غیر معمولی اہمیت کا واقعہ تھا جن کی انقلاب سے پہلے تک کوئی تحریری زبان نہیں تھی۔

نوجوان کرغیز شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات "تو" کے آگے صفحات پر شایع ہونے لگے۔ اس اخبار کی مدد سے ہزاروں کرغیز عوام تعلیم یافتہ بن گئے۔ اور اس سے ان کا تہذیبی اور ذہنی افق وسیع ہوا۔ بہت سے کرغیزیا کے نئے ادیبوں نے "ایرکین توٗ" کی مجلس ادارت میں کام کیا۔ ایک طرح سے ان اخبار نے کرغیز کے اپنے دانشوروں کو تیار کرنے میں اہم حصہ لیا۔ علی تو کومیالیف کی نظم اس اخبار کے پہلے شمارے میں شایع ہوئی۔ یہ پہلی کرغیز ادبی تخلیق تھی جو شایع ہوئی تھی۔ اس وقت تو کومیالیف ایک مشہور و معروف ادیب کرغیزیا کا عوامی شاعر ہے اس کی نظمیں صرف فرنزے میں شایع نہیں ہوئیں بلکہ بہت بڑی تعداد میں ماسکو اور دوسرے دوست اور برادرانہ جمہوریتوں میں بھی شایع ہوتی ہیں اس دور کے مشہور ادیب تو کمیل بائی نے جو اسٹالن انعام بھی حاصل کر چکے ہیں اس اخبار میں بھی کام کیا ہے۔

کرغیزیا کے عوام کی تہذیبی ترقی کے ساتھ ساتھ اخباروں کی تعداد میں بھی ترقی ہوئی۔ اب اس وقت کرغیز زبان میں بہت سے اخبار و رسایل شایع ہوتے ہیں۔ سب ملا کر ۱۶ جمہوریے کے اخبار دس علاقائی اخبار اور ۴۲ شہروں و ضلعوں کے اخبار ہیں۔ جمہوریے کا ایک اخبار استادوں کے لیے ایک نوجوانوں کے لیے اور ایک بچوں کے لیے شایع ہوتا ہے۔

ا-ا

ہندستان میں پرائمری تعلیم کی ابتدا

نیشنل آرکیوز آف انڈیا کے پاس جو ہندستان کی تاریخ کا قیمتی مواد ہے۔ اس کی قدر و قیمت واضح کرنے کے لیے اس شعبے نے کتابچوں کا ایک سلسلا جاری کیا ہے چنانچے حال ہی (میں نیشنل آرکیوز) کی طرف سے "ترقی تعلیم (ابتدائی)" نامی کتابچا شایع کیا گیا ہے اگرچے ابتدائی تعلیم کی تاریخ اختصار سے بیان کی گئی ہے لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ کارکنوں کی توجہ مزید تحقیق کی طرف لوٹائی۔

اس کتابچے میں ۱۹۱۹ء تک ابتدائی تعلیم کی تاریخ بیان کی گئی ہے جبکے یہ محکما صوبائی حکومتوں کے سپرد کیا گیا تھا۔

پس منظر ویدک زمانے ہی سے ہندستانی عوام تحصیل علم کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ہندو بچے پاٹ شالاؤں اور مسلمان فرمارواوں کے ماتحت مسلمان بچے مکتبوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ہاں درس گاہوں کو بادشاہوں امرا اور متمول شہریوں کی سرپرستی حاصل ہوتی تھی۔ ابتدائی تعلیم کو باضابطا اور باقاعدا جاری کرنے کا سہرا شہنشاہ اکبر کے سر ہے۔ انہوں نے نہ صرف نصاب تعلیم کے متعلق ہدایات جاری کیں۔ بلکے اساتذا کے فرایض بھی مقرر کیے۔

ابتدا جب انگریز ہندستان میں وارد ہوے تو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ابتدائی اسکول جاری تھے ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلی بار انگریزی کی تعلیم مدراس میں ایجاد کی۔ اگرچے کمپنی نے اس مسلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ نیک خواہشات سے آگے نہ بڑھ سکی ——— ۱۸۱۳ء میں پارلیمنٹ گرانٹ اور ولبرفورس کے اثر و رسوخ کی وجہ سے پارلیمنٹ نے تعلیم کی ترقی اور توسیع کے لیے ایک لاک روپیا منظور کیا۔ لیکن یہ روپیا صرف نہ کیا جا سکا کیونکے واران ہیسٹنگز نے مغربی بنگال میں صرف دیہاتی اسکولوں پر توجہ دی۔ جہاں ان کی کوششیں بے کار گئیں۔ البتا مدراس ثابت قدم رہا۔ اور اساتذا کی تربیت کے لیے ایک اسکیم مرتب کی گئی۔ لیکن وہ پوری نہ ہو سکی۔ اس کے بعد تعلیم کی ترقی کی رفتار قدرے سست ہی

ذریعہ تعلیم اس کے بعد لوگوں میں کچھ بیداری پیدا ہوئی اور اصلاحات کا مطالبا کیا جانے لگا۔ اور سوال پیدا ہوا کہ ذریعہ تعلیم کس زبان کو قرار دیا جاے۔

ایک طرف تو مشرقی علوم کے حامی تھے۔ اور دوسری طرف انگریزی کے۔ آخرکار لارڈ میکالے کی صلاح اور مشورے سے لارڈ ولیم بنٹنک نے انگریزی کے حق میں فیصلا دیدیا۔ اس پالیسی کو لارڈ آکلینڈ نے بھی جاری رکھا۔ لڑکیوں کا اسکول پہلے پہل ودیا ساگر اور جے۔ ای۔ ڈی بیتھیوں کی کوششوں سے کلکتے میں ۱۸۴۹ء میں کھولا گیا۔ اور حکومت کی طرف سے بعد میں اسے امداد دی گئی۔

ابتدائی تعلیم کی تاریخ میں سنہ ۱۸۵۴ء کا مشہور ڈسپیچ (مراسلہ) سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے حکومت پر یہ فرض عاید کیا گیا تھا کہ ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی تعلیم تک سب ہی کو ایک نظام میں لایا جاے اور ہر صوبے میں تعلیم عام کا ایک محکما قایم کیا جاے۔ حکومت کو بمبئی اور بنگال کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکے وہ یکسانیت کی بجاے ابتدائی تعلیم میں تنوع پسند کرتے تھے۔ اس لیے ابتدائی

تعلیم کو یکساں بنانے کی حکومت کی پالیسی ناکام ثابت ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن نے ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا۔ جس میں سر سید احمد۔ آنند موہن بوس۔ بھودیب۔ مکرجی اور کاشی ناتھ ٹرمبک ایسے ماہرین تعلیم کو شامل کیا گیا۔ اس کمیشن نے عورتوں کی تعلیم کی حوصلا افزائی اور ابتدائی تعلیم کی ترقی کی سفارش کی۔ نیز اس نے ان مقامات پر ثانوی تعلیم کی حوصلا افزائی کی بھی سفارش کی جہاں عوام کا تعاون حاصل ہو۔

ابتدائی تاریخ کا آخری مرحلہ لارڈ کرزن کے عہد میں پیش آیا جنہوں نے رایج طریقوں کے نقایص اور خوبیوں کا جایزہ لیا۔ لارڈ کرزن کو پکا یقین تھا کہ انگریزی اور ہندستانی زبانیں دونوں حکومت ہندستان کی ذمے داری ہے۔ گوکھلے سرکردہ ایسے ہندستانی لیڈروں نے اب کھلم کھلا لازمی اور مفت ابتدائی تعلیم کی حمایت شروع کر دی۔ حکومت گوکھلے کے مطالبے کے سامنے ۱۹۱۷ء میں جھک گئی جبکہ اس نے ابتدائی تعلیم کی توسیع کی۔ ایک اسکیم مرتب کی گئی۔ کمیشن کا خواب ۱۹۱۸ء میں پورا ہوا۔ جبکہ حکومت نے فیصلا کیا کہ تعلیم صوبائی حکومتوں کی ذمے داری ہوگی۔ بعد ابتدائی تعلیم عالا تعلیم کے لیے مضبوط بنیاد ثابت ہوئی۔

یونیورسٹی تبادلے کی اسکیم کے تحت گرانٹ

کامن ویلتھ یونیورسٹیوں کے تبادلے کی اسکیم کے تحت اس سال چھ ہندستانیوں اور دو پاکستانیوں کو سفر کے اخراجات کے لیے گرانٹ دی گئی ہے۔

اس گرانٹ سے استفادہ کرنے والے پروفیسروں کا تعلق ہندستان اور پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں سے ہے چونکہ یہ گرانٹ نہایت ہی مفید ثابت ہوئی ہے اس لیے آیندہ بھی اس کو جاری رکھا جائے گا۔

ہندستانی فن کاروں کا وفد کریملن میں

۳ ستمبر کی صبح کو، ہندستانی فن کاروں کو لانے والی کاریں کریملن کے بوروو تسکی گیٹ تک پہنچ کر رک گئیں۔ دوسرے ہی منٹ یہ فن کار کریملن کے پتھروں سے بنے ہوئے احاطے میں داخل ہو گئے۔ ہندستانی مہمانوں کو اپنے سامنے قدیم فن تعمیر کی یادگاروں سے بھرا ہوا ایک چوک نظر آیا۔

مہمانوں نے جشن بشارت مسیح کے گرجا میں دیوار پر قدیم مصوری اور رنگ آمیزی کے شاہکار نمونے دیکھے۔ بارویں صدی میں نووگورود مدرسہ فن کے ایک گمنام ماہر کی تخلیق کردہ ایک قدیم ولی کی تصویر کے رنگوں کی شگفتگی اور تازگی دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے۔

عید استقبال مریم کے گرجا میں جو ۱۴۸۷ء میں تعمیر ہوا تھا۔ ماسکو کے بزرگان اسرائیل اور اسقفان اعظم کے مقبروں میں ہندستانی مہمانوں نے بڑی دلچسپی کی۔

ہندستانی مہمانوں نے زار شاہی کی چالیس ٹن بھاری توپ میں — جو سولویں صدی کی روسی صنعت گری کے فن کا نادر نمونا ہے، اور عجیب و غریب زار شاہی گھنٹے میں جو اس سے بھی قدیم زمانے کا ہے، بڑی دلچسپی دکھائی۔

قدیم فن تعمیر کی یادگاروں کو دیکھنے کے بعد ہندستانی ماہرین فن اسلحہ خانے کا بڑا کمرا دیکھنے گئے، جس کی بنیاد ۱۷۰۲ء میں پیٹر اول نے رکھی تھی۔

ہندستان کی نایب وزیر صحت اور وفد کی لیڈر شری متی م ک۔ چندر شیکھر نے اسلحہ خانے کے کمرے کا معاینا کرنے کے بعد تاثرات کی کتاب میں لکھا کہ قومی اثاثے کی حفاظت بڑی اچھی طرح کی جا رہی ہے۔ اور یہ کہ وہ سب عجایب گھر دیکھ کر اور اس کے حسن انتظام سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی - ام - خان - ام - اے (عثمانیا)

ہندستانی زبان میں آزادی اصول پر لکھا جانے والا رسالہ

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

جلد (۱۵) نمبر (۲)

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان۔ام۔اے (عثمانیا)

دے سنہ ۱۳۶۴ف نومبر سنہ ۱۹۵۴ء

چندا سالانا آٹھ روپے

عنوان	مصنف	صفحہ
ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۲
حقایق و معارف	افقر موہانی وارثی	۳
غزل	سراج (لکھنوی)	۴
غزل	نازش (پرتاب گڑھی)	۵
محبت کے شعبدے	اختر انصاری (اکبرآبادی)	۶
غزل	ظفر عالمگیر	۷
عید کارڈ دیکھ کر	صفی احمد (بہاری)	۸
ہندستان کو تربیت یافتا اور بلند اخلاق کی ضرورت ہے	ڈاکٹر امرناتھ جھا	۹
جوش ملسیانی کی نثر نگاری کے نمونے	دل محمد فضا جالندھری ادیب فاضل (ملتان)	۱۰
غزل	زاہد رضوی	۱۴
وادی کشمیر — موسم خزاں میں	ا۔ا	۱۵
تعلیمی حقوق کی ضمانت دینے کے لیے چین کا بیان	ج۔ا	۱۸
رباعیات عمر خیام	ظفر عالمگیر بی۔اے (عثمانیا)	۱۹
ترکمانی گاؤں کا اسکول	د۔گودےکوف	۲۶
ہندستانی ڈاک کی کہانی	ا۔ا	۲۸
عجوبہ روزگار گھڑیاں	یوسیس	۳۱

ہمارے خیالات

"آرام حرام ہے"

(جواہر لال نہرو، وزیر اعظم ہندستان)

"بولنا حرام ہے"

(ہنومنتھیا چیف منسٹر میسور)

"جلدی کرنا شیطان کا کام ہے"

(سردار مل لال وانی، ممبر بھوپال لیجسلیٹو اسمبلی)

اگر اب بھی کسی کو شبہ ہے کہ ہندستان کی جنتا بھاشا یا عوام کی زبان "ہندستانی" نہیں بلکہ کوئی اور زبان ہے تو اوپر دیے ہوئے تینوں جملوں کی روشنی میں جانچا جائے کہ آیا دیس بھاشا "ہندستانی" ہی ہے یا کوئی اور زبان؟ یہ تینوں جملے جیسا کہ ان کے ادا کرنے والوں کے ناموں سے ظاہر ہے ہندستان کی ذمہ دار شخصیتوں کی زبان سے نکلے ہیں۔

یہ تو ہم آپ اور سبھی جانتے ہیں کہ ہمارے ہر دل عزیز وزیر اعظم جواہر لال نہرو بات چیت اور تقریر سو فی صد ہندستانی میں کرتے ہیں۔ اور گاندھی جی مرحوم کی طرح یہ خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہم ہندستانی جب آپس میں ایک دوسرے سے ملیں اور بات چیت کریں تو اپنی ہی دیس بھاشا "ہندستانی" ہی میں بولیں۔

وزیر اعظم پارلیمنٹ میں تقریریں انگریزی میں اس لیے کرتے ہیں کہ انہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اگر یہ مجبوری نہ ہوتی تو وہ اپنی ہر تقریر "ہندستانی" ہی میں کرتے۔ پارلیمنٹ سے باہر جتنی بھی تقریریں ہوتی ہیں وہ سب کی سب "ہندستانی" ہی میں ہوا کرتی ہیں۔ اگر کوئی تقریر ایسی ہو کہ ہندستان سے باہر دنیا والوں کو بھی سنانا ضروری ہو تو بعد میں وہ اسی تقریر کو انگریزی میں بھی دہرا دیا کرتے ہیں۔ لیکن اپنی زبان کی اہمیت جتانے اور دیس بھاشا کی لاج رکھنے کے لیے وہ انگریزی تقریر کے دوران بھی "ہندستانی" بھاشا کے شبد اور جملے بھی موقع محل سے استعمال کرتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اوپر کا جملا "آرام حرام ہے"، ایک انگریزی تقریر ہی کے دوران استعمال کیا گیا تھا۔

ہنومنتھیا میسور کے چیف منسٹر کو ہم نے انگریزی میں تقریر کرتے سنا ہے۔ ان کی "ہندستانی" دانی کے بارے میں ہمیں کچھ شبہ سا تھا مگر اب جبکہ انہوں نے اپنی ایک انگریزی تقریر کے دوران "بولنا حرام ہے" جیسا فصیح اور بامعنی جملا استعمال کیا ہے تو اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ ہندستانی بھاشا اچھی طرح سے جانتے ہیں حالانکہ ہنومنتھیا کرناٹک علاقے کے رہنے والے ہیں اس لحاظ سے ان کی مادری زبان کنڑی ہے، مگر چونکہ کرناٹک بھی ہندستان کا ایک جز ہے اس لیے اور صوبوں کی طرح وہاں کے لوگ بھی مادری زبان کے علاوہ دیس بھاشا بھی جانتے ہیں صرف ہنومنتھیا ہی پر کیا منحصر ہے کرناٹک کے سب ہی لوگ دیس بھاشا "ہندستانی" سمجھتے اور بولتے بھی ہیں۔ اپنے ایک پچھلے کرناٹک کے سفر میں ہم نے اس کا خاص طور پر مطالعا کیا تھا اور پچاسوں افراد سے بات چیت کر کے اس کا تجزیا کیا تھا اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ کرناٹک کے سو فی صد لوگ "ہندستانی" بول سکتے ہیں۔

حال ہی کا واقعا ہے کہ بھوپال لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک بل پر بحث ہو رہی تھی چیف منسٹر چاہتے تھے کہ اسمبلی اس بل کو جلدی ہی منظور کر لے۔ مگر ممبروں کی رائے تھی کہ اس پر بحث کا موقع دیا جائے لیکن چیف منسٹر نے پھر سے اصرار کیا کہ نہیں اس کی جلد منظوری دی جائے۔ اس پر اسمبلی کے ایک ممبر سردار مل لال وانی نے اٹھ کر ایک موزوں جملا چست کیا کہ "جلدی کرنا شیطان کا کام ہے" گویا کہ انہوں نے اپنے چیف منسٹر کو شیطان قرار دیا۔ اس لیے چیف منسٹر کو بےحد غصا آگیا اور وہ آگ بگولا ہو گئے۔ اٹھ کر صدر اسمبلی سے کہا کہ یہ جملا اسمبلی کے شایان شان نہیں" صدر نے رولنگ دی کہ "ایسے جملے بطور کہاوت کہے جاتے ہیں۔ اس کے کہنے میں کوئی برائی نہیں پاتا"

اس کے نتیجے سے ہمیں کوئی بحث نہیں یہاں اس کے پیش کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسمبلی میں تقریریں اور بحث انگریزی میں ہو رہی تھی۔ مگر موقع محل سے سردار جی نے ایک "ہندستانی" کہاوت چست کر کے چیف منسٹر کو شرما دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں جو تقریریں انگریزی میں ہوا کرتی ہیں وہ صرف اندھی تقلید کا نتیجا ہیں انگریزی آخر ایک غیر زبان ہی جو ٹھہری۔ اگر اس زبان پر بےچارے ہندستانیوں کو پورا پورا عبور حاصل ہوتا تو "جلدی کرنا شیطان کا کام ہے" کے مثل کوئی انگریزی کہاوت ہی استعمال کی جاتی۔ بہر حال اوپر کی تینوں مثالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ تقریباً ہر ہندستانی، دیس بھاشا "ہندستانی" کو اچھی طرح سے سمجھ اور بول بھی سکتا ہے۔ اور چاہے تو اس بھاشا میں تقریر بھی کر سکتا ہے۔

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

دنیا ترے انوار کی کثرت سے بنی ہے
دنیا کی ہر اک شے میں تری جلوہ گری ہے

میخانے میں رندوں پہ حقیقت یہ کھلی ہے
خاک قدم پیر مغاں تاج شہی ہے

یہ نسبت دیرینہ ازل ہی سے لکھی ہے
منسوب ترے نام سے بنت العنبی ہے

دنیا کی نظر ایک ہی مرکز پہ لگی ہے
وہ بھی ہیں نئے ان کی جوانی بھی نئی ہے

ہوں گرچہ تہی دست مگر دل تو غنی ہے
اللہ کے گھر میں بھلا کس شے کی کمی ہے

تو کعبہ کا پابند میں آزاد ہوں ناصح
سجدوں میں ترے اور مرے فرق یہی ہے

صورت پہ نگاہوں سے نہاں جلوہ فگن کی
اے برق تجلا یہ کوئی جلوہ گری ہے

اس مے کو تو واعظ بھی برا کہہ نہیں سکتا
جو میرے لیے دامن ساقی میں چھپی ہے

مدت ہوئی دیکھے ہوئے گلشن کی بہاریں
اب تک مری نظروں میں ہر اک چیز ہری ہے

اللہ رے پیغام مرے ذوق طلب کا
گم ہو کے نظر جلووں میں کچھ ڈھونڈ رہی ہے

زنداں میں اسیران کہن جتنے مرے ہیں
تصویر ہر اک کی در زنداں پہ بنی ہے

واللہ نہ بدلوں گا متاع دو جہاں سے
خاک در جاناں مجھے قسمت سے ملی ہے

پامال نہ کر تربت آسودہ ہستی
اک روز تری منزل اول بھی یہی ہے

جس شاخ پہ گلشن میں بنایا تھا نشیمن
اس شاخ کو لیتے ہوئے بجلی بھی گری ہے

میں کیا کہوں حال دل ناکام تمنا
جو بن کھلے مرجھا گئی ہو یہ وہ کلی ہے

مدت ہوئی ڈوبے ہوئے طوفان میں مجھ کو
کشتی مری اب دامن ساحل سے لگی ہے

کہہ دے کوئی ہنگامہ محشر سے خاموش
تھک کر غم دنیا سے ابھی آنکھ لگی ہے

صیاد وہیں تھا مرا گلشن میں نشیمن
سوکھی ہوئی اک شاخ جہاں آج کھڑی ہے

وہ روز قیامت ہو کہ دن حشر کا لیکن
میری شب غم طول میں دونوں سے بڑی ہے

جینے کی مسرت ہے نہ مرنے کا کوئی غم
اب زندگی و موت کا معیار وہی ہے

طوفاں کی نہیں شرط مرے واسطے افقر
ساحل کی ہر اک موج ہی طوفان بنی ہے

سراج (لکھنوی)

غزل

وہ زکوٰۃ دولت صبر تھی مرے چند اشکوں کے نام سے
وہ نظر گذر کی شراب تھی جو چھلک گئی مرے جام سے

مری چشم شوق میں کیف دل جو بھرا تھا خون کے نام سے
وہی شعلہ بن کے بھڑک اٹھا وہی پھوٹ نکلا ہے جام سے

نہ فلک کے نظم و نظام سے نہ زمیں کے منظر عام سے
نہ سحر سے کام نہ شام سے مجھے عشق ہے ترے نام سے

کوئی رات آنکھوں میں کاٹ دی کوئی تارے گن کے گذار دی
یہی مرتے مرتے ہوس رہی میں کبھی تو سو رہوں شام سے

بڑی دلفریب ہے داستان ترا ذکر اور مرا بیاں
وہ دہن دہن وہ زباں زباں جو ہے آشنا ترے نام سے

مجھے کیا ضرورت چارہ گر اسی اک دوا میں ہیں دو اثر
کبھی مر مٹا ترے نام پر کبھی جی اٹھا ترے نام سے

دم قتل لطف ہے دید کا کہ کھلا ہے پھول امید کا
ہوا غل کہ چاند ہے عید کا، جو کھنچی وہ تیغ نیام سے

مجھے واعظا اپنی لگی ہے دھن کوئی پھول آتش تر کا چن
مرے درد دل کی حدیث سن کبھی چھیڑ کر لب جام سے

جو ازل میں تھا وہی نور ہے کہ چراغ محفل طور ہے
کوئی رہنے والا ضرور ہے مرے دل میں درد کے نام سے

جو تڑپ تھی کل وہی آج ہے یہی میرے دل کا علاج ہے
مری زندگی بھی سراج ہے اسی اضطراب دوام سے

غزل

نازش پرتاب گڑھی

اس عظمت نیاز کی سب کو خبر نہیں
سر خاک پر ہے سجدہ سر خاک پر نہیں

میری تباہیوں میں ترا ہات اگر نہیں
پھر کیوں دم سحر بھی نمود سحر نہیں

آداب بندگی کی مجھے کچھ خبر نہیں
مدت ہوئی کہ سر ہے مگر سنگ در نہیں

اندیشہ غلط روی راہبر نہیں
صرف اس قدر ہے فکر کہ تو راہبر نہیں

اے سرخوش جمال تجھے یہ خبر نہیں
جلوہ نشاط دل ہے سکون نظر نہیں

گھبرا نہ اس قدر شب زندان و دار سے
یہ شب طویل تو ہے مگر بے سحر نہیں

صیاد دیکھ حسرت پرواز کے طفیل
اہل قفس کو آج غم بال و پر نہیں

اب دیکھنے لگے قد و گیسو سے دار تک
اب کوئی اک مقام، مقام نظر نہیں

بات آپڑی ہے حسرت پرواز کی یہاں
صرف اک سوال بستگی بال و پر نہیں

یہ اور بات ہے کہ چٹکتی ہے ہر کلی
لیکن کسی کلی کو یقین سحر نہیں

جس غم کے ساتھ ہو احساس بےکسی
وہ غم تو ہے ضرور مگر معتبر نہیں

اس سجدہ نظر کی جلا ہے جبین یار
وہ سجدہ نظر جو در یار پر نہیں

اچھا ہے کم سوادی غم راز ہی رہے
خوش ہوں کہ میری آہ شبی میں اثر نہیں

اس آستاں پہ محویت بےخودی نہ پوچھ
محسوس کر رہا ہوں کہ میرا سر نہیں

کلیوں سے پوچھ لذت شاخ گداز غم
سینے ہیں چاک چاک مگر آنکھ تر نہیں

ہونے کو ہیں ابھی تو کئی حملہ جمال
یہ طول راہ شوق ابھی ختم پر نہیں

نازش سکوں پسند ہے میری سرشت غم
ورنہ کوئی بھی نالہ دل بے اثر نہیں

محبت کے شعبدے

اختر انصاری اکبرآبادی

مسکراتی ہے گردش دوراں — سرنگوں ہے غرور کجکلہاں

اے خرد یہ جنوں کی ہے توہین — چھوڑ اندیشہ ہائے سود و زیاں

کہیں تھک کر نہ بیٹھنا ہمدم — ان کی نظریں ہیں دور تک نگراں

دل میں افسردگی نہ ہو پیدا — دل جواں ہے تو ہے حیات جواں

آگ دل میں سرور آنکھوں میں — کیا فنا ہے اور کیا عنواں

فرق ہے اپنی اپنی ہمت کا — ورنہ دشوار ہے نہ کام آساں

تم نظر سے نظر ملائے رہو — روک لوں میں یہ لمحہ گذراں

راس لائے خدا یہ جوشش نمو — پھول بننے لگی ہیں اب کلیاں

ہیں محبت کے شعبدے اختر
ورنہ دنیا کہاں شباب کہاں

غزل

ظفر عالمگیر

بہار اب کے بہت ناگوار گذری ہے
شگفتگی بھی مرے دل پہ بار گذری ہے

یہ گل ہی نم نہیں سبزہ بھی نم شجر بھی نم
چمن سے آج صبا اشکبار گذری ہے

گذر رہی ہے اسی طرح زندگی میری
کہ جس طرح سے شب انتظار گذری ہے

مری فغاں سے شکایت ہے بزم شبنم کو
نجوم کو بھی فغاں ناگوار گذری ہے

کہیں ملیں تو انہیں اے صبا یہ کہہ دینا
کسی کی رات بہت بیقرار گذری ہے

غرور عشق کہوں اسے یا جنوں کی شکست
کہ آج ان سے ملاقات بار گذری ہے

مری وہ یاد جو بھولے سے آگئی تھی انہیں
سنا ہے ان کو بہت ناگوار گذری ہے

ہے ناز شمع کی سی زندگی پہ تم کو مگر
مری حیات بھی پروانہ وار گذری ہے

نہیں ہے خوف مجھے حشر کا کہ حشر بنے
ہزار بار شب انتظار گذری ہے

نہ پوچھ حال دل اس وقت کا نہ پوچھ کہ جب
کلی کلی کو ہنساتے بہار گذری ہے

وہ معترف ہیں کہ ہر بات سچ تو ہے لیکن
ظفر شکایت انہیں ناگوار گذری ہے

عید کارڈ دیکھ کر

صفی احمد (بہاری)

لبوں پہ کھیلتی ہے پھر تبسمِ رنگیں
کسی کی یاد سے دل میں ہے گدگدی پیدا
سجائی جاتی ہے پھر انجمن خیالوں کی
نہالِ شوق میں ہوتی ہے زندگی پیدا

یہ رات پچھلے پہر کی اداس تھی لیکن
یہ کس نے آکے تصور میں زندگی بھر دی
یہ ننھے ننھے ستارے یہ جلتے بجھتے دیے
یہ کس کا فیض ہے کس نے یہ روشنی بھر دی

سما رہا ہے مری زندگی میں چپ چپ کون
مرے تصورِ رنگیں کا کون مرکز ہے
نہ جانے کس کے لیے بیقرار ہے دل بھی
خبر نہیں کہ ہے کس کے لیے یہ اپنی لے

یہ "عید کارڈ" یہ ثمرا میری محبت کا
مرا نصیب ہے اوجِ فلک سے بھی بالا
کسی کی چشمِ عنایت کا ہے صلا یہ بھی
کہ آرزو کے چمن میں کھلے ہیں گل، لالا

ہندستان کو تربیت یافتہ اور بلند اخلاق اساتذ کی ضرورت ہے

(ڈاکٹر امرناتھ جھا)

قدیم زمانے سے ہی اساتذ اکا رتبا بلند رہا ہے۔ وہ قوم کے حقیقی معمار ہیں۔ سنسکرت کے ایک اشلوک کے مطابق استاد کو پرماتما کا روپ بتایا گیا ہے استاد نے یہ درجا اپنے اخلاق۔ کردار۔ علم اور سیوا کی وجہ سے حاصل کیا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے بادشاہ تک اس کی دہلیز پر اپنا سر خم کرتے تھے۔ اس کی ضروریات بہت کم تھیں اور دنیاوی تفکرات سے آزاد اور ضرورت کی بہت سی اشیا سے بے نیاز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طلبا پر اس کا اثر بے پناہ تھا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ آج استاد اس رتبے کا حامل نہیں رہا۔ لیکن آج بھی اگر عوام اس کی قدر کرنے لگیں تو وہ پھر اپنا کھویا ہوا درجا حاصل کر سکتا ہے۔ آج وہ افلاس کا شکار ہے اور فاقہ کشی اور بلند نصب العین کا کوئی ساتھ نہیں۔ اگر اس کی مالی حالت کو سدھارا جائے تو آج بھی اس میں وہی سرگرمی اور جوش عمل پیدا کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ اپنا فرض منصبی خوش اسلوبی سے ادا کریں تو ان کی ہمہ گیر تربیت لازمی ہے اور اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں بچوں کی نفسیات سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہیے۔ ہمدردی سچائی اور قابلیت سے وہ بچوں کو صحیح راہ پر لا سکتے ہیں۔ اور انہیں امن پسند شہری بنا سکتے ہیں اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نصاب اور تربیت کے متعلق اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مذہبی تعلیم بھی نصاب میں شامل ہونی چاہیے۔ لیکن بعض اس کے سخت مخالف ہیں۔ مگر ایک بات بڑی حد تک صحیح ہے کہ اگر مذہبی تعلیم صحیح طریقے پر دی جائے تو ہم بچوں میں رواداری اور وسعت نظر ایسی صفات پیدا کر سکتے ہیں اور اس طرح وہ نیک شہری بن سکتے ہیں۔ لیکن استاد کو کوئی نظریہ ٹھونسنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ استاد کو تعلیم دینے کی آزادی ضرور ہونی چاہیے لیکن حکومت پر بھی یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ درس گاہوں پر نگاہ رکھے۔ تاکہ طلبا تخریب پسندی کی رو میں نہ بہہ جائیں۔ علم چلتا دریا ہے۔ وہ جامد نہیں استاد کو بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلنا ہوگا۔ استاد بچوں کا گرو ہے اس لیے اس کو اپنی زندگی مثالی بنانی چاہیے۔

آج کل تعلیم صرف کمروں تک ہی محدود نہیں۔ طلبا میں رفاقت میل جول اور رواداری کا جذبا پیدا کرنے کی غرض سے اسکول سے باہر بھی کھیلوں اسکاؤٹنگ وغیرہ کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ ہندستان میں اساتذ کے سامنے کام کرنے کا ایک وسیع میدان ہے اگر وہ جفاکشی اور محنت سے کام کریں تو قوم کا مستقبل حقیقی طور پر شاندار ہوگا۔ اور عوام پر مسرت زندگی بسر کر سکیں گے۔

نوجوان ترقی پسند افسانگار قمرالدین قمر
کے افسانوں کا مجموعا
فٹ پاتھ
عنقریب منظر عام پر آرہا ہے
ناشر۔ مرکز ادب۔ بندر روڈ۔ کراچی

جوش ملسیانی کی نثرنگاری کے نمونے

(دوسری قسط)

دل محمد فضا جالندھری ادیب فاضل (ملتان)

مختلف تحریروں میں سے نثر کے چند چھوٹے چھوٹے جملے

۱ ۔ نظم وہی کامیاب اور جاذب نظر ہوتی ہے جس کے ہر شعر میں انداز بیان غزل ہی کا ہو۔

۲ ۔ اچھی نظم وہی کہہ سکتا ہے جو اچھی غزل کہہ سکتا ہو۔

۳ ۔ اس بحث کو چھوڑیے کہ شاعر نے کیا کہا یہ دیکھیے کہ کیسا کہا۔ اور کس ٹھاٹ سے کہا۔

۴ ۔ مختلف شعرا کی فکر رسا کا اندازا کرنے کے لیے کسی مصرع پر گرہ لگانے کی مثالیں بہت دل چسپ ہوتی ہیں۔

۵ ۔ متروکات زبان کی انتہائی پابندی کے لحاظ سے فصحائے لکھنو میں حضرت دل اور فصحائے دلی میں حضرت نوح صحت زبان کے علم بردار ہیں۔

۶ ۔ معاملا بندی غزل کا اہم عنصر ہے اسے الگ کر دیا جائے تو وہ غزلیت کے رتبے سے گر جاتی ہے۔

۷ ۔ ٹھوس اور چست بندی کے بغیر لطف بیان پیدا نہیں ہو سکتا۔

۸ ۔ کلام کا عام فہم ہونا بذات خد کمال شاعری ہے۔

۹ ۔ کمال شاعری کا معیار یہ نہیں ہے کہ اسے صرف خواص ہی سمجھ سکیں۔

۱۰ ۔ فلسفیانا اور حکیمانا انداز سخن بھی قابل قدر ہے بشرطیکہ بیان کی صفائی بھی اس کے ساتھ شامل حال ہو۔

۱۱ ۔ شعر میں قافیا تک بدل دینا اصول اصلاح کے خلاف ہے۔

۱۲ ۔ شعرا بھی الفاظ اور معانی کے صناع ہیں۔ اس لیے وہ بھی صناعوں کی جماعت میں شامل ہیں۔

۱۳ ۔ شعر میں ردیف اور قافیے کا دست و گریباں ہونا ضروری ہے ورنا ردیف برائے بیت رہ جائے گی۔

۱۴ ۔ مثنوی میں شعر کو مردف رکھنے کی پابندی پر لطف اور قابل داد ہوتی ہے۔

۱۵ ۔ جب تک ہم فارسیت اور لغت بازی نہیں چھوڑتے عطف و اضافت کو آخری حد تک ترک نہیں کرتے ہندستانی کی مخالفت کو کبھی نہیں روک سکتے۔

۱۶ ۔ مولانا حالی نے "مناجات بیوہ" میں جو زبان استمال کی ہے اگر تمام اہل قلم اسی کو استمال کرتے تو ہندستانی کی مخالفت اتنی ہرگز نہ ہوتی جتنی اب ہے۔

۱۷ ۔ میرا شوق سخن اگرچے دو آتشہ پیے ہوے تھا مگر رند لاابالی ہرگز نہ تھا۔

۱۸ ۔ اب نور وشنی طبع ایک بلا بن گئی ہے۔ ہر فرمایش شامت اعمال نظر آتی ہے۔

۱۹ ۔ شعر میں شعریت نہیں تو وہ قالب بے روح ہے۔

۲۰ ۔ میں کلاسیکل شاعری کا دل دادا ہوں۔ اور جب تک زندگی ہے اسی کا دل دادا رہوں گا۔

۲۱ ۔ جن دوستوں نے شاعری کا مقصد صرف سیاسیات سمجھ رکھا ہے انھوں نے خرمن سے صرف ایک دانا چنا ہے۔

مزاحیا انداز کے نمونے

۱ ۔ رسوا مدیر "نابھا اخبار" کی شاعری

کچھ عرصا ہوا۔ ناخدائے سخن حضرت نوح ناروی کی ایک برجستا و شگفتا غزل "رہنمائے تعلیم" میں شایع ہوئی تھی اس غزل کی زمین یہ تھی۔ ؎

بڑے آئے وہ درگذر کرنے والے

سالانا ادبی رپورٹ میں اس غزل کے بعض اشعار کی دوبارہ داد دی گئی۔ مگر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس غزل کے ۱۳ اشعار رسوا نے اپنے نام سے اپنے اخبار میں شایع کر دیے۔ "افسانہ خاموش" اس مسروقہ غزل کا عنوان ہے۔ کسی شعر میں تصرف یا لفظی تغیر نظر نہیں آتا۔ بجز اس کے کے مقطع میں لفظ رسوا کس قدر رسوا ہو رہا ہے۔ غنیمت ہے کہ اس قسم کا تصرف کسی اور شعر میں نہیں کیا گیا۔ ورنا ہر شعر رسوا کی رسوائی کا رونا روتا ہوا صف ماتم نظر آتا۔ اس دور میں جبکے شعرا کو ٹکے سیر بھی کوئی نہیں پوچھتا خد کو شاعر مشہور کرنے کا خبط بعض نااہلوں میں اس حد تک ہے کہ ایک مصرع بھی نہ لکھ سکنے کے باوجود مشاہیر کا کلام اپنے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ اور طرفہ یہ کہ اسے اپنے نام پر بھی شایع کر دیتے ہیں۔ ناظرین اندازا فرمائیں کہ اگر قدر شناسی کا زمانا ہوتا تو اس قماش کے لوگ کیا کچھ نہ کر گذرتے ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ رسوا کا یہ فعل تعزیرات ہند کی دفعا ۳۷۹ یا ۳۸۰ کی زد میں آتا ہے یا نہیں۔ ہاں اس بات کا یقین ہے کہ ہر عدالت ادب سارق کو اسی سزا کا مستوجب قرار دے گی جو اس کا تخلص خد ہی ظاہر کر رہا ہے۔

۲- دلگیر صاحب کا دل کش مکتوب

گورنمنٹ ہائی اسکول ہمیر پور ضلع کانگڑا سے ہمارے نئے کرم فرما دلگیر صاحب نے دل کی ہر ایک گرہ کھول دینے والی ایک شگفتا غزل بغرض اشاعت ارسال فرمائی ہے۔ غزل کیا ہے گنج گراں مایا ہے۔ مدیر "رہنمائے تعلیم" کو اس امانت کے لیے امین بنانا بھی ان کی خاص عنایت ہے۔ مگر بہ قول حضرت داغ ؎

امانت رکھ تو لوں داغ محبت
مگر ڈرتا ہوں یہ جوکھوں بڑی ہے

ان بصارت نواز جواہر پاروں کی قدر و قیمت کا اندازا ان کے مکتوب سے بھی جو اس غزل کے ساتھ شامل ہے اچھی طرح ہو سکتا ہے ع

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

پہلی سطر اس مکتوب کی یہ ہے۔

سعادت مند مدیر "رہنمائے تعلیم" لاہور۔ تسلیم

سعادت مند پر خندا بر لب ہونے کی ضرورت تھی۔ خشی کا مقام ہے کہ دلگیر صاحب نے (خواہ وہ اسکول کے طالب علم ہی کیوں نہ ہوں) بزرگوں کی زبان سیکھ لی ہے ورنا نحوست مند بھی لکھ دیتے تو وہ بھی سعادت مند کی طرح ناظرین کی شگفتا خاطری کا ذریعا تھا۔ تسلیم کے بعد ایک مصرع لکھا ہے۔ وہ بھی ملاحظا ہو۔ کیا داد سخن دی ہے۔ ؎

چھبیلے نور سے ٹپکا کلی کی نین کا آنسو

یہ نور کا مصرع طور کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ دل و دماغ کے دریچے کھول دیجیے تا کہ یہ تجلی بے روک ٹوک داخل ہو سکے۔ ماشا اللہ کیا اظہار حقیقت ہے۔ چھبیلا نور کون نہیں جانتا۔ بے دردی میں تو درکنار۔ خاب میں بھی ہر شخص نے دیکھا ہوگا۔ پھر کلی کی نین سراپا عین۔ یہ مرکب اضافی کتنا بصارت افروز ہے۔ نین سکھ کی آندھی آنکھیں بھی روشن کر دے۔ تو تعجب نہیں۔ آنسو کا ٹپکنا تو آپ نے سنا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے۔ مگر آنسو ٹپکا میں آتش بیانی کی جو لپک ہے۔ اسے بھی ملاحظا فرمائیں۔ جہنم کی آنچوں میں بھی یہ لپک نہ ہوگی۔ پورا مصرع مطلع انوار ہے۔ چشم بد دور۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

میں یہ غزل آپ کے رسالے کی نذر کر رہا ہوں۔ (بہت بہت شکریا۔ ایڈیٹر) اگر آپ اس کو رسالے کے ادبی گلشن میں نغمہ جوانی کی شراب ارغوانی بخشیں تو از حد مہربانی کی گھٹائیں اٹھیں گی۔ ناظرین آپ پھر ہنسنے لگے داد تو دیجیے سعادت مند انشا پردازی اس سے بہتر اور کیا ہوگی۔ گلشن ہے۔ نغما ہے۔ جوانی ہے۔ پھر شراب ہے اور وہ بھی

ارغوانی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ گھٹائیں اٹھ رہی ہیں پھر مہربانی ہی کی نہیں۔ از حد مہربانی کی گھٹائیں ہیں۔ ایسا عالم سامنے ہو تو ادبی گلشن میں نغمہ جوانی کی شراب ارغوانی ہی کا دور چلنا چاہیے۔ مگر مدیر کو ایسی نعمت عظمیٰ بخشنے والا کون ہے۔ خدا (؟) بخشے تو بخشے۔ ہم تو اس لیے نظر مراۃ النظر کی داد دے سکتے ہیں۔ جو کلی کی نیند اور آنسو کی لپک کے ساتھ از حد مہربانی کی گھٹائیں اٹھا رہی اور دنیائے ادب کو سیراب و شاداب کر رہی ہے اس حسن کلام کو دیکھ کر بھی اگر دل گیری باقی ہو تو مزید دل کشائی کے لیے کچھ اور سنیے۔

فرماتے ہیں "نوازش نامہ پہنچنے پر مجھے مندرجہ ذیل باتوں سے آگاہ کریں۔

بزرگوں کے قلم تبرک رقم لکھے ہوئے خطوط نیاز نامے نہیں نوازش نامے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے ان الفاظ کی معنوی عظمت نہایت قابل احترام ہے جب شروع میں سعادت مند کہہ کر مخاطب کیا گیا تو نیاز نامے کی جگہ بھی نوازش نامے ہی لکھنے کا تناسب تھا۔ اس کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے۔

یہ نذر (غزل سے مراد ہے۔ ایڈیٹر) اگر نا منظور ہو تو لفافے میں واپس کر دیویں۔ آپ کی درگاہ میں سخت تاکید ہے کہ منظوری اور نامنظوری کا جواب جلد دیویں۔

لیجیے صاحب اس عزت افزائی کی داد دیجیے۔ رسالے کا دفتر نہ سمجھیے۔ درگاہ خیال کیجیے۔ یعنی ادبیات کا مزار مبارک۔ دفتر کو درگاہ سمجھ کر مدیر کو بھی متوفی کہنا لازم ہے مگر نہیں۔ مدیر تو ابھی مدیر ہی ہے صرف دفتر ہی کو درگاہ کا خطاب عطا ہوا ہے جون میں پھر نئے خطابات عطا ہوں گے اور از حد مہربانی گھٹائیں اٹھیں گی۔ تو یقین ہے کہ مدیر پر بھی بارش کرم ہوگی اور وہ بھی متوفی کے اعزاز سے مفتخر ہو جائے گا۔ فی الحال تو اس کو سعادت مند خطاب ہی کے قابل سمجھا گیا ہے۔

خطاب عطا کرنے والی ہستی قابل خطاب ہستی سے ہمیشہ بالادست ہوتی ہے اسی لیے تو درگاہ کے ساتھ سخت تاکید کے الفاظ مربوط کیے گئے ہیں التماس کہنے میں یہ جلالت کہاں!

اس کے بعد پھر ایک نور" علیٰ نور مصرع آنسو کی طرح ٹپکا ہے مگر دوائے دل گیری کے لیے یہی اقتباس کافی سے زیادہ ہے اس لیے وہ دل کش مصرع اور وہ دل کش غزل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں تبرک نذریں درگاہ "رہنمائے تعلیم" میں بہ مد امانت رہیں گی۔ تاکہ ہر زائر کی دل گیری کو دل کشائی حاصل ہوتی رہے۔

۳۔ بے مصرف تنقید

(مقبول صاحب کی ایک نظم لاہور کے ایک رسالے میں شائع ہوئی۔ حضرت ازل لاہوری نے اس پر اعتراضات کیے۔ مصنف نے ان اعتراضات کا جواب نظم میں دیا۔ ازل صاحب مطمئن نہ ہوئے اور جواب الجواب لکھ مارا۔ رسالہ مذکور نے اسے شائع نہ کیا۔ ازل صاحب نے وہ مضمون "رہنمائے تعلیم" میں بھیج دیا۔ یہ مکمل سلسلہ جو انہوں نے بھیجا بہ وجہ طوالت شائع نہیں کیا گیا۔ تنقید بھی بے مصرف تھی۔ اس پر انہوں نے لکھا کہ اگر مضمون شائع نہیں کرتے تو اس پر اظہار خیال ہی کیجیے۔ اس اظہار خیال میں بھی چونکہ طوالت ہے اس لیے اس کا کچھ آخری حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے)

بھائی صاحب! شاعر نے اپنے منظوم جواب میں یہ کہہ دیا ہے کہ میں نے قصوں کی زبان استعمال کی ہے۔ بس فضا پاک۔ جواب الجواب کی صورت میں نیا قصہ چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خاص کر اس صورت میں جبکہ شاعر کا منظوم جواب بلکل الہامی نوعیت کا ہو۔ دیکھیے وہ فرماتے ہیں ؎

نظم۔۔۔ میں بھی جو چھپی۔ میں نے قصے کی زبان میں تھی کہی۔
یہ بھی چھپی اور بھی کہی۔ آخر قصے ہی کی زبان ہے۔ چھپی

اور کہی کے قوافی ہیں جو لیتا ہے۔ قصوں میں اسے کوئی ترجا نتا ہی نہیں یہ قوافی بھی قول شاعر کی تائید کر رہے ہیں۔ اعتراضات سے پہلے مناسب یہ تھا کہ بازار سے چند قصے لے کر پڑھ لیے جاتے۔

اور اس قصے کو طول نہ دیا جاتا۔ "گذشتہ را صلواۃ و آیندہ را احتیاط" پر عمل کرنا ہو تو بھی مناسب یہ ہے کہ جناب دو چار مہینے قصے ہی پڑھا کریں تاکے اس زبان پر جیسے اگلے شعر میں اپ ٹو ڈیٹ کہا گیا ہے۔ عبور حاصل ہو جائے۔

وہ شعر یہ ہے ؎

وہ بھی اردو جس کو کہیے اپ ٹو ڈیٹ
لے جو پورے برّاعظم کو سمیٹ

اپ ٹو ڈیٹ کی تعریف بھی یہی ہے اور ڈکشنری میں اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ وہ پورے برّاعظم کو (جس میں آپ کا دولت کدہ بھی شامل ہے) سمیٹ لے جب یہ اردو سمیٹ لے کے سمیٹ کو اتنی دور پھینک سکتی ہے تو برّاعظم اس کی طاقت کے سامنے کیا چیز ہے۔ پس پہلے اس پر عبور حاصل کیجیے پھر آپ کی زبان بھی پورے برّاعظم کو (جس میں مقبول صاحب کا مسکن بھی شامل ہے۔) سمیٹ لے گی۔ اس زبان کا تعارف تو مقبول صاحب کی عنایت سے ہو ہی گیا ہے وہ فرماتے ہیں ؎

ہے وہ دلی لکھنو سے دور تک قاہرا سے جو ہے سنگاپور تک

اس شعر کا مطلب شعر ہی میں سنیے ؎

یہ زبان ہے ہر جگہ مشہور تک اب کیوں ہیں فہم سے معذور تک

ہمارا شعر سن کر بھی جناب اگر شاعر کے مفہوم کو نہیں سمجھے تو اس کا علاج یہی ہے کہ قاہرا سے سنگاپور تک سفر کیجیے پھر آپ مقبول صاحب کا یہ شعر بار بار پڑھا کریں گے۔

اب سند کے واسطے دیوان داغ۔ کیوں ٹٹولیں ہاتھ میں لے کر چراغ

ہماری تجربے کے مطابق اگر آپ عمل کریں تو اس سفر میں آپ کو بہت سے ایسے آنکھوں والے ایسے نظر آئیں گے جو چراغ ہات میں لے کر کسی کو ٹٹولتے ہوں۔ اگر بالفرض ایسے چند اشخاص سرسری تلاش سے نہ ملیں تو آپ خدا نہیں ٹٹول سکیں گے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع مل سکے گا۔ "جوئندہ یابندہ" زیادہ نہیں تو ان سے قصوں کی زبان تو آپ ضرور ہی سیکھ لیں گے جب جناب سنگاپور ڈاک خانہ خاص میں پہنچ جائیں گے تو وہاں بھی ہر شخص قصوں کی زبان کا ماہر نظر آئے گا اور مقبول صاحب کے یہ اشعار وہاں سب کی زبان پر ہوں گے ؎

اب تو اردو میں فرض ہے فرض بھی
جیسے غرضے کے میں بولے ہر کوئی
محض کو سب لوگ کہتے ہیں محض
شخص کو بھی عام کہتے ہیں شخص
وزن کو گر تولیے لے کر وزن
ہوں گے راضی اور خوشی سب مرد و زن
گر حرج کو کیجیے اس طرح درج
جزم رے پر آ پڑے کیا اس میں حرج
اب مرض کو لیجیے دیکھے جو قرض
بھول جانے کا اسے ہے عام مرض

ان پانچوں اشعار میں جناب کے اعتراضات کا جواب اس قدر جامع اور اپ ٹو ڈیٹ ہے کہ اسے نکر پھر جواب الجواب لکھنے کی زحمت محض (بہ فتح حائے حطی) حرکت مذبوحی ہے بندہ نواز۔ ہماری زبان فی الواقع اب اس منزل پر پہنچ گئی ہے کہ وہاں محض اور شخص ہم قافیہ ہو کر ہم آغوش نظر آتے ہیں۔ وہاں وزن کو وزن (زے کے زبر سے) لے کر تولیں تو سب مرد (ان کے ساتھ عورتیں بھی) (راضی ہوں گے) (مرد و زن کے ساتھ لفظ راضی کتنا بلیغ فرمایا گیا ہے۔ داد دیجیے) راضی ہی نہیں خش بھی ہوں گے۔ خش ہی نہیں خشی بھی ہوں گے۔ وہاں حرج کو اس طرح درج کریں یعنی انٹری کریں کہ رے پر جزم آ پڑے (یعنی اس پر لیٹ جائے) تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ اس منزل میں اس قدر سکون ہے کہ غرض اور مرض کی رے بھی مرنے والے کی نبض کی طرح ساکن ہو چکی ہے اور غرضے کے میں کاف بھی بستر مرگ پر دراز ہو کر "کے" یہ وزن فع بن چکا ہے یہ وہ بلند ترین مقام

ہے کہ لاہور میں رہنے والے اس منزل کو دیکھ ہی نہیں سکتے اور نہ وہاں کے ساکنین کی عظمت کو سمجھ سکتے ہیں۔ جب تک شاعر اس منزل پر نہیں پہنچتا مقبول ہو ہی نہیں سکتا۔ اس منزل کے شناسائی کا مزید تعارف مصنف مذکور ہی کی زبان سے سنیے نظم میں شاعر کو ہے سب اختیار۔ جس طرح چاہے کہے وہ اپنا وار تان دے فقروں کو چاہے، دے وہ ڈھیل ہو ادا مطلب تو بے جا قال و قیل شاعر کی یہ تعریف سن کر بھی جناب برحق۔ برحق نہ کہیں اور مزید بحث پر آمادہ ہوں تو پھر آپ کا مخاطب یعنی مدمقابل بھی جس طرح چاہے گا اپنا وار کرے گا۔ نظم میں اس کو سب اختیار (جیسے دوام وغیرا) حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی وہ بالکل مطلق العنان (بے مہار نہ سمجھے) ہوتا ہے۔ چاہے وہ فقروں کو چادر کی طرح تان دے۔ چاہے انہیں ڈھیل دے۔ (ڈھیل بہ معنی تاخیر و التوا نہ سمجھیے۔ یہ اجتہاد کا کرشمہ ہے کہ ڈھیل کے معنی ڈھیلا کر دینا ہو گئے) جب مطلب ادا ہو گیا تو پھر قیل و قال کہ دیا۔ تو کیا۔ اور قال و قیل کہہ دیا تو کیا۔

بھائی صاحب۔ قسم ہے کلام مقبول کی اور قسم ہے ایڈیٹر صاحب کے جواب معقول کی جو آپ کے خیالات کی تردید میں لکھا گیا۔ قسم ہے آپ کے لیے مصرف شوق تنقید کی اور قسم ہے آپنے مضمون ناقابل تردید کی۔ ہمیں تو کلام مقبول میں کلام کی گنجایش کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کا مصنف تو اس قابل ہے کہ خدا تعالیٰ اسے اپنا درباری شاعر بنا لے۔ جب حقیقت حال یہ ہو تو ہم آپ کے اعتراضات کی تائید کس طرح کریں اور اس گناہ کبیرہ کے مرتکب کیوں ہوں۔

اگر آپ مصنف ہیں اور اپنی تصنیف کی بھلائیوں اور برائیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں تو ہندستانی ادب میں تبصرے کے لیے اپنی تصنیف کو ضرور بھیجیے۔ اس لیے کہ یہی وہ بے باک رسالہ ہے جو اپنوں اور غیروں کا لحاظ کیے بغیر کھری کھری سنا دیتا ہے

غزل

زاہد رضوی

تمہاری یاد کیوں تڑپا رہی ہے
کہ دل کی بات لب پر آ رہی ہے
گلے مل کر جمال یار سے اب
جوانی بے طرح شرما رہی ہے
شب غم میں کسی کی یاد پیہم
قیامت پر قیامت ڈھا رہی ہے
مزاج وقت سے دل بجھ گیا ہے
اداسی دو جہاں پر چھا رہی ہے
تری پر کیف سی مطرب نوائی
ہمارے دل کو پھر گرما رہی ہے
محبت میں مجھے کیا ہو گیا ہے
اسے کیوں نبض ڈوبی جا رہی ہے
کرم پر آج وہ مایل ہیں شاید
سکوں کچھ دل کی دنیا پا رہی ہے
پشیماں ہیں وہ خود اپنی جفا پر
نظر بھی ان کی جھکتی جا رہی ہے
مری بربادیوں پر آج زاہد
بھری دنیا بھی کچھ شرما رہی ہے

وادی کشمیر — موسم خزاں میں

ا - ا

موسم خزاں میں وادی کشمیر کے مختلف حصے ان کے مختلف اوقات پر مختلف مناظر پیش کرتے ہیں۔ صبح کے وقت پھولوں کے پودوں کے ارد گرد دگری ہوئی پتیاں پڑی دکھائی دیتی ہیں۔ زردی مایل پتے درختوں سے زمین کی طرف گرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور فضا میں کچھ اداسی سی چھائی ہوتی ہے۔ لیکن اس موسم میں جھیل کے کنارے حالت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں ہاوس بوٹ میں بیٹھے ہوئے طلوع آفتاب کا منظر کچھ اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسا کہ صبح کی رانی گہری نیند کے بعد اپنی نرم و نازک آنکھیں کھول رہی ہو۔ اور ان میں سے نور کا ایک فوارا پھوٹ پڑا ہو۔ شام کے وقت یہی نظارا ایک نئے رنگ میں سامنے آتا ہے۔ شام کے دھندلکے میں جیسے فضا میں اداسی کی جھلک سی نظر آنے لگتی ہے تو آسمان کی تاریکی آہستا آہستا ایک پر اسرار طریقے سے ہمیں اپنی لپیٹ میں لیتے ہوئے محسوس ہوتی ہے اور دور افق سے پہاڑیوں کی چوٹیوں پر شام کی مدھم روشنی کا پڑا ہوا دامن دکھائی دیتا ہے

وادی کشمیر کے دیہی علاقوں میں موسم خزاں نیا ہی منظر پیش کرتا ہے۔ وہاں سے خالی ننگ دھڑنگ درختوں کی ٹہنیوں میں سے سرکتی ہوئی ہوا وادی کی کھلی فضاؤں میں سے گذرتی ہے اور پھر چھوٹی چھوٹی کانٹے دار جھاڑیوں سے چھوتی ہوئی جنگلوں کی خاموشی میں گم ہو جاتی ہے صبح کے وقت کچھ مرجھائے ہوئے پتے درختوں سے نیچے گرتے ہیں اور ایک وسیع حلقے پر غم کی فضا غالب آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن اس اداسی بھرے قدرتی منظر کو دیکھنے کی محویت بھی اپنے اندر مسرت کا پہلو لیے ہوتی ہے اور اس سے ایک انوکھا لطف محسوس ہوتا ہے۔

اس موسم میں ایک ایسے کھیت کے کنارے پر کھڑا ہونے سے جس میں سے چاول کی فصل کاٹ لی گئی ہو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ سبزے سے خالی وادی کی معصوم فضا آپ کو اپنی آغوش میں لے رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کہیں سبزا بھی نظر آتا ہے۔ ننگ دھڑنگ درختوں کے درمیان کہیں کہیں سبزے کا چھوٹا سا قطعا نہایت شوخ منظر پیش کرتا ہے۔ اور دو پہاڑوں کی برف پوش بلند چوٹیاں ایک ایسا نظارا پیش کرتی ہیں جس کا عکس ہمارے ذہن سے کبھی ہٹ نہیں سکتا۔

وادی کے زیریں حصوں میں باغوں کے مالکوں نے پہل اکٹھے کر لیے ہیں۔ لیکن بالائی حصوں میں سیبوں سے لدے ہوئے درخت ابھی تک موسم خزاں کی دھوپ میں فضا کو رنگین بنا رہے ہیں۔ شہد کی مکھیاں پالنے والے چھتوں سے شہد نکالنے کے انتظار میں ہیں۔ تھوڑے دنوں میں جب شہد پک کر اچھی طرح تیار ہو جائے گا تو وہ اسے نکال لیں گے اخروٹ کی فصل اکٹھا کی جا چکی ہے اور اسے منڈی میں لانے کے لیے صاف کیا جا رہا ہے۔

کچھ عرصا پیشتر جن پہاڑوں پر سبزا دکھائی دیتا تھا وہ اب خشک نظر آ رہے ہیں۔ اس لیے گڈریے اپنے مویشیوں کو ساتھ لے کر پہاڑوں کی بلندیوں سے نیچے اتر آئے ہیں۔ دیہات میں دھان کی کٹی ہوئی فصل کے بڑے بڑے ڈھیر لگائے جا رہے ہیں۔ کسان ان دنوں فصل کاٹنے میں بہت مصروف ہیں شام کے وقت کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں سے مل کر گانے یا دور سے کسی دیہاتی گیت کی مترنم آواز ایک نئی زندگی کا اثر دالیے ہمارے کانوں میں پڑتی ہے۔

اب وادی کشمیر کے ان حصوں پر نظر ڈالیے جہاں کی

آبادی مقابلتہً زیادہ ہے۔ اس موسم میں ان علاقوں کے بازاروں میں پھل اور سبزیوں کے ڈھیر لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں ناشپاتی آلوچا کی جدید ترین اقسام ہر قسم کے سیب بہی سفرجل غرضیکہ سرخ سنہری رنگ کے مختلف پھل بہت دل کش منظر پیش کرتے ہیں لکڑی کے کندہ کاری اور کاغذ کا صندوق اور کشتی وغیرہ بنانے والے کارکن اپنی تیار کردہ اشیا نہایت سستے داموں فروخت کر رہے ہیں۔ اور سیر و تفریح کے لیے جانے والے اشخاص اپنے بجٹ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اتنی اشیا کی خرید کے مواقع میسر آنے پر حیران رہ جاتے ہیں۔ پھلوں کی افراط کا تو یہ عالم ہے کہ لاریوں اور ٹرکوں سے مختلف قصبوں میں پھل ڈھونے کا کام سارا سارا دن جاری رہتا ہے۔

اس موسم میں ہاؤس بوٹ کی زندگی ایک نیا ہی لطف دیتی ہے۔ اب گرمی کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ اس لیے دن کو ہاؤس بوٹ کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے بیٹھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہاؤس بوٹ میں بیٹھے ہوئے اب ہر وقت باہر کے قدرتی منظر سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ صبح و شام کے وقت جب سورج کی کرنیں دریا کے پرسکون پانی سے ہم آغوش ہوتی ہیں تو روح کو تازگی بخشنے والا ایک عجیب سماں بندھ جاتا ہے۔ جھیل ڈل کے کنارے سے ان رنگوں کا نظارہ قابل دید ہوتا ہے جن کا عکس پانی میں پڑتا ہے اور پھر یہ رنگین منظر آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جھیل اور تالابوں کے بعض گوشوں میں کنول کے پھولوں کی پنکھڑیاں اکٹھی ہو گئی ہیں لیکن کہیں کہیں ایک آدھ پھول بھی نظر آ جاتا ہے۔ جو شاید شرساری سے گردو نواح کی مغموم فضا کا ماتم کر رہا ہوتا ہے۔

اگر آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی ہے تو کرپا کر کے چندا منی آرڈر کر دیجیے۔ وی پی کی شکل میں خرچ زیادہ بیٹھے گا۔

نائیجیریا کی تعلیمی ترقی

نائیجیریا میں ہمیشہ اس چیز کو محسوس کیا گیا ہے کہ تعلیم اور تربیت ملک کی معاشی، سماجی اور سیاسی ترقی میں ایک اہم رول ادا کر سکتی ہے بین قومی بنک کے مشن نے اپنی رپورٹ میں جو ابھی ابھی شائع ہوئی ہے تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن میں نائیجیریا آفس کے ایک ترجمان نے کہا ہے کہ حکومت نائیجیریا پہلے ہی سے تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دے رہی ہے صرف ایک مشکل ہے اور وہ یہ کہ اسٹاف کی نائیجیریا میں کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ حکومت نائیجیریا ہر سال ۵۰۰۰،۰۰۰ پونڈ تعلیم پر خرچ کر رہی ہے جبکہ جنگ سے قبل اس کے تعلیمی اخراجات صرف ۲۹۶،۰۰۰ پونڈ تھے موجودہ صدی کے پہلے نصف کے اعداد و شمار کے برابر سنہ ۱۹۰۰ء میں صرف ۱۷ لڑکوں نے بطور ٹیچروں کے تربیت حاصل کی۔ سنہ ۴۸ء میں اس قسم کی تربیت حاصل کرنے والے لڑکوں کی تعداد ۴۸۰۰ اور لڑکیوں کی تعداد ۱۰۶۰ تھی۔ نائیجیریا میں اس وقت ٹیچروں کو تربیت دی جا رہی ہے۔ نائیجیریا کے مغربی علاقے میں جلد بچوں کی مفت پرائمری تعلیم کا نظام قائم کر دیا جائے گا۔ آبادان کے یونیورسٹی کالج میں جو سنہ ۴۸ء میں شروع کیا گیا تھا اب ۵۰۰ طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور آگے چل کر اس میں ایک ہزار طلبا تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ لندن یونیورسٹی کے تعاون سے جو امتحانات منعقد کیے گئے ہیں ان کے نتائج بہت حوصلہ افزا ہیں۔ لندن یونیورسٹی اس کالج کے کامیاب طلبا کو ڈگریاں عطا کرتی ہے فنی تعلیم کی سہولتیں بھی دی جا رہی ہیں حکومت نائیجیریا اپنے باشندوں کو برطانیہ، کینیڈا اور امریکا میں فنی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظیفے دیتی ہے۔ برطانیہ میں نائیجیریا کے طلبا کی تعداد تین ہزار ہے۔

ج-۱

تعلیمی حقوق کی ضمانت دینے کیلیے چین کا پلان

۱۹۵۳ء میں تعلیم کے لیے چینی سرکار کی طرف سے دی گئی امدادی رقم ۳۰ گنا تھی۔ اور ۱۹۵۴ء میں ۱۹۳۶ء کے مقابلے میں جو کومنتانگ کے عہد حکومت کا انتہائی بلند سطح والا سال تھا ۷ء۳ گنا ہے۔ عوامی سرکار نے ۲ لاکھ ۳۰ ہزار پرائمری اسکول اور ۰۰ ۷ مڈل اسکول اور ۲۰۰ سے زائد اعلا تعلیمی ادارے قایم کیے ہیں۔ فاضل وقت کے لیے کسانوں اور مزدوروں کے لاکھوں اسکول ان کے علاوہ ہیں زیر تربیت استادوں کی تعداد میں بھاری اضافہ ہوا ہے مزدوروں اور کسانوں کے بچوں اور دوسرے نوجوانوں طالب علموں کو بڑتی ہوئی مالی امداد کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں مزدوروں اور کسانوں کے کنبوں کے طالب علموں کی تعداد بڑی ہے۔ مڈل اسکولوں میں ان کی گنتی ۵۰ فی صدی تک استادوں کی تربیت کے اسکولوں میں ۶۴ فی صد تک اور پرائمری اسکولوں میں ۸۰ فی صد سے زاید تک پہنچ چکی ہے۔ اقلیتی قومیتوں کے عوام کے بچوں کو خاص رعائتیں دی گئی ہیں یعنی داخلا لینے کی آسان شرایط بڑی بڑی امدادی رقمیں درسی کتابوں کی بھاری سپلائی اور طالب علموں کو ان کی اپنی زبان میں پڑانے کی آسانیاں۔ اسکول جانے والی لڑکیوں کی گنتی نسبتاً زیادا بڑی ہے۔ قومی آزادی سے ۱۹۴۷ء میں لڑکیاں کل طالب علموں کا ۱۸ فی صد تھیں۔ لیکن اب ۲۵ فی صد ہیں۔

چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں پرائمری اسکولوں میں ۵ کروڑ طالب علم تھے یعنی کومنتانگ کے عہد حکومت کے انتہائی بلند سطح والے سال سے ۱۳۰ فی صد زیادا آ ناوی اسکولوں میں ۳ کروڑ ۶ لاکھ ۲۰ ہزار طالب علم تھے یا پھر قومی آزادی سے پہلے کے بلند ترین اعداد شمار سے ۳۹ فی صد زیادا اعلا تعلیمی اداروں میں ۲ لاکھ بارا ہزار طالب علم تھے یعنی قومی آزادی سے پہلے کے بلند ترین اعداد شمار سے ۷۰ فیصد زیادا۔

کومنتانگ کے ۲۰ سال سے زاید کے عہد حکومت کے دوران تعلیم پر اخراجات سرکاری بجٹ کا ۴ فی صد سے زاید نہیں ہوتے تھے۔ اس فنڈ پر بھی فوجی حکام جھپٹ پڑتے تھے اور جو کچھ بچ رہتا تھا وہ تضیع اور غبن کی نذر ہو جاتا تھا۔

آئین کے مسودے میں درج تعلیمی کاموں کو قدم بہ قدم پورا کرنے کے لیے چین میں ہر امکان موجود ہے۔ شہریوں کو تعلیم پانے کے حق سے لطف اندوز ہونے کی ضمانت دی جائے۔ سرکار مختلف اسکولوں اور دوسرے تہذیبی اور تعلیمی اداروں کو قایم کرتی ہے۔ اور ان میں قدم بہ قدم توسیع کرتی ہے۔

تعلیم کا اب جو پنجسالا پلان وضع کیا جا رہا ہے وہ قومی تعمیر خاص طور سے صنعتوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے علمے کے اہل کارکنوں کی تربیت کو یقینی بنائے گا۔ اور پرائمری اور مڈل اسکولوں کو ترقی دے گا۔ تا کے محنت کش عوام کے بچوں خاص طور سے صنعتی مراکز کے مزدوروں کے بچوں کو قدم بہ قدم تعلیم دی جائے۔ اس مقصد کے لیے استادوں کو تربیت دینے کے کام کو تیز تر کیا جائے گا اور ملک میں استادوں کے کالجوں میں بھی بھاری توسیع کر دی

جائے گی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۹۵۷ء تک تمام مڈل اسکولوں کے استادوں کی گنتی یونیورسٹیوں کے گریجویٹ شامل ہیں۔ موجودہ تعداد سے دگنی ہو جائے گی۔ پرائمری اسکولوں کے لیے لاکھوں نئے استاد بھی مہیا کیے جائیں گے یہ سب باتیں شہریوں کے لیے ان کی تعلیم کے حق کی ضمانت دینے کے سلسلے میں عظیم اقدام ثابت ہوں گی۔ مقامی سرکار اسکولوں کی عمارتیں تعمیر کرنے یا ان کی مرمت کرنے اور ان سے ملحقہ عمارتوں کو توسیع دینے کے لیے مزید بھاری رقوم وقف کرے گی۔ تاکہ شہریوں کے لیے تعلیم کے حق سے لطف اندوز ہونے کے مادی حالات کو یقینی بنایا جائے۔ مستقبل قریب میں بہت سے نئے اسکول تعمیر کیے جائیں گے۔ اور پرانے اسکولوں کو توسیع دی جائے گی مثال کے طور پر پیکنگ میں سنہوا یونیورسٹی کی عمارت اپنے رقبے کے اعتبار سے دگنی ہو گی۔ اور اس سے ملحقہ عمارتوں چھ سے سات گنا تک توسیع دی جائے گی۔ بہت سے مڈل اور ٹکنیکل اسکولوں کی عمارتوں کو بھی قد و قامت کے اعتبار سے دگنا کر دیا جائے گا۔

آج کے بعد سے پرائمری اور مڈل اسکول قائم کرنے کی جگہوں کا فیصلہ آبادی کی کثرت اور جغرافیائی حالات خاص حالات اور اقلیتی عوام کی رنگا رنگ ضروریات کے اعتبار سے کیا جائے گا۔ اور کان کنی کے اور صنعتی مراکز کے مزدوروں کے بچوں کے حق میں فیصلے پر زور دیا جائے گا اس میں کوئی شک اور شبہ نہیں کہ سرکار کی اقتصادی قوت کی مسلسل نشو و نما سے شہریوں کے تعلیم سے متعلق حق میں بھی مزید توسیع ہو گی۔

مضمون نگار حضرات سے عرض ہے کہ مضامین ہمیشہ واضح اور صاف خط میں لکھا کریں۔ بدخط مضامین کا پڑھنا مشکل سا ہو جاتا ہے۔

سوویت یونین کا نظام تعلیم

بین قومی استادوں کے فیڈریشن کے انیسویں اجلاس منعقدہ ماسکو کے موقع پر روسی وزیر تعلیم ایوان کیروف نے مہمانوں کا پرجوش خیر مقدم کیا اور ان کی معرفت برطانیہ فرانس، چین، ہالینڈ، سوئیزرلینڈ، اٹلی جرمنی کی عوامی جمہوریہ، بلجیم، چیلی اور انڈونیشیا کے استادوں کو مبارکباد پیش کی۔ انہوں نے مشترکہ کمیٹی کی زبردست اہمیت پر روشنی ڈالی۔

اپنی بات چیت کے دوران وزیر موصوف نے مہمانوں کو سوویت نظام تعلیم اور نئی نسل کی پرورش و پرداخت کے متعلق بتایا۔ ایوان کیروف نے بتایا کہ سوویت اسکولوں میں نئی پود کو گہری اور وسیع تعلیم دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں نوجوانوں کو آزادی کی محبت اور سوویت قوموں اور دنیا کے تمام ممالک کے محنت کش عوام کے درمیان دوستی کی قدر و منزلت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سوویت اسکولوں میں بچے کی انفرادی صلاحیتوں کو ترقی دینے کے ساتھ ساتھ اس میں اجتماعیت بھائی چارگی اور انسان دوستی کے جذبے کو ابھارا جاتا ہے۔

سوویت تعلیم کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایوان کیروف نے بتایا کہ پورے سوویت یونین میں سات سالہ لازمی تعلیم کے اصول پر عمل ہوتا ہے اور اس سال تمام روسی فیڈریشن کے ایک سو بیس شہروں میں عام ثانوی (دس سالہ) تعلیم کا رواج عام کیا جائے گا۔

بیرونی مہمانوں نے پولی ٹکنیکل تربیت سوویت اور بیرونی اسکولوں کے تعلقات کی ترقی بیرونی زبانوں کے مطالعہ اسکول سے پہلے تعلیم اور تربیت کا کام کرنے والے اداروں وغیرہ کے متعلق بہت سے سوالات کیے۔

اس کے بعد مشترکہ کمیٹی کے صدر ا۔ م گوسارت نے اظہار خیال کیا اور سوویت یونین میں شریک اجلاس مندوبین کا جس طرح گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا ہے اس کا شکریہ ادا کیا۔

(انتقاد)

رباعیات عمر خیام

(پہلی قسط)

ظفر عالمگیر بی۔ اے (عثمانیہ)

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں)

عمر خیام مشرق کے ان چند شعرا میں سے ہے جن کی عظمت کو مشرق اور مغرب کے اصحاب فکر و نظر نے تسلیم کیا ہے بہت دنوں پہلے میں نے عمر خیام کی رباعیاں فارسی میں پڑھی تھیں اور بعد میں انگریزی رباعیاں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ فٹنر جیرالڈ کا ترجمہ بڑا دلفریب اور بہت خوب صورت ہے۔ جیرالڈ نے ترجمے کا حق ادا کیا ہے کچھ دنوں پہلے عمر خیام کی رباعیات کا ہندستانی ترجمہ ہاتھ آیا جو محشر نقوی نے کیا ہے۔ اور جس میں منظر کی بنائی ہوئی بعض تصویریں بھی شامل ہیں۔ جن میں خیام کے اشعار کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کاغذ اور طباعت کی حد تک یہ تصنیف بہت خوب ہے۔ منظر کی تصاویر، تصاویر نہیں، عمر خیام کی عظیم شاعری کا بھونڈا مذاق ہے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ایک تو مشق مصور بھی نہیں، بلکہ تصویریں اتارنے والے نے کسی عریاں رسالے میں جا بجا جنسی ہیجان برپا کرنے عورتوں کی تصاویر بنا دی ہیں۔ کتاب میں پہلی ہی تصویر سر تا پا عریاں دوشیزا کی ہے جو بڑی مخرب اخلاق ہے تصاویر سے خیام کی رباعیات کا جمالیاتی پہلو نمایاں ہونے کی بجائے تصویر بنانے والے کے جنسی اختلال اور گندہ ذہنی کا اظہار ہو رہا ہے۔

ترجمہ محشر نقوی نے کیا ہے جو خود اپنے الفاظ میں "کوئی مستند ادیب ہیں اور نہ حقیقی معنوں میں شاعر" جیسا کہ اس تصنیف کے پیش لفظ میں انہوں نے فرمایا ہے اگر یہ انکساری ہے تو قابل معافی اور اگر حقیقت ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے عمر خیام جیسے شاعر پر دست درازی ہی کی زحمت ہی کیوں گوارا کی۔ پیش لفظ میں ان کا دوسرا دعوا موجود ہے کہ ———

"ہندستان کے بعض شعرا نے بھی عمر خیام کی رباعیات کو ہندستانی کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے لیکن ان حضرات نے جہاں تک میرا خیال ہے اصل فارسی کلام کو پیش نظر رکھا اور رباعی ہی کے وزن میں ان کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی رد و بدل الفاظ کے ساتھ مکھی پر مکھی ماری جانے کی وجہ اصل رباعیوں کی نزاکت اور رنگینی متاثر ہو کر رہ گئی۔ برخلاف اس کے میں نے فارسی رباعیوں کے عوض فٹنر جیرالڈ کے انگریزی ترجمے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایک طویل لیکن مترنم بحر اختیار کی تاکہ ترجمے میں شاعر کا حقیقی منشا و مفہوم ظاہر ہو سکے۔"

ان الفاظ سے محشر نقوی کے ذہن میں موجود ترجمے کے اصولوں کا پتا چلتا ہے یعنی ترجمہ کرتے مکھی پر مکھی نہ ماری جائے بلکہ شاعر کے مفہوم و منشا کو ادا کیا جائے اور اس طرح کہ اصل کی نزاکت اور رنگینی کم سے کم متاثر ہو۔ میرا عقیدہ تو یہ رہا ہے کہ غیر زبانوں کی نظموں کا ترجمہ نظم کی بجائے نثر ہی میں زیادہ کامیابی اور اصلیت کے ساتھ ممکن ہے مشہور انگریزی شاعر لارڈ بائرن کی انتہائی طویل نظم "شیلان کا قیدی" کا ترجمہ میں نے نثر میں کیا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ کیٹس، شیلی اور کئی جدید انگریزی شعرا کی نظموں کا ترجمہ میں نے نثر ہی میں کیا۔ بنگالی زبان کے مشہور شاعر کوی غلام مصطفٰے

کی نظم ”پیام ملت“ کا ترجمہ آزاد نظم میں کرتے ہیں نے محسوس کیا تھا کہ نثر کے بعد آزاد نظم بھی بڑی حد تک اس غرض کے لیے مفید ہے لیکن بنگالی شاعرہ بیگم صوفیا کمال کی نظم ”آزادی“ کا منظوم ترجمہ میں بخوبی کر سکا اور نہ مجھے وہ ترجمہ پسند آیا۔ اگرچہ شایع بھی ہوا۔ غیر ہندستانی نظموں کے منظوم ترجمے میں نے اکثر پڑھے ہیں۔ اور یہی محسوس ہوتا ہے کہ منظوم سے کہیں بہتر منثور ترجمہ ہو سکتا ہے چاہے وہ انگریزی فارسی گجراتی یا بنگالی سے کیا جائے۔ میرے اس عقیدے کی بنیاد مطالعے سے زیادہ اپنے تجربے پر ہے لیکن محشر نقوی نے منظوم ترجمہ کیا ہے اور ان کے اوپر کے بیان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس مترنم بحر یعنی (مفعول مفاعیلن فعلن) میں انہوں نے دوسرے مترجمین کے مقابلے شاعر کا حقیقی منشا، مفہوم اور رباعیوں کی نزاکت اور رنگینی کو پوری طرح پیش کیا ہے ان کا یہ دعوا صرف دعوا ہے ورنہ ان کے ترجمے میں خیام جیسے رنگین او[ر ناز]ک بیان شاعر کی رنگینی اور نزاکت تو کیا ہمارے یہاں کی معمولی شعرا کی نزاکت اور رنگینی مفقود ہے۔ ہمارے فن کار اپنے کام کو ملا[حظہ] کیے سمجھے دوسروں کے کام سے بہتر قرار دیتے ذرا نہیں جھجکتے اور ایسے موقع پر سوچتا ہوں ـــ

”گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل“

رباعیوں کے ترجمے کو عمر خیام کی رباعیوں کے مقابل رکھ کر جانچنے کی بجائے بہتر ہے کہ فٹز جیرالڈ کے ترجمے کو پیش نظر رکھا جائے جو خود محشر نقوی کے پیش نظر رہا ہے۔ یہ ایک سو ایک رباعیوں کا ترجمہ ہے پہلی رباعی ہے۔

"WAKE FOR THE SUN, WHO SCATTER'D INTO FLIGHT
THE STARS BEFORE HIM FROM THE FIELD OF NIGHT
DRIVES NIGHT ALONG WITH THEM FROM HEAV'N AND STRIKES
THE SULTAN'S TURRET WITH A SHAFT OF LIGHT"

اس کا ترجمہ ہے۔

اٹھ جاگ کہ خورشید خاور وہ چرخ پہ پیکاں شہ پارا
تاریکی شب کی چادر کو اک آن میں کر پارا پارا
ہر برگ و شجر ہر بام و در کو نور کا پہنا کر زیور
مشرق کی ہیم کو سر کرکے اہرام فلک کو دے مارا

اس رباعی پر کچھ کہنے سے پہلے اس کی بحر پر مجھے کچھ کہنا ہے۔ محشر نقوی نے کہا ہے کہ بعض مترجمین نے رباعیوں کا ترجمہ ان کے اوزان ہی میں کیا ہے۔ جن میں رباعیاں کہی گئیں یہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں اور اگر (بالفرض محال) ہے بھی تو اس سے زیادہ قابل اعتراض بات یہ ہے کہ رباعی کے لیے ایسی بحر اختیار کی جائے جو جایز نہیں جس بحر میں ترجمہ کیا جا رہا ہے وہ جہاں تک میرا خیال ہے رباعی کے لیے جایز نہیں۔ رباعی کے لیے بحر ہزج مخصوص ہے۔ اور اس کے صرف دس ارکان ہوتے ہیں۔ (مفاعیلن، مفاعلن، مفاعیل، مفعولن، مفعول فاعلن، فعول، فاع، فعل، فع) ان کے علاوہ کسی اور رکن کو جایز نہیں سمجھا جاتا۔ اور پھر ان دس ارکان کی نشست پر بھی پابندیاں ہیں اور ان ارکان سے رباعی کے لیے یہ چوبیس اوزان مروج ہیں۔

پہلا دایرہ

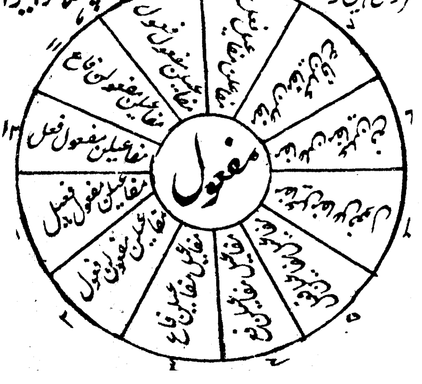

دوسرا دائرہ

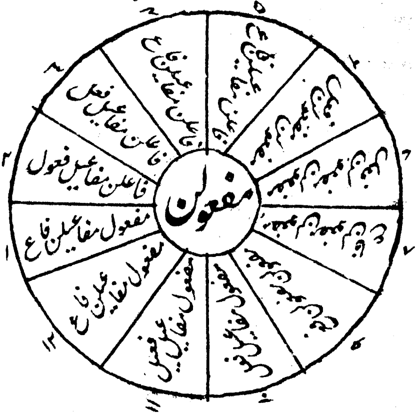

ظاہر ہے کہ ان میں مفعول مفاعیلن فعلن شریک نہیں جس میں محشر نقوی نے ترجما کیا ہے مفعول اور مفاعیلن ارکان رباعی میں شامل ہیں لیکن فعلن شریک نہیں۔ اس طرح اس بحر میں رباعیوں کا ترجما جایز نہیں ہے۔ اور ان رباعیوں کو ہم قطعے کہہ سکتے ہیں۔

اوپر کی رباعی کو اگر انگریزی رباعی کے مقابل رکھا جاے تو ترجما ناقص نظر آتا ہے۔ پہلا مصرع "THE SUN" کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ یعنی ایک نفظ کا مفہوم آٹھ الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ "تاریکیٔ شب" کا اور "ہر برگ و شجر ہر بام و در کو نور کا پہنا کر زیور" ـــ ان کا مفہوم انگریزی رباعی کے کسی حصے سے ظاہر نہیں۔ مترجم کی نوازش ہے۔ رباعی میں تو یہ کہا جا رہا ہے کہ "جاگ کہ سورج ـ جس نے رات کے میدان سے ستاروں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ رات کی دیوی کو تاروں کو ساتھ آسمان سے گذر جانے پر مجبور کیا ہے اور روشنی کی کرن سے سلطان کے محل کے مینارے پر ضرب لگاتا ہے" ـــ

اس مفہوم کو رباعی میں کس قدر توڑ موڑ دیا گیا گیا ہے ظاہر ہے ـــ

BEFORE THE PHANTOM OF FALSE MORNING DIED
METHOUGHT A VOICE WITHIN THE TAVERN CRIED
"WHEN ALL THE TEMPLE IS PREPARED WITHIN
WHY NODS THE DROWSY WORSHIPPER OUTSIDE"

اور اس کا ترجما کیا گیا ہے۔

آئی یہ صدا ہنگام سحر میخانہ کا اپنے کھلتے ہی دَر
اے مست و خراب بنت عنب آوارہ و رسوا خستہ جگر
اٹھ جاگ کہ ساغر پر کر لیں کیوں سوتا ہے خواب غفلت میں
ڈر ہے نہ کہیں پر ہو جاے خود زیست کا تیرے ہی ساغر

انگریزی رباعی کے ابتدائی دو مصرعوں کا مفہوم یہ ہے کہ "صبح کاذب کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میخانے سے آواز آئی" ہندستانی میں اس مفہوم کو مترجم نے اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "آئی یہ صدا ہنگام سحر میخانے کا اپنے کھلتے ہی در" سمجھ میں نہیں آتا کہ "میخانے" کے ساتھ "اپنے" کی تخصیص کیوں کی گئی۔ اور "کھلتے ہی در" کا مفہوم کس بنا پر پیش کیا گیا۔ اصل میں یہ موجود نہیں۔ ہندستانی رباعی کے دوسرے مصرع میں انگریزی رباعی کے چوتھے مصرع کے "DROWSY WORSHIPPER" کا ترجما یوں کیا گیا ہے کہ "مست و خراب بنت عنب آوارا اور رسوا خستہ جگر" ـــ یہ سراسر لیے معنی اور مفہوم سے عاری ہے۔ انگریزی رباعی کے آخری دو مصرعوں کا مفہوم ہے کہ جب بت کدہ آراستہ اور پیراستہ ہے تو ایک عقیدت کیش باہر کیوں اونگ رہا ہے۔ اس مفہوم کا ہندستانی لباس ملاحظہ کیجیے۔ نہ انگریزی رباعی میں جاگنے کی دعوت ہے نہ ساغر پر کرنے کی تلقین نہ یہ سوال کہ خواب غفلت میں کیوں سوتا ہے۔ اور نہ یہ اندیشا کہ زندگی کا جام چھلک نہ جاے ـــ ان دو مصرعوں کا مفہوم انگریزی

رباعی میں کہیں نہیں۔ ہندستانی ترجمے میں تخاطب سے کام لیا گیا ہے۔ حالانکہ انگریزی رباعی میں ایسا کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ مصرعوں کی بندش فرسودا ہے۔ اور اردو کی بدترین مثال ہیں۔

AND AS THE COCK CREW, THOSE WHO STOOD BEFORE
THE TAVERN SHOUTED —— "OPEN THEN THE DOOR!
YOU KNOW HOW LITTLE WE HAVE TO STAY
AND ONCE DEPARTED, MAY RETURN NO MORE."

اس کا ترجما کیا گیا ہے ؎

"دی مرغ سحر نے بانگ دھر اور ل کے صدا رندوں نے ادھر
کچھ دیر کے مہماں ہیں ساقی! کھلتا نہیں کیوں میخانے کا در
یہ دور نشاط و بزم طرب رہ جائیں گے پیچھے ٹھاٹ یہ سب
اک کوچ ہے اپنا سوئے عدم، ہم باندھ چکے ہیں رخت سفر"

انگریزی رباعی کا مفہوم ہے کہ —— "اور جب مرغ نے بانگ دی تو وہ جو میخانے کے باہر کھڑے تھے لیکارا ٹھے دروازہ کھولو تم جانتے ہو کہ ہم کو کتنے دن رہنا ہے اور ایک بار گذر جانے کے بعد نہیں آ سکتے" —— ہندستانی رباعی کا پہلا مصرع انگریزی رباعی سے ہم آہنگ ہے لیکن باقی تین مصرعوں میں بات کہاں سے کہاں جا پڑی ہے۔ ہندستانی رباعی کے آخری دو مصرعوں کا مفہوم انگریزی رباعی سے کسی حال پیدا نہیں ہوتا —— اور رباعی ترجمے کی بجائے مترجم کے ذہن کی بد وضع تخلیق بن کر رہ گئی ہے۔

NOW THE NEW YEAR REVIVING OLD DESIRES
THE THOUGHTFUL SOUL TO SOLITUDE RETIRES.
WHERE THE WHITE HAND OF MOSES ON THE BOUGH.
PUTS OUT AND JESUS FROM THE GROUND SUSPIRES."

اس رباعی کا ترجما کیا گیا ہے۔

پھر آمد سال نو تازہ امید و تمنا لے آئی
پھر روح شاعر ڈھونڈے ہے اک گوشۂ فکر و تنہائی
ہو کثرت برگ گل سے جہاں موسیٰ کے ید بیضا کا گماں
جس جا پہ دم عیسیٰ سے زمیں تزئین حیات تو پائی

انگریزی رباعی کے پہلے مصرع کا مفہوم ہے کہ "اب سال نو پرانی تمناؤں کو زندا کرتا ہے" اور ترجما کیا جا رہا ہے کہ "پھر آمد سال نو تازہ امید و تمنا لے آئی" —— اصل میں سال نو ہے نہ کہ آمد سال نو اور پرانی امیدیں یا تمنائیں ہیں نہ کہ تازا امید و تمنا —— جیرالڈ کا ترجما ہے کہ پرانی امیدیں تازا ہو رہی ہیں اور محشر کا ترجما ہے کہ نئی اور تازا امیدیں لا رہی ہیں۔ دوسرے مصرع میں جیرالڈ نے کہا ہے کہ "روح شاعر تنہائی میں جا بستی ہے" اور محشر نے "جا بستی ہے" کو از راہ کرم اس کو "ڈھونڈے ہے" سے بدل دیا۔ "RETIRES" کے معنی "SEARCHES" قطعاً نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح آخری مصرعوں کا ترجما نقوی نے بلکل متضاد کیا ہے اور وہ جیرالڈ کے ترجمے کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکے۔

IRAM INDEED IS GONE WITH ALL HIS ROSE
AND JAMSHYD'S SEV'N RING'D CUP, WHERE NO ONE KNOWS
BUT STILL A RUBY KINDLES IN THE VINE
AND MANY A GARDEN BY THE WATER BLOWS.

اس کا ترجما ملاحظا کیجے۔

دارا و سکندر، جام جم عبرت کے ہیں فسانے
نمرود رہا باقی نہ ارم، ویران ہیں ان کے کاشانے
لیکن گل و بلبل اب بھی ہیں وارفتۂ الفت دیوانے
لبریز مئے گلگوں ہیں ابھی رندان جہاں کے پیمانے

یہ ترجما ایک حد تک درست ہے۔ اگرچہ کہ الفاظ کی بھرتی محسوس ہو رہی ہے لیکن دوسری رباعیوں کے مقابل اس رباعی کا ترجما غنیمت ہے ———

"COME, FILL THE CUP AND IN THE FIRE OF SPRING
YOUR WINTER GARMENT OF REPENTANCE FLING.
THE BIRD OF TIME HAS BUT A LITTLE WAY
TO FLUTTER AND THE BIRD IS ON THE WING."

اس رباعی کا ہندستانی ترجما ہے۔

"آ ساغر مئے لبریز کریں ہے فصل بہار اب توبہ شکن
کر نذر آتش موسم گل، تقوی کا تیرے یہ رخت کہن
کچھ دیر کی ہے پرواز یہاں کچھ دیر بسیرے کا امکان
ہے طائر جاں پرواز کناں مایل بہ فصال روح و تن"

پہلا مصرع لیجیے "ساغر مئے" بے معنی سی بات ہے "ساغر" کافی ہے۔ "ہے فصل بہار اب توبہ شکن" بھرتی ہے۔ انگریزی رباعی کے کسی حصے سے یہ مفہوم ماخوذ نہیں بلکے اضافا ہے۔ REPENTANCE کے معنی تقوا نہیں بلکے پشیمانی انفعالی یا توبا کے ہیں لیکن مترجم نے ترجما تقوا کیا ہے۔ اس کے علاوا ——— WINTER GARMENT سے مراد شاعر نے سرد لباس لیا ہے نہ کہ رخت کہن۔ آخری دو مصرعوں میں مفہوم کو الفاظ کی بھرمار میں الجھا دیا گیا ہے نہ ذرا سی رنگینی باقی رہی نہ نزاکت۔

AND DAVID'S LIPS ARE LOCKT; BUT IN DIVINE
HIGH PIPING PEHLEVI WITH "WINE! WINE! WINE!
RED WINE!" ——— THE NIGHTINGALE CRIES TO THE ROSE
THAT SALLOW CHECK OF HERS T' INCARNADINE

اس رباعی کا ترجما ہے۔

داود کے "بادہ بادہ" کی خوش لحنی سے لب بند ہوئے
اور حرف و حکایت سے صہبا کی شیریں قند ہوئے
مانگے ہے پھر سے غازۂ گل رخسار بے رنگ بلبل
پھر چشم ساقی تندی مئے سے مخمور و خورسند ہوئے

یہاں بھی نقایص کا طومار ہے۔ "خوش لحنی" کوئی بات نہیں "لحن" عربی لفظ ہے جس کے معنی خوش آوازی خوش خوانی اور سریلی آواز کے ہیں۔ اس کے بعد لحن کو "ی" جوڑ کر لحنی بنانا اور صفت "خوش" کا اضافا کرنا کس حد تک جایز ہے۔ مترجم خود سوچ لیں "لحن" میں وہ سارا مفہوم آپ ہی موجود ہے جو انہوں نے "خوش لحنی" میں پیش کیا۔ دوسرا مصرع لیجیے اگر کہنا یہ تھا کہ "صہبا کی شیریں حرف و حکایت سے مثل قند ہوئے" تو مصرع کی بندش قطعی غلط اور انتہائی ناقص قرار پاتی ہے اور اگر یہ کہنا مقصود ہے کہ صہبا کی حرف و حکایت سے مثل قند شیریں ہوئے تو بھی بندش میں نقص موجود ہے۔ مصرع سے ظاہر نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ تیسرا مصرع بھی ایسا ہی ہے "غازۂ گل" یعنی سرخ غازہ RED WINE کا ترجما ہے۔ اور "رخسار بے رنگ" SALLOW CHEEK کا ترجما ہے۔ حالانکے SALLOW کے معنی ہیں "پھیکا زرد" نہ کہ "بے رنگ"۔ ترجمے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ بلبل کا بے رنگ رخسار سرخ غازہ مانگے ہے" اور انگریزی رباعی میں کہا جا رہا ہے کہ بلبل اپنے زرد رخساروں کو قرمزی رنگ سے رنگنے کے لیے گلاب سے سرخ شراب مانگتی ہے"

یہاں ظاہر ہے انگریزی مفہوم کو کس بے دردی سے کاٹ چھانٹ کر ہندستانی کا لباس پہنایا گیا۔ ہندستانی رباعی کا آخری مصرع شاید محشر کی "ساقی پرستی" کا ثبوت ہے جس بنا پر اس کو یہاں ٹھونس مارا ورنہ انگریزی رباعی میں نہ ساقی کا ذکر ہے نہ مفہوم ہی پیدا ہوتا ہے۔

WHETHER AT NAISHAPUR, OR BABYLON
WHETHER THE CUP WITH SWEET OR BITTER SUN.
THE WINE OF LIFE KEEPS OOZING DROP BY DROP
THE LEAVES OF LIFE KEEP FALLING ONE BY ONE

ہندستانی ترجمہ ہے۔

مشرق میں ہو یا مغرب میں گذر ہو رنج میں یا شادی میں بسر
ہے نخلِ حیات دور و نہ کا موت ہی غافل برگ و ثمر
یاں قطرہ بہ قطرہ ہر لحظہ مے زیست کی ٹپکی جاتی ہے
یوں گرتے ہیں ہر دم برگِ نفس جیسے کہ خزاں دیدہ ہو شجر

انگریزی رباعی کے ابتدائی دو مصرعوں کا ترجمہ ہندستانی میں ایک مصرع میں ہوا ہے اور باقی دو مصرعوں کا تین مصرعوں میں۔ ہندستانی رباعی کا دوسرا مصرع عجیب ہے "غافل" منادی ہے اور حرف ندا غائب ہے۔ نخلِ حیات دور و زد اکا ثمر موت ہے لیکن یہ "برگ و ثمر" کیا چیز ہے۔ نخلِ حیات اسی وقت نخل ہوگا جس کے برگ یعنی پتے بھی ہوں۔ اور سال سب کا ثمر (بہ معنی انجام) موت ہے اگر ثمر کے معنی پھل ہیں اور یہی مراد لیے گئے ہیں تو "برگ و ثمر" کا استعمال سراسر غلط ہے اور آخری مصرع بھی عجیب سا ہے برگِ نفس اس طرح گرتے ہیں جیسے خزاں دیدہ شجر۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ برگِ نفس کے گرنے کو خزاں دیدہ شجر کے گرنے سے کیا تعلق۔ جب کہ یہ سوکھ جانے کے باوجود برسوں میں کہیں گرتے ہیں۔ کہنا یہ چاہیے تھا کہ جس طرح خزاں میں درخت کے پتے گرتے ہیں۔ اس طرح برگِ نفس جھڑ جاتے ہیں لیکن اس مفہوم کو پیش نہ کیا جا سکا۔

EACH MORN A THOUSAND ROSES BRING YOU SAY?
YES, BUT WHERE LEAVES THE ROSES OF YESTERDAY?
AND THIS FIRST SUMMER MONTH THAT BRINGS THE ROSE
SHALL TAKE JAMSHYD AND KAIKOBAD AWAY.

اس کا ہندستانی ترجمہ کیا گیا ہے کہ۔

ہر صبح ہزاروں لالہ و گل کو ساتھ لیے ہوتی ہے عیاں
کل تک جو تبسم پاش رہا اس گل کو گر چھوڑ آئی کہاں
اب کے بھی بہار آئے گی اٹل ہمراہ لیے پھولوں کے دل
جمشید و قباد و کسریٰ کو لیکن یہ کرے گی نذرِ خزاں

انگریزی رباعی میں ذکر گلابوں کا ہے نہ کہ لالہ و گل کا۔ پہلے دو مصرعوں میں مفہوم درست ہے۔ لیکن الفاظ کی بھرمار ہے۔ تیسرا مصرع بے معنی سا ہے: "اب کے بھی بہار آئے گی" کافی تھا۔ "اٹل" کا استعمال بے معنی ہے۔ اور "پھولوں کے دل" بہار نہیں لاتی۔ دل تو پھولوں میں موجود ہی ہوتے ہیں "پھولوں کو ساتھ لیے آنا" سے یہ مفہوم ظاہر ہوتا ہے کہ پھول کھلائے گی لیکن "پھولوں کے دل ساتھ لیے آنا" لایعنی بات ہے۔ چوتھے مصرع میں یہ کہا جا رہا ہے کہ "وہ جمشید وغیرہ کو نذرِ خزاں کرے گی" اور انگریزی رباعی میں کہا گیا ہے کہ "وہ جمشید وغیرہ کو ساتھ لے کر جائے گی ــــ"

WELL, LET IT TAKE THEM! WHAT HAVE WE TO DO
WITH KAIKOBAD THE GREAT OR KAI KHOSRU
LET ZAL AND RUSTUM BLUSTER AS THEY WILL
OR HATIM CALL TO SUPPER—HEED NOT YOU.

اس رباعی کے ابتدائی دو مصرعوں میں کہا جا رہا ہے کہ ان کو خزاں کو لے جانے دو۔ ہمیں کیقباد اعظم یا کیخسرو کا کیا کرنا ہے۔ یعنی کیخسرو اور کیقباد کا کچھ ہو ہمیں کیا غرض۔ اس مفہوم کو محشر نے ہندستانی کا جامہ یوں پہنایا ہے کہ۔

ہونے دے انہیں تو نذر خزاں یاں سب کو آنا جانا ہے
جمشید کو کیا لے جانا ہے کیخسرو کو کیا لے جانا ہے

جمشید کے لے جانے اور کیخسرو کے لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرا مصرع یوں ہونا چاہیے تھا کہ۔

جمشید سے ہم کو کیا مطلب، کیخسرو سے کیا ہم کو غرض

لیکن ردیف اور قافیے کی بنا پر ساری رباعی بدلنا پڑے گی پہلے مصرع میں "یاں سب کو آنا جانا ہے" محض بھرتی کے الفاظ ہیں۔ آخری دو مصرعوں کا ترجمہ ہے۔

حاتم کی سخاوت خود سایل رستم کی شجاعت خود گاہیں
دنیا میں انہوں نے کیا پایا عقبیٰ میں انہیں کیا پانا ہے

ترجمہ کس قدر بدل گیا ہے۔ شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ رستم زال اور حاتم پر توجہ نہ دے۔ اور مترجم صاحب حاتم کی سخاوت کو سایل اور رستم کی شجاعت کو گھایل بنا کر ہی دم نہیں لیتے۔ بلکہ ان کی عقبیٰ کی تباہی کا فتوا بھی صادر فرما رہے ہیں اس کے علاوا حاتم اور رستم کے متعلق یہ کہنا کہ "دنیا میں انہوں نے کیا پایا" بالکل مہمل اور خلاف حقیقت بات ہے رستم نے دنیا میں وہ شہرت پائی کہ اس دور کے سورما اس کے نام سے لرزتے تھے۔ اور رستم آج تک زندہ کردار ہے۔ تاریخ کا بھی ادب کا بھی اور حاتم کی سخاوت کے جس قدر چرچے آج تک ہیں اس کی شہرت اور عزت جو اب بھی زندہ ہے نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اگر یوں کہا جاتا کہ یہ دنیا سے کیا لے گئے تو بات درست ہوتی۔

A BOOK OF VERSES UNDERNEATH THE BOUGH
A JUG OF WINE, A LOAF OF BREAD AND THOU
BESIDE ME SINGING IN THE WILDERNESS
OH! WILDERNESS WERE PARADISE ENOW!

اس رباعی کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ اگر شاخ کے سایے میں اشعار کی کتاب روٹی کا ٹکڑا اور شراب کا جام ہو اور تم اس بیابان میں پاس بیٹھے گا رہے ہو تو بیاباں بھی جنت ہوگا اس مفہوم کو محشر پیش کرتے ہیں کہ۔

ہو یا اس کتاب شعر و سخن اور سر پہ صنوبر سایہ فگن
کچھ قلقل مینا ہوش ربا کچھ سر میں سرور عرق کہن
پھر شاہد مہوش تجھ جیسا اور محو ترنم نغمہ سرا
واللہ! بیاباں جنت ہے صحرائے مغیلاں رشک چمن

انتہائی الجھا ہوا ترجمہ ہے۔ جس میں دقیق کے علاوا وزن کی تکمیل کے لیے بھرتی کے الفاظ نے مفہوم کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے خیام کے مفہوم کو اپنایا نہیں گیا بلکہ کسی نو مشق شاعر نے اس کا خیال چرا کر اپنی مہر لگا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ "کچھ قلقل مینا ہوش ربا" یعنی "کچھ ہوش اڑا دینے والی مینا سے نکلتی ہوئی شراب کی آواز" دراصل فٹز جیرالڈ کے "تم" کو ہندستانی میں محشر نے یوں پیش کیا ہے "پھر شاہد مہوش تجھ جیسا" ان خوب صورت الفاظ میں وہ بات اور سحر آفرینی نہیں جو صرف تم میں ہے۔ اس کے علاوا اس مصرع میں مفہوم بے دم پرند کی طرح حسین الفاظ کے دام میں پھنس کر رہ گیا اور اسی طرح چوتھے مصرع کا دوسرا حصا بھرتی کا ہے۔ (باقی)

آوازی اصول

ہندستانی زبان یا بھاشا کو ہمیشہ آوازی (فونیٹک) اصول پر لکھا کیجیے۔ اسی میں ہندستانی زبان اور ادب کی بھلائی اور کامیابی بھی ہے۔

ترکمانستانی گاؤں کا اسکول

د۔ گودکوف

صبح تڑکے آپ کو ملک اوگرک گاؤں کی سڑکوں پر بہت سے زندہ دل گروہ سائیکلوں پر سوار تیز تیز جاتے دکھائی دیں گے اور اگر آپ ان کے پیچھے پیچھے چلتے جائیں تو آپ ایک بڑے سے باغ میں واقع اسکول کی ایک بڑی سی سفید عمارت میں پہنچ جائیں گے۔

اسکول کے پھاٹک پر کھڑی سائیکلوں سے جن کی تعداد دو سو سے کم نہیں تھی ہمیں کچھ اندازہ ہوا کہ اس اسکول میں پڑھنے والوں کی تعداد کیا ہے۔ کچھ دیر بعد اسکول کے پرنسپل سایا رانا ساقالوف نے طلبا کی ٹھیک تعداد بتائی۔ انہوں نے بتایا کہ اسکول میں تعلیم پانے کے لائق گاؤں کے سارے بچے جن کی تعداد ۳۶۸ ہے۔ اس اسکول میں تعلیم پاتے ہیں۔ ہمارے اسکول میں دس سالا ثانوی تعلیم دی جاتی ہے۔ سایا رانا ساخالوف نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "ترکمانستان میں سویت اقتدار قایم ہونے سے پہلے یہاں کے فی ہزار سات باشندے تعلیم یافتہ تھے۔ ہزار میں سات صرف مرد ہوتے تھے۔ عورتیں تعلیم سے بالکل نابلد تھیں۔"

"میں خود اپنے تجربے سے جانتا ہوں کہ ان چند خوش نصیبوں کو گاؤں کے ابتدائی اسکول یعنی مکتب میں کیا پڑھایا جاتا تھا۔ پہلے دن ہی ہمارے استاد ملا صاحب نے عربی زبان کی ایک کتاب اٹھائی اور زور سے پڑھنا شروع کیا۔ ہم اس زبان کو ذرا نہ سمجھتے تھے۔ یہ قرآن مجید کی آیات تھیں جن میں مذہب اسلام کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس رسالے کو ختم کرنے کے بعد ہمیں خود قرآن مجید پڑھایا جانے لگا۔ کئی سال تیار کرنے کے بعد مجھے بہت سے عربی الفاظ اور دعائیں یاد ہو گئیں۔ ریاضیات جغرافیہ اور اپنی ترکمانی زبان کے بنیادی اصولوں سے بالکل بے بہرہ رہا۔ مجھے اصلی تعلیم سویت دور حکومت ہی میں حاصل ہو سکی۔"

اناساخالوف نے ہمیں پڑھائی کے کمروں کو دیکھنے کی دعوت دی۔ ہر طرف چھائی ہوئی خاموشی میں کسی قسم کا خلل پیدا کیے بغیر ہم ایک پڑھائی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ طبیعات کا کمرا تھا۔ میزوں پر مختلف قسم کے آلات رکھے تھے اور دیواروں پر مختلف قسم کے نقشے اور چارٹ آویزاں تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں خوش نمارنگ کا قومی لباس پہنے ہوئے بلیک بورڈ کی طرف دیکھ رہے تھے جس پر ان کے استاد میر دجر کی زوف نے بجلی کے حلقوں کے عمل اور ردعمل کو دکھانے کے لیے کچھ فارمولے تیار رکھے تھے۔ تمام طلبا بڑی توجہ کے ساتھ استاد کی تشریح کو سن رہے تھے۔ اور بار بار سوال کر رہے تھے بعض مرتبہ ان سوالوں کا تعلق زندگی کے مشاہدوں سے ہوتا۔

ان سوالوں کو سن کر آپ کے اندر عجیب حیرانی اور جوش کے جذبات پیدا ہو جائیں گے۔ ان بچوں کے والدین اپنی جوانی کے زمانے میں، کاراکم کے لیے کنار ریگ زاروں میں خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے اور بجلی کے متعلق ان کو ہلکا سے ہلکا وہم و گمان بھی نہ تھا لیکن آج ان کے بچے بجلی کے ٹریکٹروں اور ریڈیو سٹ کے ڈیزاین میں دل چسپی لیتے ہیں اور عاشق آباد میں ایک ٹیلی ویژن مرکز کی جلد از جلد تعمیر کے لیے اپنی تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں۔ اس اسکول کے سابق طلبا اب یہاں پنچایتی فارم کے پن بجلی گھر کے کنٹرول روم میں کام کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

ایک دوسرے کمرے میں ترکمانی ادب پر ایک سبق دیا جا رہا تھا۔ یہاں نے ترکمانی ادیب بردی کرمابائیف کی تخلیقات کا تجزیہ کیا جا رہا تھا۔ جنہوں نے اپنی تخلیقات میں پچھلے بیس

سال کے اندر ترکمانی عوام کی زندگی میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو پیش کیا ہے اسکول میں مادری ترکمانی زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ وقفے کے دوران، ہم نے دسویں جماعت کے طلبا کے ایک گروہ سے بات چیت کی۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ اس سال اٹھائیس لڑکے لڑکیوں نے اسکول کی تعلیم ختم کی ہے۔ ان میں سے بہتوں نے عالی تعلیم کے دوران میں داخلہ لے لیا ہے۔ بعض، جو عملی کام کرنا چاہتے تھے پنچایتی فارموں اور مشین اور ٹریکٹر اسٹیشنوں میں یا کارخانوں پر کام کرنے کے لیے چلے گئے۔ لیکن وہ بھی خط وکتابت کے ذریعے اور رات کی پڑھائی کے تعلیمی اداروں میں شریک ہو کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

بڑے خوشگوار تاثرات کے ساتھ ہم اس اسکول سے واپس ہوئے جہاں مستقبل کے سائنس دانوں، شاعروں اور مزدوروں کے کردار کی — سوویت ترکمانستان کے نئے عوام کے کردار کی تربیت کی جاتی ہے — سوویت ترکمانستان جس نے تہذیبی ترقی کی شاہراہ پر بڑی بڑی منزلیں سر کی ہیں —

ترجمہ کرنے والی مشین

(برطانوی حساب داں کی ایجاد)

برطانیہ کے ایک حساب داں ڈاکٹر اینڈریو بوتھ نے ایک ایسی مشین ایجاد کی ہے جو چھپی ہوئی عبارت کا ہر زبان میں ترجمہ کر سکتی ہے انہوں نے سلسلہ وار تین مشینیں بنائی ہیں اور ہر مشین اس سے پہلے بنائی گئی مشین سے چھوٹی ہے۔ ان کا آخری مقصد ایک ایسی چھوٹی سی مشین بنانا ہے جو ایک سوٹ کیس میں رکھی جا سکے۔ ہر مشین پر تقریباً ۱۵۰۰ پونڈ صرف ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر بوتھ کے اندازے کے مطابق ان تینوں مشینوں پر اب تک کل ۵۰۰۰ پونڈ خرچ ہو چکے ہیں۔ یہ اخراجات لندن یونیورسٹی برداشت کر رہی ہے۔

ہندستان کا نیا لسانیاتی سروے کیا جائے
ماہرین شرقیات کی کانفرنس کا ریزولیوشن

کیمبرج کے مقام پر ماہرین شرقیات کی ۲۳ اگست کو جو ۲۳ ویں بین قومی کانفرنس ہوئی تھی اس کے ہندستانی سکشن میں ڈاکٹر ایس۔ ایم کاترے نے "ہندستان کا نیا لسانیاتی سروے" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ انہوں نے اپنے مقالے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندستان میں پھر سے لسانی جائزے کی ضرورت ہے۔ کانفرنس کے ہندستانی سکشن نے متفقہ طور سے ایک ریزولیوشن پاس کیا جس میں حکومت ہندستان سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ سروے کا کام اپنے ذمے لے۔ کانفرنس میں جس ہندستانی وفد نے شرکت کی اس میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی (چیرمین مغربی بنگال لیجسلیٹو کونسل) ڈاکٹر پی۔ وی کانے (ایڈووکیٹ و سابق وائس چانسلر بمبئی یونیورسٹی) اور ڈاکٹر آر۔ این ڈانڈیکر (ڈائرکٹر بھنڈارکر اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (پونا) شامل تھے)

کانفرنس کے اسلامک اسٹڈیز سکشن میں سات مقالے پڑھے گئے۔ یہ سکشن دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے کا تعلق تو اسلامک زبان و ادب اور آرٹ سے اور دوسرے کا اسلامی تاریخ اور مذہب سے تھا۔

ہندستانی ڈاک کی کہانی

ا-ا

(ڈاک ٹکٹوں کی سولا سالا یادگار کے سلسلے میں پہلی اکتوبر ۱۹۵۴ء کو حکومت ہندستان کی طرف سے نئی دلی میں ڈاک ٹکٹوں کی بین قومی نمایش کا افتتاح ہوا۔ ہندستان میں اپنی قسم کی یہ پہلی نمایش تھی۔ جس میں دنیا کے ۳۰ ملکوں نے حصہ لیا۔ اس یادگار تقریب کے موقع پر انڈین انفورمیشن نے ڈاک کی جو مختصر سی تاریخ مرتب کی ہے وہ آپ کے ملاحظے میں پیش کر رہے ہیں۔ ایڈیٹر)

اگرچہ ہندستان میں ڈاک ٹکٹوں کے اجرا کی شتابدی یا سو سالا یادگار منائی گئی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ڈاک سروس کے انتظامات قدیم عرصے سے موجود رہے ہیں۔ چندر گپت موریا کے وزیر عالا چانکیا کے ارتھ شاستر میں اس مطلب کے حوالاجات موجود ہیں کہ ۳۲۲ قبل مسیح میں ڈاک سسٹم موجود تھا چندر گپت کی سلطنت فارس سے دکن ہند تک پھیلی ہوی تھی اور راجدھانی پاٹلی پتر (پٹنا) سے اس کے نظم و نسق کو کنٹرول کیا جاتا تھا اس وسیع سلطنت کی مختلف ریاستوں کی راجدھانیوں اور مرکزی راجدھانی کے درمیان کبوتروں کے ذریعے ڈاک کی آمد و رفت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ چندر گپت کے پوتے اشوک کے عہد میں بھی یہ طریقا جاری رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تجارت کو فروغ دینے کی غرض سے اندرونی رسل و رسایل کا سسٹم جاری کیا گیا جس کے مطابق اہم تجارتی مراکز کو ہرکاروں کے ذریعے بل بھیجے جاتے تھے سترویں اور اٹھارویں صدی میں مہاجن ڈاک کے طریقے کی بنیاد شاید اسی سسٹم پر رکھی گئی تھی اس ملک میں ڈاک سروس کی موجودگی کے بارے میں دوسرا ذکر چودویں صدی کے مشہور سیاح ابن بطوطا کی تحریروں میں آتا ہے اس نے اپنی تحریروں میں محمد بن تغلق کے زمانے میں ہرکاروں کے ذریعے ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات کا ذکر کیا ہے ڈاک کی آمد و رفت کے لیے گھوڑسواروں اور پیادا قاصدوں دونوں سے کام لیا جاتا تھا۔

شیر شاہ کا زمانا۔ مشہور مورخ فرشتا نے سولویں صدی میں شیر شاہ کے عہد میں گھوڑوں کے ذریعے ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات پر روشنی ڈالی ہے۔ شیر شاہ پہلا حکمران تھا۔ جس نے بنگال سے دریاے سند کے کناروں تک دو ہزار میل لمبی شاہراہ تیار کروائی اور ڈاک کی ترسیل کے لیے اس شاہراہ پر ہر دو میل کے فاصلے پر دو گھوڑے سوار ہرکارے متعین کیے۔ تاریخ میں اس بات کا ذکر آتا ہے کہ اس کے بعد اکبر کے زمانے میں سرکاری ڈاک کی آمد و رفت کے لیے ہر دس میل کے فاصلے پر دو گھوڑے سوار اور ہر پیادا قاصد متعین کیے گیے یہ ہرکارے دن بھر میں تقریبًا سو میل کی مسافت طے کر لیتے تھے اور اس طرح آگرا سے احمد آباد پانچ دنوں میں چٹھی پہنچ جاتی تھی کئی سڑکیں جنگلوں میں سے گذرتی تھیں جن پر نہ صرف جنگلی جانوروں بلکے ڈاکوؤں کے حملوں کا خطرا رہتا تھا۔ اسطرح کئی بار ڈاک دیر سے پہنچتی تھی اور بعض اوقات اس کے ضایع ہو جانے کا اندیشا بھی رہتا تھا۔

۱۶۰۰ء میں برطانیا اور ہندستان کے درمیان تجارت کی غرض سے ایسٹ انڈیا کمپنی وجود میں آئی اور اس نے جلد ہی مدراس۔ بمبئی۔ کلکتا میں پاوں جما لیے۔ تجارتی سرگرمیوں میں توسیع کے ساتھ ساتھ کمپنی کو خط کتابت کے سلسلے میں مختلف شہروں کے درمیان ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن ایک سو سال سے زیادا عرصے تک کمپنی پہلے سے موجود ڈاک سسٹم سے کام چلاتی رہی۔ ۱۶۸۸ء میں کمپنی نے اپنے تنخواہ دار ہرکاروں کے ذریعے نئی ڈاک

سروس شروع کی۔ اس زمانے میں مہاجن ڈاک کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جس کے تحت ساہوکاروں نے اپنی ڈاک کی آمد و رفت کے نجی انتظامات کو رکھے تھے۔

ڈاک محصول کا اجرا۔ ۳۱ مارچ سنہ ۱۷۷۴ء کو وارن ہیسٹنگز نے ڈاک کا باقاعدہ سسٹم قایم کیا۔ ایک پوسٹ ماسٹر جنرل مقرر کیا گیا اور ذاتی چٹھیوں پر پہلی بار ڈاک محصول لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن یہ سسٹم ملک کے انہی حصوں تک محدود رہا۔ جہاں کمپنی کے تجارتی ادارے قایم تھے۔ اور دوسرے حصوں میں ڈاک سروس کے نجی انتظامات کا سلسلہ ۱۸۳۷ء تک جاری رہا۔ جبکہ ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات کی ذمے داری حکومت نے سنبھال لی۔

اٹھارویں صدی کے آخر تک بنگال میں ڈاک ہرکاروں اور قاصدوں کے ذریعے تقسیم کی جاتی رہی۔ ان میں سے ہر قاصد کے ساتھ ڈھول پیٹنے والا ایک شخص ہوتا تھا۔ جو جنگل میں سے گذرتے ہوئے زور زور سے ڈھول پیٹتا تھا خطرناک علاقوں میں غروب آفتاب کے بعد دو مشعل بردار اور دو تیر انداز بھی ہرکاروں کے ساتھ رہتے تھے۔

چونکہ بہت سے شہر اور قصبے امپیریل پوسٹل سروس کے حلقے سے باہر تھے اس لیے ڈسٹرکٹ پوسٹل سسٹم کا آغاز کیا گیا۔ جس کے ذریعے ہر ضلع کے ہیڈ کوارٹر کو پولیس اور ریونیو اسٹیشنوں سے ملا دیا گیا۔ اس سروس کا کنٹرول ضلع کے حکام کے سپرد کیا گیا۔

چٹھیوں کی قسم کی ذمے داری پولیس اور گاؤں کے چوکیداروں کو سونپی گئی۔ لیکن اس کے نتایج تسلی بخش ثابت نہ ہوئے۔

سرکاری اجارہ داری۔ ۱۸۳۷ء میں ڈاک کے قواعد پر نظر ثانی کی گئی۔ نجی پوسٹل سروسوں کو ختم کر دیا گیا صرف چند ایک لائسنس یافتہ سروسوں کو جاری رکھنے کی اجازت دی گئی۔ حکومت نے ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات کی ذمے داری خود سنبھال لی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقوں میں ڈاک خانے قایم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ۱۸۵۰ء میں لوگوں کے آرام اور کارکردگی کے لحاظ سے ڈاکخانے کے انتظامات کو بہتر بنانے کے سلسلے میں تین ممبروں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ اس کمیشن نے ۱۸۵۱ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اور اس سے ایک سال بعد اسی رپورٹ کی بنیادوں پر شعبہ ڈاک کی موجودہ تنظیم کا ڈھانچا وجود میں لایا گیا۔

پہلے ڈاک ٹکٹ کے اجرا سے لے کر حصول آزادی تک

۱۸۵۱ء میں کورٹن رپورٹ کی اشاعت اور ۱۸۵۳ء میں ریلوں کے آغاز سے ہندستان میں ڈاک سسٹم کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں ڈاکٹر اوشاگینسی کی طرف سے تار برقی کے آغاز نے بھی پیغامات کی ترسیل کے انتظامات میں اہم حصہ ادا کیا۔

پہلا ڈاک ٹکٹ۔ یکم اکتوبر سنہ ۱۸۵۴ء کو کل ہند بنیادوں پر پہلا ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا۔ اس سال ڈاک خانے کو ڈائرکٹر جنرل پوسٹ آفس کے واحد کنٹرول کے تحت رکھنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شعبہ ڈاک نے ملک میں ریلوں کے آغاز سے فائدہ اٹھانے میں تاخیر نہ کی۔ اور ریل گاڑیوں کے ذریعے ڈاک کی آمد و رفت کے سلسلے میں آر۔ ایم۔ ایس کی تنظیم کی بنیادیں اسی زمانے میں رکھ دی گئیں۔ اسی سال حکومت نے پی اینڈ او سٹیم نیوی گیشن کمپنی سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے برطانیہ سے ہندستان تک اسکندریہ کے رستے بحری ڈاک کی آمد و رفت کا اہتمام کیا گیا۔ بحری ڈاک کی یہ سروس ۷ جولائی سنہ ۱۸۵۴ء کو شروع کی گئی۔

ریلوں کے ذریعے ڈاک کی آمد و رفت۔ شروع شروع میں ڈاک کے تھیلوں کو ڈاک بیگ کہا جاتا تھا۔ اور ریلوے کمپنیوں پر ڈاک مفت لے جانے کی ذمے داری عاید کی گئی۔ لیکن اس کے بعد یہ پابندی منسوخ کر دی گئی۔ تنظیم نو

کے بعد پہلے دس سال کے عرصے میں ڈاک سروسوں میں توسیع برطانیہ کے تجارتی اور فوجی مفاد کے مدنظر کی جاتی رہی۔ اور نئے ڈاک خانے زیادہ تر انہی لائینوں پر کھولے جاتے رہے جہاں سے فوجیوں کو ڈاک کی سہولتیں میسر آسکتی تھیں لیکن ریلوے سسٹم کی توسیع کے ساتھ ساتھ ڈاک کے انتظامات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا شروع ہوا اور ۱۸۷۱ء تک پانچ ہزار اشخاص کی آبادی کے ہر قصبے میں ڈاک خانے قایم کردیا گیا۔ اور اس سے کم آبادی کے قصبوں میں لیٹر بکس لگا دیے گئے جہاں سے نزدیکی ڈاک خانے کے ہرکارے چٹھیاں نکال کر لے جایا کرتے تھے۔

بحری ڈاک۔ ساتھ ہی ساتھ بحری ڈاک کی آمد و رفت کے انتظامات کو بہتر بنانے کے اقدامات کیے گئے۔ مختلف غیر ممالک کو بھیجی جانے والی چٹھیوں کی شرح ڈاک مقرر کرنے کی ضرورت کے پیش نظر ہندستان نے ۱۸۷۵ء میں یونیورسل پوسٹل یونین میں شمولیت کا فیصلا کیا۔ ۱۸۸۰ء میں شعبہ ڈاک نے ترقی کی طرف ایک اور اقدام اٹھایا۔ اس وقت تک منی آرڈروں کی ادائیگی صرف سرکاری خزانوں سے ہی کی جاتی تھی۔ اور اس سے لوگوں کو بہت دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا چنانچہ ۱۸۸۰ء میں ساڑھے پانچ ہزار ڈاک خانوں کو منی آرڈر حاصل کرنے وادا کرنے کے اختیارات دیے گئے اور اس طرح منی آرڈر کی رقم وصول کرنے والے شخص کے لیے ڈاک خانہ میں حاضر ہونا لازمی نہ رہا۔

ہوائی ڈاک ۲۶ اپریل ۱۹۲۶ء کو ہندستان اور برطانیہ کے درمیان ہوائی ڈاک کی آمد و رفت کا اہتمام کیا گیا۔ اور چھ مہینے بعد دلی اور کراچی کے درمیان بھی ہوائی ڈاک کی آمد و رفت کا سلسلا شروع ہوگیا۔

> "ہندستانی ادب" کے خریدار بن کر ہمیں علم و ادب کی سیوا کا موقع دیجیے۔

افریقن یونیورسٹی کی جانب سے طلبا کو ڈگریاں

یوگنڈا کے مکریرہ کالج نے جسے کچھ عرصا ہوا یونیورسٹی کا درجا دیا گیا تھا ۱۶ اگست کو پہلی بار اپنے طلبا کو ڈگریاں عطا کیں۔

اس کالج کا تعلق لندن یونیورسٹی سے ہے ڈگریاں تقسیم کرنے کی رسم برک بیک کالج لندن کے ڈاکٹر جے۔ ایف۔ لاک وڈ نے ادا کی۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اس کالج کے کام کی تعریف کی اور کہا کہ یہ کالج اس براعظم کی زندگی میں جو پارٹ ادا کر رہا ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازا لگانا بہت مشکل ہے۔

مکریرہ کالج نہ صرف مشرقی افریقا کے چار علاقوں یوگنڈا۔ تانگانیکا۔ کینیا اور زنجیبار بلکہ شمالی اور جنوبی روڈیشیا اور نیاسالینڈ کی بھی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

سوڈان اور جنوبی افریقا کے درمیان نائیجیریا کی ابادان یونیورسٹی کو چھوڑ کر یہ واحد افریقن یونیورسٹی ہے۔ اس کالج کا قیام ۱۹۲۲ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس سال اس میں ۴۹۴ طلبا تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اس سال پہلی بار ایک انگریز خاتون بھی اس کالج میں داخل ہوئی ہے۔

> اس سال سے رسالے کے چندے میں اضافا کر دیا گیا ہے خریدار حضرات نوٹ فرمالیں۔

عجوبہ روزگار گھڑیاں

یوسیس

(امریکی رصدگاہ میں عجوبہ روزگار گھڑیاں، وہ گھڑیاں جن کے وقت میں ایک سکنڈ کے ہزارویں حصے کا بھی فرق نہیں ہوتا)

نیچے کے معلوماتی مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ امریکا کی رصدگاہ میں ایسی گھڑیاں اور کلاک موجود ہیں جن سے صحیح ترین وقت معلوم ہوتا ہے۔ ان کی ساخت میں بھی ندرت ہے۔ سائنس دانوں نے گہری تحقیق کے بعد یہ کلاک اور گھڑیاں تیار کی ہیں۔ ہوابازوں۔ جہازرانوں۔ سائنس دانوں کو صحیح وقت کی عام انسانوں کی نسبت بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

زمین کو اپنے محور کے گرد گھومنے میں جو وقت لگتا ہے عام انسانوں کے نزدیک وہی ایک دن ہے۔ جب دن کو ۲۴ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے تو گھنٹے بنتے ہیں۔ یہ سب بالکل سادا سی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں اتنی سیدی سادی باتیں نہیں۔

زمین کی حرکت کسی قدر بے مرکز بھی ہوتی ہے اور بعض دفعہ گردش کرتے ہوئے اس میں کچھ لغزش سے بھی آجاتی ہے جس کی وجہ ابھی تک صاف طور پر نہیں سمجھی جا سکی ہے۔

سائنس دانوں کے لیے

یہ باتیں عام لوگوں کے نزدیک اہم نہ ہوں —

لیکن سرکاری سائنس دانوں، تجارتی کمپنیوں کے لیے ریڈیو ٹیلی ویژن جغرافیائی پیمائشوں اور تحقیق زلزلوں کے مطالعے زمین میں تیل کے ذخیروں کی تلاش کے سلسلے میں یہ نہایت اہم باتیں ہیں اور صحیح وقت جاننے کی انہیں انتہائی ضرورت ہے یہاں تک کہ ان کے مطالعے اور تحقیق کے کام میں ایک سکنڈ بھی بڑا لمبا عرصا ہوتا ہے اور ایک سکنڈ کے لاکھوں حصے تک کے صحیح وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہوائی اور سمندری جہازوں میں

ہوائی اور سمندری جہازوں کے چلانے میں تو کئی وجوہ کی بنا پر انتہائی صحیح وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کے جہازراں لوگ ہر دو گھنٹے کے بعد ریڈیو کے ذریعے صحیح وقت معلوم کرتے رہتے ہیں۔

امریکا میں پچھلی ایک صدی سے بحری محکمہ صحیح وقت کے متعلق تحقیق اور کھوج کرتا آرہا ہے کیونکہ امریکی بحریے کو صحیح وقت جاننے کی بےحد ضرورت ہوتی ہے۔

آج واشنگٹن میں امریکی بحریے کی تجربہ گاہ میں صحیح وقت جاننے کا اتنا مکمل اور اعلا انتظام ہے کہ ایک سکنڈ کے کئی ہزارویں حصے تک کی صحت کے ساتھ وقت بتایا جاتا ہے اور اسی لیبارٹری سے سمندری اور ہوائی جہازوں سرکاری اور تجارتی ایجنسیوں کو صحیح ترین وقت کی اطلاعات دی جاتی ہیں۔

اس بحری تجربہ گاہ (لیبارٹری) میں کئی قسم کی دوربینیں موجود ہیں۔ لیکن صحیح وقت معلوم کرنے کے لیے ایک سادا اور آسان بناوٹ والی ایک ٹیوب (نلی) ہے جسے فوٹو گرافک زینتھ ٹیوب کہا جاتا ہے یہ ایک ایسا آلہ ہے جو ستاروں کی اس وقت تصویریں اتارتا ہے۔ وہ آسمان کی چوٹی (زینتھ) پر ہوں۔ اس آلے کے نچلے سرے میں ایک برتن کے اندر دوربینی شیشے کے بدلے پارا بھرا ہوا ہوتا ہے۔

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیا)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

ایڈیٹر

جی۔ ام۔ خان۔ ام۔ اے (عثمانیہ)

"ہندستانی" تمیں آوازی اصول پر لکھا جانے والا رسالا

رجسٹرڈ نمبر ایچ (۱۸۴)

ہندستانی ادب

حیدرآباد دکن

جلد (۱۵) نمبر (۳)

ایڈیٹر

جی۔ام۔خان۔ام۔اے (عثمانیا)

بہمن ۱۳۶۴ف دسمبر ۱۹۵۴ء

چندا سالانا آٹھ روپے

ہمارے خیالات	ایڈیٹر	۳
حقایق و معارف	اقبر موہانی وارثی بی۔اے	۴
زلف گیتی	سلام سندیلوی ام۔اے۔ال ال۔بی وایس گاہ	۵
غزل	سراج (لکھنوی)	۶
چندر وزاور	نازش (پرتاب گڑھی)	۷
غزل	صفی احمد (بہاری)	۸
یونیورسٹی تعلیم میں تنوع پیدا کرنے کی ضرورت	پروفیسر وی کے سیتن وائیس چانسلر (اٹینا)	۹
رباعیات عمر خیام	ظفر عالمگیر بی۔اے (عثمانیا)	۱۱
ہیمنگ وے	یوسیس	۲۰
ہندستانی موسیقی کی نشو و نما اور ارتقا	ا۔ا	۲۲
حمزا حکیم نیازی	م۔یعقوب بے	۲۴
سوویٹ یونین میں جدید ہندستانی زبانوں کا مطالعا	و۔اکوچر گینا ام۔ایس سی لسانیات	۲۶
چین کی پہلی مردم شماری	ج۔ا	۲۸
سبزیوں کی اہمیت	ڈاکٹر ایس ایس پوریوال	۲۹
برطانیا میں طبی تحقیقی کام	ب۔ا	۳۱
تبصرے	" ا "	۳۲

ہمارے خیالات

"این چہ بو العجبیست"

۱۰ راکتوبر ۵۶ء کے "الفاروق" میں ایڈیٹر نے اس عنوان کو ایک خبر کی سرخی قرار دیا ہے۔ لیکن انہیں کیا معلوم تھا کہ وہی طنز ایک لعنت بن کر خود ان کے گلے آن پڑے گا۔ فارسی کا ایک مشہور مقولا ہے کہ "چاہ کن را چاہ درپیش" یا جیسا کہ "ہندستانی" کی ایک عام کہاوت ہے "جیسا کروگے ویسا بھروگے" چنانچہ یہ مثال ایڈیٹر موصوف پر پوری پوری اترتی ہے۔

۱۲ راکتوبر ۱۹۵۶ء کے "الفاروق" میں "اسٹیٹ انجمن ترقی اردو کے اراکین مجلس عاملا سے خطاب" کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ ——

"میں اردو ہندستانی کو ہندستان میں رہنے بسنے والی مختلف اقوام کے میل جول کا نتیجا قرار دیتا ہوں . . . . . "

ہم یہ سمجھنے سے مجبور ہیں کہ "اردو ہندستانی" کون بلا ہے —— یہ تو ایک بالکل اچھوتے ہی بھوت کا نام سننے میں آیا ہے۔ آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

"یہاں یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ ہم اردو کو ہندی ہندستانی سے الگ کوئی چیز نہیں سمجھتے"

معلوم ہوتا ہے کہ اردو والوں کا دماغ اب کچھ ہلکا ہوتا نظر آرہا ہے اسی لیے وہ اب "ہندستانی" سے قریب تر ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹ راکتوبر کے اسی پرچے کی ایک خبر ہے کہ ——

"اسٹیٹ انجمن ترقی اردو نے اپنی شاخوں کے علاوہ ہر ادبی اور علمی ادارے سے یہ خواہش کی ہے کہ وہ اردو ہندستانی ہفتا منا کر ملک کی دوسری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں سے ربط پیدا کرے"

"اردو ہندستانی" کی یہ تکرار ایڈیٹر موصوف کے قلم سے اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ زمانے کے حالات کو بہتر طریقے پر سمجھ چکے ہیں اسی لیے ان کے خیالات کا جھکاؤ "ہندستانی" کی طرف ڈھلتا چلا نظر آتا ہے۔ اس کا مزید ثبوت ایڈیٹر موصوف کے ان خیالات سے بھی ملتا ہے ——

". . . گاندھی جی نے اس حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے طور پر اس کا فیصلا بھی کر لیا تھا کہ ہندستان کی زبان کا نام "ہندستانی" ہوگا اور یہ دونوں لپیوں میں لکھی جائے گی۔ انہوں نے آزادی ملنے کے بعد بھی اپنی رائے نہیں بدلی۔ حالانکہ ان کے بہت سے ساتھیوں نے اپنی اپنی رائے بدل دی"

ہم ایڈیٹر موصوف کے اس خیال سے متفق ہیں۔ گاندھی جی نے حقیقت میں اس بات کا پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ہندستان کی بھاشا "ہندستانی" کو منوا کر کے رہیں گے۔ یہ بات سچ ہے کہ اگر گاندھی جی زندہ رہتے تو دیس بھاشا کی طرح راشٹر بھاشا کا نام بھی "ہندستانی" ہی ہوتا۔ جو دونوں ناگری اور فارسی میں لکھی جاتی۔ سچ تو یہ ہے کہ گاندھی جی کے اس اٹل فیصلے سے بہت پہلے ہی "ہندستانی" کے حق میں فیصلا ہو جاتا مگر جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے کہ مولوی عبدالحق نے اس خصوص میں روڑے اٹکائے۔ اور انہیں کی ضد اور ہٹ نے "ہندستانی" کو پھلنے پھولنے نہ دیا۔

مولوی عبدالحق نے جب یہ دیکھا کہ اردو ہندی کا سنگم ہندستانی کا روپ لینے کو ہے تو انہوں نے بے معنی اور مہمل سے اعتراضات تراشنے شروع کر دیے۔ گاندھی جی کی ذات پر عصبیت کا داغ لگانا چاہا۔ اور ان کے ساتھیوں پر بیجا و بے جا حملے بھی کیے۔ نتیجا یہ رہا کہ "ہندی ساہتیہ سمیلن" والے برہم ہو گئے —— مولوی عبدالحق اصل میں چاہتے بھی یہی تھے کہ ان لوگوں کو کسی طرح بھی مشتعل کر کے زبان کے مسئلے

کو کھٹائی میں ڈال دیا جائے چنانچہ مولوی عبدالحق کی دلی مراد برآئی اور "ہندستانی" کے حق میں کوئی فیصلہ نہ ہونے پایا۔

عام طور پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ مولوی عبدالحق زبان کے ہمدرد جو ٹھہرے — آخر وہ ایسی حرکت کیوں کرنے چلے — یہی وہ راز ہے جس کو آج تک عوام سمجھ نہ سکے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ اگر مولوی عبدالحق "ہندستانی" کے فیصلے کو تسلیم کر لیتے تو آگے چل کر مولوی عبدالحق کا کوئی خاص مقام نہ رہتا۔ "ہندستانی" کے پرچار کے لیے ایسی ایک کمیٹی بنتی جس کے ایک ممبر مولوی عبدالحق بھی ہوتے مگر انہیں اردو کے علم بردار کی حیثیت سے جو خاص مقام حاصل تھا وہ بات اس وقت باقی نہ رہتی۔ صاف ظاہر ہے کہ مولوی عبدالحق کی شہرت کا جنازہ نکل جاتا، اور ان کی مقبولیت کا پہاڑ ٹوٹ کر پاش پاش ہو جاتا۔ مولوی عبدالحق کو اپنی ہر دل عزیزی کی موت آنکھوں میں پھرتی نظر آئی۔ اسی لیے بوکھلا کر انہوں نے مخالفت کا بیڑا اٹھایا۔ وہ اپنے جھوٹے مقصد میں کامیاب رہے۔ اور ایک دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک دی۔ نا سمجھ لوگوں نے ان کی اس غلط روش کو سراہا۔ اور سمجھدار افراد نے مولوی عبدالحق کی خود غرضانہ ضد اور ہٹ پر آٹھ آٹھ آنسو بہائے۔ مولوی عبدالحق کی اس مکارانہ چال کو بہت ہی کم لوگوں نے سمجھا تھا۔ بھولے بھالے لوگ مولوی عبدالحق کی "سفید ریش" کے دھوکے میں آ گئے۔ مگر افسوس کہ کسی نے اس وقت اس "گرگ جہاں دیدہ" کے گھٹا ٹوپ تاریک من کو ٹٹول کر نہ دیکھا کہ اس خضر نما دنیا پرست نے اپنی شخصی عزت اور وقار کی کشتی کو ڈگمگاتے دیکھ کر ہندستان کی عام زبان "ہندستانی" کے بننے والے مضبوط اور پائیدار قلعے کی بنیاد ہی کو اکھیڑ پھینکا۔ مولوی عبدالحق کو تو "بابائے اردو" جیسے دل خوش کرنے والے شبد سن کر باغ باغ ہونا مقصود تھا —

بہرحال ایک دنیا اس دھوکے کا شکار بن گئی اور جو کام حقیقت میں ہونا چاہیے تھا وہ ہو نہ سکا۔ اس وقت "اردو ہندستانی" کا نعرہ لگانے والے اس وقت "ہندی ہندستانی" یا صرف "ہندستانی" کو دیس بھاشا کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے تو انہیں آج یہ زمانہ شناس نعرہ لگانے کی نوبت نہ آتی۔ زبان کے رنگ اور روپ سے اس وقت قطع حجت اور بحث نہ ہونی چاہیے تھی اس لیے کہ جب زمانے کا رنگ بدلتا رہتا ہے تو پھر زبان کا رنگ بدلنے میں کون امر مانع تھا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ زبان کا رنگ بھی خود ہی بدلتا جاتا، اور آج وہی زبان "ہندستانی" کہلواتی۔ جس کو گاندھی جی مرحوم نے "ہندی اردو کا سنگم" قرار دیا تھا۔

"ہندستانی" بھاشا سے قریب ہونے والے "اردو ہندستانی" کے پریمیوں کو ہمارا یہ نیک اور مفید مشورہ ہے کہ اب بھی وقت ہے وہ ہمارے ان وچاروں پر دھیان دیں۔ اور حقیقت کے آئینے میں ان اہم مسائل کو جانچنے کی کوشش کریں کہ زبان کی بقا اور ترقی کی خاطر "اردو ہندستانی" کے بے ڈھنگے نعرے لگانا مناسب ہے یا قریب سے قریب تر ہو کر "ہندستانی" میں گھل مل جانا بہتر ہے۔ اس کی عقدہ کشائی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ دستور ہندستان میں تو "اردو" ہندستان کی ہر زبانوں میں سے ایک ہے۔ دستور اور قانون میں ہمیشہ لچک ہوا کرتی ہے۔ اور جب کبھی کسی دفعہ کی ترمیم یا تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے تو پارلیمنٹ میں اس کا تصفیہ ہوا کرتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہندی سرکاری یا حکومت کی بھاشا قرار دیے جانے کے سبب ایک خاص مقام حاصل کر چکی ہے اور اب وہ اس مقام سے نیچے نہیں آ سکتی۔ اور نہ کسی دوسری بھاشا سے ہات ملا سکتی ہے۔ مگر وہ اس سنگم کا جز برابر بن سکتی ہے۔ جس کا خواب گاندھی جی دیکھ رہے تھے کیا عجب کہ آپ کی ہماری کوششوں سے وہی سپنا "سنگم" "ہندستانی" کے روپ میں حقیقت بن کر ظاہر ہو جائے۔

آخر میں ہم یہ کہے بغیر نہ رہیں گے کہ "اردو ہندستانی" جیسے مہمل اور بے معنی نعرے لگانے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ جاننے والے اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ بدلے حالات سے مجبور ہو کر صرف گرگٹ کی طرح رنگ بدلا جا رہا ہے جس کا نتیجہ سوائے صفر کے اور کچھ نہیں۔

حقایق و معارف

افقر موہانی وارثی

محروم تمنا سے تو ناکام دعا سے
یوں روزِ ازل آیا ہوں درگاہِ خدا سے

ہوتی ہے تسلی سی مرے دل کو جفا سے
جاتی ہے اگر جان نکل جائے بلا سے

موسیٰ نہ رہے ہوش میں جلووں کی ضیا سے
پردہ نہ اٹھا پھر بھی رخِ جلوہ نما سے

ڈرتا نہیں بیمارِ غمِ عشق قضا سے
خاکِ درِ جاناں نہیں کم خاکِ شفا سے

ٹکرا گیا موجِ لبِ ساحل سے سفینا
ساحل پہ جو ہم پہنچے بھی طوفانِ بلا سے

کچھ درد میں محسوس کمی ہوتی ہے مجھکو
پھر دل پہ کوئی وار اسی تیغِ ادا سے

صیاد نہ کر تذکرۂ فصلِ بہاراں
ڈرتے ہیں اسیرانِ قفس ایسی فضا سے

جیسے کوئی رہ رہ کے مجھے کھینچ رہا ہو
اٹھتا نہیں سر سجدۂ نقشِ کفِ پا سے

دردِ دلِ بیتاب کا غم پوچھنے والے
شرمندہ نہ کر اپنی جفاؤں کو وفا سے

کافر وہ کرے شک جو ستمگر کی وفا میں
وعدوں پہ ہیں وعدے تو دلاسوں پہ دلاسے

کرتے ہیں اسیرانِ قفس سجدوں پہ سجدے
آتی ہے کبھی خاکِ نشیمن جو ہوا سے

صحرا میں بہاروں پہ ہے ہر خارِ مغیلاں
سرسبز بیاباں ہے ترے آبلہ پا سے

کیا جانے کہا کیا مرے ٹوٹے ہوئے دل نے
روتا ہے جہاں ساز شکستہ کی صدا سے

جلووں کے تلاطم سے نظر ہوگئی خیرہ
اب دیکھ رہا ہوں نہیں جلووں کی ضیا سے

انجام یہ ہے زندگیِ عشق کا افقر
کرتے ہیں دعا موت کی ہم اب تو خدا سے

زلفِ گیتی

سلام سندیلوی
ام-اے، ال ال-بی (وائس پرنسپل) لکھنؤ

گل ہوئی جاتی ہے انسان کی شمعِ امید ‌ ‌ محفلِ زیست پریشان ہوئی جاتی ہے
لاکھوں ارماں ابھی باقی ہیں نکلنے کے لیے ‌ ‌ اور دنیا ہے کہ ویران ہوئی جاتی ہے

ان سے پوچھے کوئی کیا ان کو ملا لطفِ حیات ‌ ‌ جن کے لب موجِ تبسم سے کبھی مل نہ سکے
وہ بھی کیا یاد کریں گے کہ بہار آئی تھی ‌ ‌ جن کے دل گلشنِ ہستی میں کبھی کھل نہ سکے

سونی سونی نظر آتی ہے ہر اک بزمِ جہاں ‌ ‌ نہ کہیں شیشہ و ساغر نہ کہیں چنگ و ستار
عشق و الفت کے فسانوں میں وہ رنگینی ‌ ‌ گلِ خوں کے نہ وہ غمزے نہ حسینوں کے سنگار

چاندنی رات میں کھلتے ہوئے غنچے کی چٹک ‌ ‌ کسی دوشیزۂ غمگیں کی ہو سسکی جیسے
نیلگوں چرخ پہ رنگین ستاروں کا ہجوم ‌ ‌ شدتِ غم سے کوئی آنکھ ہو بھیگی جیسے

کیوں نہ چھا جائے گلستاں پہ اداسی کی گھٹا ‌ ‌ جب دلوں میں نہیں تابندہ محبت کی کرن
آج آمادہ ہیں انساں کا لہو پینے کو ‌ ‌ نشۂ جور میں کھوئے ہوئے کچھ گرگِ دہن

چند بد نفس و جفا کوش و سیہ کارِ انساں ‌ ‌ وسعتِ ارض کو مٹھی میں لیے بیٹھے ہیں
بے خبر ہو کے زمانے کی دبی آہوں سے ‌ ‌ بادۂ نخوت و پندار پیے بیٹھے ہیں

کیا خبر ان کو کہ پامال دلوں کے خوں سے ‌ ‌ اک نیا مہرِ ضیا بار ابھرنے ہی کو ہے
اک نئے طرز سے الجھی ہوئی زلفِ گیتی ‌ ‌ کپکپاتے ہوئے ہاتوں سے سنورنے کو ہے

غزل

مدد اے درد جگر رات بسر ہو جائے
ایک کروٹ میں شب غم کی سحر ہو جائے

دل رہے یا نہ رہے خون جگر ہو جائے
سب گوارا جو ادھر تیری نظر ہو جائے

اب سے دور آہ وہ معصوم خیالی تو با
جب تمنا تھی ہمیں درد جگر ہو جائے

سانس لیتے ہوئے ڈرتا ہوں سراپا غم ہوں
کہیں ایسا نہ ہو ظالم کو خبر ہو جائے

ہائے اٹھتے ہوئے درد محبت کے مزے
زندگی جس کے سہارے سے بسر ہو جائے

روشنی کرتا ہوں کم شمع جلاتا ہوں کبھی
چاہتا ہوں کہ سر شام سحر ہو جائے

رخ ہواؤں کا بدل دو مری ٹھنڈی سانسو
میں جسے یاد کروں اس کو خبر ہو جائے

کہہ کے یہ بند کی آخر ترے بیمار نے آنکھ
وہ شب غم ہی نہیں جس کی سحر ہو جائے

یوں گڑی دل میں کہ اب ہٹ نہیں سکتی وہ نگاہ
رخ ہے تصویر کا کھنچتے ہیں جدھر ہو جائے

چارہ گر بن کے مجھے لوٹ لیا ظالم نے
کروٹیں لیتا ہوں پر درد جگر ہو جائے

آخری اشک کا ہے سر مژگاں آ کر
ڈوب جائے یہ ستارا تو سحر ہو جائے

دن کے ڈھلنے پہ بھی طوفان تلون ہے وہی
ہو گئی شام تو کہتا ہوں سحر ہو جائے

شب غم لطف ہے پروانہ مزاجی کا سراج
رات بھر آگ سے کھیلو تو سحر ہو جائے

سراج (لکھنوی)

چند روز اور

ہائے اس شوخ کے دہکے ہوئے رنگیں عارض
مرمریں شانوں پہ بکھری ہوئی زلفوں کی لٹیں
میں انہیں روکش گلزار بنا آیا ہوں
میں انہیں جان شب تار بنا آیا ہوں

اس کی پیشانی کے اٹھلاتے ہوئے رنگوں سے
میری محبوبہ کی شاداب نگاہوں میں مجھے
وہ شفق زار کھلے تھے کہ نظر جھولی تھی
کچھ وہ انوار ملے تھے کہ سحر جھولی تھی

سرمئی رات کے دامن میں ستاروں کا ہجوم
گنگناتی ہوئی تنہائی اور اس کی سانسیں
مجکو محبوب کے آنچل کا خیال آیا تھا
مجکو بجتی ہوئی چھاگل کا خیال آیا تھا

اس بھرے ہونٹوں پہ ٹھہری ہوئی مبہم لرزش
اور وہ جاتی ہوئی رات کے گاتے لمحے
شوق کے ہاتھوں میں اک ساز تھا اور کچھ بھی نہیں
اس کی سرگوشی کا انداز تھا اور کچھ بھی نہیں

مجکو پیغام ملا جب کوئی غنچہ چٹکا
ہمنشیں میں نے بھی رنگین غزل لکھی تھی
میری خاطر بھی نگاہوں کا سلام آتا تھا
ہاں کبھی مجکو بھی انداز کلام آتا تھا

آج لیکن بت طناز کے عشووں کی قسم
چاہتا ہوں کہ میں رنگین محلکے ڈھالوں
کاوش دل کا نتیجہ میری غزل دیتی ہے
میری تخئیل مگر خون اگل دیتی ہے

استعارا جو تراشوں تو وہ دے جاتا ہے لو
لفظ بھڑکے ہوئے شعلوں کی طرح ہوتے ہیں
سوچتا ہوں میں جو تشبیہ وہ جل جاتی ہے
نظم رستے ہوئے زخموں میں بدل جاتی ہے

رات گاتی نہیں الجھی ہوئی زلفوں میں کہیں
زردیاں آ بھی چکیں عارض و پیشانی تک
اب چمن زار نہیں یار کے رخساروں پر
راکھ کی تہہ ہے دہکتے ہوئے انگاروں پر

آج محبوب کے آنچل میں ہے زخموں کا ہجوم
تیرگی آنکھوں کے میخانے میں در آئی ہے
مفلسی چاند ستاروں کا جگر کاٹ گئی
بھوک ہونٹوں کا درخشندہ لہو چاٹ گئی

گاؤں کی گلیوں کی دل دوز کراہوں کی قسم
سوز غم سے یہ سلگتے ہوئے جسموں کی بھبک
میرے محبوب کے پایل کی جھنک ڈوب گئی
اس کے ملبوس کی جاں بخش مہک ڈوب گئی

جس کو پیغام دیا باد سحر کے ہاتھوں
کوئی بتلائے کہ میں عشق لٹاؤں کیوں کر
آج خلوت سے وہ بازار تک آ پہنچی ہے
زندگی آج حد دار تک آ پہنچی ہے

اپنے محبوب کو لٹنے سے بچانے کے لیے
اپنی رنگین سی غزلوں کی حفاظت کے لیے
میں نے اک بات ہی چھیڑی تھی کہ تم روٹھ گئے
میں نے آواز اٹھائی تھی کہ تم روٹھ گئے

معترض ہو مرے موضوع سخن پر لیکن
عشق باقی ہو کسی دل میں تو وہ مجکو خبر
ہو کوئی اور بھی رستا تو دکھاؤ مجکو
حسن محفوظ کہیں ہو تو بتاؤ مجکو

اب کہاں برہمی زلف دوتا کی باتیں
حسن نیلام ہوا ہے کہ نہیں بتلاؤ
نکہت کاکل شب تاب لٹی ہے کہ نہیں
عظمت روکش مہتاب بکی ہے کہ نہیں

پھر کہیں قوت برداشت نہیں رہ جاتی
ایسے حالات میں اس جان تغزل کی قسم
آنچ جب کاکل رخسار تک آ جاتی ہے
بات پازیب سے تلوار تک آ جاتی ہے

مری غزلوں میں صداقت نہ رہے گی باقی
حسن کو کوچۂ ہوس کار سے لوٹ آنے دو
میں نظر آؤں گا پھر شاعر آشفتہ مزاج
اک ذرا مجکو حد دار سے لوٹ آنے دو

نازش پرتاب گڑھی

غزل

صفی احمد (بہاری)

وہ نقاب اٹھ رہی ہے کہ ہیں صبح کے اجالے
کہیں کھل رہے ہیں گیسو کہ بکھر رہے ہیں کالے

ترے حسن کا ہے زیور تری شرمگیں نگاہیں
وہیں موت حسن کی ہے جو نقابِ رخ اٹھا لے

یہ ترا رخ منور یہ کھلے کھلے سے گیسو
شب چاردہ میں جیسے ہوں قمر کے گرد ہالے

یہ ترا شباب ساقی ہے نوید جذب و مستی
کہ شراب سے بھرے ہیں کہیں دو حسیں پیالے

مری زندگی میں چپ چپ یہ سما رہا ہے کوئی
مری آرزو کی دنیا ہے کسی کے اب حوالے

یہ مرے سکوں کی دنیا کہیں ہو نہ غرق طوفاں
کہ سکوت شب میں پھر ہیں کہیں "پی کہاں" کے نالے

تری جستجو میں آخر کہیں تھک نہ جائے دل بھی
مرے پائے آرزو کے کہیں پھٹ پڑیں نہ چھالے

او صفی خوش نوا تو یوں ہی چھیڑتا چلا جا
تری بانسری کی لے ہے کسی ٹوٹے دل کے نالے

یونیورسٹی تعلیم میں تنوع پیدا کرنے کی ضرورت

(پروفیسر وی کے مینن وائس چانسلر پٹنا یونیورسٹی)

(تعلیم کے حقیقی مقاصد تحصیل علم، سماج سیوا اور تحقیق ہیں)

ہندستان میں تعلیم کو حقیقی معنوں میں قومی بنانا بے حد ضروری ہے اور اس کی بنیاد تحصیل علم اور تہذیبی جمہوری اور مین قومی قدروں جیسے عالا نصب العین پر رکھی جانی چاہیے۔ بنیادی تعلیم کو عمومی ثانوی کو تنوع اور یونیورسٹی تعلیم کو بہتر بنانا مقصود ہے۔ عالا تعلیم میں علمی تحقیق کو خاص اہمیت دی جانی چاہیے۔ یہ بات ہر شخص پر بخوبی روشن ہے کہ برطانوی حکمرانوں کے پیش نظر ہمیں تعلیم دینے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم ان کی انتظامی مشنری کو چلاتے رہیں۔ تعلیم کے بعد صرف ملازمت حاصل کرنے کا رجحان ابھی تک باقی ہے جسے دور کرنا ہمارا فرض ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ہماری تعلیم ادھوری ہے۔ ہمیں لیکچروں اور امتحانات کے طریقوں کو بدل ڈالنا چاہیے اور ٹکنیکل تعلیم اور اخلاقی قولوں پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹیوں کی تنظیم میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے تعلیم سے متعلق انہیں خدمختاری حاصل ہونی چاہیے۔ ہمیں تعلیم میں مذہب کے مقام اور سرکاری ملازمت کے لیے یونیورسٹی ڈگریوں کی اہمیت پر بھی غور کرنا ہوگا۔ چونکہ میرا زیادہ تر تعلق یونیورسٹیوں سے ہے۔ اور قوم کی زندگی میں یونیورسٹیاں ایک اہم پارٹ ادا کرتی ہیں اس لیے میں انہی کی اصلاح کے متعلق خیالات کا اظہار کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ ہم یونیورسٹیوں کو اتنی اہمیت نہیں دے رہے ہیں جن کی کہ وہ مستحق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یونیورسٹی، علم تہذیب اور تحقیق کا گہوارا ہوتی ہے لیکن ان کا کام یہیں ختم نہیں ہو جاتا

ضرورت اس بات کی ہے کہ یونیورسٹیوں اور قومی زندگی کے درمیان ربط پیدا کیا جائے اس سلسلے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبا کی تعداد کا مسلا نہایت اہم ہے۔ اگرچہ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں ہندستان کی یونیورسٹیوں میں طلبا کی تعداد کم ہے لیکن یہاں طلبا کا رجحان ٹکنیکل تعلیم کی بجائے ڈگریوں کے حصول کی طرف زیادہ ہے البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں ٹکنیکل اداروں کی تعداد کم ہے اور عام طلبا ان درسگاہوں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس کا نتیجا ظاہر ہے۔ ہماری تعلیم سوسائٹی کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ طلبا اپنے مستقبل سے عموماً مایوس نظر آتے ہیں اور یونیورسٹیاں شرارت کی شکارگاہیں بن کر رہ گئی ہیں۔ طلبا کی زندگی میں روح پھونکنے کے لیے ہمیں تعلیم میں تنوع پیدا کرنا ہوگا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جبکہ ٹیکنیکل اداروں کی تعداد میں ضروریات کے مطابق اضافا کیا جائے۔ اس کے علاوہ طلبا اور عوام کو نزدیک تر لانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ وہ تعلیم بالغان میں حصہ لے سکتے ہیں۔ طبی تعلیم حاصل کرنے والے طلبا گرد و نواح میں لوگوں کو طبی امداد بہم پہنچا سکتے ہیں اور دوسرے کاموں میں ان کا ہات بٹا سکتے ہیں۔ اگر طلبا میں سماج سیوا کا جذبا پیدا ہو جائے تو یونیورسٹیوں کی بہت سی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے اور تعلیم کے حقیقی مقاصد بھی تحصیل علم سماج سیوا اور تحقیق ہیں۔

ذریعہ تعلیم کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ ہندستان کے بہت سے حصوں میں مادری زبان میں تعلیم دینے کے اصول کو نہ صرف تسلیم کر لیا گیا ہے بلکہ اسے عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی جا رہی ہے لیکن یونیورسیٹوں میں اس طریقہ تعلیم کو رائج کرنے میں بہت سی مشکلات درپیش ہیں۔ انہیں ایک درجن یا اس سے زیادہ زبانوں میں تعلیم دینے کے انتظامات کرنے پڑیں گے۔ اور اس پر خرچ بہت زیادہ بیٹھے گا جو وہ برداشت نہ کر سکیں گی۔ الفاظ اصطلاحات اور درسی کتابوں کے لحاظ سے ابھی تک کوئی مادری زبان انگریزی کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور جب تک ایک ملی جلی زبان رائج نہیں ہو جاتی ہمارے لیے انگریزی میں ہی تعلیم دینا مناسب ہوگا۔ لیکن اس اصول کو نظرانداز کرنا عبث ہوگا کہ قدرتی اور عالا ذریعہ تعلیم مادری زبان ہی ہو سکتا ہے گو اس پر عمل کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ مادری زبان کے ساتھ ساتھ ثانوی تعلیم کی نچلی جماعتوں میں ہمیں قومی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دینا چاہیے اس طرح ملک میں حب الوطنی اور اتحاد کا جذبہ پیدا ہوتا چلا جائے گا۔

قمرالدین قمر (مرحوم)

یہ خبر انتہائی رنج و ملال کے ساتھ سنی جائے گی کہ نوجوان افسانہ نگار قمرالدین قمر انتقال کر گئے ۔۔۔

قمر مرحوم نے کچھ عرصے سے "ہندستانی ادب" میں مستقل طور پر لکھنا شروع کیا تھا۔ اب تک ان کے کئی ایک افسانے چھپ چکے ہیں صحت کی خرابی اور مسلسل بیماری نے انہیں زیادہ لکھنے لکھانے کا موقع نہیں دیا مگر دیرینہ علالت کے باوجود وہ اس رسالے کے لیے اپنے مضامین برابر بھجوایا کرتے تھے سچ تو یہ ہے انہیں اس پرچے سے کچھ انس سا ہو گیا تھا۔ جس کا ثبوت مرحوم کے بھیجے کے آخری خط سے ملتا ہے ۔۔

6.9.54

۳ ر رجنی چودھری روڈ

فرید آباد

ڈھاکا (مشرقی پاکستان)

خان صاحب تسلیم!

آپ کا خط ملا ـــــ شکریہ!

جواب لکھنے میں جو تاخیر ہوئی اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔

پرچہ برابر مل رہا ہے جس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔

ادھر عرصے سے جو میری طبیعت خراب تھی وہ بدستور علیل ہے بلکہ اب تو اور زیادہ خراب ہو گئی ہے کہ گھر میں علاج ممکن سے باہر ہو گیا چنانچہ چند ڈاکٹروں کی متفقہ رائے سے میں کل منگل کے روز میڈیکل ہسپتال میں داخلہ لے رہا ہوں۔ آپ پرچہ وہی پرانے یعنی گھر کے پتے پر ارسال کریں۔ میں ہسپتال سے خط لکھنے کی کوشش کروں گا۔ آج کل پرچہ ماشاء اللہ خوب نکل رہا ہے اس کی ترتیب میں بہت شائستگی پیدا ہو گئی ہے اور کتابت وغیرہ بھی بہت اچھی ہونے لگی ہے۔ پرچے کی کامیابی کے لیے مبارکباد پیش کرتا ہوں لیکن تھوڑی سی تاکید اور کیجیے! میرے کئی افسانوں کا مسودہ آپ کے پاس ہوگا میری ایک کتاب بہت جلد کراچی سے طبع ہو رہی ہے پشت پر اس کتاب کا اشتہار مختصر لکھ رہا ہوں۔ اگر آپ اس میں کچھ بڑھانا چاہیں تو خوشی بڑا ہے آئندہ شمارے سے آپ اشتہار ضرور شایع کیجیے ایگا

ہم ہسپتال سے خط آنے کے انتظار میں تھے ـــــ مگر کیا معلوم تھا کہ اس انتظار کا سکوت ایک رنج و غم بھری خبر سے ٹوٹ جائے گا!

مرحوم میں افسانہ نگاری کی پوری پوری صلاحیتیں موجود تھیں۔ اگر موت کے ظالم پنجے نے انہیں اس قدر جلد نہ جکڑا ہوتا اور ان کی افسانہ نگاری کی مشق اسی طرح جاری رہتی تو یقیناً قمر بھی ایک دن صف اول کے افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے۔

بہر حال ہمیں قمر کی جواں مرگی پر بے حد افسوس ہے اور آخر میں ہم مرحوم کے پسماندوں کی خدمت میں اپنی دلی اور گہری ہمدردیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ایڈیٹر

انتقاد

رباعیات عمر خیام

(دوسری قسط)

ظفر عالمگیر بی۔اے
(عثمانیہ)

(ایڈیٹر کا مضمون نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں)

SOME FOR THE GLORIES OF THIS WORLD; AND SOME
SIGH FOR THE PROPHET'S PARADISE TO COME
AH! TAKE THE CASH AND LET THE CREDIT GO
NOR HEED THE RUMBLE OF A DISTANT DRUM

اس کے ابتدائی دو مصرعوں کا ترجما کیا گیا ہے ——

کچھ جاہ و حشم کے دلدادہ اور سرتاسر دنیا والے
کچھ جنت موعودہ پہ عبث امید بندھے فردا والے

پہلے مصرع کے پہلے حصے میں انگریزی رباعی کے پہلے مصرع کا پورا مفہوم موجود ہے اور دوسرا حصا بھرتی کا ہے۔ دوسرے مصرع میں کئی نقایص۔ "پہ عبث" کا مفہوم انگریزی مصرع میں کہیں نہیں۔ یہ مترجم کا اضافا ہے۔ "امید بندھے" کی بجائے "امید باندھے" ہونا چاہیے تھا۔ "فردا والے" لایعنی بات ہے۔ بعد کے دو مصرعوں کا ترجما ہے۔

امروز کا بہتر ہے سودا عاقل کہ مواعید فردا
یہ ڈھول سہانے دور ہی بس دھوکے میں آ جو گیا رکھے

یہاں تو ایک نہ شد دو شد والی بات ہے۔ پہلے مصرع میں مخاطب "عاقل" سے ہے اور دوسرے مصرع میں وہی "عاقل" بھولا بھالا بن گیا ہے۔ یہ تضاد ہے ترجمے میں۔ ورنا انگریزی رباعی میں نہ عاقل ہی مخاطب نہ عاقل نہ بھولا بھالا نہ سیانا۔ "دور کے ڈھول سہانے" مفہوم کہاں تو ہے اس کو لگا کر دوسرے مصرع میں ٹھونسا گیا ہے اور مفہوم یہ پیدا ہو رہا ہے کہ "سہانے ڈھول دور ہی" رکھے۔ حالانکہ شاعر یہ کہہ رہا ہے کہ "دور کے سہانے ڈھول پر توجہ نہ دے"۔ ——

LOOK TO THE BLOWING ROSE ABOUT US —"LO
LAUGHING", SHE SAYS, "INTO THE WORLD I BLOW
AT ONCE THE SILKEN TASSEL OF MY PURSE
TEAR, AND ITS TREASURE ON THE GARDEN THROW.

اس رباعی کا ترجما کیا گیا ہے کہ

غنچہ چٹکا کچھ دیر ہنسا، پھر یوں محو فریاد ہوا
اک لحظہ شگفتہ ہو کر میں بے سود و عبث ہی شاد ہوا
بس ایک ہوا کا جھونکا تھا میں تھا کم سرمایہ تھا
یہ طرۂ زریں پژمردہ آناً فاناً برباد ہوا

خیام نے قاری یا سامع کو دعوت دی ہے کہ پھول کو دیکھے لیکن ہندستانی ترجمے میں اسے نظر انداز کر کے اس کی بجائے "غنچہ چٹکا کچھ دیر ہنسا پھر یوں محو فریاد ہوا" کو لکھا گیا۔ SHE SAYS کا ترجما "محو فریاد ہونا" نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح "بے سود عبث ہی شاد ہوا"۔ ہندستانی رباعی میں مترجم کا اضافا ہے۔ اصل رباعی میں جیب یا بٹوا مذکور ہے لیکن ہندستانی میں (THE SILKEN TASSEL OF MY PURSE) کو "طرۂ زریں" کہا گیا ہے۔ ہندستانی رباعی کے آخری مصرع

ہیں "پژمردہ" وزن کی تکمیل کے لیے بھرتی کیا گیا ہے پھول کہتا ہے کہ میرا سرمایا یا خزانا گلستاں میں بکھر گیا۔ ہندستانی رباعی میں یہ مفہوم لاتا ہے۔

ANOTHER VOICE WHEN I AM
SLEEPING, CRIES
"THE FLOWER SHOULD OPEN
WITH THE MORNING SKIES"
AND A RETREATING WHISPER,
AS I AWAKE
"THE FLOWER THAT ONCE HAS BLOWN,
FOR EVER DIES"

ابتدائی دو مصرعوں کا ہندستانی ترجما ہے۔

سوتے میں مجھے آئی یہ صدا، یہ مان لیا او دیوانے
ہر روز عیاں ہوتی ہے سحر گولے کے گلوں کے پیمانے

"یہ مان لیا او دیوانے"، نہ جانے کون سے انگریزی الفاظ کا مفہوم ہے جو رباعی میں موجود ہیں۔ ابتدائی دو انگریزی مصرعوں کا ترجما ہوگا کہ "جب میں سو رہا تھا یہ آواز آئی کہ سحر کے ساتھ پھول کو کھلنا چاہیے۔" اصل رباعی کے دوسرے مصرع میں پھول نہ صرف انتہائی اہم ہے بلکہ فاعل کا مرتبا رکھتا ہے لیکن ترجمے میں فاعل کا مرتبا سحر کو حاصل ہوگیا۔ اور پھول ثانوی اہمیت سے زیادہ کچھ نہ پا سکے حالانکہ رباعی کا اصل موضوع پھول ہے نہ کہ سحر۔ بعد کے دو مصرعوں کا ہندستانی ترجما ہے۔

لیکن یہ ندا ساتھ ہی آئی اے ہستی دو دل کے سودائی
معلوم نہیں کھلتی ہے کلی اک بار ہمیشہ مرجھانے

RETREATING WHISPER کے معنی ہیں۔ انتہائی دھیمی آواز۔ لیکن مترجم نے اس کا "ندا" کیا ہے جس کے معنی ہیں "پکار یا بانگ صدا"۔ مترجم کہتے ہیں "یہ ندا ساتھ ہی آئی"۔ پوری ہندستانی رباعی کو پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ سوتے میں ایک آواز سنی اور ساتھ ہی دوسری آواز آئی۔ حالانکہ اصل رباعی میں سننے والے کے جاگنے کی اطلاع دی گئی ہے (AS I WAKE) لیکن مترجم نے اس کو نظرانداز کر دیا ہے۔ "معلوم نہیں" وزن کی تکمیل کے لیے بھرتی ہے۔

THE WORLDLY HOPE MEN SET THEIR
HEARTS UPON
TURN ASHES OR IT PROSPERS;
AND ANON
LIKE SNOW UPON THE DESERT'S
DUSTY FACE
LIGHTING A LITTLE HOUR OR TWO
IS DONE.

اس کے ابتدائی دو مصرعوں کا ترجما کیا گیا ہے۔

اک خاک کے تودے پر تکیہ امید پہ تکیہ کرتا ہے
بیکار توقع ہے اس پہ بے سود بھروسہ کرتا ہے

نہ انگریزی میں "خاک کے تودے" کا ذکر ہے اور نہ "بے سود بھروسا کرنے کا" تذکرا ہے۔ پہلے مصرع کا مفہوم مترجم ہی بہتر جانتا ہے۔ آخری مصرعوں کا ترجما ہے۔

خورشید نکلنے پر لرزاں شبنم کی لڑی جیسے رقصاں
کچھ لحظہ چمک دیکھی اس کی کچھ آن تماشہ کرتا ہے

انگریزی کے مفہوم کے اعتبار سے سورج اور شبنم کی تمثال کا انتخاب بہت خوب ہے لیکن یہ خوبی بیان کی خامی میں جذب ہو گئی ہے۔ "رقصاں" کا مصرع میں کوئی مفہوم نہیں بلکہ اس سے مصرع بے معنی ہوا جا رہا ہے۔ "رقصاں" کو نکال دیں تو مفہوم مکمل ہے۔ دوسرا مصرع صحیح ترجما نہیں۔ اس کے علاوا "کچھ لحظہ" اور "کچھ آن" نہیں بولتے۔ "اک لحظہ" اور "اک آن" بولا جاتا ہے۔ بعد کی رباعی میں مترجم نے کمال کر دکھایا ہے۔

THINK, IN THIS BATTER'D CARAVAN-SERAI
WHOSE PORTALS ARE ALTERNATE NIGHT AND DAY
HOW SULTAN AFTER SULTAN WITH HIS POMP
ABODE HIS DESTINED HOUR AND WENT HIS WAY.

ابتدائی دو مصرعوں کا ترجما کیا گیا ہے۔

یہ دہر سرائے فانی ہے دروازے ہیں جس کے روز و شب
آئین یہاں کا ہنگامہ دستور یہاں کا رنج و تعب

یہاں دوسرا مصرع خود مترجم کی تراشں ہے جو سراسر بے محل ہے آخری مصرعوں کا مفہوم یہ ہے کہ "ایک کے بعد دوسرا بادشاہ اپنی شان و شوکت لیے اپنے وقت تک رہا اور پھر اپنی راہ لی" —— لیکن اس مفہوم کو مترجم نے یوں پیش کیا ہے۔

ہر روز مسافر آتے ہیں دو چار گھڑی بس جاتے ہیں
اس کو نہ غریبوں کی پرواہ اس کو نہ سلاطیں سے مطلب

نہ خیام نے مسافروں کی آمد کا ذکر کیا نہ بسنے کا، نہ غریبوں کا نہ سلاطین کا نہ مطلب کا نہ پروا کا لیکن مترجم نے جانے کس بنا پر اس سیدی سادی رباعی سے اتنے سارے مطالب پیدا کر لیے —— بعد کی رباعی میں بھی مترجم نے اسی قسم کی شاعری فرمائی ہے۔

THEY SAY THE LION AND THE LIZARD KEEP
THE COURTS WHERE JAMSHYD GLORIED AND DRANK DEEP

جمشید کے ایوان عشرت ہیں آج درندوں کے مسکن
مے محفل نائو نوش جہاں ہے وہاں بوم محو شیون

پہلے مصرع میں انگریزی کے دونوں مصرعوں کا مفہوم آگیا ہے اور دوسرا مصرع سراسر بھرتی ہے۔ "محفل" کے ساتھ مترجم نے "مے" استعمال کیا ہے حالانکہ محفل عربی لفظ ہے اور مونث ہے جو ہندستانی میں بھی مونث استعمال ہوتا ہے۔ پہلے مصرع میں "درندوں" کے اعتبار سے دوسرے مصرع میں "بوم" جمع استعمال کیا جانا چاہیے تھا نہ کہ واحد "ہے" کی بجائے "ہیں" چاہیے تھا۔ "محو شیون" یعنی "محو فریاد" الو نہیں ہوتے۔ الو بولتے ہیں لیکن فریاد کرتے ہیں کوئی بات نہیں۔ یوں بھی محاورا یہ ہے کہ "جہاں زندگی کا ایوان تھا وہاں الو بولتے ہیں" نہ کہ "الو فریاد کرتے ہیں" بعد کے دو مصرعے اور ان کا ترجما ہے:۔

AND BAHRAM, THAT GREAT HUNTER — THE WILD ASS
STAMPS OVER HIS HEAD BUT CANNOT BREAK HIS SLEEP"

شکاری بڑے ہشیار اور چوکنے ہوتے ہیں۔ ذرا سی آہٹ ان کو چونکا دیتی ہے اس حقیقت کے پیش نظر خیام کہتا ہے کہ "اور بہرام وہ صیاد عظیم سویا پڑا ہے اور جنگلی گدھا اس کے سرانے ٹاپیں مارتا ہے لیکن اسے اس خواب سے نہیں جگا سکتا۔" خیام کا مطلب یہ کہنے کا ہے کہ بہرام جو زبردست شکاری تھا اور جو ذرا سی آہٹ پر چونک جاتا تھا آج پڑا سوتا ہے اور جنگلی گدھا اس کے سرانے ٹاپیں مارتا ہے تب بھی نہیں چونکتا مترجم نے اس مفہوم کو یوں پیش کیا ہے۔

بہرام وہ صیاد اعظم تھا جس سے خر صحرا بیدم
اب اس کی ٹھوکر بھی نہ جگا سکتی ہے اسے زیر مدفن

مفہوم الٹ گیا ہے۔ خیام نے یہ نہیں کہا کہ خر صحرا بہرام سے بیدم تھا۔ یہ ناگوار اضافہ ہے جس کا ذمے دار مترجم ہے اس کے علاوہ ان مصرعوں میں چند در چند نقائص ہیں۔ اگر مترجم کے مفہوم کو صحیح مان لیں تو ان نقائص کو کیا کریں؟ بہرام کو صیاد اعظم کہا گیا اور اس دعوے کے ثبوت کے طور پر

پیش کیا گیا کہ اس سے خر صحرا بے دم ہو جاتا۔ بے دم ہو جانا بجائے خود غلط ہے گھبرانا یا بھاگ کھڑا ہونا کہا جانا چاہیے تھا۔ دعوے کا ثبوت کس قدر ضعیف ہے اگر کسی سے صحرا کا گدھا یہ قول مترجم بے دم ہو جائے تو کیا وہ صیاد اعظم ہو گا۔ صحرا کا گدھا شیر جیسے درندوں کے خاندان سے نہیں۔ صیاد کی عظمت کا ثبوت اس کے بہادر دلیر اور جری شکار کی گھبراہٹ ہی سے مل سکتا ہے اور خر صحرا کی گھبراہٹ معیار نہیں بن سکتی۔ دوسرے مصرع میں "نہیں" کی بجائے "نہ" استعمال کر کے وزن کی تکمیل تو کر دی گئی بندش کا ناس مار دیا گیا۔ "زیر مدفن" بھونڈی سی بات ہے اگر بہرام کی لاش زیر مدفن نہ ہوا ور مدفن کے اوپر ہو تو کیا خر صحرا کی ٹھوکر اسے جگا دے گی؟

THE PALACE THAT TO HEAV'N HIS
PILLARS THREW
AND KINGS THE FORE HEAD ON
HIS THRESHOLD DREW
I SAW THE SOLITARY RINGDOVE
THERE
AND "COO COO COO" SHE CRIED
AND "COO COO COO"

اس قدر آسان سی رباعی کا ترجمہ ہوتا ہے۔

وہ سر بہ فلک کاخ و ایوان وہ دل کش خوبان خوش رو
شاہان سلف کے سر جن کی دہلیزوں پہ ہوتے تھے فرو

خیام کہہ رہا ہے کہ وہ محل جس کے مینارے آسمان کو چھوتے اور جس کی دہلیز پر بادشاہ (انسان کی ہے جس کھینچ لاتے (وہ اجڑ گیا اور آج) وہاں میں نے اکیلی فاختہ کو کوکو کرتے دیکھا سمجھ میں نہیں آتا ہندستانی ترجمے میں یہ "دل کش خوبان خوش رو" آخر کون سے محل کی چھت سے ٹپک پڑے ہیں۔ انگریزی رباعی میں ان کا پتا نہیں ہے۔ دوسرے مصرع میں مفہوم کو الٹ کر نظم کیا گیا ہے۔ آخری دو مصرعوں کا ترجمہ ہے۔

ہے بوم وہاں اب محو فغاں قمری کی صدا سے صحرائیاں
افسوس کہاں بس اللہ ہو ہستند کجا کوکوکو

ابھی ابھی "دل کش خوبان خوش رو" ٹپک پڑے تھے اور اب بوم آ دھمکا ہے۔ تیسرے مصرع کا پہلا حصہ سراسر بھرتی ہے شاعر صرف فاختہ کا تذکرہ کر رہا ہے اور مترجم فاختہ کے ساتھ الو لے آئے۔ شاعر کہہ رہا ہے "اکیلی فاختہ" اور شاید مترجم کو اکیلاپن گراں گذرا اس لیے الو کو ساتھ کر دیا گیا۔ "بوم کا محو فغاں ہونا" کہنا خلاف حقیقت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ "میں نے قمری کو کوکو کرتے دیکھا" اور مترجم نے اسے بدل کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ آخر مصرع کے فارسی الفاظ کو ہندستانی جامہ پہنا دیں تو یہ مصرع یوں ہوگا۔ "گئے کہاں بس اللہ ہو ہیں کہاں کوکوکو"۔ اس پر میں نقد نہیں کرتا قارئین کرام غور فرمائیں کہ میں کہوں گا تو کیا کہوں گا — بعد کی رباعی ہے۔

AH MY BELYED! FILL THE CUP THAT
CLEARS
TO DAY OF PAST REGRETS AND
FUTURE FEARS
TOMORROW! WHY, TOMORROW!
I MAY BE
MYSEEF WITH YESTERDAY'S
SEVFN THOUSAND YEARS.

اس کا ترجمہ ملاحظہ ہو!! —

وہ بادۂ رنگیں دے ساقی! جو روح کو مالا مال کرے
وہ ماضی و مستقبل کے وہم و شک کا استیصال کرے
بس آج کا لیکا سودا ہے لے سودا امید فردا ہے
معلوم نہیں کل ہونے تک تقدیر مرا کیا حال کرے

مجھے تو فانی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

فردوس بداماں ہے ہر نقش خیال ان کا
یہ شانِ تصور، تصویر کو کیا کہیے

سوچ رہا ہوں کہ واقعی کیا کہوں؟ ــــ اس رباعی کے ترجمے کو لیجیے۔ پہلے ہی زبان و بیان کے چند در چند نقایص اس پر مفہوم کی الٹ پھیر!

شاعر محبوب سے مخاطب ہے اور مترجم ساقی سے "روح کو مالا مال کردے" مترجم کا اضافہ ہے۔ جو غیر ضروری ہے شاعر تو یہ کہتا ہے کہ "اے میرے محبوب! وہ جام بھر جو ماضی کے غم اور مستقبل کے اندیشوں کو بھلا دے"۔ REGRETS اور FEARS کو ہم وہم و شک نہیں کہہ سکتے۔ وہم و شک دونوں عربی الفاظ ہیں، اور ہم معنی لیکن REGRETS اور FEARS ہم معنی نہیں۔ مفہوم کا حسن وہم و شک کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔ مستقبل کے تعلق سے وہم و شک درست ہو سکتا ہے لیکن ماضی کے تعلق سے کیا ہوگا؟ ماضی تو حقیقت کی سنگلاخ چٹان ہوتا ہے نہ کہ وہم و شک۔ ہندستانی ترجمے کے آخری دو مصرعے سراسر مترجم کی تخلیق ہیں جن کا اصل رباعی سے کوئی تعلق نہیں۔ شاعر یہ کہہ رہا ہے "کل کیوں! کل (مستقبل) میں کل (ماضی) کے سات ہزار برسوں میں کھو جاؤں" یعنی کل کا انتظار نہ کر۔ کون جانے کل میں رہوں نہ رہوں۔ اس مفہوم کا ہندستانی مصرعوں کے مفہوم سے تقابل کیجیے۔ پتا چلے گا کہ ترجما کیا ہے۔ اور اصل مفہوم کیا ہے؟

FOR SOME ONE LOVED, THE
LOVELIEST AND THE BEST
THAT FROM HIS VINTAGE ROLLING
TIME HATH PREST,
HAVE DRUNK THEIR CUP, A
ROUND OR TWO BEFORE
AND ONE BY ONE CREPT SILENTLY
TO REST.

ابتدائی دو مصرعوں کا ترجما ہے۔

وہ جن سے محبت کی ہم نے وہ جن کو لگایا سینے سے
صد حیف کہ یہ رفتہ رفتہ منہ موڑ گئے سب جینے سے

"وہ جن کو لگایا سینے سے" بھرتی کا ٹکڑا ہے۔ دوسرے مصرع میں "سب" وزن کی تکمیل کا سہارا ہے پہلے مصرع میں THE LOVELIEST AND THE BEST کا مفہوم کہیں نہیں۔ دوسرے مصرع میں وقت کا تذکرا ہے اور جو کچھ شاعر نے ہوتا ہوا بیان کیا ہے اس کا سبب وقت کا ہاتھ ہے۔ لیکن مترجم نے رباعی کی اس اہم چیز کو قلم کی ایک جنبش سے نکال پھینکا۔ دوسرے مصرعوں کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے ایک آدھ جام پیا اور خامشی سے یکے بعد دیگرے ابدی سکون اختیار کر گئے۔ اس مفہوم کو مترجم نے یوں ادا کیا ہے کہ

اس جام حیات دور روزہ کا بعض نے چکھا بھی نہ مزہ
ایسے میں اجل آئی کہ ابھی لب تر نہ ہوئے تھے پینے سے

کہاں اصل مفہوم اور کہاں ترجما "جام حیات دور روزہ" کا یہاں کیا ذکر۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ ایک یا دو جام پی کر رخصت ہوئے اور مترجم کہتا ہے کہ بعض نے مزا تک نہ چکھا اور بعض نے پیا تک نہیں۔ لب اسی وقت تر ہوں گے جب کچھ پیا جائے۔ شاعر کے مفہوم سے یہ مفہوم کس قدر جدا ہے شاعر نے موت کے آنے کی اطلاع کہیں نہیں دی ہے۔ لیکن مترجم نے اصل کے ابدی سکون کو اجل کی آمد سے بدل دیا ہے اگر ان تمام رباعیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو پتا چلتا ہے کہ بعض رباعیوں میں انہوں نے انگریزی رباعی کے ایک مصرع کے مفہوم کو دو مصرعوں میں اور بعض رباعیوں کے دو مصرعوں کے مفہوم کو ایک مصرع میں ادا کیا ہے ــ تفصیلی انتقاد کی بجائے (جس میں آپ کا اور میرا وقت بھی ضائع ہوگا) میں ایسے مصرعوں کو متوازی طور پر پیش کیے دیتا ہوں۔ جن میں کہیں مفہوم الٹ دیا گیا ہے یا اپنی جانب سے مفہوم میں اضافا کر دیا گیا۔ یا مفہوم پوری طرح ادا کیا جا سکا۔

AND WE, THAT MAKE MERRY IN THE ROOM.

ہم چار گھڑی دنیا میں عیش یاں عشق و محبت کرتے ہیں
اسلاف کے کاخ و ایواں میں بے معنی مسرت کرتے ہیں

یہاں اصلی مصرع میں عشق و محبت کا ذکر نہیں اور نہ اسلاف کے کاخ و ایوان کا نہ بے معنی مسرت کرنے کا۔ بلکہ "ہم اس جگہ اب جو عیش کرتے ہیں" اتنے سے مفہوم کو ربر سمجھ کر اس قدر کھینچا گیا کہ روح فنا ہو گئی۔ پہلے مصرع میں "یاں" قطعی بے معنی ہے۔

A MUEZZIN FROM THE TOWER OF DARKNESS CRIES
"FOOLS! YOUR REWARD IS NEITHER HERE NOR THERE"

ہاتف نے صدا دی دیوانو! اے شمع فنا کے پروانو!
یہ شوق جزا یہ خوف سزا بے کار "یہاں" "بے سود" "وہاں"

یہ دیوانے جنہیں ہاتف صدا دے رہا ہے رباعی کے مطابق "کچھ دولت عقبیٰ پر والغ، کچھ دولت پر نازاں کچھ حاصل دور روزہ پہ مگن کچھ وعدہ فردا پر شاداں" ہیں۔ ان کو مترجم نے "شمع فنا کے پروانے" کہا ہے جو سراسر غلط ہے۔ دولت یا آخرت، حاصل دور روزہ یا وعدہ فردا کے پروانوں کو شمع فنا کے پروانے کہنا درست نہیں۔ شمع فنا کا پروانا اس کو کہیں گے جو فنا ہو جانا چاہتا ہو۔ اور شمع زندگی کا پروانا اسے کہتے ہیں جو زندہ رہنا چاہے۔ یہاں پروانوں سے جو لوگ مراد ہیں وہ فنا کے پروانے نہیں۔ بلکہ دولت، دولت آخرت، حاصل دور روزہ۔ اور وعدہ فردا کے پروانے ہیں۔ فنا کہہ کر وہ اشیا مراد نہیں لی جا سکتی ہیں جو فنا ہو جائیں۔ اسی قدر بے معنی "شوق جزا" اور "خوف سزا ہے" اور "یہاں بے سود وہاں" بھی لایعنی مجموعہ الفاظ ہے۔

THERE WAS THE DOOR TO WHICH I FOUND NO KEY

اس در کی کلید آخر نہ ملی جس در سے آنا جانا تھا"

اس مصرع میں "جس در سے آنا جانا تھا" مترجم کا بے معنی اضافہ ہے۔ پہلے ہی ٹکڑے میں انگریزی مصرع کا مفہوم آ گیا ہے۔

THEN TO THE LIP OF THIS POOR EARTHERN URN
LEANED, THE SECRET OF MY LIFE TO LEARN

شاعر کہہ رہا ہے کہ اپنی زندگی کا راز جاننے وہ مٹی کے پیالے کے ہونٹوں کے قریب گیا۔ مترجم نے اس کو یوں پیش کیا ہے

یہ ساغر مے نے مجھ سے کہا کیا "تجھ کو تری پہچان نہیں
کیا راز حیات دو روزہ سے واقف تو نادان نہیں"

اصلی مصرعوں میں شاعر کی تمنا کا پتا چلتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ترجمہ کرتے وقت اس تمنا کو بالائے طاق رکھا گیا۔ اور ساغر مخاطب کر رہا ہے تاکہ شاعر بتلائے کہ زندگی کا راز کیا ہے شاعر کی تمنا ساغر کی تمنا بن گئی۔

FOR I REMEMBER STOPPING BY THE WAY
TO WATCH A POTTER THUMPING HIS WET CLAY"

اک روز دکان کوزہ گر کا میں نے رستہ لیا یوں ہی
کچھ ظرف لگی ڈھلتے دیکھے کچھ ڈھل کے رکھے وال صف بستہ

شاعر کہہ رہا ہے کہ رستا چلتے میں قصداً رکا کہ کوزہ گر کو گیلی مٹی سے ظرف بنانا دیکھوں اور مترجم نے کہا ہے کہ دکان کوزہ گر کا یوں ہی رستا لیا۔ رستا لینے اور ٹھہرنے میں "یوں ہی"

ہیں اور "قصد" میں زمین اور آسمان کا بل ہے ہندستانی کا دوسرا مصرع مترجم کی اپنی کاوش کا ثمر ہے اور اصل رباعی میں شاعر نے ایسی کوئی اطلاع نہ دی تھی۔ یوں بھی اس مصرع میں "ڈھلتے" کی بجائے "ڈھالے جاتے" اور "ڈھل کے" کی بجائے "ڈھال کے" ہونا چاہیے تھا۔ "ظرف ڈھلتے نہیں ڈھالے جاتے ہیں" "صف بستہ" کے معنی ہیں "صف باندھے ہوئے" کیا ظروف صف باند سکتے ہیں؟

THINK THEN YOU ARE TO DAY
WHAT YESTERDAY
YOU WERE; TO MORROW SHALL
NOT BE LESS.

یہ دہر سراب قدرت ہے یہ جان حباب فطرت ہے
بس آج وہی ہے جو کل تھا، کل کا بھی یہی فرجام ہو

یہاں پہلا مصرع مترجم کا اضافہ ہے۔ یوں بھی دہر کو سراب قدرت نہیں بلکہ قدرت کے صحرا کا سراب اور جان کو حباب فطرت کی بجائے بحر فطرت کا حباب کہا جانا چاہیے دوسرے مصرع میں دونوں انگریزی مصرعوں کا نامکمل مفہوم ہے دوسرے ہندستانی مصرع کا دوسرا ٹکڑا ابھرتا ہے اس ٹکڑے میں کل TOMORROW کا مفہوم چاہیے تھا۔

AND LO! THE PHANTOM CARAVAN
HAS REACHED
THE NOTHING IT SET OUT FROM—
OH MAKE HASTE.

ہاں جلد اٹھو کہ سوئے عدم اٹھتے ہیں مسافر تیرے قدم
یاں کوچ کا ساماں ہے ہر دم بھگتے گا ورنہ خمیازہ

شاعر کا اصل مفہوم تو یہ ہے کہ "جلدی کر کہ کارواں اس منزل گم نام کو پہنچ چکا ہے جہاں سے وہ چلا تھا"

اور اس مفہوم کو توڑ موڑ کر جس طرح ہندستانی میں پیش کیا گیا ہے۔ محتاج بیان نہیں۔

BEARING A VESSEL ON HIS
SHOULDER AND
HE BID ME TASTE OF IT AND
'TWAS THE GRAPE'

کچھ نال پہ شاید رحم آیا اس خم کو مرے منہ تک لایا
لب لگتے ہی جاں میں جاں آئی دل خوش بادہ سرجوش یا د

شاعر اسی قدر کہہ رہا ہے کہ "کاندھے پہ ظرف لیے ایک پیکر حسن آیا اور مجھ سے کہا کہ میں مزا چکھوں اور وہ شراب تھی" نہ رحم آنے نہ منہ تک لانے کا ذکر ہے اور نہ جان میں جان آنے کا نہ جان سے جان جانے کا نہ دل خوش کا نہ بادۂ سرجوش کا۔ سیدھی سی بات کو توڑ موڑ دینا کیا ترجمے کا کوئی اعلا فن ہے؟

AND BY AND BY MY SOUL RETURN'D
TO ME
AND ANSWER'D "I MYSELF AM
HEAVEN AND HELL"

شاعر کہتا ہے کہ میں نے اپنی روح کو فضا کی خبر لانے بھیجا اس نے واپس آکر کہا کہ "میں خود جہنم ہوں اور میں خود جنت ہوں"

وہ ہفت فلک گھوم آئی مگر بیانۂ انوکھی لائی خبر
اے دوست وہاں کیا رکھا ہے "تو خود دوزخ تو خود جنت"

مصرعوں کی بندش کا جھول نمایاں ہے اس پر مترجم نے خوب اضافہ کیا ہے۔ شاعر تو بے چارہ معلوم نہ کر سکا کہ روح سات آسمان گھوم کر آئی یا نہیں اور نہ یہ بتا سکا کہ وہ انوکھی خبر لائی لیکن مترجم نے پتا لگا لیا کہ روح گئی تو تھی لیکن سات آسمانوں کی سیر کر کے انوکھی خبر لائی ہے۔ میرا خیال ہے کہ

محشر نقوی کا شمار شاعروں میں نہیں، کولمبس واسکوڈاگاما اور کپتان کک جیسے سیاحوں میں ہونا چاہیے۔ روح اگر کہتی ہے کہ میں ہی دوزخ ہوں اور میں ہی جنت۔ اور مترجم نے "میں" "کو" "تو" سے بدل دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ترجمے کے ساتھ ساتھ تصحیح کی زحمت بھی ازراہ کرم گوارا فرمائی گئی۔ خیام نے جس خیال کو اس رباعی میں پیش کیا ہے دنیا کے ادب میں اس کی مثالیں شاذ و نادر ہی ملتی ہیں۔ لیکن اس خیال کا مترجم نے جو ناس مارا ہے میرا خیال ہے وہ بیداد کی بجائے داد کا مستحق ہے۔

میں نے چند مثالیں پیش کی ہیں۔ ورنہ ایک سو دو صفحات پر مشتمل اصل رباعیوں کے ترجمے کے مجموعے میں ایک رباعی کا ترجمہ بھی ایسا نہیں کہ قابل تعریف نہ سہی درست تو ہو۔ کئی ترجمے سراسر مہمل ہو کر رہ گئے ہیں۔ کہیں مصرعوں میں ناگوار و ناقابل برداشت اضافے کر دیے گئے تاکہ وزن پورا کیا جا سکے۔ اور کہیں مطلب کو الٹ دیا گیا ہے۔ انگریزی رباعیوں سے ترجمے در ترجمے کے علاوہ فارسی رباعیوں کا ترجمہ بھی غلطیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایک فارسی رباعی کے ابتدائی دو مصرع ہیں۔

ابریق مے مرا شکستی ربی
بر من در عیش را ببستی ربی

یعنی اے رب تو نے میرا جام شراب توڑ دیا اور مجھ پر عیش کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کا ترجمہ ہوا ہے۔

یا رب یہ کہاں کی شوخی ہے جو ساغر مے پاش کیا
مسدود در عیش و عشرت بے کیف یہ لو دو پاش کیا

شاعر کہیں یہ نہیں کہہ رہا کہ "یا رب یہ کہاں کی شوخی ہے" اور نہ یہ کہہ رہا کہ "بے کیف یہ لو دو پاش کیا"۔ اسی رباعی کا تیسرا مصرع ہے۔

بر خاک بریختی مے ناب مرا

یعنی میری شراب زمین پر پھینک دی۔ ترجمہ ہوتا ہے۔

"مے بہہ گئی ساغر پھوٹ گیا دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا"

اس سے بڑھ کر قابل دید چوتھے مصرع ——

"خاکم بدہن مگر تو مستی ربی"

کا ترجمہ ہے کہ

"خاکم بدہن راز مستی اپنا ہی تو نے فاش کیا"

آپ فیصلہ کر لیں، میں خاموش ہو جاتا ہوں ——

عمر خیام کی بڑی مشہور رباعی ہے جس سے ایک فسانوی قسم کا واقعہ بھی منسوب ہے۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آں کس کہ گناہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

یعنی گناہ نہ کرنے والا دنیا میں کون ہے کون ہے جو گنہگار نہیں اور جس نے گناہ نہ کیے اس نے کیوں کر زندگی بسر کی میں نے برائی کی اور تو نے اس کا برا صلا دیا۔ پس مجھ میں اور تجھ میں کیا فرق ہے —— ترجمہ ہوتا ہے۔

ہے دست دراز عصیاں سے ہر ایک گریباں چاک یہاں
یاں کون جیا ناکردہ گنہ یہ سارا ہے ناپاک جہاں
تجھ سے بھی امید عفو خطا، برعکس سزا ہوتی ہے عطا
پھر تجھ میں مجھ میں فرق کہاں؟ تو اور یہ منت خاک کہاں

ترجمے کی دوسری خامیاں ایک طرف رہیں۔ آخری دو مصرعوں کا مطلب بدل گیا ہے —— یہ اس مجموعے کی آخری رباعی ہے۔ محشر نقوی سے قطعاً واقف نہیں ہوں ورنہ بتلا سکتا کہ آیا وہ یہ ترجمہ کرنے کے ہر اعتبار سے قابل ہیں؟ لیکن جہاں تک اس ترجمے کا تعلق ہے وہ مجھے معاف فرمائیں۔ اگر میں کہہ دوں کہ ان میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت مطلق نہیں۔ کسی شاعر کے کلام کا ترجمہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حقیقی معنی میں ترجمہ کرنا اپنی کوئی چیز پیش کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ محشر نے دوسرے ترجمہ کرنے والوں پر اپنے مجموعے کے دیباچے میں اعتراضات

کیے ہیں کہ ان لوگوں نے مکھی پر مکھی ماری ہے۔ اور اس بنا پر محشر نے کہا ہے کہ انھوں نے رباعیوں کی رنگینی اور نزاکت کو باقی رکھنے کی کوشش کی تاکہ شاعر کا حقیقی منشا اور مفہوم ظاہر ہو سکے۔ اس مقصد میں محشر بری طرح ناکام رہے ہیں انھوں نے شاعر کے اصلی منشا اور مفہوم کو ظاہر کرنے کی بجائے اس کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ انھیں چاہیے تو یہ تھا کہ اپنا مجموعہ شائع کرانے سے پہلے خوش فہمیوں کے جزیرے سے نکل کر حقیقت کی روشنی میں خوب خوب غور کر لیتے۔ عمر خیام کے مقالات کو ترجمے کے صحیح قالب میں اگر کسی نے ڈھالا ہے تو وہ فٹز جیرالڈ ہے لیکن جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں ——مگر ہم نہیں کہہ سکتے کہ عمر خیام فٹز جیرالڈ ہے اور فٹز جیرالڈ عمر خیام —— یہ سراسر غلط خیال ہے۔ اگر ترجمہ بہ حسن و خوبی انجام پا گیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جیرالڈ کو عمر خیام کہہ دیں۔ ہم فٹز جیرالڈ کو ایک اچھا مترجم تو مان سکتے ہیں لیکن اس کو عمر خیام کا ہم پایہ تسلیم نہیں کر سکتے۔ خیالات تو جیرالڈ کے نہ تھے۔ وہ عمر خیام کے تھے۔ صرف انداز بیان اور مفہوم کی ادائی کی خوبی جیرالڈ کا حصہ ہے یوں بھی انگریزی زبان میں اس زبان کی وسعت کی بنا پر دوسری زبانوں کی بہ نسبت کسی قدر آسانی اور بہتری سے ترجمہ ہو جاتا ہے۔ اگر جیرالڈ ملٹن یا بائیرن یا کسی اور انگریزی شاعر کے کلام کا فارسی میں ترجمہ کرتا تو اس خوبی سے کبھی نہ کر سکتا جس خوبی سے عمر خیام کی فارسی رباعیات کا انگریزی میں کر سکا۔ زبان کی وسعت مترجم کے لیے دشواری یا آسانی کا باعث ہوتی ہے ——

ہندستانی زبان

اور ادب کی سیوا ہر ہندستانی پر فرض ہے۔

گلاسگو ٹیکنیکل کالج میں پڑھنے والے ہندستانی طلبا

دو ہندستانی طلبا مسٹر کے ڈی دتا (آسام) اور مسٹر اے چیٹرجی (بنگال) نے اپنے ایک بیان میں گلاسگو کے رائل ٹیکنیکل کالج کی ان خدمات کو سراہا ہے جو وہ دنیا میں فنی تعلیم کی اشاعت سے متعلق سر انجام دے رہا ہے یہ دونوں طلبا گذشتہ نو مہینے سے اس ادارے میں میکینیکل انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مسٹر چیٹرجی نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ یہ ادارہ برطانیہ میں میکینیکل انجینیرنگ کی تعلیم دینے والا بہترین ادارہ خیال کیا جاتا ہے پڑھائی کا معیار بہت اونچا ہے۔

اس نے مزید کہا کہ ہم اپنے پہلے سال کی پڑھائی (تجھ ہو رہی) ختم کرنے والے ہیں اس کے بعد ہم فنی و عملی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیں گے۔ مسٹر دتا نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ ہمیں اس ادارے میں کل چار سال گذارنا پڑتے اور اس عرصے کے دوران ہمیں کیمسٹری فزکس۔ حساب۔ انجینیرنگ اور ڈرائینگ کی تعلیم دی جاتی ہے ہمارے تقریباً سب پروفیسر اسکاٹ لینڈ کے باشندے ہیں وہ نہایت قابل ہیں اور ہمارے ساتھ وہ بڑی اچھی طرح سے پیش آتے ہیں۔

ہماری جماعت میں ۴ یا ۵ اور دوسرے ہندستانی طلبا بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کالج میں کل ہندستانی طلبا کی تعداد ۶۱ ہے۔

یہ کالج ۱۷۹۶ء میں شروع کیا گیا تھا اس کی بنیاد جان اینڈرسن نے جو گلاسگو یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر تھے رکھی تھی۔ انھوں نے اپنی وصیت میں اپنی تمام جائیداد اس ادارے کے لیے وقف کر دی تھی۔

ہیمنگ وے

(۱۹۵۴ء کا نوبل انعام پانے والا امریکی ناول نویس)

یونیس

ہیمنگ وے امریکی ناول نگاروں میں ایک الگ ہی مرتبہ رکھتا ہے اکثر نقاد اس کی تصنیفوں پر شدید نکتہ چینی کرتے رہے ہیں۔ گو مداحوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ لیکن زیادہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ اس کو تین چھوٹے سے ناول کے لیے اسے ادب کا سب سے بڑا انعام ملے گا تاہم دوربین اور ادب شناس نگاہوں نے اس کے ناول "بوڑھا آدمی اور سمندر" کو بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھا تھا اور ۱۹۵۲ء میں امریکا کا بلیٹزر مل چکا تھا۔

ہیمنگ وے کے نکتہ چین برسوں سے یہی کہتے آئے ہیں کہ جیسا وہ شکل و صورت میں ہے ویسی ہی اس کی طرز نگارش بھی ہے۔ یعنی چوڑا چکلا بڑے کیے یا پیپے کی مانند سینا دل کا سخت اور کٹھور۔ وہ صرف جنگ اور بربریت کی کہانیاں لکھتا ہے جن کا اختتام شکست پر ہوتا ہے۔ اور جن میں کوئی بھی سحر آفرینی یا اثر انگیزی نہیں پائی جاتی۔

— پھر اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں ہیمنگ وے نے ایک نئے ڈھنگ اور جدید اسلوب کا ایک اور ناول لکھا۔ اگرچہ اس کی مخصوص طرز نگارش اس میں پائی جاتی تھی لیکن یہ کہانی نسبتہً چھوٹی تھی۔ اور زیادہ سکون اور غور و فکر سے لکھی گئی تھی۔

اس ناول میں ہیمنگ وے نے کیوبا کے ایک مچھیرے کی سادہ سی کہانی بیان کی ہے۔ جو تین دن تک ایک نوجوان اور عظیم اور جسیم مارلن مچھلی کے ساتھ کشمکش کرتا رہا۔ اس میں بھی ہیمنگ وے نے اپنے کھلاڑی پن۔ شجاعت باہمی مقابلے کی روح پھونک دی ہے۔ اس کا انجام بھی مختلف دکھایا گیا ہے۔ اور اسے امید اور کامرانی پر ختم کیا گیا ہے۔ جس طرح تاریک بادلوں کو چیر کا سورج یکایک نمودار ہو جائے ایسی چھوٹی سی تصنیف کے لیے ہیمنگ وے کو دنیا کے سب سے بڑے انعام سے نوازا جا رہا ہے یعنی اسے ۱۹۵۴ کے نوبل انعام کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔

ہیمنگ وے اس وقت ۵۶ برس کا ہے۔ اس ناول کی زبان اور طرز بیان نہایت موثر اور عالا ہے۔ ہیمنگ وے ابھی اوک پارک ای نادیں ۱۶ یا ۱۷ برس کی عمر کا فٹ بال کا کھلاڑی طالب علم ہی تھا کہ اس نے مضمون نگاری شروع کی تھی۔ یہ ۱۹۱۶ء کی بات ہے۔

کئی سال تک وہ اخبار کنساس سٹی اسٹار کے رپورٹر کے طور پر کام کرتا رہا۔ اور ۱۸ برس کی عمر میں اپنے ڈاکٹر باپ کی مرضی کے خلاف اٹلی میں ایمبولنس گاڑی چلانے کے لیے اپنے آپ کو رضاکار کے طور پر پیش کر دیا۔ یہ ایک عجیب افتاد طبیعت تھی کہاں اخبار کی رپورٹری اور کہاں ڈرائیوری — یہ پہلی عالمی جنگ کا زمانا تھا (جسے ہندستان میں عام طور پر پہلی جرمن جنگ کہا جاتا ہے)۔

اس جنگ میں ہیمنگ وے بہت شدید طور پر زخمی بھی ہوا۔ آخر جنگ کے خاتمے کے بعد اس نے ٹارنٹو اسٹار اخبارات کے لیے انسانی دلچسپی کی کہانیاں لکھنی شروع کیں۔ اور اس دوران میں ادبی اور علمی طرز نگارش کا خاصا شعور اور اہلیت و مہارت پیدا کر لی۔ اسے یہاں یہ تجربا بھی حاصل ہوا کہ اس کے مضامین نامنظور اور رد بھی کیے جا سکتے ہیں جس سے اسے اپنی طرز تحریر میں اصلاح کرنے میں مدد ملی۔

پیرس میں جب وہ اسٹار کے نامہ نگار کی حیثیت سے پیرس گیا تو اسے یہ یقین ہوتا گیا کہ وہ اخبار نویسی کے عوض علمی اور ادبی تصانیف کے زیادہ اہل ہے اور اس طرف اس کا طبعی میلان زیادہ ہے۔ چنانچہ انہی دنوں اس نے امریکا کے مشہور ناول نویس شروڈ اینڈرسن کو لکھا کہ "یہ اخبار نویسی تو مجھے رفتہ رفتہ تباہی کی طرف لے جا رہی ہے۔"

پیرس میں ہیمنگ وے کی ملاقات جرٹرو ڈ اسٹین اور ایزرا پاونڈ سے ہوئی۔ ان دونوں نے اس کی ادبی زندگی پر گہرا اور خوشگوار اثر ڈالا۔

چنانچہ مس اسٹین نے اسے صاف لفظوں میں ایک دفعہ کہا کہ "تمہاری تحریر میں بیانیہ کیفیت بہت زیادہ ہوتی ہے ساتھ ہی بے اسلوبی اور بعد ازیں بھی پایا جاتا ہے۔ تم ان سب چیزوں کو نئے سرے سے پوری توجہ اور انہماک سے لکھو۔"

ہیمنگ وے نے مس اسٹین کی اس نصیحت پر پوری طرح عمل کیا۔ اور پھر اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں اس نے دو کتابیں شایع کیں۔ ایک کا نام "تین کہانیاں اور دس نظمیں" تھا۔ اور دوسرے کا نام "ہمارے وقت میں" ان کتابوں کی اشاعت نے ہیمنگ وے کو تخلیقی قوت رکھنے والے مصنفوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔

ہیمنگ وے کے اکثر ناولوں میں تشنا و اصلیت پائی جاتی ہے کیونکہ یہ ناول مصنف نے اپنے تجربوں کی روشنی میں لکھے ہیں۔ مثلاً اس کا پہلا ناول "آفتاب بھی طلوع ہوتا ہے" — اس میں فرانس کی راجدھانی پیرس میں جو تجربے مصنف کو حاصل ہوئے ان کا عکس واثر پایا جاتا ہے۔

اسی طرح اس کے دوسرے ناول "اسلحا کو الوداع" میں متشددانا تجربوں اور مشاہدات کی عکاسی کی گئی ہے۔ جو اسے پہلی عالمی جنگ میں پیش آئے۔

چونکہ اس کی تصنیفات میں اس کا اپنا ذاتی تشخص بھی پایا جاتا ہے اس لیے ان کے ہیرو بھی ہیمنگ وے سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً "ہیو اینڈ ہیو ناٹ" ناول کا ہیرو مورگن "فار ہوم دی بیل ٹولس" کا ہیرو رابرٹ جارڈن۔ اکیراس دی رور اینڈ انٹو دی ٹریز" کا کرنل کینٹ وغیرہ ان سب میں ہیمنگ وے کا اپنا عکس پایا جاتا ہے اور یہ ہیرو جس طرح جان کو جوکھوں میں ڈالتے یا جرات مندی اور شجاعت دکھلاتے یا جسمانی طور پر خطرا ٹھاتے ہیں۔ یہ سب باتیں ہیمنگ وے میں بذات خود پائی جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب اس کا ناول "اکراس دی ریور اینڈ انٹو دی ٹریز" طبع ہوا تو نکتہ چینوں نے اسے ہیمنگ وے کی بدترین تصنیف قرار دیا۔ اور ان کا فتوا تھا کہ ۱۹۲۶ء کے بعد سے یہ تنزل کی طرف جا رہا ہے۔

لیکن جب اس نے "اولڈ مین اینڈ دی سی" "بوڑھا آدمی اور سمندر" ناول تصنیف کیا تو اسے ۱۹۵۲ء میں امریکا کا سب سے بڑا پلٹ زر انعام ملا۔

اور اب اسی تصنیف کے لیے اسے نوبل پرائز جیسا دنیا کا سب سے بڑا انعام دیا جا رہا ہے اس ادبی کارنامے نے اسے دنیا کے سب سے بڑے ناول نویسوں میں شامل کر دیا ہے۔

انسان اور حیوان، انسان اور قدرت و فطرت اور انسان اور انسان کے درمیان جو کشمکش پائی جاتی ہے اس ناول میں ہیمنگ وے اس سے بالاتر چلا گیا ہے۔

بیروت یونیورسٹی کے لیے برطانوی فرموں کا تحفہ

برطانیا کی بہت سی فرموں نے مل کر امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے شعبۂ انجینرنگ کو ۳۰۰۰۰ پونڈ کا انجینرنگ سامان تحفہ دیا ہے۔ اس یونیورسٹی میں تمام عرب ممالک کے طلبا فنی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ بہت سے سامان پہلے ہی سے وہاں پہنچ چکا ہے اور باقی عنقریب بھی جلد پہنچ جائے گا۔

ہندستانی موسیقی کی نشو ونما اور ارتقا

۱-۱

ہندستانی سنگیت کی شاندار روایات کا ڈانڈا زمانۂ قدیم سے ملتا ہے۔ سام وید ایک ایسی کتاب ہے جو غنائیت سے بھرپور ہے۔ موسیقی ہندستانی زندگی کے رگ و ریشے میں پیوست ہو چکی ہے۔ بچا جب رحم مادر میں ہوتا ہے تب ہی سے اس کے کان گیتوں سے آشنا ہو جاتے ہیں کیونکہ آسیب وغیرہ سے اسے محفوظ رکھنے کے خیال سے گیت گائے جاتے ہیں جوں جوں بچا بڑا ہوتا ہے زندگی کے مختلف مرحلوں پر موسیقی اس کے قدم بہ قدم چلتی ہے۔

جیسا کہ ویدوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ موسیقی مکتی کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ موسیقی میں نہ صرف مذہبی بلکہ غیر مذہبی سنگیت بھی شامل ہے۔ غیر مذہبی موسیقی کی جمالی کیفیت دیرپا قدروں کی حامل ہوتی ہے اور انسان کو اونچا اٹھانے میں ممد و معاون ہوتی ہے بنیھو ولن کے قول کے مطابق فنون لطیفہ کی ساری تخلیق کا سرچشمہ خدا ہے۔

کمار سوامی نے اپڑھ پن اور جہالت میں امتیاز کرنے پر زور دیا ہے۔ عوام کی بہت بڑی تعداد تو ان پڑھ ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ مندروں کے آس پاس بستے ہوں تو رامائن اور مہابھارت جیسی عظیم تصانیف سے روشناس ہو سکتے ہیں اور سنتوں۔ رشیوں اور سورماؤں کے بارے میں بہت سے گیت بھی انہیں یاد ہوں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ آج کے اپنے شہری کی بہ نسبت ان کا ثقافتی معیار اور سطح بلند ہو جو گھٹیا ادب سنسنی خیز فلموں اور اعصاب پر برا اثر ڈالنے والی موسیقی کا ... ہے۔

ہندستان کے ہر خطے نے بڑے بڑے موسیقی کار پیدا کیے ہیں۔ بنگال میں جے دیو اور گورنگ تھے تو یو۔پی میں کبیر اور سورداس۔ راجستھان نے میرا بائی کو پیدا کیا تو مہاراشٹر نے رام داس، ایکناتھ، تکارام اور نام دیو کو جنم دیا۔ دکنی بھارت کو تیاگ راج پر فخر ہے۔ سنگیت نے تمام سماجی رکاوٹوں کو پار کیا ہے۔ کبیر بنکر تھا۔ رام داس موچی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ دھنا ایک کسان کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ سادھنا ایک بوچڑ تھا تو سینا نائی۔ نام دیو خاندانی طور پر درزی تھا جبکہ میرا بائی ایک راجکماری تھی۔

سنگیت اصل میں گیت ناچ اور اظہار جذبات کے امتزاج کا نام ہے گیت اور ناچ کی نشو و نما دو الگ الگ شعبے کی حیثیت سے ہوئی ہے لیکن اظہار جذبات اب بھی موسیقی کی بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

ہندستانی موسیقی میں آٹھ سر کے برابر دے ہوتے ہیں حقیقت میں ہندستانی سرگم میں بارہ سے زیادہ ضمنی حصے ہوتے ہیں مختلف سروں کو ملا کر گمک پیدا کی جا سکتی ہے۔ سروں کو ملا جلا کر ۷۲ تان بن سکتے ہیں۔

تیرہویں صدی عیسوی تک ہندستان بھر میں سنگیت کا ایک ہی نظام رائج موسیقی پر سارنگ دیو نے سنسکرت میں سنگیت رتناکر نامی رسالہ لکھا ہے جسے شمالی اور ہندستان کے لوگ مستند مانتے ہیں۔ ہندستان میں مسلم اقتدار کے ظہور سے بیرونی ممالک کی موسیقی سے رابطہ پیدا ہوا۔ امیر خسرو نے اس سلسلے میں بڑا کام کیا ہے اس وقت سے اتری ہندستان کی موسیقی کی نشو و نما جدا طریقے پر ہوئی ہے۔ موجودہ دور کی دوسری ربع صدی میں مرحوم پنڈت ڈگمبر پلوسکر اور سورگیا

پنڈت وشنو نارائن بھات کھانڈے نے موسیقی کی روایتی صفائی اور پاکیزگی دوبارا حاصل کرنے کی جد و جہد کی۔

ہندستان میں کئی قسم کے آلات موسیقی کا رواج ہے، جن میں تار، سانس اور ضرب سب ہی قسم کے باجے شامل ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ سر بہار، سرود، بانسری شہنائی، طبلا، وینا، ستار، سارنگی اور رباب۔ ضرب کے آلات موسیقی کے بارے میں شاید ہندستان سب سے آگے ہے۔

کلاسیکل راگ راگنی کے علاوہ ہلکے پھلکے گانوں کا رواج بھی ہندستان میں رہا ہے۔ مسلم فرمانرواؤں نے اس کی بڑی حوصلا افزائی کی ہے۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں درت خیال ٹھمری، غزل اور قوالی وغیرا نے ترقی پائی ہے۔ دور جدید میں ایسے ہلکے پھلکے گیتوں کو رواج دینے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں جن میں ادب اور موسیقی دونوں خصوصیات پائی جائیں۔ مہاکوی ٹیگور نے اس سلسلے میں قابل قدر کام انجام دیا ہے۔ یہ تحریک ہندستان بھر میں زور پکڑتی جا رہی ہے۔

ہندستان عوامی سنگیت سے مالا مال ہے۔ شاید یہ چیز فنی موسیقی سے بھی قدیم ہے۔ ان دونوں شعبوں کو بھی ملانے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ چنانچے راگ سارنگ کی داغ بیل لوک سنگیت ہی پر پڑی ہے۔

دیہات میں اعلا تعلیم

حکومت ہندستان نے فورڈ فاونڈیشن کے اشتراک عمل سے ہندستان میں اعلا تعلیم کے میدان کا جایزا لینے کی غرض سے ماہرین کی ایک بین قومی کمیٹی قایم کی ہے۔ ہندستان کی ۸۰ فی صدی آبادی دیہات دیہات میں آباد ہے اس لیے دیہاتی تعلیم ملک کے لیے ایک بنیادی مسلا بن گیا ہے۔

آکسفورڈ میں بین قومی کانفرنس

حال ہی میں آکسفورڈ میں دنیا کے ۳۰ ممالک کے ۱۰۰ سائینس دانوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں اس ترقی کو زیر بحث لایا گیا۔ جو گذشتا تین سال کے دوران ایٹمی توانائی کو پر امن مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے سلسلے میں ہوئی ہے۔

اس قسم کی پہلی کانفرنس جولائی ۱۹۵۱ء میں بھی بمقام آکسفورڈ منعقد کی گئی تھی۔ اس میں پانچ سو ڈیلیگیٹوں نے شرکت کی تھی۔

ریڈیو ایکٹو آئسوٹوپس (شعاع زن ذرات) کا استعمال اب بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اور برطانیا یورپ۔ دولت مشترکا اور بعض دوسرے ممالک کو آئسوٹوپس برآمد کرنے میں ایک اہم پارٹ ادا کر رہا ہے اس قسم کا مال زیادا تر ہارویل کے ریسرچ ادارے سے سپلائی ہوتا ہے۔ لیکن ریڈیوکیمیکل مرکز واقع ایمرشیم میں کیمسٹوں کی اس جماعت کا کام جو آئسوٹوپس شامل کر کے کیمیاوی مرکب تیار کر رہی ہے۔ عالمگیر دلچسپی کا باعث بن گیا ہے۔ گذشتا چھ سال میں برطانیا نے ۴۲ مختلف ممالک کو آئسوٹوپس برآمد کیے ہیں۔

آکسفورڈ کانفرنس کا افتتاح ہارویل ایٹمی ریسرچ ادارے کے ڈائرکٹر سر جون کاک کرافٹ نے کیا تھا۔

حمزا حکیم نیازی

م - یعقوب بے

پچھلے اکتوبر ازبیک سویت ادب کے بانی، وسط ایشیا کے کلچر اور فنون لطیفا کی ایک ممتاز شخصیت حمزا حکیم نیازی کی پینسٹھ ویں سالگرہ منائی گئی۔

حمزا حکیم نیازی ۱۸۸۹ء میں ایک چھوٹے سے ازبیک قصبے کوکند میں ایک طبیب کے گھر پیدا ہوے۔ لڑکپن ہی میں انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ ۱۹۰۵ء کے پہلے روسی انقلاب کے زیر اثر وسط ایشیا کے محنت کش عوام جنتا کی لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے خلاف ابھر رہے تھے بعد میں اس ہونہار اور ذہین نوجوانوں کے نظریے پر یہی تاثرات حاوی رہے۔

حمزا حکیم نیازی ادبی تخلیقات کی راہ پر شروع سے محنت کش عوام کے شاعر بن کر آے۔ ان کی نظمیں اسلوب کے کے اعتبار سے ازبکستان کے ممتاز اور مشہور جمہوریت پسند ادیب مقیمی اور فرقت کی تخلیقات کی طرح سادا ہیں ان کی بہت سی نظموں کی دل کش اور مقبول دھنیں نکالی گئیں اور انہوں نے ہزاروں لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔

حمزا حکیم نیازی، علم کی دولت عام کرنے کے بہت بڑے حامی اور اس میدان عمل کے سرگرم کارکن بھی تھے۔ ۱۹۱۰ء ۱۹۱۱ء میں ان کی کوششوں سے کوکند اور مارغیلان میں اسکول کھل گئے۔ اسکول کے استاد کی حیثیت سے انہوں نے درسی کتابیں اور ادبی انتخابات مرتب کیے۔ اور بچوں کے لیے قصے کہانیاں لکھیں۔

اکتوبر انقلاب کے روز اول ہی سے حمزا حکیم نیازی نے جمہوریا کی عوامی سرگرمیوں میں حصا لینا شروع کر دیا تھا۔ شاعر کی تخلیقی توجہ عوام سے قریبی طور پر انتبا-

مقیں۔ سویت حکومت قایم ہونے کے بعد شروع کے زمانے میں ان کی کہی ہوئی انقلابی نظمیں ازبیک سویت ادب کے اولین نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حمزا نے ڈرامے لکھے اور تھیٹر کی تنظیم میں بھی سرگرم عمل حصا لیا۔ انہوں نے نوجوانوں پر مشتمل ایک تہذیبی جتھا منظم کیا۔ جس نے ازبکستان کے شہروں اور گاؤں کا دورا کیا۔ یہ جتھا وسط ایشیا کی تاریخ میں پہلی بار آرٹ اور کلچر کی دولت لے کر عوام الناس کے پاس پہنچا۔

اپنی مختصر زندگی میں انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ ان کی نظموں کا ایک ضخیم مجموعا ہے جو ازبیک قوم کی زندگی کے اہم ترین واقعات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کے علاوا انہوں نے بہت سے ڈرامے بھی لکھے جن میں ان کا مشہور ڈراما "بے اور مزدور" اور "طربیا" "بیارا کے شعبدے" بھی شامل ہیں۔

حمزا حکیم نیازی کی شاعری انقلابی سوز میں رچی ہوئی ہے ان کی نظموں نے عوام کو مجتمع کیا اور ان کے دل میں ایک نئی زندگی کی تعمیر کی کامیابی کا یقین پیدا کیا۔ اپنی تخلیقات میں حمزا نے بحسن وکمال معمولی اور سادا ازبیک محنت کشوں کی عکاسی کی ہے جنہوں نے ظلم واستبداد سے چھٹکارا پانے کے بعد اپنی زندگی کی خود ہی تعمیر شروع کر دی تھی۔ بالکل ازبیک شاعر کا ہیرو ایک نیا انسان ہے جو اپنی قسمت اور اپنی مسرت کا مالک آپ ہو گیا ہے۔

شاعر کی تخلیقات میں ازبیک عورت پیکر کو نمایاں مقام حاصل ہے حمزا کی بہت سی تخلیقات اسی سے معنون ہیں جو صدیوں کی مظلومیت اور جہالت کی تاریکی سے نجات حاصل کر چکی ہے۔

حمزا ایک ممتاز شاعر ہیں اور انہیں فن شعر گوئی پر کمال حاصل ہے ان کی شاعری عوام کے خیالات اور ان کی آرزوؤں

اور تمناؤں کی عکاسی کرتی ہے۔

شاعر کی تخلیقات کے مواد میں نظریاتی گمبھیرتا، سویت حقیقت کی ندرتوں کو ایسے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی کہ عوام بخوبی سمجھ سکیں۔ ان کی تخلیقات میں سویت عہد کے سب سے زیادہ باکمال شاعر مایاکوسکی کی تخلیقات سے مشابہت پیدا کر دیتی ہے ازبیک کلاسیکی ادب کی ترقی پسند روایات کی تقلید کرتے ہوئے اور انہیں تعمیری انداز میں اپنی تخلیقات میں رچا لے کے ساتھ ساتھ حمزا نے اپنی شاعری میں نئے نئے تجربے کیے۔ نئی نئی راہیں نکالیں اور ازبیک سویت شاعری کا سنگ بنیاد رکھا۔

یہ باکمال شاعر پہلا ازبیک نغمہ نگار بھی تھا۔ انہوں نے اپنے پر اثر گیت لکھے ہیں جو فوراً عوام میں مشہور و مقبول ہو گئے۔

اپنی تصانیف کے لیے بڑی محنت سے نتیجا خیز کام کرنے کے ساتھ ساتھ حمزا حکیم نیازی اپنی جمہوریا کی عوامی سرگرمیوں میں بھی عملی حصہ لیتے تھے۔ وہ مختلف سائنسی اور تعلیمی موضوعات پر تقریریں کرتے اور لوگوں میں ان پڑھ پن دور کرنے کے لیے تعلیمی لفایوں کی تنظیم کیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں جمہوریا کے گاؤں کا دورا کرتے ہوئے حکیم حمزا نیازی کو عوام کے دشمن ارجعت پسندوں نے ہلاک کر دیا!

عوام نے اپنے سپوت کی یادگاریں بڑے احترام سے قایم کی ہیں۔ ازبیکستان کا ریاستی اکادیمک تھیٹر، اسکول، کتب خانے، صحت گاہیں، پنچایتی فارم اور نئی شاہراہیں حمزا کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کی تصانیف سویت یونین کی بہت قوموں کی زبانوں میں شایع ہو چکی ہیں۔

ہندستانی ادب
کے خریدار بن کر ہمیں علم و ادب کی سیوا کا موقع دیجیے

ہندستانی ممتاز ادیب اور سویت یونین

ہندستانی ادیب پریم چند (منشی دھنپت رائے) نے ۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء کو انتقال کیا۔ پریم چند ایک نامور عالم، پرجوش انسان دوست اور قابل منتظم تھے انہوں نے اپنا پورا فن اور اپنی تمام تر سرگرمیاں ہندستان کے فن کاروں کو حقیقت پسندی کی راہ پر لے جانے کے لیے وقف کر دی تھیں۔

سویت یونین میں پریم چند کا ان کی حب الوطنی اپنے وطن سامراجی اقتدار سے نجات دلانے کی شاندار جد و جہد کی کامیابی کے لیے اپنی بہترین کوشش کرنے کی وجہ سے بڑا ہی احترام کیا جاتا ہے۔

پریم چند سویت عوام کو اس لیے عزیز ہیں کہ انہوں نے ہندستان کے معمولی الشان لوگ — کسان، دفتر کے چھوٹے موٹے بابو، دانشور — کی حقیقت افروز تصویریں پیش کی ہیں۔

پریم چند کو سویت یونین میں اس لیے بھی بڑا پسند کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کے سماج کی زندگی، نظریات اور رسم و رواج میں جاگیردارانہ نظام کے بچے کھچے اثرات بلے دھڑک ہو کر بے نقاب کیے۔

ہندستان کے اس عظیم مرتبت ادیب کو روسی کلچر سے بڑی ہی دلچسپی تھی۔ ہندستان کے قارئین کو لیو طالسطائی سے روشناس کرانے کے لیے پریم چند نے ان کے افسانے ترجمہ کیے۔

سویت یونین میں پریم چند کی تصانیف کئی زبانوں میں شایع ہو چکی ہیں۔ مثلاً ان کے بعض افسانے اور ان کی تصانیف کے متعلق اکادیمیشین اے۔ پ۔ برانی کوف کا ایک مضمون سنہ ۱۹۲۶ء ہی میں یوکرینی زبان کے ایک رسالے "چیروونی شلیاخ" میں شایع ہو چکے تھے۔ ازبیکستانی اور ترکستانی، ترکمانی اور تاجکستانی قارئین پریم چند اور ان کی تصانیف سے بخوبی واقف ہیں۔

سویت یونین میں جدید ہندستانی زبانوں کا مطالعا

و۔ ا۔ کوچرگینا ام۔ ایس سی (لسانیات)

روس میں جدید ہندستانی زبانوں کے مطالعے کی ابتدا اکتوبر اشترا کی انقلاب عظیم کے بعد ہوئی اس آغاز کا تعلق اکادمیشین ا۔ پ براننکوف کی تعلیمی اور سائینسی سرگرمیوں سے تھا۔

ا۔ پ برانی کوف نے ہندستانی کی پہلی روسی درسی کتاب ایک لغت اور ایک مجموعہ مضامین "جدید ہندستانی نثر کی مثالیں" مرتب کی انھوں نے للو لال جی کی تصنیف "پریم ساگر" اور تلسی داس کی "راماین" کا روسی زبان میں ترجما کرکے سویت عوام کو ہندستانی ادب کی نمایاں تصانیف سے متعارف کیا۔ نئی ہندستانی زبانوں کے متعلق مسلوں پر ا۔ پ برانی کوف نے کئی مضامین لکھے "ہندستانی میں لفظی تکرار" "ہندستانی میں مرکب فعل اور روسی زبانوں میں ان کے مرادف" "قدیم لسانیاتی حقایق سمجھنے کے لیے مستعارات کی اہمیت" وغیرا سویت علم ہندستان کے فرایض معین کرنے کی غرض سے بھی انھوں نے کئی مضامین سپرد قلم کیے۔

جدید ہندستانی زبانوں کا مطالعا سویت ماہرین علم لسانیات کے لیے سائینسی اعتبار سے بہت ہی اہم ہے۔ عملی طور پر بھی یہ بہت ہی کارآمد ہے کیونکے سویت عوام ہندستان کی قوموں کی زندگی کے متعلق اور بھی زیادا معلومات حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں اور ہندستان کے ادب سے ان کی دلچسپی دن بہ دن بڑھ رہی ہے جو مختلف تاریخی زمانوں سے متعلق تہذیبی یادگاروں سے مالا مال ہے۔

سویت یونین کی سائینس اکادمی کے علمی ادارہ مطالعہ مشرقیات میں اور ماسکو ریاستی یونیورسٹی کے تاریخ اقتصادیات اور لسانیات کے شعبوں میں اور سویت یونین کی دوسری یونیورسیٹیوں میں ہندستانی کا بنگالی، مراٹھی، پنجابی، تامل تلگو اور دوسری جدید ہندستانی زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔

مثلاً لینن گراڈ ریاستی یونیورسٹی کے شعبے مشرقیات کے ہندستانی شعبے میں ہندستانی کی تعلیم کا طریقا ہے۔ سال اول سے لے کر سال پنجم تک ہندستانی پڑھائی جاتی ہے۔ سال اول میں اور سال دوم کے شروع میں ا۔ پ برانی کوف کی درسی کتاب کام میں لائی جاتی ہے۔ سال دوم کے آخری حصے میں اور سال سوم میں طلبا زیادا تر زبانی ادب کا مطالعا کرتے ہیں۔ بڑی جماعتوں کے طلبا ہندستان کے کلاسکی اور جدید ادیبوں کی کتابیں پڑھتے ہیں۔

ہندستان کی عام زبان ہندستانی میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیش نظر سویت یونین کی سائینس اکادمی کے علمی ادارے مطالعہ مشرقیات نے ہندستان کی ایک نئی درسی کتاب مختصر مستقبل میں مرتب کر لینے کا ذمالیا ہے۔ سویت سائینسداں دوسری ہندستانی زبانوں کی درسی کتابیں بھی مرتب کر رہے ہیں۔ جدید ہندستانی زبانوں کے مطالعے کے لیے لغات کی بڑی اہمیت ہے پچھلے دنوں شایع ہونے والی لغات کی ادارت کے فرایض ا۔ پ برانی کوف نے انجام دیے۔ ہندستانی روسی لغت (۱۹۵۱ء) جو سویت ماہرین علم ہند و۔ م بیسکرووَنی اور و۔ ا۔ کراسنو دیم سکی نے مرتب کی اور ہندی روسی لغت (۱۹۵۳ء) مرتبہ و۔ م بیسکرووَنی جدید ہندستانی زبانوں کی دوسری لغات دیگر فرہنگ نویس مرتب کر رہے ہیں۔

سوویت یونیورسٹیوں میں زبان کے نصاب میں نظریاتی لیکچر شامل ہوتے ہیں۔ جو جدید ہندستانی زبانوں کی تشکیل کے عمل کے متعلق مکمل اور مربوط تصور پیش کرتے ہیں اور طلبا کو ہندستانی ادب اور آرٹ سے روشناس کراتے ہیں۔

ہندستانی ادب اور آرٹ کے مسایل پر سوویت سائنسدانوں نے کئی ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں سے بعض رابندر ناتھ ٹیگور، پریم چند اور دوسرے ہندستانی ادیبوں کی تخلیقات کے متعلق ہیں۔

کالج کے بہت سے بی۔ ایس سی اور ام۔ ایس سی کے طلبا جدید ہندستانی زبانوں پر علمی تحقیق کر رہے ہیں۔ طلبا کے بعض سالانا اور امتحانی مقالوں میں ہندستانی لسانیات کے مسلوں پر بحث کی جاتی ہے مشہور سوویت سائنسداں جدید ہندستانی زبانوں سے متعلق مسلوں پر تحقیق کر رہے ہیں۔

ام۔ ایس سی کے امتحانوں میں طلبا نے جو مقالے پیش کیے ان میں ہندستانی زبانوں کے قواعد صرف و نحو سے متعلق مسلوں کی تحقیق و جستجو کی گئی ہے۔ ا۔ س کولوبوف نے "جدید بنگالی میں فعل" پر مقالا لکھا۔ ل۔ گ لوزوودی نے "ہندستانی زبان میں جملہ شرطیہ" ل۔ م پو میرانتسیف نے "جدید ادبی ہندستانی میں جز لاحقا کا نحوی استعمال" پر اور ل۔ م چیوکینا نے "جدید ادبی بنگالی میں جز لاحقا کے جوڑ"۔

ہندستان میں بسنے والی قوموں کی زندگی اور رسم و رواج سے دلچسپی محض سوویت لسانیات دانوں ہی کو نہیں بلکے تاریخ دانوں، اقتصادیات کے ماہروں اور فنون لطیفا کے عالموں کو بھی ہے۔ ہندستان اور سوویت یونین کے درمیان روز افزوں تہذیبی تعلقات کی بدولت اس دلچسپی میں نمایاں اضافا ہو گیا ہے۔ سوویت سائنسدانوں کو بڑی دلچسپی اس بات سے ہے کہ ان کے ہندستانی ساتھیوں نے جدید ہندستانی زبانوں میں علمی تحقیق کے کون کون سے کارنامے انجام دیے۔ پانینی اور ان کے شاگردوں کے زمانے سے مشہور ہے کہ ہندستان والے باکمال لسانیات داں ہیں۔ اور وہ اپنے ہاں کے لسانیاتی خزانوں کے متعلق بڑی جستجو اور تحقیق کرتے ہیں۔ اور انہیں جمع کر کے محفوظ رکھتے ہیں۔ لسانیات کے متعلق ہندستانی ماہرین کی تازا ترین تصانیف بلاشبہ سوویت یونین میں جدید ہندستانی زبانوں کے مطالعے اور خصوصاً ان کی صوتی خصوصیات کے مطالعے کا شوق پیدا کریں گی۔

سوویت عوام اور خصوصاً سوویت سائنسدانوں کے دلوں میں ہندستان کے لوگوں سے محبت اور دوستی کا جو جذبا موجود ہے اس کی بدولت سوویت یونین میں جدید ہندستانی زبانوں کے مطالعے کی روایات کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ دوستی مستحکم بنیادوں پر سوویت یونین اور ہندستان کے لوگوں کی خواہش امن پر۔ قایم ہے۔

برطانوی نظام تعلیم کا مطالعا

ایک اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ ان دنوں ۱۶ ممالک کے بیس طلبا کی ایک جماعت برطانوی اسکولوں کا معاینا کر رہی ہے اور برطانوی نظام تعلیم کے متعلق واقفیت حاصل کر رہی ہے۔ برطانیا کے ممتاز ماہرین تعلیم بھی لیکچروں کے ذریعے سمندر پار کے ان طلبا کو برطانوی تعلیمی سسٹم کے متعلق واقفیت بہم پہنچا رہے ہیں طلبا کی اس جماعت میں لدھیانا کی مس کے گپتا اور مدراس کے مسٹر ایس۔ ام لکشمن بھی شامل ہیں مس گپتا انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اور مسٹر لکشمن امپیریل کالج آف سائنس تعلیم حاصل کرنے برطانیا آئے ہوئے ہیں۔

چین کی پہلی مردم شماری

ج ۔ ا

اعداد شمار کے سرکاری بیورو نے یکم نومبر ۱۹۵۴ء کو ایک سرکاری اطلاع نامے میں چین میں پہلی مرتبہ ملکی پیمانے پر کی گئی مردم شماری کی تفصیلات شائع کی ہیں۔

۳۰ جون ۱۹۵۳ء کو رات کے بارہ بجے تک چین کی کل آبادی ۶۰۱،۹۳۸،۰۳۵ تھی۔ اس میزان میں سے ۵۷۴،۲۰۵،۹۴۰ کی گنتی براہ راست مردم شماری سے حاصل کی گئی۔ اور ۲۷،۷۳۳،۰۹۵ کی بقیہ گنتی بلواسطہ مردم شماری کے ذریعے۔ اس میں صوبہ تائیوان کی ۷،۵۹۱،۲۹۸ کی گنتی جسے ابھی آزاد کرایا جانا ہے۔ اور ۱۱،۷۴۳،۳۲۰ ان چینیوں کی گنتی جو بدیس میں رہتے ہیں یا پڑھتے ہیں اور دور افتادہ سرحدی علاقوں کی ۸،۳۹۷،۴۷۷ کی گنتی بھی شامل ہے جہاں مقامی چناؤ ابھی منعقد نہیں ہوئے یا جہاں آمد و رفت کی آسانیاں خاص طور سے خراب حالت میں تھیں۔ براہ راست شمار کی گئی میزان میں ۵۱،۸۲ فی صدی مرد تھے۔ اور ۴۸،۱۸ فی صدی عورتیں۔

اسی میزان میں ۳۳۸،۰۰۰،۰۰۰ سے زاید اشخاص ۱۸ برس یا اس سے زاید کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ چین میں مردم شماری کے وقت سب سے معمر شخص ۱۵۵ برس کا تھا۔ چین میں ۳،۳۸۴ اشخاص سو برس کے ہیں اور ۱۸،۵ لاک سے زاید اشخاص کی عمر ۸۰ سے ۹۹ برس کے درمیان ہے۔

ہاں قومیت کل آبادی کا لگ بھگ ۹۴ فی صدی ہے۔ اس میں صوبہ تائیوان کے لوگ اور بدیسوں میں رہتے یا پڑھنے والے چینی شامل نہیں۔ قومی اقلیتوں کی آبادی ۳۵،۰۰۰ سے زاید ہے یا پھر کل آبادی کا ۶،۰۶ فی صدی ہے۔

ہان قومیت کے علاوہ چین میں دس اور قومیتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کی آبادی دس لاک سے زاید ہے مثلاً منگولیائی، ہوئی، تبتی، اوئی غر، میاو، یی، چوانگ، پیوئی، کوریائی اور مانچو قومیتیں۔

صوبہ زے چوآن جس میں ۶۲،۰۰۰،۰۰۰ سے زاید لوگ رہتے ہیں ایک ایسا صوبہ ہے جس کی آبادی سب سے زیادہ ہے اور چنگھائی صوبہ جو رقبے کے اعتبار سے دگنا سے بھی زاید ہے اس کی آبادی ۱۶ لاک ۷۰ ہزار ہے جو سب سے کم ہے۔

سرکاری اطلاع نامے میں اس بات کا انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ ۲۵ لاک سے زاید اشخاص نے مردم شماری کے کام میں امداد دی اور مردم شماری کی درستی کو جانچنے کے لیے مختلف علاقوں میں نمونے کی ایک محتاط از سر نو پڑتال کی گئی جن کی کل آبادی لگ بھگ ۵۳،۰۰۰،۰۰۰ تھی۔ اس بات کے نتیجے نے ظاہر کیا ہے کہ جن آدمیوں کا نام دو مرتبہ درج ہوا وہ ۱۳۹ء فی صدی ہیں اور جن کا نام درج ہونے سے رہ گیا وہ ۲۵۵ء فی صدی ہیں۔

مختلف قومیتوں کی آبادی درج ذیل ہے: ہان قومیت ۵۴۷،۲۸۳،۰۵۷ و منگولیائی قومیت ۱،۴۶۲،۹۵۶، ہوئی قومیت ۳،۵۵۹،۳۵۰، تبتی قومیت ۲،۷۷۵،۶۲۲، اوئی غر ۳،۶۴۰،۱۲۵، میاو قومیت ۲،۵۱۱،۳۳۹، یی قومیت ۳،۲۵۴،۲۶۹، چوانگ قومیت ۶،۶۱۱،۴۵۵، پیوئی قومیت ۱،۲۴۷،۸۸۳، کوریائی قومیت ۱،۱۲۰،۴۰۵، مانچو قومیت ۲،۴۱۸،۹۳۱، دوسری قومیتیں ۶،۷۱۸،۰۲۵۔

سبزیوں کی اہمیت

ڈاکٹر ایس ایس اوپوال

موجودہ زمانے کی انسانی خوراک میں سبزیوں کی شمولیت ازبس ضروری ہے کیونکہ ساگ پات حیاتین معدنی عناصر نمک اور خام ریشے مہیا کرنے کی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ عمدہ اور اچھی طرح پکائی ہوئی سبزیاں خوراک کے ذائقہ رنگ اور خوشبو میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ اور کھانے کی رغبت بڑھاتی ہیں۔ جسم انسانی کے لیے ضروری تیزابی مادے کی موجودگی کی وجہ سے سبزیاں نہ صرف بہت لذیذ ہوتی ہیں بلکہ وہ جسم کے اندرونی عمل میں بھی مساوی بنتی ہیں۔

حیاتین

انسانی جسم کی نشو و نما صحت اور افعال کے لیے حیاتین بہت ضروری ہیں۔ حیاتین الف سردی زکام انفلوئنزا امراض سوزش چشم اور شب کوری یا نیم بینائی اور دیگر بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ گاجر، پالک، شلغم، کرم کلا، لوبیا، کوتمیر، چولائی، ٹماٹر، کاہو اور شکر قندی جسم کو حیاتین الف مہیا کرتی ہیں۔ آدھ پاؤ سبز پتوں والی سبزیاں کھانے سے ایک بالغ انسان کے لیے درکار حیاتین الف جسم کو بآسانی حاصل ہو جاتے ہیں۔

حیاتین ب لوگوں کی صحت مندی افعال ہاضمے کی درستگی اور استسقا قسم کی بیماریوں سے بچاؤ کے لیے بے حد مفید ہوتے ہیں۔ یہ حیاتین سبزیوں میں کم مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن سیم اور لوبیا کی پھلیوں، شکر قندی، سبز مٹر خشک اور ہرے پیاز کرم کلا اور ٹماٹر میں یہ حیاتین کافی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ اور سالم دالوں اور گری دار اشیا خاص کر مونگ پھلی میں یہ حیاتین سب سے زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

حیاتین ج ف: خون اور خارش کی بیماریوں سے بچاتے ہیں۔ خون اور خون کی نالیوں نیز جوڑوں کو درست حالت میں رکھتے ہیں یہ حیاتین پالک کرم، کرم کلا آبی سلاد ٹماٹر اور پھول گوبی میں بکثرت ملتے ہیں۔ آملا میں حیاتین ج بہت زیادہ موجود ہوتے ہیں۔ ایک آملا میں اتنے حیاتین ج ہوتے ہیں جتنے دو سنگتروں میں ہو سکتے ہیں۔

معدنی عناصر

ہڈیوں اور دانتوں کی ساخت میں خون اور جسمانی مادے کی بناوٹ اور جسم کے نظام کے افعال میں معدنی عناصر اور نمک استعمال ہوتے ہیں۔ پھلوں اور سبزیوں میں معدنی عناصر اور نمک بہتات سے موجود ہوتے ہیں۔ چولائی، میتھی اور پالک وغیرہ کے ساگ، اور پتے دار سبزیوں میں کلسیم بکثرت ہوتا ہے۔ گاجر، پیاز، ٹماٹر اور کدو میں لوہا شامل ہوتا ہے۔ آیوڈین بھی جسم کے لیے ضروری ہے اور یہ پیاز آبی سلاد، بھنڈی، توری، گول کدو اور اسپاراگس وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ پودوں کے خام ریشے غذائیت کے لحاظ سے تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ لیکن معدے کو صاف رکھنے اور متعدد بیماریوں کی جڑ یعنی قبض کو دور کرنے میں بہت مددگار ہوتے ہیں۔

کاربوہائیڈریٹ و پروٹین

آلو شکر قند۔ اروی، نینوکا، لچا لو، رتالو اور کٹ ہاتی چوک وغیرہ سبزیوں سے کم خرچ پر کافی مقدار میں

کاربوہائیڈریٹ حاصل ہوتے ہیں۔ نیز مولی شلغم اور گاجر وغیرا جڑ دار سبزیوں میں بھی پلے جاتے ہیں۔ مٹر سیم اور لوبیا کی پھلیاں پروٹین سے بھرپور ہوتی ہیں۔

سبزیوں کی اقتصادی اہمیت

سب لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ دیگر ہر قسم کی کاشتکاری کے مقابلے میں سبزیوں کی کاشت کرنے سے فی ایکڑ آمدنی بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ ایک ہی قطعہ اراضی سے سال میں دو تین فصلیں حاصل کر لی جاتی ہیں۔ صحت کو برقرار رکھنے کے لیے عام طور پر دس اونس فی کس کے حساب سے جڑوں والی پتے دار اور بغیر پتوں کے سبزیاں درکار ہوتی ہیں یعنی ہر ایک بالغ کی روزانہ خوراک میں ۲۰ فی صدی سبزیاں ہونی چاہئیں۔ ہمارے ملک کی حقیقی پیداوار اس کی ضرورت کے نصف کے برابر بھی نہیں۔ امریکا جیسے ملکوں میں سبزیوں کی روزانہ کھپت پندرہ اونس فی کس ہے یعنی روزمرہ خوراک میں تیس فی صدی سبزیاں ہوتی ہیں اس میں مزید پچیس تیس فی صدی اضافہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہندستان میں سبزیوں کی پیداوار کو کم سے کم سو فیصدی تک بڑھانا نہایت ضروری ہے تاکہ لوگوں کو صحت مند بنانے کے لیے زیادہ سبزیاں میسر آسکیں۔ سنہ ۱۹۴۸-۴۹ میں ہندستان کی زرعی تحقیقی کونسل نے سارے ملک میں آلو کی قسم کی اہم سبزیوں کے متعلق کھوج کرنے کی اسکیمیں بنائی تھیں۔ اور اس بارے میں کافی حد تک مفید کام سرانجام دیا جا چکا ہے۔ پنجاب میں اروی اور شکر قندی کی نئی قسمیں پیدا کی گئی ہیں۔ اور ان کے بارے میں کافی کھوج بھی کی گئی ہے جس کے اہم نتائج حسب ذیل ہیں۔

اروی

عمدہ اور بہت زیادہ پیداوار دینے والی ایس ۱۱۔ ڈوم قسم کی اروی پیدا کی گئی ہے۔ اس کی پیداوار چار سو پینسٹھ من فی ایکڑ تک ہو جاتی ہے اس کو آخر فروری سے وسط مارچ تک کے دنوں میں ایسے نرم کھیت میں جس میں ۲۰ ٹن فی ایکڑ کے حساب سے دیہاتی کھاد ڈالا گیا ہو بونا چاہیے۔ سوا فٹ چوڑی قطاروں میں ایک ایک فٹ کے فاصلے پر پودے بوے جائیں۔ اس کھیت میں تونبا کدو یا لمبے کدو یا لمبے خربوزے کی بیلیں لگا دینے سے پیداوار زیادہ اچھی حاصل ہوتی ہے اروی کی گانٹھیں نالیوں کے بیچ میں بوئی جانی چاہئیں۔ اور کدو یا خربوزے کے بیج اس کے کناروں پر بوے جائیں وسط اپریل میں تین من فی ایکڑ کے حساب سے امونیا سلفیٹ ڈالا جائے اور جب بارشیں شروع ہوں تب پھر آدھا من امونیا سلفیٹ ڈالا جائے۔ اس وقت خربوزا اور کدو کی بیلوں کو نکال دیا جائے اور اروی کے پودوں پر مٹی چڑھا دی جائے گرم اور خشک موسم میں ہر چوتھے روز اور بارش کے دنوں حسب ضرورت پانی دیا جائے۔

شکر قند

وی ٹی ۲ قسم کی شکر قند نہایت اعلا ہوتی ہے اور ۲۸۰ من فی ایکڑ تک پیداوار دیتی ہے۔ مارچ کے آخر میں اس کو ایک فٹ چوڑی نالیوں میں فٹ فٹ کے فاصلے پر بویا جائے اور فوراً ہی تھوڑا سا پانی دیدیا جائے جب پودے بڑھنے لگ جائیں تو فی ایکڑ تین من امونیم سلفیٹ اور دو من پوٹاشیم کا مرکب ڈالا جائے۔ جہاں بارشیں کافی ہوتی ہوں وہاں اسکو پانی دینے کی ضرورت نہیں ہے خشک مقامات پر ایک یا دو بار پانی دینا کافی ہوگا۔

اروی اور شکر قند کی ان بڑھیا قسموں کے بیج اکانمک بوٹانسٹ (ویجی ٹیبلز) پنجاب، لدھیانہ دستیاب ہو سکتے ہیں

اگر آپ کی
مدت خریداری ختم ہو گئی ہے تو کرپا کرکے چندا منی آرڈر کر دیجیے وی۔ پی کی شکل میں خرچ زیادہ بیٹھے گا۔

برطانیا میں طبی تحقیقی کام

ب۔ ا

برطانیا میں طبی ریسرچ کی پہلی ذمے داری تقریباً چالیس سال سے حکومت پر ہے وہ میڈیکل ریسرچ کونسل کو براہ راست گرانٹ دیتی ہے۔ یونیورسیٹیوں کو بھی یونیورسٹی گرانٹس کمیٹی کے ذریعے مالی امداد دی جاتی ہے۔

حکومت کے علاوہ پرائیویٹ ادارے بھی طبی ریسرچ سے دل چسپی لیتے ہیں اور اس مقصد کے لیے بڑی بڑی رقمیں صرف کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر نفلیڈ فاونڈیشن نام کا ادارا طبی تحقیقات سے گہری دل چسپی لیتا ہے دوا سازی کے ممتاز کارخانے دار بھی ہر سال اپنی تجربا گاہوں میں ریسرچ پر کافی خرچ کرتے ہیں۔ میڈیکل ریسرچ کونسل اور دوسرے ریسرچ اداروں کے درمیان گہرا تعاون پایا جاتا ہے۔

میڈیکل ریسرچ کونسل میڈیکل ریسرچ کمیٹی کی جو ۱۹۱۳ء میں نیشنل ہیلتھ انشورنس ایکٹ بابتہ سنہ ۱۹۱۱ء کے تحت قایم کی گئی تھی۔ جانشین ہے یہ ادارا اپنے موجودا نام سے سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک شاہی فرمان کے ماتحت قایم کیا گیا تھا۔

میڈیکل ریسرچ کونسل تین طریقوں سے اپنے فرایض سرانجام دیتی ہے اول یہ کہ اس نے اپنا سائنٹفک و فنی اسٹاف رکھا ہے یہ عملا ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۵۰ طبی ماہرین اور ۳۰۰ سائینس داں شامل ہیں۔ دوسرے وہ یونیورسٹیوں، ہسپتالوں وغیرا کو تحقیق کے لیے گرانٹ دیتی ہے۔ تیسرے یہ کہ ہونہار نوجوانوں کو وظیفے دیتی ہے تاکہ وہ موزوں نگرانی میں میڈیکل ریسرچ کے طریقوں کے متعلق تربیت حاصل کر سکیں۔

میڈیکل ریسرچ کونسل کا اپنا سب سے بڑا ادارا نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ریسرچ ہے اس کے دوسرے بڑے بڑے ریسرچ اداروں کی تعداد تقریباً پچاس ہے اور وہ برطانیا بھر میں پھیلے ہوے ہیں۔

ریسرچ کی بہت سی اسکیمیں دوسری جنگ عظیم کے دوران رک گئی تھیں۔ اور جب جنگ بند ہوئی تو نئے سرے سے ریسرچ کو منظم کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ اب تقریباً ۵۔۶ سال کے بعد ضروری طبی مسایل کی جانب توجہ دینا ممکن ہو گیا ہے۔ جنگ کی وجہ سے طبی ریسرچ کے کام میں رکاوٹ پڑ گئی تھی لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ اتحادی فوجوں کی طبی ضروریات کے پیش نظر ہی جنگ کے شروع میں بمقام آکسفورڈ پنسیلین ایجاد کی گئی تھی۔ کونسل کے مختلف مراکز میں اس وقت زکام (پولیو۔ فالج اطفال) سرطان اور کالی کھانسی کے متعلق ریسرچ جاری ہے۔

برطانیا گذشتہ پچاس سال سے گرم ممالک کی بیماریوں کے متعلق ریسرچ کر رہا ہے اور ان کے علاج ڈھونڈ رہا ہے۔ لندن اسکول آف ہائی جین اینڈ ٹراپیکل میڈیسن میں دنیا بھر کے متعدد طلبا گرم ممالک کی بیماریوں کے متعلق تعلیم اور تربیت حاصل کرتے ہیں۔

ہندستانی ادب

کے لیے زیادا سے زیادا خریدار فراہم کرکے آپ اپنی زبان دوستی کا ثبوت دیجیے

تبصرے

غبار کارواں

از محشر عابدی۔ ۱/۱۶ کراون۔ ۹۶ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی مناسب۔ ٹائیٹل بہتر۔ قیمت ایک روپیا۔ ملنے کا پتا۔ نشاط افزا ملے پلی حیدرآباد دکن

ڈاکٹر محمد محسن ام۔ ایس سی، پی ایچ۔ ڈی پروفیسر حیاتیات عثمانیہ یونیورسٹی، ادبی حلقوں میں محشر عابدی کے قلمی نام سے مشہور ہیں محشر عابدی اگرچہ سائنس کے متعلم رہے ہیں لیکن انہیں ادبیات سے بھی خاصی دل چسپی اور لگاو رہا ہے۔ اب تک ان کے افسانوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں اس کے علاوہ ایک ڈراما اور سائنس پر بھی ایک کتاب نکل چکی ہے۔

محشر نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ پرگو شاعر بھی ہیں، جس کا ثبوت ان کی زیر تبصرہ کتاب سے ملتا ہے اس منظوم مجموعے کی تو یادہ تر نظمیں شاعر کے "مشاہدے، احساسات اور جذبات" کی آئینہ دار ہیں۔ بعض غزلیں اور اکثر نظمیں معرکے کی ہیں۔ جن میں کویل زلیخا، زیب النسا، نور جہاں، دوشیزۂ صحرا، گل فروش، رقاصہ، قلعہ گولکنڈہ، عورت اور دلہن سے خطاب، خاص طور پر داد سخن پانے کی مستحق ہیں۔

"رقاصہ" عنوان شاعر نے نہ معلوم کس "موڈ" میں رکھ دیا ہوگا اور تعارف کرانے والے صاحب نے پتا نہیں کس "دھن" میں بلا سوچے سمجھے یہ کہہ مارا کہ "نظم "رقاصہ" میں ... مصرعے ناچتے ہوئے سے محسوس ہوتے ہیں"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب کے کان "حقیقت آشنا" واقع نہیں ہوئے ہیں، اس لیے کہ اس نظم کا ہر مصرع راگ الاپ رہا ہے، نغما گا رہا ہے اور لوتا سنائی دے رہا ہے اس لحاظ سے نظم کا صحیح عنوان "مد نغموں کی رانی" ہونا چاہیے یقین ہے کہ آیندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح کر دی جائے گی۔

ہماری رائے میں اس کتاب کا ہر گھر اور خصوصاً ہر لائبریری میں رہنا ضروری ہے اس لیے ہم ہر ایک سے اس کی خریدی کی سفارش کرتے ہیں۔

"ا ہ"

انگور

از محمد نعیم الدین حسن۔ ۱/۱۶ کراون۔ ۸۰ صفحے۔ کاغذ چکنا لکھائی چھپائی معمولی ٹائیٹل رنگین۔ قیمت دو روپے ملنے کا پتا ندارد۔

حیدرآباد دکن کی سرزمین میوے کی کاشت کے لیے نہایت ہی موزوں ثابت ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانے ہی سے یہاں ہر قسم کے پھل کی کاشت ہوتی رہی ہے اورنگ زیب کی آمد کے وقت اورنگ آباد مختلف پھلوں اور اور خاص کر انگور کی کاشت کے لیے بہت مشہور تھا۔ اس کے اثرات پایۂ تخت حیدرآباد تک پھیل گئے تھے۔ مگر کچھ عرصا بعد یہ شوق ٹھنڈا سا پڑ گیا تھا۔ لیکن اب پھر سے ایک دور ایسا آیا ہے کہ انگور کی کاشت کی طرف بہت زیادا توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ کتاب اس بڑھتے رجحان کا نتیجا ہے جو آج سے چند سال پہلے لکھی گئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ انگور کی کاشت سے متعلق زیر تبصرہ کتاب میں بہت سی مفید معلومات موجود ہیں۔ لیکن اب زمانا بہت ترقی کر چکا ہے روسی اور انگریزی زبان میں اب تک کئی ایک معیاری کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کتابوں سے استفادہ کرنے کے بعد کتاب "انگور" کا دوسرا بہتر اور بڑا ایڈیشن شایع کیا جائے۔ آیندہ ایڈیشن میں ان باتوں کا خاص طور پر خیال رہے کہ کاغذ بہتر قسم کا استمال ہو۔ لکھائی چھپائی نفیس اور غلطیوں سے پاک رہے۔ حجم کم سے کم دو سو صفحے اور ہر تصویر کے نیچے تشریح ضرور موجود ہو۔ موجودا قیمت مناسب ہے اور ملنے کا پتا ضرور دیا جائے۔ "ا"

تبصرے

کے لیے ہر کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ کتاب وصول ہوتے ہی فوراً تبصرا کر دیا جائے ادارا اپنی سہولت کا لحاظ کرتے کتابوں وغیرا پر سلسلے وار تبصرا کرتا ہے۔

رجسٹرڈ نمبر اپیچ (۱۸۴)

قواعد

(۱) یہ رسالہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں شایع ہوا کرے گا۔

(۲) حجم حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ گھٹتا بڑھتا رہے گا۔

(۳) دل آزار مباحث کے سوا ہر موضوع پر مضامین قبول کیے جائیں گے۔

(۴) بے لاگ تنقید اور تبصرے کے لیے اس رسالے کے صفحے ہر وقت کھلے رہیں گے۔

(۵) مستقل خریداروں کو وقت پر رسالہ نہ پہنچے تو ۱۵ ر تاریخ تک اطلاع دینے پر دوبارہ بھیجدیا جائے گا۔

(۶) جواب طلب امور کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ لگا ہوا لفافہ اور مضامین کی واپسی کے لیے بھی مناسب ٹکٹ لگا ہوا لفافہ لازمی طور پر بھیجا جائے۔

(۷) اشتہار صاف ہوں ورنہ دفتر کسی قسم کی غلطی کا ذمے دار نہ ہوگا۔

(۸) جب تک اشتہار کی اجرت پہلے وصول نہ ہو اشتہار چھاپے نہ جائیں گے۔

(۹) مضامین وغیرہ صاف ایک ہی رخ پر خوش خط لکھے جائیں۔

(۱۰) اگر رسالے کی خریداری منظور ہو تو ایک سال کا چندہ پہلے ہی بھیجدیا جائے۔

منیجر "ہندستانی ادب"

۹۹۔ اے۔ اعظم پورہ مشرقی۔ پی۔ او۔ جوبلی حیدرآباد دکن ۲